مقالہ

برائے

پی ایچ۔ڈی (اردو)

اردو تحقیق کے فروغ میں معارف کا حصہ

(آزادی سے قبل)

مقالہ نگار

اطہر حسین

اندراج نمبر:A171129

نگراں

ڈاکٹر ابو عمیر

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو

اسکول برائے السنہ، لسانیات اور ہندوستانیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس

2022

"Urdu Tahqeeq Ke Farogh Mein Maarif Ka Hissa (Azadi Se Qabl)"

Thesis submitted in partial fulfilment of the requirement for the award of the Degree of

Doctor of Philosophy

In

URDU

By

Athar Husain

En.No. A171129

Roll No. 17PHUR002LK

Under the Supervision of

Dr. Abu Omair

Assistant Professor

Dept. of Urdu

School of Languages, Linguistics & Indology

Maulana Azad National Urdu University, Lucknow Campus

2022

D E C L A R A T I O N

I do hereby declare that this thesis entitled **“Urdu Tahqeeq ke Farogh Mein Maarif Ka Hissa (Azadi Se Qabl)”** is original research carried out by me. No part of this thesis was published, or submitted to any other University/Institution for the award of any Degree/Diploma.

Research Scholar

Athar Husain
(Enrollment no. A171129)

Place: MANUU, Lucknow Campus

Date:___________________

मौलाना आजाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY
(A Central University Established by an Act of Parliament in 1998)
Gachibowli, Hyderabad (T.S.) 500 032, Ph: 040-23006612, 13, 14 and 15
(Accredited with Grade "A" by NAAC)

DEPARTMENT OF URDU

CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled, **"Urdu Tahqeeq ke Farogh Mein Maarif Ka Hissa (Azadi Se Qabl)"** submitted for the award of the Degree of Doctor of Philosophy in Department of Urdu, School of Languages, Linguistics & Indology, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad, is the result of the original research work carried out by **Mr. Athar Husain** under my supervision and to the best of my knowledge and belief, the work embodied in this thesis does not form part of any thesis/dissertation already submitted to any University/Institution for the award of any Degree/Diploma.

Head	**Supervisor**
Prof. Shamsul Hoda	**Dr. Abu Omair**
Head, Dept. of Urdu	**Department of Urdu**

Dean

School of Languages, Linguistics & Indology

Place: MANUU, Lucknow Campus

Date:___________

پیش لفظ

پیش لفظ

دارالمصنفین کے بانی علامہ شبلی نعمانی (1857۔1914) اردو ادب میں کئی حیثیتوں سے جانے جاتے ہیں۔آپ صرف مصنف ہی نہیں بلکہ مفکر، مصلح اور معتبر مورخ بھی تھے۔علمی و ادبی موضوعات پر آپ نے اہم کتابیں تحریر کیں۔سیرت وسوانح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ایک اچھے نقاد اور محقق بھی تھے۔علمی و ادبی موضوعات پر آپ کی تنہا خدمات ایک ادارے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے بعض ادبی کارنامے علم جاودانی کا مرتبہ رکھتے ہیں۔دارالمصنفین اور ماہنامہ معارف کا شمار علامہ شبلی کے ایسے ہی کارناموں میں کیا جاتا ہے۔

دارالمصنفین ہندوپاک بالخصوص عالم اسلام میں محتاج تعارف نہیں۔بلاشبہ ہندستان کا مایہ ناز علمی و تصنیفی ادارہ ہے۔دارالمصنفین کا جو خاکہ علامہ شبلی نے بنایا تھا اس میں ایک علمی و تحقیقی رسالہ کا اجرا بھی شامل تھا۔ماہنامہ کا نام ’معارف‘ وہ خود طے کر چکے تھے۔ماہنامہ معارف کی اشاعت کا خیال علامہ کے ذہن میں دوران علی گڑھ سے ہی تھا۔ترکی کے سفر میں علامہ شبلی کی نظر سے وہاں کے جو بلند پایہ علمی رسائل نظر سے گزرے ان میں ایک معارف بھی تھا۔یہ ترکی کا ایک مشہور ہفت روزہ رسالہ تھا اس میں علوم جدیدہ کے اعلی درجہ کے مضامین ہوتے تھے۔علامہ شبلی کو یہ نام ایسا بھایا کہ ترکی سے واپسی کے دوسرے ہی سال 1893 میں انہوں نے اسی نام سے ایک رسالہ کا خاکہ شائع کیا تھا۔

معارف کا خاکہ انھوں نے مرتب کیا تھا مگر ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور اس طرح اس خاکہ میں رنگ بھرنے کی سعادت ان کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندوی (1884۔1953) کو ملی ۔ماہنامہ معارف جولائی 1916 میں علامہ سید سلیمان ندوی نے جاری کیا اور یہ تا حال تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔

ماہنامہ معارف بنیادی طور پر علمی و تحقیقی رسالہ ہے، جس کا مقصد نئے گوشوں کی تلاش اور ادب کا معیار متعین کرنا ہے۔معارف نے ہمیشہ سے تحقیقی موضوعات کو فوقیت دی ہے۔یہی وجہ ہے کہ معارف کے توسط سے علم و ادب کے نئے نئے گوشوں کا نہ صرف انکشاف ہوا ہے بلکہ بہت سے قدیم اور نایاب مخطوطوں اور کتابوں کی تحقیق اور ان کا تعارف بھی اس نے پیش کیا ہے جس سے علمی و ادبی دنیا بے خبر تھی۔معارف ایک صدی سے زائد عرصے سے علم و ادب کے مختلف پہلوؤں کو تواتر کے ساتھ روشن کر رہا ہے۔ مدیران معارف کی کوشش رہی ہے کہ اگر کسی لائبریری میں مخطوطات کے ذخیرے، قدیم اور غیر مطبوعہ نسخے، جدید تحقیقی مقالے کا علم ہو تو قارئین معارف تک پہنچا دیں۔یہی وجہ

ہے کہ علمی وادبی دنیا کو بہت سے نادر ونایاب ، اہم مخطوطوں اور قدیم کتابوں کا تعارف معارف کے توسط سے ہی ہوا ہے۔

ادبی تحقیق کی اولیات کا بھی ایک خزانہ معارف کے صفحات پر بکھرا ہوا ہے۔تحقیقی مزاج کے حامل اس رسالے میں علم وادب کی تحقیق سے متعلق بے شمار مقالے شائع ہوئے ،مباحثے بھی ہوئے ادبی دنیا میں اس کی بازگشت بھی رہی یہ کہنا مشکل ہے کہ ایسے کون سے مباحث ہیں جو معارف میں زیر بحث نہیں آئے۔معارف کی تحقیقات کو آسانی کے لیے مختلف حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔دکنیات،اقبالیات،غالبیات،لسانیات،ذخیرہائے مخطوطات کا تعارف، قلمی نسخوں اور نادر مطبوعات کی دریافت،ادبا وشعرا کے احوال کی بازیافت،شعرا کے تذکروں کے متعلق معلومات وغیرہ اس کے علاوہ بھی اردوادب کی تحقیق کے حوالے سے کئی ایسے پہلو ہیں جن کا ایک بڑا خزانہ شعبہ معارف میں موجود ہے۔اس مقالے میں انہیں پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے تا کہ اس بات کا تعین کیا جاسکے کہ اردو تحقیق کے فروغ میں ماہنامہ معارف کا کیا حصہ رہا ہے۔

موضوع کا انتخاب تحقیق کا سب سے پہلا اور اہم مرحلہ ہوتا ہے۔بالخصوص نو واردین ریسرچ اسکالر کے لیے یہ بڑا دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے۔البتہ ایم فل کرنے کی وجہ سے دشواریاں کم پیش آئیں۔کیونکہ ایم فل کے دوران میں نے تحقیق کے اصول وضوابط اور دیگر تکنیکی باتوں سے خاطر خواہ واقفیت کرادی جاتی ہے۔پھر بھی موضوع کا انتخاب ایک مسئلہ تھا۔ڈاکٹر گیان چند جین نے 'تحقیق کے فن' میں موضوع کے انتخاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ موضوع کا انتخاب ہمسفر کے انتخاب کرنے سے زیادہ مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔موضوع کے انتخاب کے وقت میرے ذہن میں بہت سارے موضوعات گردش کررہے تھے۔مگر میں تذبذب کا شکار تھا۔یہ فیصلہ کرپانا میرے لیے بہت مشکل ہورہا تھا کہ کس موضوع کا انتخاب کیا جائے۔تعلیمی میدان میں ہمیشہ سے میرا رجحان غیر افسانوی ادب کی طرف رہا ہے۔موضوع کے انتخاب میں ڈاکٹر عمیر منظر صاحب نے میری بڑی مدد کی۔تلاش وتفتیش کے دوران انہوں نے دارالمصنفین سے شائع ہونے والے رسالہ ماہنامہ معارف کی طرف رہنمائی کی۔میں ایک مدت تک دارالعلوم ندوۃ العلماء،لکھنؤ کا طالب علم رہنے کی وجہ نہ صرف یہ دارالمصنفین اور معارف سے واقف تھا بلکہ علامہ شبلی نعمانی کی متعدد کتابیں بھی پڑھ چکا تھا۔میں نے معارف کی فائلیں پڑھنا شروع کیں،مطالعہ اور ماہرین کے مشورہ کے بعد یہ طے پایا کہ معارف کی تحقیقی خدمات کے حوالے سے کام کرنا ایک اچھا موضوع رہے گا۔بالآخر میں نے 'اردو تحقیق میں ماہنامہ معارف کا حصہ آزادی سے قبل' کا انتخاب کیا۔شعبہ کی ریسرچ کمیٹی نے بھی اس موضوع پر تحقیق کرنے کی اجازت دے دی۔

موضوع کے انتخاب کے بعد دوسرا اہم مرحلہ مواد کی فراہمی کا ہوتا ہے۔مواد کی فراہمی میں الحمدللہ مجھے بہت

زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔معارف کے شمارے نہ صرف یہ کہ بیشتر کتب خانوں میں دستیاب ہیں بلکہ دارالمصنفین نے معارف کے تمام شماروں کو سی ڈی کی شکل دے دی ہے جو مجھے ڈاکٹر عمیر منظر صاحب کے توسط سے بڑی آسانی سے مل گئی۔سی ڈی کی دستیابی کے بعد میں نے 1947 تک کے تمام شماروں کی فہرست کوان کی زبانی ترتیب سے عکس بندی کی اور پھران مضامین کی نشاندہی کی جو تحقیقی نوعیت کے تھے۔سی ڈی کی مدد سے موضوع سے متعلق تمام مضامین کو پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا۔معارف کا عکس بڑی نفاست سے لیا گیا ہے اس لیے اس کو پڑھنے میں زیادہ دشواری نہیں پیش آئی۔اس کے علاوہ اب تک معارف کے ان اشاریوں سے مدد لی گئی جو شائع ہو چکے ہیں۔معارف تحقیق کا ایک بڑا ذخیرہ شذرات پر مشتمل ہے۔خوشی کی بات ہے کہ سید سلیمان ندوی کے تمام شذرات کو' شذرات معارف' کے عنوان سے کتابی شکل دے دی گئی۔مقالے کی تسوید میں اس سے بڑی مدد اور رہنمائی ملی۔

ثانوی ماخذ کی تلاش کے لیے متعدد لائبریوں کا رخ کیا۔جن میں کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی،سید حامد لائبریری مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد،فروغ اردو حیدرآباد،میسور یونیورسٹی لائبریری،مانو لکھنؤ کیمپس لائبریری اورحیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی لائبریری شامل ہیں۔اس کے علاوہ انٹرنیٹ کی مدد سے ریختہ فاؤنڈیشن اوراس کے ارباب ومجاز خصوصی شکریے کا مستحق ہیں،جنھوں نے کتاب تک رسائی کو بے حد آسان کردیا ہے۔لاک ڈاؤن کے زمانے میں اس سے خصوصی فائدہ اٹھایا گیا۔اس کے علاوہ معارف اور شبلیات پر نظر رکھنے والے صاحبان علم سے رجوع بھی کیا نیز ان کی تحریروں سے استفادہ کیا گیا۔

ایک صدی سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی معارف پر بہت کم لکھا گیا ہے۔البتہ دارالمصنفین کی تاریخ اوراس کی خدمات پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔مقالے کی تکمیل کے آخری مراحل میں معارف پر باضابطہ کوئی کتاب تو نہیں ملتی البتہ' معارف کی کہانی مدیران معارف کی زبانی' کے عنوان سے کلیم صفات اصلاحی کی کتاب 2020 نظر سے گزری۔جس میں معارف کی تاریخ اور خدمات کے حوالے سے کچھ نہیں لکھا گیا ہے البتہ اسے ایک حوالہ جاتی کتاب کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔سندھ یونیورسٹی پاکستان میں' رسالہ معارف کی اردو ادبی خدمات: ایک تحقیقی وتنقیدی جائزہ' کے عنوان سے عتیق احمد جیلانی نے اپنا تحقیقی مقالہ لکھا ہے جہاں تک مجھے معلوم ہوسکا وہ اب تک غیر مطبوعہ ہے۔مذکورہ مقالے میں بھی معارف کی تحقیقی خدمات پر زیادہ نہیں لکھا گیا ہے بلکہ انہوں نے معارف کے ادبی مضامین کو تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔2017 میں دارالمصنفین نے معارف صدی تقریبات کا اہتمام کیا جس میں ماہنامہ معارف کے مختلف پہلوؤں کو عنوان بنا کر مقالے پڑھے گئے۔اس سمینار کا کلیدی خطبہ جناب اجمل ایوب اصلاحی نے پیش کیا تھا انہوں نے تحقیق کے متعلق بعض اہم نکات قائم کیے تھے جس

سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔واضح رہے کہ معارف صدی کے موقع پر ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ڈاکٹر عمیر منظر، اور ڈاکٹر شاہنواز فیاض نے ہندستان کے اہم رسائل میں معارف سے متعلق مضامین لکھے تھے جس میں معارف کی تحقیقی اہمیت اور نوعیت پر خاص زور دیا گیا تھا۔ بہر نوع ان چند مضامین کے علاوہ اس موضوع پر اور کچھ دستیاب نہیں تھا۔ان چند کاموں کو سامنے رکھ کر تحقیقی مقالے کو لکھا گیا ہے۔مواد کی فراہمی کے بعد اس مقالہ کو چار ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب کے تحت مختلف ذیلی عناوین قائم کیے گئے ہیں۔

باب اول۔ 'دارالمصنفین اور ماہنامہ معارف: اجمالی تاریخ' کے عنوان سے ہے۔اس باب کے تحت دو ذیلی ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ پہلا باب دارالمصنفین جبکہ دوسرا ماہنامہ معارف ہے۔جس میں دارالمصنفین اور ماہنامہ معارف کی تاریخ اور خدمات پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب دوم۔ 'اردو رسائل وجرائد کی تاریخ' کے نام سے ہے۔جس کو پانچ ذیلی ابواب کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔جو حسب ذیل ہیں ابتدائی نقوش، چھاپہ خانہ اور مطبوعہ صحافت، اردو صحافت کا ابتدائی زمانہ، ادبی صحافت کے روشن نقوش اور بیسویں صدی کے ادبی رسائل۔مذکورہ باب میں نہ صرف یہ کہ بیسویں صدی کے رسائل کا تعارف کرایا گیا ہے بلکہ صحافتی تاریخ کے پس منظر، چھاپہ خانوں کی ایجاد اور مطبوعہ صحافت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان ابواب کی مدد سے تسلسل کے ساتھ رسائل کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب سوم۔ 'ادبی تحقیق کی روایت' کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔جس میں چار ذیلی ابواب 'ادبی تحقیق معنی ومفہوم، ابتدائی نقوش، ادبی تحقیق کا ابتدائی دور اور ادبی تحقیق کی روایت ہے۔جس کے تحت ادبی تحقیق کی روایت تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب چہارم۔ 'ماہنامہ معارف کی تحقیقی خدمات' کے عنوان سے ہے۔جس کے تحت چھ ذیلی ابواب قائم کیے گئے ہیں' قلمی نسخوں اور مخطوطات کی بازیافت، دکنیات، غالبیات، اقبالیات، لسانیات اور متفرقات' اس باب میں ماہنامہ معارف کی تحقیق خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔

ماحصل میں ان تمام نکات کو جامعیت اور قطعیت کے ساتھ قلم بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو معارف میں شائع ہونے والے تحقیقی مضامین کے مطالعہ کے بعد سامنے آئے۔اس کے علاوہ ادبی تحقیق کے فروغ میں ماہنامہ معارف کا کیا حصہ رہا اور اس نے رسائل کی تاریخ کو کس طرح فروغ بخشا اس پر بطور خاص روشنی ڈالی گئی ہے۔

ہر باب کے آخر میں حوالے وحواشی کا اہتمام کیا گیا ہے۔کوشش کی گئی ہے کہ قدیم سے قدیم حوالوں سے رجوع کیا جائے۔سب سے آخر میں کتابیات ہے جس میں کتابیات کے اصول کے مطابق ان تمام بنیادی اور ثانوی ماخذ کو درج کیا گیا ہے جو اس مقالے کو پائے تکمیل تک پہونچانے میں براہ رست یا بالواسطہ طور پر معاون ثابت

ہوئیں۔

تحقیق کے دوران میں ریسرچ کا نو وارد شہسوار ہونے کی وجہ سے میری کم علمی بار بار آڑ آتی رہی ،لیکن جب خداوند قدوس کی مدد شامل حال ہوتو منزلیں آسان ہو جاتی ہیں۔آج اس مقالے کے اختتام پر میں سب سے پہلے اس پاک وبابرکت ذات کی بارگاہ میں شکریہ ادا کرتا ہوں جس کا کوئی ثانی نہیں جو دونوں جہان کا رب ہے۔اس کے بعد میں اپنے والدین کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتا ہوں جن کی محبتوں ،شفقتوں اور دعاؤں کی بدولت آج اس مقام پر پہنچ سکا۔بالخصوص والدہ مرحومہ اور والد محترم کا جن کی دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں اور وقتاً فوقتاً علم کی اہمیت وافادیت پر نصیحت ،رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

مشفق ومہربان استاد اور نگراں ڈاکٹر ابوعمیر (عمیر منظر) کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنہوں نے مقالہ لکھنے میں میری رہنمائی کی جو میرے لیے سرمایہ افتخار ہے۔میں شعبۂ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی (حیدرآباد) کے تمام اساتذہ کا شکر گزار ہوں نیز صدر شعبہ پروفیسر شمس الہدی دریابادی صاحب کا خاص طور سے ،جن کی بے پناہ شفقتیں ومحبتیں مجھے حاصل رہیں نیز دوران تحقیق مفید مشوروں سے بھی نوازتے رہے۔ایم فل میں تحقیق کے ابتدائی اصول وضوابط کے نکات انہوں نے واضح کیے تھے۔دعا کرتا ہوں کہ ان کی شفقتیں اور مہربانیاں ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے لکھنؤ کیمپس کے تمام اساتذہ بالخصوص ڈاکٹر ہمایعقوب صاحبہ (انچارج مانو لکھنؤ کیمپس) ڈاکٹر شاہ محمد فائز صاحب ،ڈاکٹر مجاہد الاسلام صاحب ،ڈاکٹر عشرت ناہید صاحبہ اور ڈاکٹر نور فاطمہ صاحبہ کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے بہت حوصلہ بڑھایا۔میں دعا گو ہوں کہ تعلیم تربیت کے تئیں ان کے ایثار ،جوش وولولے کو اللہ ہمیشہ قائم رکھے۔اس کے علاوہ کیمپس کے غیر تدریسی عملہ نیز کیمپس کی لائبریری کے ذمہ دار ڈاکٹر مسیح الدین خاں کا بھی شکر گزار ہوں۔

مانو لکھنؤ کیمپس کے ابتدائی تحقیقی کارواں میں شامل رفقائے کار میں شاہد حبیب ،محمد ارشد ،موسی رضا ،محمد سعید اختر ،نیرج کمار ،مجتبیٰ حسن صدیقی ،محمود الحسن اور محمد شفیق شکریہ اس لیے ضروری ہے کہ اس مختصر سی جماعت نے نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کا پاس وخیال رکھا بلکہ مقالے کی تسوید میں ہر ممکنہ مدد بھی کی۔محمد سعید اختر ،نیرج کمار اور شاہد رضا کا شکریہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ انہوں نے کمپوزنگ اور تصحیح کے کام میں میری معاونت کی۔ڈاکٹر سعد الحسن ،نوشاد احمد ،عبد الرحیم اور عاقب جاوید کا بھی شکریہ ضروری ہے یہ وہ احباب ہیں جن کے حوصلہ بخش کلمات میرے لیے نفع بخش ہوتے رہے۔

شکریہ کے فرائض میں اپنے تمام اہل خانہ بالخصوص اکمل حسین ،اجمل حسین ،احمد حسین ،راغب حسین ،مظہر حسین اور مظفر الدین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود ہمیشہ میری ہر طرح کی

مدد کی اور ہمیشہ میرے حوصلے کو بلند رکھا۔

مقالے کی تکمیل کی مشکل گھڑی میں شریک حیات شازیہ صدیقی کے حوصلہ بخش کلمات میرے لیے طمانیت کا باعث رہے۔آخر میں ایک بار پھر تمام بہی خواہوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں ،ریسرچ کے دوران جن کی مدد اور نیک خواہشات میرے ساتھ رہیں۔اللہ تعالی سب کو جزائے خیر سے نوازے۔آمین۔

اطہر حسین

ریسرچ اسکالر

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس

فہرست ابواب

پیش لفظ 07

باب اول: 14

دار المصنفین اور ماہنامہ معارف: اجمالی تاریخ

(۱) دار المصنفین 15

(۲) ماہنامہ معارف 39

باب دوم: 72

اردو رسائل و جرائد کی تاریخ

(۱) ابتدائی نقوش 73

(۲) چھاپہ خانہ اور مطبوعہ صحافت 80

(۳) اردو صحافت کا ابتدائی زمانہ 85

(۴) ادبی صحافت کے روشن نقوش 87

(۵) بیسویں صدی کے ادبی رسائل 98

باب سوم:

ادبی تحقیق کی روایت

(۱) ادبی تحقیق: معنی ومفہوم 150

(۲) ابتدائی نقوش 154

(۳) ادبی تحقیق کا ابتدائی دور 160

سرسید احمد خان 161

محمد حسین آزاد 165

مولانا الطاف حسین حالی 170

علامہ شبلی نعمانی 175

(۴) ادبی تحقیق کی روایت 180

مولوی عبدالحق 181

حافظ محمود شیرانی 185

سید سلیمان ندوی 189

مسعود حسین رضوی ادیب 196

نصیرالدین ہاشمی 199

قاضی عبدالودود 205

مولانا امتیاز علی خاں عرشی 210

مالک رام 213

رشید حسن خاں 216

گیان چند جین 219

مختارالدین احمد آرزو 223

باب چہارم: 232

ماہنامہ 'معارف' کی تحقیقی خدمات

(۱) قلمی نسخوں اور مخطوطات کی بازیافت 233

(۲) دکنیات 275

(۳) غالبیات 293

(۴) اقبالیات 310

(۵) لسانیات 332

(۶) متفرقات 347

ادبا و شعرا کے احوال سے متعلق تحقیق 348

لائبریریوں میں موجود مخطوطوں کا تعارف 365

شعرا کے تذکروں سے متعلق تحقیق 368

ماحصل 384

کتابیات 396

تلخیص

برائے

پی ایچ۔ڈی (اردو)

اردو تحقیق کے فروغ میں معارف کا حصہ
(آزادی سے قبل)

مقالہ نگار

اطہر حسین

اندراج نمبر: A171129

نگراں

ڈاکٹر ابو عمیر

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو

اسکول برائے السنہ، لسانیات اور ہندوستانیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس

2022

علامہ شبلی نعمانی (1857-1914) کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک جامع اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا شمار اردو کی ممتاز علمی وادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے تحقیق وتنقید کے ساتھ ساتھ تاریخ وسیرت پر بلند پایہ کتابیں تحریر کی۔ تحقیق وتصنیف کے میدان میں ان کی خدمات بہت متنوع ہیں۔ ہیروز آف اسلام کے تحت المامون اور الفاروق تحریر کی اس کے علاوہ سیرت النعمان، الغزالی اور سوانح مولانا روم لکھی۔ علامہ شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ سیرۃ النبیؐ ہے۔ جس کا خاکہ انہوں نے تیار کیا اور ابتدائی دو جلدیں بھی تحریر کیں۔ سیرت وسوانح کے باب میں یہ نہایت اہم کتابیں ہیں۔ شعر العجم جیسی غیر معمولی اہمیت کی حامل تنقیدی کتاب تصنیف کی نیز موازنۂ انیس ودبیر لکھ کر تقابلی تنقید اور مطالعہ کی بنیاد ڈالی۔ انہیں کسی ایک شعبہ سے نہیں جوڑا جا سکتا، انہیں ہر میدان میں دسترس حاصل تھی۔ بطور شاعر بھی علامہ شبلی نعمانی کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ تاریخی نظموں کے ساتھ ساتھ ہنگامی اور وقتی مسائل وحالات پر بھی ان کی نظمیں خاصی اہم ہیں۔

علامہ شبلی نے گرچہ بہت کم عمر پائی مگر اس قلیل مدت میں بھی انہوں نے تصنیف وتالیف کے میدان میں نہایت اہم خدمات انجام دی۔ انہیں اپنی زندگی ہی میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ دولت عثمانیہ نے انہیں ان کی علمی کاوشوں کی وجہ سے تمغۂ مجیدیہ سے نوازا تھا۔ جامعہ ازہر مصر جس کا شمار دنیا کے بڑے اور قدیم تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے جب اس نے اپنے تعلیمی نظام کی اصلاح کرنا چاہی تو انہوں نے علامہ شبلی کا انتخاب کیا۔ اسی طرح مدینہ یونیورسٹی کا خاکہ تیار ہوا تو اس کی اصلاح کے لیے شبلی کا نام تجویز کیا گیا۔ انجمن ترقی اردو (1903) کا قیام عمل میں آیا تو علامہ شبلی اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے۔ انگریزوں کے خلاف انہوں نے نہ صرف یہ کہ تحریک وقف علی الاولاد کا آغاز کیا بلکہ علماء اور قانون دانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ اس کے علاوہ 1894 میں جبکہ آپ کی عمر محض ۳۷ رسال تھی حکومت برطانوی نے آپ کو شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ اگر کوئی ایک شخص شاعر، مورخ، فلسفی، نقاد، ماہر تعلیم، فقیہ، محدث اتنی ساری صفات کا مالک ہو سکتا ہے تو وہ شبلی کی شخصیت ہے۔

شبلی نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں بڑے انتشار کا دور تھا۔ ملک پر انگریزوں کا تسلط تھا، تعلیم کا نظام بہت خستہ تھا، تعلیم سے مسلمانوں کا گہرا رشتہ نہیں تھا بلکہ وہ تعلیم سے منحرف ہو رہے تھے۔ علامہ کو اپنی قوم سے محبت اور والہانہ لگاؤ تھا، وہ قوم وملت اور مسلمانوں کی حالت پر بہت فکر مند تھے اور اسی لیے کسی ایسے لائحہ عمل کی تلاش میں تھے جس سے قوم کو بیدار کر سکیں۔ علامہ شبلی کا شمار عالم اسلام کے ان صاحبان بصیرت میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تحریکوں اور تحریروں سے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ وہ سرسید کے معاونین میں تھے۔ انہوں نے ان کی تعلیمی پالیسی کو بنظر خود دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے روم، مصر، شام نیز حجاز مقدس کا سفر کیا تھا۔ مدینہ، یورپ اور دیگر ممالک کے تعلیمی معیار وطریقۂ کار کو بغور دیکھا اور سمجھا تھا۔ مستشرقین کی ناپاک سازشوں سے بھی آگاہ تھے۔ یورپی مستشرقین جو اسلام سے

نا آشنا تھے ہیروز آف اسلام کی سیرت لکھ کر اسلام کی شبیہ خراب کر رہے تھے۔جس کی فکر علامہ شبلی کو کھائے جارہی تھی۔شبلی کا سب بڑا امتیاز مشغلہ علمی تھا۔وہ مستشرقین کی پھیلائی گمراہیوں کو نہ صرف بھانپ جاتے تھے بلکہ اس کا منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔جرجی زیدان نے تمدن اور تہذیب کے نام پر جو گمراہی پھیلائی تھی علماء مصر اس کا جواب دینے سے قاصر تھے۔علامہ شبلی نے جرجی زیدان کی غلط کاریوں کا پردہ فاش کیا۔وہ مستشرقین کا جواب دے کر اسلام کی حقیقی تاریخ لوگوں تک پہچانا چاہتے تھے۔المامون،الفاروق،سیرت النبی ﷺ اسی فکر کا نتیجہ ہے۔مقالے کو چار ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب کے تحت مختلف ذیلی ابواب قائم کیے گئے ہیں۔

بــــاب اول۔ ’دارالمصنفین اور ماہنامہ معارف:اجمالی تاریخ کے عنوان سے ہے۔اس باب کے تحت دو ذیلی عنوان قائم کیے گئے ہیں۔ پہلا عنوان دارالمصنفین جبکہ دوسرا ماہنامہ معارف ہے۔جس میں دارالمصنفین اور ماہنامہ معارف کی تاریخ اور خدمات پر مفصل روشنی ڈالی گئے ہے۔

باب دوم۔ ’اردو رسائل و جرائد کی تاریخ‘ کے نام سے ہے۔جس کو پانچ ذیلی ابواب کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔جو حسب ذیل ہیں:ابتدائی نقوش، چھاپہ خانہ اور مطبوعہ صحافت،اردو صحافت کا ابتدائی زمانہ،ادبی صحافت کے روشن نقوش اور بیسویں صدی کے ادبی رسائل۔مذکورہ باب میں نہ صرف یہ بیسویں صدی کے رسائل کا تعارف کرایا گیا ہے بلکہ صحافتی تاریخ کے پس منظر، چھاپہ خانوں کی ایجاد اور مطبوعہ صحافت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان عناوین کی مدد سے تسلسل کے ساتھ رسائل کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بــــاب ســـوم۔ ’ادبی تحقیق کی روایت‘ کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔جس میں چار ذیلی ابواب’ادبی تحقیق معنی ومفہوم،ابتدائی نقوش،ادبی تحقیق کا ابتدائی دور اور ادبی تحقیق کی روایت کے تحت ادبی تحقیق کی روایت تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بــاب چھــارم۔ ’ماہنامہ معارف کی تحقیقی خدمات‘ کے عنوان سے ہے۔جس کے تحت چھ ذیلی ابواب قائم کیے گئے ہیں’قلمی نسخوں اور مخطوطات کی بازیافت،دکنیات،غالبیات،اقبالیات،لسانیات اور متفرقات‘اس باب میں ماہنامہ معارف کی تحقیق خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کی دلی خواہش تھی کی یورپین ممالک کی طرز پر ہندوستان میں بھی کوئی ادارہ ہو جو قوم وملت کی خدمت کرے اور اپنے شعار کو برقرار رکھے۔انہوں نے دارالمصنفین کے قیام کا اظہار پہلی بار دہلی میں اجلاس ندوہ (مارچ ۱۹۱۰) کے موقع پر سہ سالہ رپوٹ پیش کرتے وقت۔اس وقت علامہ شبلی نعمانی سیرت النبیؐ کی تالیف میں مصروف تھے اس کے علاوہ ندوۃ العلماء کی معتمدی بھی ان کے ذمہ تھی،اس لیے دارالمصنفین کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہیں نکال سکے

۔اس کے بعد ندوہ میں اختلاف شروع ہوگیا۔جولائی 1913 میں جب ندوہ کی معتمدی سے مستعفی ہوگئے تو دارالمصنفین کی طرف یکسوئی ہوئی۔

دارالمصنفین کے قیام کا خیال اب اس قدر پختہ ہوگیا تھا کہ انہوں نے 1914 'الہلال' کلکتہ میں اس تجویز کو ملک کے سامنے پیش کیا اور انگریزی میں اس کے ترجمے کرا کر اپنے احباب کو اس جانب متوجہ ہونے کے لیے پیش کیا ۔دارالمصنفین کے قیام کا منصوبہ حتمی ہوگیا تھا مگر یہ طے کر پانا مشکل ہو رہا تھا کہ دارالمصنفین کو کہاں قائم کیا جائے۔علامہ شبلی نے اس سلسلہ میں احباب سے مشورہ طلب کیا۔جبکہ مولانا کی دلی خواہش تھی کہ دارالمصنفین ندوہ میں قائم ہو اکثر احباب شبلی بھی یہی چاہتے تھے مگر دارالمصنفین کے قیام کے لیے حالات اب وہاں سازگار نہیں تھے۔دارالمصنفین کے قیام کے سلسلے میں تبادلئہ خیال جاری تھا ابھی مقام کا تعین نہیں ہوا تھا کہ بقول سید سلیمان ندوی قاضی تقدیر نے خود اس کا فیصلہ کردیا۔چنانچہ اگست 1914 شبلی کے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق صاحب کا انتقال ہوگیا۔اس حادثہ کی خبر سن کر مولانا اعظم گڑھ چلے آئے یہاں ان کو سکون نظر آیا تو یہیں اپنے کاموں کا مرکز بنانے کا فیصلہ کرلیا۔بھائی کی وفات کے بعد علامہ شبلی نے اعظم گڑھ میں مستقل قیام کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔اس لیے دارالمصنفین کا اعظم گڑھ میں قائم ہونا طے ہوگیا۔اس فیصلہ کے بعد مولانا نے دارالمصنفین کے لیے اپنا ذاتی باغ اور بنگلہ وقف کیا۔اپنے اعزہ سے بھی زمینیں وقف کرائیں۔اپنی اور اپنے احباب کی کتابوں سے بھری کئی الماریوں کو مہیا کیا۔دارالضیوف تعمیر کرایا۔

دارالمصنفین اپنے علمی وادبی اور تحقیقی کاوشوں کی بدولت صرف ہندوپاک ہی نہیں بلکہ دیگر ممالک میں بھی اپنی پہچان رکھتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی بعض بے شمار یونیورسٹیوں میں دارالمصنفین کی مطبوعات شامل نصاب ہیں۔بعض کتابوں کے تراجم بھی دیگر زبانوں میں ہوئے۔الفاروق،سیرت عائشہؓ اور خلفاء راشدین وغیرہ کا ترجمہ ترکی زبان میں ہوا،شعرالعجم کا ترجمہ فارسی زبان میں ہوا،اس کے علاوہ سیرت النبیؐ جلد اول اور دوم کا ترجمہ حکومت مصر نے عربی میں کرایا۔غرض دارالمصنفین ایک ایسا ادارہ ہے جس کی خدمات سے پوری دنیا مستفید ہو رہی ہے۔

دارالمصنفین کا جو خاکہ علامہ نے بنایا تھا اس میں ایک علمی وتحقیقی رسالہ کا اجرا بھی شامل تھا۔ماہنامہ کا نام 'معارف' وہ خود طے کر چکے تھے۔ماہنامہ معارف کی اشاعت کا خیال علامہ کے ذہن میں دوران علی گڑھ سے ہی تھا۔ترکی کے سفر میں علامہ شبلی کی نظر سے وہاں کے جو بلند پایہ علمی رسائل گزرے ان میں ایک معارف بھی تھا۔یہ ترکی کا ایک مشہور ہفت روزہ رسالہ تھا اس میں علوم جدیدہ کے اعلی درجہ کے مضامین ہوتے تھے۔علامہ شبلی کو یہ نام ایسا بھایا کہ ترکی سے واپسی کے دوسرے ہی سال 1993 میں انہوں نے اسی نام سے ایک رسالہ کا خاکہ شائع کیا تھا غالبا امتیاز کے لیے اس پر لام تعریف داخل کردیا اور رسالہ کا نام 'المعارف' رکھا۔

تصنیف وتالیف کی مصروفیت اور محمڈن اینگلو اورنٹل کالج میگزین سے وابستگی کی وجہ سے اس وقت وہ یہ رسالہ نہ نکال سکے۔ میر ولایت حسین کی ڈائری میں ایک حوالہ ملتا ہے کہ کالج میگزین بند ہوا تو شبلی نے مجھ سے کہا دونوں مل کر 'معارف' کے نام سے رسالہ نکالیں گے شبلی اس وقت تو نہیں نکال سکے۔ اسی دوران مولوی وحیدالدین سلیم نے 1898 میں معارف نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا جو علی گڑھ اور پھر پانی پت سے ساڑھے تین سال نکل کر بند ہو گیا۔ نام کی مشابہت کی وجہ سے اس کا نام لیا جاتا ہے مگر اب صرف اس کا نام ہی رہ گیا ہے۔ دارالمصنفین کے قیام کے وقت ادارہ کا اپنا پریس نہیں تھا۔ اس لیے معارف فوری طور پر جاری نہ ہو سکا۔ دارالمصنفین کے قیام کے بعد جب ادارہ کو قدرِ استحکام ملا تو علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد کی اس خواہش کو بھی عملی جامہ پہنایا اور تقریبا دو سال بعد جولائی 1916 میں پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ دارالمصنفین کے علمی ترجمان ہونے کی وجہ سے معارف کے اغراض ومقاصد وہی تھے جو دارالمصنفین کے تھے۔

معارف کی اشاعت اس وقت ہوئی جب ملک میں ایک بلند پایہ رسالہ کی ضرورت تھی، اہل علم نے نہ صرف اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا بلکہ متعدد اخبارات اور رسائل میں ان پر خوش کن تبصرے کیے گئے۔ بعض رسائل نے معارف کے مضامین کو اپنے کالموں میں جگہ دی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ معارف اپنی طرز کا منفرد رسالہ تھا۔ بہت کم مدت میں نہ صرف علمی وادبی حلقوں میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا بلکہ ہندستان کی موقر رسالوں میں شمار ہونے لگا۔

معارف کے معیار کو بلند کرنے اور اپنے مقصد میں کامیاب کرنے کی غرض سے سید صاحب نے انگریزی، عربی، فارسی اور اردو کے بہت سارے رسائل منگوائے اور اس سے استفادہ کیا۔ سید صاحب نے ان تجربات سے فائدہ اٹھایا جو الندوہ اور الہلال کی صحافت سے حاصل کیا تھا۔ اس کے علاوہ ملک کے مشاہیر علماء وادبا سے بہت سارے مضامین لکھوائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے خالص فقہی موضوعات پر مقالے حاصل کیے۔ معارف بنیادی طور پر تحقیقی رسالہ ہے اس لیے عام نثری تخلیقی ادب کو جگہ نہیں مل سکی۔ اس کے باوجود بھی معارف نے چند سالوں میں صحافتی ادب کے صف اول میں جگہ بنالی۔

معارف کی اہمیت ومقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ملک اور بیرون ملک ادیب ودانشور نہ صرف یہ معارف کو پابندی پڑھتے تھے بلکہ اس کی جلدوں کو محفوظ بھی رکھتے تھے۔ علامہ اقبال کو دارالمصنفین سے دلی لگاؤ تھا وہ نہ صرف معارف کو پڑھتے تھے بلکہ ان کا کلام بھی معارف میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہی ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔ معارف کی انفرادیت اور مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ معارف کو ہمیشہ سے بلند پایہ مدیران کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی سے لے کر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی تک علم وادب کی ایک کہکشاں ہے۔ معارف کی ادارت کرنے والوں میں مولانا سید سلیمان ندوی، شاہ معین

الدین ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا ضیاالدین اصلاحی اور پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کے نام شامل ہیں۔ مذکورہ مدیروں کے علاہ مولانا عبدالماجد دریابدی اور مولانا ریاست علی ندی نے بھی کچھ مدت تک ادارت کے فرائض انجام دیے۔

معارف کی ادارت وسرپرستی ہمیشہ سے بڑے قلم کاروں کی رہی ہے۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ معارف میں لکھنے والے بھی ہمیشہ سے بڑے پایے کے عالم، ادیب ونقاد رہے ہیں۔ اس لیے معارف بہت جلد ایسا رسالہ بن گیا جس میں شائع ہونا باعث افتخار سمجھا جانے لگا۔ کم ہی ایسے لکھنے والے ہوں گے جن کی نگارشات معارف میں شائع نہ ہوئی ہوں۔ ماہنامہ معارف ظاہری اور معنوی طور پر کئی حیثیتوں سے عصری صحافت اور معاصر رسائل سے مختلف اور بہت سارے تخصصات کا حامل ہے۔ معارف کے سوسالہ سفر کو مدنظر رکھتے ہوئے چند اہم خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ معارف (جولائی 1916) آج اپنے معاصر رسائل میں قدیم ہونے کا اعزاز رکھتا ہے۔ آج تک اس کی اشاعت میں ناغہ نہیں ہوا، مسلسل بغیر کسی انقطاع کے روز اول سے جاری ہے اور اس کے تمام شمارے محفوظ اور آن لائن استفادہ کے لیے موجود ہیں۔ معارف علمی وادبی رسالہ ہے اس کے کچھ اختصاص بھی ہیں، یعنی رسالوں میں کالم وغیرہ کی ابتدا معارف ہی نے کی ہے۔ معارف نے مختلف عنوانات کے تحت کالموں کو خاص کر رکھا ہے۔ مثلا اداریہ کی شذرات کا ہونا مختلف عنوانات کے تحت کالموں میں بٹا ہونا۔

ماہنامہ معارف بنیادی طور پر علمی وتحقیقی رسالہ ہے، جس کا مقصد نئے گوشوں کی تلاش اور ادب کا معیار متعین کرنا ہے۔ معارف نے ہمیشہ سے تحقیقی موضوعات کو فوقیت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معارف کے توسط سے علم وادب کے نئے نئے گوشوں کا نہ صرف انکشاف ہوا ہے بلکہ بہت سے قدیم اور نایاب مخطوطوں اور کتابوں کی تحقیق اور ان کا تعارف بھی پیش کیا ہے جس سے علمی وادبی دنیا بے خبر تھی۔ مدیران معارف کی کوشش رہی ہے کہ اگر کسی لائبریری میں مخطوطات کے ذخیرے، قدیم اور غیر مطبوعہ نسخے، جدید تحقیقی مقالے کا علم ہو تو قارئین معارف تک پہنچا دیں۔ یہی وجہ ہے کہ علمی وادبی دنیا تک بہت سے نادر ونایاب اور اہم مخطوطوں اور قدیم کتابوں کا تعارف معارف کے توسط سے ہی ہوا ہے۔ تحقیقی مزاج کے حامل اس رسالے میں علم وادب کی تحقیق سے متعلق بے شمار مقالے شائع ہوئے، مباحثے بھی ہوئے ادبی دنیا میں اس کی بازگشت بھی رہی یہ کہنا مشکل ہے کہ ایسے کون سے مباحث ہیں جو معارف میں زیر بحث نہیں آئے۔

معارف کی تحقیقات کو آسانی کے لیے مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دکنیات، اقبالیات، غالبیات، لسانیات، ذخیرہائے مخطوطات کا تعارف، قلمی نسخوں اور نادر مطبوعات کی دریافت، ادبا وشعرا کے حالات کی بازیافت، شعرا کے تذکروں کے متعلق معلومات وغیرہ اس کے علاوہ بھی اردو ادب کی تحقیق کے حوالے سے کئی ایسے پہلو ہیں جن کا ایک بڑا خزانہ شعبہ معارف میں موجود ہے۔ ادبی تحقیق کی اولیات کا بھی ایک خزانہ معارف کے صفحات پر بکھرا ہوا ہے۔ ایسے

مضامین ومقالات کی ایک بڑی تعداد ہے۔اس لیے یہاں صرف چند اہم مضامین کا تعارف پیش کیا گیا ہے تا کہ معارف کی تحقیقی اولیات کا اندازہ لگایا جا سکے۔

ماہنامہ معارف نے جب علم وتحقیق کی دنیا آباد کی تو دکنیات سے متعلق بہت سے گوشوں کو پیش کیا۔دکنی کتابوں کا تعارف کرایا۔چونکہ اردو ادب کے فروغ میں دکن کا نمایاں کردار رہا ہے۔اردو کی پیدائش گرچہ دہلی اور نواح دہلی میں ہوئی مگر اس کی پرورش و پرداخت سرزمین دکن میں ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ اردو کی ابتدائی نثری اور منظوم کتابیں دکن میں ہی لکھی گئیں۔معارف تحقیق میں ایک حصہ دکن اور دکنی موضوعات پر مشتمل ہے۔دکنی مباحث کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جس کو 'معارف' نے سلجھایا ہے۔

اردو کی سب سے پہلی مثنوی 'کدم راو پدم راو' جس کے مصنف فخر دین نظامی ہیں اس کی بازیافت کا سہرا معارف کے سر ہے۔اکتوبر 1932 میں نصیرالدین ہاشمی (1895۔1964) نے پہلی بار اس مثنوی کے متعلق ایک طویل مضمون لکھا اور اس مثنوی کے نام کا بھی تعین کیا۔اسی طرح اردو کی سب ضخیم مثنوی 'خاور نامہ' جو دکن کے ایک باکمال شاعر کمال خاں رستمی کی تصنیف ہے۔اس مثنوی کے قلمی نسخے کی اطلاع سب سے پہلے معارف ہی نے علمی و ادبی دنیا کو پہنچائی۔'کتاب نورس' جو بیجاپور کے چھٹے حکمراں ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کے راگ راگنیوں کا مجموعہ ہے۔نصیرالدین ہاشمی نے جون 1932 میں 'نورس' کے تین مختلف نسخوں کی معارف کے ذریعے اطلاع دی جس کے بعد جولائی 1953 میں ڈاکٹر نذیر احمد (1915۔2008) کا ایک تفصیلی مقالہ ماہنامہ معارف میں شائع ہوا، جس میں کتاب نورس کے دس مخطوطوں کی اطلاع تھی۔1955 میں ڈاکٹر نذیر احمد نے ہی اپنے تفصیلی مقدمے کے ساتھ اسے مرتب کر کے شائع کیا۔علی عادل شاہ ثانی شاہی (1048۔1083) بیجاپور کے شاہی حکمرانوں میں آٹھواں حکمراں تھا جو علم وفضل کا قدرداں اور خود بھی ذی علم تھا۔شعر و سخن میں ید طولی رکھتا تھا، اس کا اردو کلیات جو نایاب تھا معارف نے 1933 میں اس کے قلمی نسخے کی بازیافت کی۔جسے زینت ساجدہ نے 1962 میں مرتب کر کے شائع کیا۔شیخ داود ضعیفی جو ایک صاحب دیوان دکنی شاعر تھا ان کی دو کتابوں 'ہدایت ہندی اور عشق صادق' سے ہی اب تک ادبی دنیا واقف تھی معارف نے پہلی بار ان کی ایک اور کتاب 'نصیحت مدن' سے متعارف کرایا۔بالاجی نایک ذرہ جو گیارہویں صدی ہجری کا ایک ہندو دکنی شاعر ہے جس کا کلام اب تک ناپید تھا پہلی بار معارف نے کتب خانہ آصفیہ میں اس کے غیر مطبوعہ کلیات کے بازیابی کی خبر دی۔سید میران ہاشمی بیجاپوری (1635۔1697) کا شمار دکن کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ریختی کا ایک دیوان اور دو کتابیں 'احسن القصہ' اور 'یوسف زلیخا' ان کی یادگار ہیں۔اب تک یہ خیال عام تھا کہ 'احسن القصہ' اور 'یوسف زلیخا' دو الگ الگ کتابیں ہیں مگر ماہنامہ معارف نے برٹش میوزیم کے ایک قلمی مخطوطے کے موجودگی کی خبر دی جس کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ دونوں کتابیں دراصل

ایک کتاب کے دونام ہیں۔اس کے علاوہ ماہنامہ معارف میں دکنی مباحث کا ایک بڑاذخیرہ ہے جس میں نادرونایاب نسخوں کی دریافت، ادباوشعراء کے احوال، شعرا کے تذکرے اور دکنی کتابوں پر تعارف وتبصرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

دکنی مباحث کے علاوہ سیکڑوں ایسے مضامین ہیں جن میں قلمی نسخوں اور مخطوطات کی بازیابی کی خبر دی گئی۔ان مخطوطات کی دریافت سے نہ صرف یہ کہ ہمارے علمی وادبی ذخائر میں اضافہ ہوا ہے بلکہ تحقیقی معیار بھی بلند ہوا ہے۔میر اثر خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی اور صاحب دیوان شاعر تھے۔انہوں نے اردو کی مختلف شعری اصناف میں طبع آزمائی کی۔ان کے دیوان میں غزلیں، رباعیات اور دومثنویاں شامل ہیں۔میر اثر کی مثنوی 'خواب وخیال' کواردوادب میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ایک مدت تک یہ مثنوی کم یاب تھی۔پہلی بار سید سلیمان ندوی نے 1917 میں معارف کے شذرات میں اس کی اطلاع دی۔ڈھاکہ سے حکیم مولوی حبیب الرحمٰن خاں سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں اردو لغت ومحاورات کی دونادر کتب کی اطلاع دیتے ہیں جو کہ دریائے لطافت سے پہلے لکھی گئی۔مذکورہ خط شذرات معارف جولائی 1917 میں شائع ہوا۔اس خط سے نہ صرف یہ کہ اردو کی دوقدیم کتابوں کے متعلق واقفیت ہوتی ہے بلکہ محمد حسین آزاد کا یہ نظریہ بھی باطل قرار پاتا ہے کہ انشاءاللہ خاں انشاء کی دریائے لطافت (1802) اردو قواعد کی پہلی کتاب ہے۔

اشرف علی فغاں شمالی ہند کے باکمال شعرا میں سے تھے۔اردو اور فارسی دونوں میں شاعری کرتے تھے۔انہوں نے اردو کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی۔میر تقی میر، سودا، قدرت اللہ قاسم، درد، آرزو، مصحفی اور جان جاناں کے نہ صرف معاصرین میں سے تھے بلکہ سودا جیسے اہم شاعر نے فغاں کی تقلید میں قطعات اور غزلیں کہیں، البتہ اشرف علی فغاں کو وہ شہرت نہ مل سکی جوان کے معاصر شعرا کو ملی۔فغاں کے دیوان سے نہ صرف عوام بلکہ خواص بھی ناآشنا تھے۔ماہنامہ معارف اپریل 1922 کو عبدالسلام ندوی کا ایک مضمون 'اشرف علی فغاں' کے عنوان سے شائع ہوا۔جس میں پہلی مرتبہ فغاں کے قلمی دیوان کی دستیابی کی خبر دی گئی تھی۔

مولانا الطاف حسین کی شخصیت محتاج تعارف نہیں وہ نہ صرف اردو تنقید کے بنیاد گزاروں میں سے ہیں بلکہ انہوں نے یادگار غالب اور حیات جاوید جیسی غیر معمولی اہمیت کی حامل سوانح عمریاں بھی تحریر کیں۔اس کے علاوہ حالی نے کئی اہم کتابیں تحریر لکھیں۔ان کی لکھی ہوئی کتابوں سے ہر کوئی واقف ہے البتہ کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ مولانا حالی نے خود اپنی کہانی تحریر کی تھی، جو نایاب تھی معارف نے اس کی اطلاع اردو دنیا تک پہنچائی۔دراصل مولانا حالی نے اپنے سوانحی حالات قلم بند کرکے نواب عمادالملک بلگرامی کی خدمت میں بھیجا تھا۔نواب صاحب کے انتقال کے بعدان کے کاغذات میں یہ مسودہ ملا۔جسے مدیر معارف کے ایک مختصر نوٹ کے ساتھ ماہنامہ معارف مئی 1927 کو شائع کیا گیا۔

عظیم آباد ایک عہد تک نہ صرف علم وادب کا گہوارہ رہا ہے بلکہ بعض لوگوں کے نزدیک اسے ایک دبستان کی

حیثیت حاصل ہے۔اردو کے کئی نامور ادبا وشعرا کا مسکن بھی رہا ہے۔دہلی کے اجڑنے کے بعد شعرا وادبا کی ایک بڑی تعداد نے عظیم آباد کا رخ کیا۔دلی سے عظیم ہجرت کرنے والوں میں ایک نام عشق عظیم آبادی کا ہے۔عشق عظیم آبادی کا شمار اردو کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ان کے حالات اور کلام کا انتخاب اکثر تذکروں میں ملتا ہے البتہ ان کا کلیات نایاب تھا۔اصحاب ذوق کی تلاش وجستجو کے بعد بھی کلیات عشق دستیاب نہ ہوسکا۔حسرت موہانی بھی اس کلیات کی تلاش میں عظیم آباد گئے مگر افسوس ان کی یہ حسرت پوری نہ ہوسکی۔معارف کو یہ خوش نصیبی حاصل ہے کہ اس نے کلیات عشق کے بازیابی کی اطلاع سب سے پہلے اردو دنیا کو دی۔مولوی سید حسن رضا کا مضمون ’شاہ رکن الدین عشق عظیم آبادی ان کا کلیات اور تذکرہ حیات‘ معارف مئی 1929 میں شائع ہوا۔جس میں پہلی بار کلیات عشق کی دستیابی کی خبر دی گئی۔

شاد عظیم آبادی کا ایک تبرک ’متروکات شاد‘ معارف جولائی 1929 میں شائع ہوا۔شاد عظیم آبادی نے مذکورہ مضمون میں اپنی شاعری کے متروکات کو درج کیا ہے۔شاد کی یہ ایک قدیم تحریر ہے جو ایک مدت سے نایاب تھی۔معارف نے اس کی اطلاع سب سے پہلے دی۔قاضی عبدالودود کا مضمون ’سید انشا کا غیر مطبوعہ قطعہ اور اس کا شان نزول‘ معارف ستمبر 1937 شائع ہوا۔مذکورہ مضمون میں انشاء اللہ خاں انشا ایک ایسے قطعہ کی بازیابی کی گئی ہے۔جو انشاء کی مطبوعہ کلیات میں بھی نہیں ہے۔معارف اکتوبر 1943 کو محمد ابواللیث صدیقی بدایونی کا مضمون ’میر حسن کی ایک نادر مثنوی‘ شائع ہوا ۔جس میں انہوں نے پہلی بار اردو دنیا کو مثنوی رموز العارفین سے متعارف کرایا۔فاضل مضمون نگار نے میر حسن کی کلیات کے کئی اہم نسخے دستیاب کر کے قلمی دیوان اور مثنویوں پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔یہاں صرف چند مضامین پر روشنی ڈالی گئی البتہ 1947 تک کی مدت میں شائع ہونے والے ایسے تمام مضامین کو مقالے میں شامل کیا گیا ہے۔

معارف تحقیق کا ایک بڑا حصہ غالبیات پر مشتمل ہے۔ابتدائی جلدوں سے ہی معارف کی غالب شناسی کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔غالب کے متعلق معارف میں جو تحریریں شائع ہویں ان میں غالب کی زندگی،شاعری اور ان کی تحریروں کے بارے میں تحقیق،غالب کے شاگردوں کا تذکرہ اور تحقیق نیز کلام غالب کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔غالب کے حوالے سے کئی اہم پہلوؤں پر مباحث کا سلسلہ معارف سے ہی شروع ہوا جو نہ صرف کئی برسوں تک چلا بلکہ بعد میں اس پر مختلف رسائل میں مضامین لکھے گئے۔غالب کے متعدد خطوط کی بازیابی معارف کے ذریعہ ہوئی۔غالب کے فکر وفن سے متعلق لکھی گئی کم وبیش سو کتابوں پر تبصرے یا ان کا تعارف کرایا گیا ہے۔غالب صدی کے دوران ہند وپاک کے رسائل نے کثرت سے غالب نمبر شائع کیے ان میں سے کئی اہم نمبروں پر بھی تبصرہ شائع ہوا۔

غالب تحقیق میں نسخۂ حمیدیہ ایک مستقل موضوع رہا ہے۔واضح رہے کہ نسخہ حمیدیہ کی دریافت ماہنامہ معارف کی اولیات میں سے ہے۔ستمبر 1918 کے شذرات میں سید سلیمان ندوی نے مولانا عبدالسلام ندوی کے حوالے سے مرزا

غالب کے ایک قلمی دیوان کی اطلاع دی۔اس اطلاع کو معارف میں غالب تحقیق کا نکتہ آغاز کہا جا سکتا ہے۔اس نسخہ کو بعد میں نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شہرت ملی۔نسخہ حمدیہ اور کتب خانہ حمیدیہ کے متعلق بحث کا سلسلہ 1918 سے 2017 تک جاری رہا۔ مذکورہ نسخے کے دریافت کے بعد غالبیات میں نئے مباحث کا آغاز ہوا۔واضح رہے کہ یہ 1821 میں مرزا غالب نے اس وقت مکمل کیا تھا جب وہ چوبیس سال کے تھے۔ یہ نسخہ کب اور کس طرح بھوپال پہنچا یہ اب بھی تحقیق طلب ہے۔البتہ بعد میں محققین نے نہ صرف اس کا مطالعہ کیا بلکہ اپنی آرا کو بھی پیش کیا ہے۔

دسمبر 1922 میں ’غالب کا ایک منظوم رقعہ شائع کیا گیا۔مرزا غالب نے یہ خط نواب علاء الدین خاں علائی کے نام تحریر کیا تھا،نواب صاحب نے بھی اس کا منظوم جواب دیا تھا۔اس خط میں دو دو قطعات ہیں ایک اردو اور دوسرا فارسی میں دونوں میں بحر و قافیہ یکساں ہیں۔معارف کے توسط سے یہ خط پہلی بار منظر عام پر آیا۔مذکورہ خط ضیاء الدین خاں رامپوری نے مرزا بشیر احمد خاں سے حاصل کیا تھا۔یہی منظوم مکتوب خلیق انجم نے اپنی کتاب ’غالب کی نادر تحریریں‘ میں بھی شائع کیا ہے۔

مئی 1926 میں نذیر احمد کا ایک مضمون ’مرزا غالب کے بچپن کی ایک تحریر‘ کے عنوان سے معارف میں شائع ہوا ۔اسے دستاویزی حیثیت حامل ہے کیونکہ یہ تحریر جس کو 1804 کو مرزا غالب نے خداداد خاں ولی داد خاں کے پاس اپنا مکان گروی رکھ کر جو روپیہ لیا تھا اس کے عوض میں لکھ کر ان کے حوالے کیا تھا۔معارف میں اس تحریر کی اشاعت کے بعد محققین نے بالخصوص ڈاکٹر مختار الدین آرزو اور مالک رام نے اس طرف توجہ کی اور اس حوالے سے مختلف رسالوں میں مضامین لکھے گئے۔معارف میں شائع ہونے والی اس تحریر سے اردو دنیا نہ صرف نو دریافت تحریر سے آشنا ہوئی بلکہ پہلی مرتبہ غالب کی والدہ کا نام بھی سامنے آیا۔

اپریل اور مئی 1922 کے شمارے میں دو قسطوں میں حافظ احمد علی خاں کا ایک مقالہ ’سراج الدین ظفر شاہ دہلی اور مرزا غالب کی زندگی کا ایک گم شدہ ورق‘ شائع ہوا۔جس میں بہادر شاہ ظفر کی شیعیت کے مسئلہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔جب یہ مشہور ہوا کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے ہیں تو غالب نے ایک مثنوی لکھی جس میں بقول حالی بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا۔حافظ علی احمد خاں نے کتب خانہ رام پور کی ایک کتاب ’دستور العمل اودھ‘ کے حوالے سے اس مسئلہ پر بحث کرنے کوشش کی ہے البتہ اس مضمون سے کوئی نتیجہ نکل کر سامنے نہیں آتا۔آج بھی یہ پہلو تحقیق طلب ہے۔مولانا عبد الماجد دریابادی کا ایک مضمون ’مرزا غالب کا ایک فرنگی شاگرد آزاد فرانسیسی‘ معارف جنوری 1922 میں شائع ہوا۔اس مضمون میں ایک معروف یورپی اردو شاعر الیکزینڈر ہدرلے آزاد کا تعارف ان کے مطبوعہ دیوان سے کرایا گیا ہے جو ان کی اطلاع کے مطابق کتب خانہ رامپور میں موجود ہے۔اس مضمون کی اشاعت سے قبل مرزا غالب کے اس فرنگی شاگرد کا ذکر خطوط غالب

کے علاوہ محض چند تذکروں میں ملتا ہے۔

ماہنامہ معارف کا ایک بڑا حصہ سرمایہ اقبال کی تحقیق وتنقید پر مشتمل ہے۔علامہ شبلی اور علامہ اقبال کے گہرے مراسم تھے۔شبلی نے نہ صرف انہیں ترجمان حقیقت کا خطاب دیا تھا بلکہ بڑے شاعر ہونے کی پیشین گوئی بھی کی تھی۔علامہ شبلی کے انتقال کے بعد ان کے جانشین سید سلیمان ندوی سے بھی کافی لگاو رہا۔دارالمصنفین کے قیام بعد علامہ اقبال نے اس ادارے سے نہ صرف دلچسپی لی بلکہ تاحیات اس کے رکن بھی رہے۔سید صاحب کا معمول تھا کہ علامہ اقبال کے متعلق جب کوئی خوش کن خبر آتی تو معارف میں اس کا ذکر ضرور کرتے تھے۔اقبال کی متعدد نظمیں اور غزلیں سب سے پہلے معارف میں ہی شائع ہوئی۔ یہ بات بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ مولانا عبدالسلام ندوی کی کتاب 'اقبال کامل' آزاد ہندستان میں اقبال پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔

افکار اقبال کے مطالعہ کا آغاز معارف کی ابتدائی جلدوں سے ہوگیا تھا۔عہد سلیمانی سے تا حال علامہ اقبال کی سوانح،شاعرانہ عظمت اوران کے فکر وفلسفہ پر ڈیڑھ سو سے زائد مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ان مضامین سے نہ صرف اقبال شناسی میں مدد ملتی ہے بلکہ بے شمار ایسے گوشے ہیں جن کا ذکر سب سے پہلے معارف میں آیا۔اس کے علاوہ اقبال کی اور ان کے فکر وفلسفہ پر لکھی گئی تقریباسو کتابوں پر تبصرے بھی شامل ہیں۔معارف کے سرمایہ اقبالیات کی فہرست کافی طویل ہے البتہ ان پر لکھی گئی تحریروں کو آسانی کے لیے مختلف حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔فکر اقبال پر مقالات،حیات اقبال پر تحقیق،کلام اقبال کی فنی جہت کا تعین، کتب اقبال پر تبصرے،کلام اقبال کی تعبیر وتشریح اور فلسفہ اقبال کی تفہیم قابل ذکر ہیں۔

ماہنامہ معارف نے لسانی موضوعات کو ہمیشہ سے فوقیت دی ہے۔معارف میں شائع ہونے والے لسانی مضامین کی تعداد ستر کے قریب ہے۔مضامین کے علاوہ شذرات میں بھی زبان وبیان کا ایک بڑا سرمایہ ہے۔معارف کی ایک خاص بات یہ رہی ہے کہ اس نے ابتدائی جلدوں سے ہی لسانی موضوعات کو جگہ دی۔قابل غور بات یہ ہے کہ معارف نے اس وقت ان موضوعات کو فوقیت دی جب اردو کے دیگر رسائل لسانی مضامین سے یکسر خالی ہوتے تھے۔معارف جولائی 1932 میں عبدالسلام ندوی کا مضمون 'ایک قدیم دکھنی شعر' شائع ہوا جس سے نہ صرف یہ کہ اردو زبان میں اسلوبیاتی تنقید کی ابتدا ہوئی بلکہ یہ عالمی ادب میں اسلوبیاتی مطالعہ کی ابتدائی تحریر کہی جاسکتی ہے۔اردو میں اسلوبیاتی تنقید کا بانی عام طور سے مسعود حسین خاں کو مانا جاتا ہے،البتہ معارف کے مذکورہ مضمون کے حوالے سے عبدالسلام ندوی کو اسلوبیاتی تنقید کے بنیاد گاروں میں کہا جاسکتا ہے۔

معارف تحقیق کا ایک بڑا حصہ ادبا وشعرا کے سوانحی احوال کی تلاش وتحقیق پر مشتمل ہے۔معارف کے مشمولات میں ایسے مضامین کی ایک بڑی تعداد ہے۔ان مضامین میں بعض ایسے قدیم شعرا کے احوال ملتے جو کہیں اور نہیں ملتے یا پھر کم ہی

تذکروں میں ملتے ہیں ۔بعض ایسی تحریریں بھی شائع ہوئی ہیں جنہیں سوانحی تحقیق میں اولیت حاصل ہے۔ادبا شعرا کے حالات کی دریافت پر مشتمل مضامین میں صاحب اورنگ آبادی، شیخ خوب محمد چشتی، مصحفی کا سال وفات، مرزا مظہر جانجانا کا سال وفات، میر حسین تسکین، تذکرہ شعراء رام پور کا ایک گمنام شاعر، آتش سے ایک بہاری ادیب کی ملاقات، طالب علی عیش، شمس العلماء مولانا محمد سعید اورنگ آبادی، شیخ علی بخش بیمار، امیر الدین آزاد اور سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی قابل ذکر ہیں۔ان مضامین میں بعض ایسے ہیں جو نہ صرف یہ کہ سلسلہ وار کئی قسطوں میں شائع ہوئے بلکہ جواب میں متعدد محققین کے مضامین بھی شائع ہوئے۔کئی شعرا کی سن وفات کا تعین بھی معارف سے ہوا۔شعرا و ادبا کے متعدد ایسے پہلو جن بازیافت معارف نے کی ہے۔معارف میں اردو تحقیق کا ایک بڑا خزانہ موجود ہے۔مذکورہ مقالے میں صرف 1947 تک کے مضامین شامل کیا گیا۔1947 کے بعد بھی کثرت سے تحقیقی نوعیت کے مضامین شائع ہوئے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مقالات کو دوبارہ پڑھا جائے اور ان مباحث پر از سرِ نو تحقیق کی جائے۔ایک صدی سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی معارف پر نہ کے برابر لکھا گیا ہے۔معارف کے حوالے سوائے چند مضامین کے کوئی باضابطہ کتاب نہیں ملتی۔

انڈیا آفس لندن قدیم ترین لائبریریوں میں سے ایک ہے۔جس کا قیام 1800 میں ہوا۔جہاں مختلف علوم فنون کی کتابوں اور مخطوطات ایک بڑا ذخیرہ ہے۔یہاں اردو، عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی کی وہ کتابیں بھی دستیاب ہیں جو ہندستان میں نادر و نایاب ہیں۔J H BLUM HARDT کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست بھی ہے جو 1920 میں شائع ہوئی۔معارف جون 1920 کو سید سلیمان ندوی کا مضمون 'انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ' کے عنوان سے شائع ہوا ۔جس میں نہ صرف انڈیا آفس لائبریری کا تعارف کرایا گیا ہے بلکہ کتب خانے میں موجود مخطوط پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ماہنامہ معارف کو انڈیا آفس کے مخطوطات کو اردو دنیا سے روشناس کرانے میں اولیت حاصل ہے۔معارف میں لائبریری میں موجود مخطوطات کی نہ صرف یہ کہ فہرست شائع ہوئی بلکہ ان کی خامیوں کی بھی نشاندہی کی گئی۔

معارف نومبر دسمبر 1924 کے دو شماروں میں مولوی نذیر احمد کا مضمون 'عبدالرحیم خان خاناں اور اس کا کتب خانہ اور اس کی موجودہ بقیہ یادگاریں' اور 'عبدالرحیم خان خاناں کے کتب خانے کی قلمی کتابیں' کے عنوان سے شائع ہوا۔پہلے مضمون میں تفصیل کے ساتھ عبدالرحیم خان کے سوانحی حالات اور خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔نیز احمد آباد میں موجود ان کتب خانے کے احوال بیان کیے گئے ہیں۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو کتابیں جمع کرنے اور مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ان کے اس شوق کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حبیب گنج میں موجود ان کے کتب خانہ میں کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔معارف میں ان کے متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں۔شروانی صاحب کتابوں کے بڑے رسیا تھے۔حرمین کی زیارت

کے لیے گئے تو وہاں بھی نادر ونایاب کتابوں کی دریافت میں مشغول رہے۔ وہاں سے لوٹ کر ہندستان آنے کے بعد مدینہ کی لائبریریوں میں موجود کتابوں کی اطلاع ماہنامہ معارف کو ایک مضمون میں لکھ بھیجا۔ مذکورہ مضمون میں عربی وفارسی کی ۹ نادر کتابوں کے نسخوں کا تذکرہ ہے۔ جن میں التقصی، ارتیاح الاکباد فی ریاح فقدالاولاد، اخبار الکریم وغیرہ۔ ان میں بعض ایسی بھی کتابیں ہیں جو ہندستان میں نایاب ہیں۔

ذخیرہ مخطوطات کی تلاش کے حوالے سے شیخ عبدالقادر کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ انہوں نے حکومت کی اعانت سے محض تین ماہ کی قلیل مدت میں 116 مخطوطات جمع کیے تھے۔ جو کہ مختلف علوم وفنون کے تھے۔ اس حوالے سے معارف جولائی 1936 کو پرفیسر سید نواب علی کا مضمون 'ممبئی یونیورسٹی کی فہرست مخطوطات' شائع ہوا۔ مذکورہ مضمون میں نہ صرف یہ کہ چند اہم قلمی نسخوں کا تعارف کرایا گیا ہے بلکہ حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں یورپی فہرست نگاروں کی اغلاط کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ جن کتابوں کے مخطوطات پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں اشجار واثمار، مظہر العجائب، نامہ خیالات، قصیدہ مصنع، ہشت بہشت وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ گجرات کے ریختہ گویوں کا ایک قدیم تذکرہ 'مخزن الشعراء' بھی موجود ہے جسے قاضی نورالدین نے مرتب کیا تھا۔ اس نسخہ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ 1851، 52 میں تصحیح کی غرض سے مرزا غالب کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ غالب کی رائے حاشیے پر موجود ہے۔

معارف کے تحقیقی سرمایہ میں شعرا کے تذکروں کے حوالے سے متعدد مضامین ملتے ہیں۔ ان مضامین کی مختلف نوعتیں ہیں۔ البتہ بیشتر مضامین میں کم یاب تذکروں کا تعارف، تذکروں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، بعض تذکروں کی روشنی میں شعرا کے احوال کی تحقیق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ تذکروں پر شائع ہونے والے مضامین کی ایک بڑی تعداد ہے البتہ یہاں صرف 1947 تک شائع ہونے والے مضامین پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مقالے کا ایک باب 'ادبی تحقیق کی روایت' کے عنوان سے ہے۔ جس میں چار ذیلی ابواب 'ادبی تحقیق معنی ومفہوم، ابتدائی نقوش، ادبی تحقیق کا ابتدائی دور اور ادبی تحقیق کی روایت ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ تحقیق کی لغوی واصلاحی تعریف بیان کی گئی ہے بلکہ متعدد محققین نے تحقیق کی جو تعریف بیان کی ہے اسے بھی نقل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، نصیرالدین ہاشمی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، گیان چند جین مختار الدین احمد آرزو اور دیگر کئی اہم محققین کی خدمات پر بھی مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

معارف چونکہ ایک رسالہ ہے اور رسائل کی تاریخ پر اب تک بہت کم لکھا گیا ہے اس حوالے سے ایک باب 'اردو رسائل وجرائد کی تاریخ' کے نام سے ہے۔ جس کو پانچ ذیلی ابواب کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ جو حسب ذیل ہیں ابتدائی نقوش، چھاپہ خانہ اور مطبوعہ صحافت، اردو صحافت کا ابتدائی زمانہ، ادبی صحافت کے روشن نقوش اور بیسویں صدی کے ادبی

رسائل۔ مذکورہ باب میں نہ صرف یہ بیسویں صدی کے رسائل کا تعارف کرایا گیا ہے بلکہ صحافتی تاریخ کے پس منظر، چھاپہ خانوں کی ایجاد اور مطبوعہ صحافت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان عناوین کی مدد سے تسلسل کے ساتھ رسائل کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اطہر حسین
ریسرچ اسکالر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس

باب اول

دارالمصنفین اور ماہنامہ معارف: اجمالی تاریخ

1۔ دارالمصنفین

2۔ ماہنامہ معارف

دار المصنفين

علامہ شبلی نعمانی (1857۔1914) کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک جامع اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا شمار اردو کی ممتاز علمی و ادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ تاریخ و سیرت پر بلند پایہ کتابیں تحریر کی۔ تحقیق و تصنیف کے میدان میں ان کی خدمات بہت متنوع ہیں۔ ہیروز آف اسلام کے تحت المامون اور الفاروق تحریر کی اس کے علاوہ سیرت النعمان، الغزالی اور سوانح مولانا روم لکھی۔ علامہ شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ سیرۃ النبیؐ ہے۔ جس کا خاکہ انہوں نے تیار کیا اور ابتدائی دو جلدیں بھی تحریر کیں۔ سیرت و سوانح کے باب میں یہ نہایت اہم کتابیں ہیں۔ شعر العجم جیسی غیر معمولی اہمیت کی حامل تنقیدی کتاب تصنیف کی نیز موازنۂ انیس و دبیر لکھ کر تقابلی تنقید اور مطالعہ کی بنیاد ڈالی۔ انہیں کسی ایک شعبہ سے نہیں جوڑا جا سکتا، انہیں ہر میدان میں دسترس حاصل تھی۔ بطور شاعر بھی علامہ شبلی نعمانی کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ تاریخی نظموں کے ساتھ ساتھ ہنگامی اور وقتی مسائل و حالات پر بھی ان کی نظمیں خاصی اہم ہیں۔

علامہ شبلی نے گرچہ بہت کم عمر پائی مگر اس قلیل مدت میں بھی انہوں نے تصنیف و تالیف کے میدان میں نہایت اہم خدمات انجام دی۔ انہیں اپنی زندگی ہی میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ دولت عثمانیہ نے انہیں ان کی علمی کاوشوں کی وجہ سے تمغۂ مجیدیہ سے نوازا تھا۔[1] جامعہ از ہر مصر جس کا شمار دنیا کے بڑے اور قدیم تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے جب اس نے اپنے تعلیمی نظام کی اصلاح کرنا چاہی تو انہوں نے علامہ شبلی کا انتخاب کیا۔ اسی طرح مدینہ یونیورسٹی کا خاکہ تیار ہوا تو اس کی اصلاح کے لیے شبلی کا نام تجویز کیا گیا۔ انجمن ترقی اردو (1903) کا قیام عمل میں آیا تو علامہ شبلی اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے۔ انگریزوں کے خلاف انہوں نے نہ صرف یہ کہ تحریک وقف علی الاولاد کا آغاز کیا بلکہ علماء اور قانون دانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ اس کے علاوہ 1894 میں جبکہ آپ کی عمر محض ۳۷ رسال تھی حکومت برطانوی نے آپ کو شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ اگر کوئی ایک شخص شاعر، مورخ، فلسفی، نقاد، ماہر تعلیم، فقیہ، محدث اتنی ساری صفات کا مالک ہوسکتا ہے تو وہ شبلی کی شخصیت ہے۔

شبلی نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں بڑے انتشار کا دور تھا۔ ملک پر انگریزوں کا تسلط تھا، تعلیم کا نظام بہت خستہ تھا، تعلیم سے مسلمانوں کا گہرا رشتہ نہیں تھا بلکہ وہ تعلیم سے منحرف ہو رہے تھے۔ علامہ کو اپنی قوم سے محبت اور والہانہ لگاؤ تھا، وہ قوم و ملت اور مسلمانوں کی حالت پر بہت فکر مند تھے اور اسی لیے کسی ایسے لائحہ عمل کی تلاش میں تھے جس سے قوم کو بیدار کرسکیں۔ علامہ شبلی کا شمار عالم اسلام کے ان صاحبان بصیرت میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تحریکوں اور تحریروں سے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ وہ سرسید کے معاونین میں تھے۔ انہوں نے ان کی تعلیمی پالیسی کو بنظر خود دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے روم، مصر، شام نیز حجاز مقدس کا سفر کیا تھا۔ مدینہ، یورپ اور دیگر ممالک کے تعلیمی معیار و طریقۂ کار کو بغور دیکھا اور سمجھا تھا۔ مستشرقین کی ناپاک سازشوں سے بھی آگاہ

تھے۔ یورپی مستشرقین جو اسلام سے ناآشنا تھے ہیروز آف اسلام کی سیرت لکھ کر اسلام کی شبیہ خراب کررہے تھے۔ جس کی فکر علامہ شبلی کو کھائے جارہی تھی۔ شبلی کا سب بڑا امتیاز مشغلہ علمی تھا۔ وہ مستشرقین کی پھیلائی گمراہیوں کو نہ صرف بھانپ جاتے تھے بلکہ اس کا منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ جرجی زیدان نے تمدن اور تہذیب کے نام پر جو گمراہی پھیلائی تھی علماء مصر اس کا جواب دینے سے قاصر تھے۔ علامہ شبلی نے جرجی زیدان کی غلط کاریوں کا پردہ فاش کیا۔ 2وہ مستشرقین کا جواب دے کر اسلام کی حقیقی تاریخ لوگوں تک پہچانا چاہتے تھے۔ المامون، الفاروق، سیرت النبی ﷺ اسی فکر کا نتیجہ ہے۔ ان کی دلی خواہش تھی کی یورپین ممالک کی طرز پر ہندوستان میں بھی کوئی ادارہ ہو جو قوم وملت کی خدمت کرے اور اپنے شعار کو برقرار رکھے۔ وہ چاہتے تھے کہ علما جو ان علوم کے اصل وارث ہیں، وہ علوم فنون کی نادر کتابوں کی فراہمی کریں، تحقیق اور تحشیہ وتدوین کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی صحیح شناخت دنیا کے سامنے پیش کریں۔ مگر اس وقت کے علما اسی قدیم روش پر قائم تھے اور مستشرقین اسلامی علوم وفنون کی تحقیق وتدوین میں مستغرق تھے۔ وہ بڑی چالاکی سے مسلمانوں کی کتابوں کا استعمال کرکے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کتابیں لکھ رہے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی علامہ کی اسی فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’مولانا سے پہلے ہمارے علما پر مدرسیت اتنی چھا گئی تھی کہ ان کی نظر درسی کتابوں اور ان کے شروح وحواشی تک محدود ہوکر رہ گئی تھی، زیر درس کتابوں کے علاوہ کسی نئی کتاب کا دیکھنا، کسی اور علم وفن کی کتاب سے استفادہ، قلمی کتابوں کی تلاش اور نوادر کتب کے مطالعہ کا شوق عموماً ناپید تھا۔ مولانا کو اللہ تعالی نے یہ ذوق فطری عنایت فرمایا، انہوں نے ہر علم وفن کی بکثرت کتابیں مطالعہ کیں، نوادر کتب بہ کثرت بہم پہنچائے، کتب خانے چھانے، دنیا کے کونہ کونہ سے مطبوعات منگوائے، ادب، محاضرات، فتوح، تاریخ، رجال، فلسفہ، منطق، کلام کا بڑا سرمایہ جمع کیا اور اپنی تصنیفات اور مضامین میں ان کے حوالے دیے، نصاب تعلیم میں ان میں سے بعض کو داخل کیا، طلبہ اور علماء کو ان کے مطالعہ کی ترغیب دی اور اپنے شاگردوں اور ہم نشینوں میں اس کا ذوق پیدا کیا۔ ندوہ کے ایک اجلاس میں علما کے فرائض پر تقریر کرتے ہوئے خاص طور سے ادھر توجہ دلائی، ان کو یہ دیکھ کر دلی تکلیف ہوتی تھی کہ یورپ کے مستشرقین جن کو اسلام سے کوئی واسطہ نہ تھا، وہ تو مسلمانوں کے علوم فنون کی نادر کتابوں کی فراہمی، تصحیح، تحشیہ اور اشاعت میں ایسی جانفشانیاں دکھا رہے ہیں اور مسلمان علماء جو ان علوم کے اصل وارث تھے ان کو اپنے ان خزانوں کی خبر نہیں، چہ جائے کہ ان کی تلاش وتصحیح مطالعہ واشاعت کی زحمت اٹھائیں۔ مولانا نے اسی شوق میں ایک دفعہ یہ ارادہ کیا کہ ان کی اشاعت کی خاطر ایک مجلس قائم کی جائے۔ اس کا اعلان بھی کیا، مگر خاطر خواہ جواب نہیں ملا

،اسی سلسلہ میں دائرۃ المعارف حیدآباد کو متوجہ کیا اور اس سے فائدہ پہنچا اور کہا جاسکتا ہے کہ ان کی یہ تحریک علماء میں ناکام نہیں رہی، ان ہی غرضوں کے لیے دارالمصنفین کا خاکہ ان کے دماغ میں آیا تھا۔ جوان کی زندگی کا اخیر کارنامہ تھا۔'' 3

دارالمصنفین کے قیام کا خیال علامہ کے ذہن میں ایک طویل مدت سے پرورش پارہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک دائرتالیف قائم کیا جائے جہاں مختلف علوم وفنون کے ماہرین یکجا ہوں اور تصنیف وتالیف میں اپنا وقت صرف کریں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ ادارہ یورپی اکیڈمیوں کی طرز پر کام کرے۔ اس کام کے لیے علامہ شبلی ایسے مصنفین ومولفین کی اشد ضرورت محسوس کررہے تھے جو باذوق، صاحب علم، محنتی، دیانتدار اور ایثار پسند لوگ ہوں۔ نئ پرانی دونوں قدروں سے واقف ہوں اور قدیم وجدید دونوں علوم سے استفادہ کرنے پر قادر ہوں۔ تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ آنے والی نسل کی تربیت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اسلاف کے چودہ سوسالہ کارنامے جو الماریوں میں پڑے بوسیدہ ہورہے ہیں انہیں جمع کیا جائے اور تدوین وتحقیق کرکے عوام تک پہنچایا جائے۔ اس کے علاوہ ترقی یافتہ قوموں کی طرح ایک ایسے ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جو اپنے علوم وفنون کی ترویج وترسیل کرسکے اور ایسا علمی اور پرسکون ماحول ہو جو دنیا کی ہنگاموں سے دور رہ کر فقط قوم وملت کی خدمت کرے۔ ستمبر 1916 کے معارف میں سید سلیمان ندوی ''خواب تمنا، دارالمصنفین کا متخیلہ اعمال، بغداد کے دارالحکمہ کا تخیل ہندوستان کی سرزمین میں'' کے عنوان سے دارالمصنفین کے تخیل پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان مشکلات اور دقتوں کے حل تصنیف وتالیف کی ترقی اور ملک کے خیالات کی توسیع وتصحیح کے لیے ضروری ہے کہ ایک دارالتصنیف قائم کیا جائے۔

1۔ جس کے احاطہ میں ایک کتب خانہ ہو۔

.2۔ مصنفین کی اقامت وسکون کے لیے جس میں مسلسل عمارات اور حجرے ہوں۔

3۔ جہاں مصنفین کی دل جمعی اور اطمینان خاطر کے لیے وظائف کا سامان ہو۔

4۔ جہاں طبع واشاعت کے اسباب مہیا ہوں۔''

ہم نے خطرات کی راہ میں جہاں تک مسافت طے کرلی ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

کتب خانہ:

دارالمصنفین کا کتب خانہ مشرقی ومغربی علوم کا مجمع البحرین ہونا چاہئے، مغربی تصانیف کا ذخیرہ ہمارے پاس نہایت ہی قلیل ہے انسائکلو پیڈیا اور ولڈ ہسٹری کے علاوہ قدیم تاریخ، قانون اور بعض لٹریری تصنیفات نیز مذہب اسلام اور آپؐ کے متعلق تمام کتابیں گو ہمارے پاس موجود ہیں ،لیکن علوم وفنون کی تصنیفات ہمارے پاس ایک دو کے سوا مطلقاً نہیں۔ اس حصے کو ابھی بہت کچھ

ترقی دینا ہے۔کم از کم اس قدر ضروری ہے کہ علم وفن پر انگریزی کی ایک دو مستند کتابیں موجود رہیں۔مشرقی علوم کی تصنیفات میں فارسی سرمایہ بھی مختصر ہے لیکن گراں مایہ ہے عن قریب گب سیریز اور ایشیاٹک سوسائٹی کی مطبوعات سے اس میں خاطرخواہ اضافہ ہوجائے۔عربی زبان میں تفسیر وحدیث کی تمام مطبوعات موجود ہیں ۔اسماء الرجال کا سلسلہ بھی مکمل ہے۔معقولات اور ریاضت کی تعداد کم ہے۔ادب ولغت کی شاید ہی کسی نادر تصنیف کی ہمارے ذخیرے میں کمی ہو،تاریخ کا سرمایہ بھی ایک حد تک مغتنم ہے۔بعض کتابوں کی حاجت ہے۔وہ عن قریب پوری ہوجائے گی۔چند قلمی ونایاب کتابیں بھی کتب خانے میں موجود ہیں۔امید ہے کہ پانچ ہزار کی رقم اگر میسر آجائے تو ایک حد تک انگریزی علوم کی کتابیں اور تمام تر مشرقی تصنیفات ہمارے کتب خانے میں مجتمع ہوجائیں گی۔بالفعل ہم صرف پچیس روپیہ ماہوار کتب خانہ کی ترقی واضافے پر صرف کررہے ہیں۔

بیت المصنفین:

بڑے شہروں میں ہم کو اس ابتدائی حالت میں بہ مشکل زمین مل سکتی تھی۔لیکن یہاں بیرون شہر آبادی سے کس قدر متصل ۱۰ بیگہ زمین ہم کو مل گئی ہے جو مخصوص دارالتصنیف اور دیگر علمی ضرورتوں کے لیے وقف کردی گئی ہے اس زمین کے اندر دو بنگلے پہلے سے بنے تھے۔ایک خود مولانا مرحوم کا تعمیر کردہ تھا جو بالفعل لائبریری ہال ہے۔دوسرا بنگلہ کس قدر ترمیم کے ساتھ سکریٹری کا آفس ہے۔ہال کے اطراف اور گوشو میں متعدد حجرے اور کمرے ہیں،جہاں مصنفین اور رفقا قیام پذیر تھے لیکن یہ مسکن ان کے لیے کچھ زیادہ مناسب نہ تھا۔

مئی ۱۹۱۶ میں مجموعا کئی ہزار کی رقم ہمیں مل گئی ہے ہم نے سب سے پہلے بیت المصنفین کا سلسلہ شروع کردیا،ستمبر میں یہ تعمیر تکمیل کو پہونچ گئی،مسلسل پانچ کمروں کی ایک قطار ہے،سامنے برآمدہ ہے،داہنے بائیں غسل خانے ہیں،وسط سلسلہ میں کھانے کا کمرہ ہے،بیت المصنفین کے دوسرے پہلو پر دارالمصنفین کا آفس تعمیر ہوا ہے۔یہ تمام مکانات پختہ،بلند اور مستحکم وخوبصورت بنے ہیں۔آفس کے پہلو میں کس قدر خام عمارات کا سلسلہ ہے جو دارالاشاعت اور دارالطباعت ہے۔سلسئہ تعمیر میں ہم کو سب سے زیادہ ایک مستحکم،پختہ،وسیع،روشن اور ہوادار عمارت کتب خانہ کی ضرورت ہے جہاں کتابیں اتفاقات سے محفوظ رہ سکیں اور ہر موسم میں جہاں بیٹھ کر مصنفین کام کرسکیں اس عمارت پر تقریبا ۱۵۰۰۰ صرف آئے گا۔خدا کے فضل وعنایت سے امید ہے کہ آئندہ موسم سرما میں دارالمصنفین کا وفد دردمندان ملک کی خدمت میں پیش ہوگا تو قدر شناسان شبلی کی بحمداللہ ملک میں اتنی تعداد ہے کہ شاید وفد کو اپنی کامیابی کے لیے زیادہ سرگرداں نہ ہونا پڑے۔

وظائف اور سرمایہ مالی:

یہ وہ ضرورت ہے جس کے بغیر دین و دنیا کی کوئی تحریک سرسبز نہیں ہوسکتی ۔ اب تک عام اور پبلک چندوں نے ہماری کوئی اعانت نہیں کی اور نہ ہم نے اس کے لیے کبھی دست طلب بڑھایا۔ ہمارے سرمایہ مالی کے چار ذرائع ہیں :

۱۔ حیدرآباد و بھوپال کی اعانت ۵۰۰ ماہانہ۔

۲۔ جائداد موقوفہ کی آمدنی ۱۵۰ سالانا تقریباً۔

۳۔ ممبروں کے سالانا چندے ۳۰۰ سالانا تقریباً۔

۴۔ دارالاشاعت کا منافع ۲۰۰ سالانا تقریباً۔

بالفعل تقریباً ۳۰۰ ماہوار رفقا اور مصنفین کے وظائف پر صرف ہوتا ہے۔ پچیس ماہوار کتب خانے کے لیے مخصوص ہے اور تقریبا پچیس ماہوار انتظامی اشخاص اور دفتر کے لیے ۔ بہرحال ہمارے پاس اس وقت اتنا سرمایا ہے کہ تین مشرقی اور مغربی علوم کے مصنفین اور چار رفقائے تصنیف (فیلو) کس قدر ایثار کے ساتھ بہ اطمینان گزار سکتے ہیں ۔

دارالاشاعت:

دارالاشاعت کے لیے چند کمروں کی قطار ہمارے پاس ہے جو خزانۃ الکتب (بک ڈپو) ہے۔ اسی احاطہ میں ایک پریس قائم کیا گیا ہے جو ابھی ابتدائی مراحل میں ۔ 1917 تک امید ہے کہ یہاں مشین آجائے ،اس وقت دارالاشاعت کو اپنی کامیابی کے لیے بہترین موقع ہاتھ آئے گا۔ تمام ہندوستان میں خالص مصنفین کے لیے بغیر تاجرانہ ارادہ و نیت کوئی پریس قائم نہیں۔ اگر ہماری کامیابی ہمارے حوصلے کے مطابق ہوئی تو امید ہے کہ سب سے بڑی کمی دارالاشاعت سے پوری ہوجائے بعض دوستوں کی رائے ہے کہ ہمدرد وغیرہ کی طرح پبلک کے مشترکہ سرمائے سے پریس کو ترقی دی جائے لیکن ہمارا جواب یہ ہے کہ اولا ہم کو ہندوستان میں مشترکانہ کاموں کی کامیابی سے ناامیدی ہے، ثانیا اگر پبلک کی شرکت بہ غرض منافع ہو تو اس سے اصل غرض مفقود ہوجائے گی اور ایسے اشخاص کا وجود جو اخلاص نیت کے ساتھ بلا ارادۂ مزد و فوائد مالی شرکت فرمائیں کبریت احمر سے نادرتر ہے۔ خزانۃ الکتب (بک ڈپو) میں اس وقت تک صرف مولانا مرحوم اور دارالمصنفین کے ممبروں کی تصنیفات ہیں ۔ ارادہ یہ ہے کہ ایک اردو کے خیار الکتب کی تجویز عمل میں لائی جائے۔

دارالتصنیف:

ہم چند فقرائے ملت نے اپنے حوصلہ سے بلندتر وہ فرائض اپنے سر لیے ہیں جو صرف شاہانہ ہمتوں

کے شایان شان تھے،''وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا''۔

۱۔ ہمارا مقصد صرف اردو زبان کے سرمایہ کی ترقی نہیں ہے بلکہ اولا ملک میں ایک ایسی جماعت پیدا کرنا ہے جو قوم کی دماغی قوتوں کے نشوونما کا سامان کر سکے۔

۲۔ اسلامی علوم وفنون اور علماء اسلام کی قدیم نادر تصنیفات کو بربادی اور گم شدگی سے بچانا اور اگر ممکن ہو تو اس کے طبع واشاعت کا سامان کرنا۔

۳۔ مشرقی اور مغربی علوم پر اپنی زبان میں مستند تصنیفات کا وجود۔''4

علامہ شبلی نعمانی نے دارالمصنفین کے قیام کا اظہار پہلی بار دہلی میں اجلاس ندوہ (مارچ ۱۹۱۰) کے موقع پر سہ سالہ رپوٹ میں پیش کیا۔خود مولانا کی زبان سے دارالمصنفین کے قیام کے خیالات کا اظہار ملاحظہ ہو:

''قومی ومذہبی ضروریات میں جس قدر قومی مدرسہ، ایک قومی کالج، ایک قومی یونیورسٹی کی ضرورت ہے، اسی قدر ایک قومی کتب خانہ اعظم کی بھی ضرورت ہے، اگر مسلمانوں کے مذہب، مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کی قومی تاریخ کو زندہ رکھنا ہے تو ضرور ہے کہ ایسا کتب خانہ بہم کیا جایے، جس میں علوم مذہبی کے متعلق نادر وبیش بہا تصانیف موجود ہوں، جس میں مسلمانوں کی خاص ایجاد کردہ علوم وفنون کا کافی سرمایہ ہو، جس میں ہر فن کے متعلق وہ تمام کتابیں موجود ہوں جو اس فن کے دور ترقی کے مدارج ہیں، جس میں قدما کے عہد کی یادگاریں ہوں اور ان سب باتوں کے ساتھ یہ کتب خانہ کسی کا ذاتی نہ ہو بلکہ وقف عام ہوتا کہ تمام ہندوستان کے مسلمان اور بالخصوص مصنفین اور اہل علم اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ تجویز کہ ندوہ میں ایک دائرہ تالیف قائم کیا جائے جس کے ارکان کا کام صرف مطالعہ کتب اور تصنیف وتالیف ہو جس طرح یورپ میں اکاڈمیاں ہوتی ہیں، یہ بھی اسی وقت پوری ہوسکتی ہے جب ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کردیا جائے۔''5

ندوہ کے اسی جلسہ میں علامہ شبلی نعمانی نے مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی دارالمصنفین کے قیام کی تجویز پیش کرنے کو کہا تھا سید سلیمان ندوی نے''ندوہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ کی ضرورت'' کے عنوان سے ایک دلچسپ مقالہ پیش کیا تھا۔مولانا سید سلیمان ندوی کی وہ تقریر الندوہ میں شائع ہوئی تھی۔سید صاحب کی تقریر ملاحظہ ہو:

'' ندوہ العلماء جس قسم کے علماء اپنے مدرسے میں تیار کرانا چاہتا ہے وہ اس اسکیم سے ظاہر ہے کہ یہاں کے طلبہ درجہ عالمیت یا درجہ تکمیل کے بعد تالیف وتصنیف میں مشغول ہوں اور ایک بڑے پیمانہ پر صیغۂ تصنیف وتالیف قائم کیا جائے۔جس سے علوم تاریخ اسلام کا احیا ہو لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ کام اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب ندوہ العلماء کے احاطہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ ہو جس میں تمام نادر تصنیفات موجود ہوں، اردو زبان کی بہترین لائف الفاروق ہے لیکن حضرات آپ کو معلوم ہے کہ یہ پانچ صفحوں کی کتاب ہندوستان، مصر، قسطنطنیہ کے تمام کتب خانوں کو

کھنگال کر لکھی گئی ہے۔ یہ امر بدیہی ہے کہ ہر مصنف کو یہ فرصت و وسعت نہیں مل سکتی کہ وہ ایک ایک تصنیف کے خاطر تمام روئے زمین کا سفر کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں عمدہ تصنیفات شاذ و نادر شائع ہوتی ہیں۔ اگر قوم ندوہ العلماء کی اقتدا میں ایک ایسا کتب خانہ تیار کر دے جو تمام ضروری اسلامی تالیفات کو محیط ہو تو یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ مفید تالیفات کا ذخیرہ نہایت آسانی سے اردو زبان میں جمع ہو جائے اور خصوصاً اس اسکیم کے قوت سے فعل میں آنے کی صورت پیدا ہوگی کہ ممتاز طلبائے دار العلوم کا ایک حصہ صیغۂ تالیف و تصنیف کے لیے وقف کر دیا جائے جس کی اس وقت قوم کو نہایت سخت ضرورت ہے۔........ دار العلوم کی جدید عمارت میں ایک کتب خانہ اعظم کے مناسب شان ایک بلند عمارت تیار کی جائے جس میں کتب خان کے سوا ایک وسیع کمرہ ارباب قلم و مصنفین کے لیے بنایا جائے جس میں قوم کی ایک جماعت تالیف و تصنیف میں مشغول ہو۔ مادری زبان کو جس گہوارہ یہی دہلی ہے، ان تصنیفات کے ذریعہ ترقی دی جائے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ارباب قلم و مصنفین جس کی تعداد ہندوستان میں ایک مناسب حد تک ہے، اس کے مصارف اپنے جیب سے پورا کریں اور اس عمارت کا نام ''دار المصنفین'' ہو بظاہر یہ تجویزیں خیال کا اختراع معلوم ہوتی ہیں لیکن قوم کی امداد سے جہاں آج بظاہر بہت سے مشکل بلکہ بظاہر محال کام انجام پا رہے ہیں اس کتب خانہ اعظم کا قائم ہو جانا بھی بعید نہیں۔ جس کے غالباً متوسط حیثیت میں پچاس ہزار کا سرمایا کافی ہوگا۔ اس رقم کے مہیا کرنے کے لیے کتابوں کے بہم پہنچانے کے لیے، مطبوعات کی خریداری کے لیے، قلمی نسخوں کے نقل و نسخ کے انتظام کے لیے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ندوۃ العلماء کی نگرانی میں اس کے لیے باقاعدہ ایک کمیٹی قائم کی جائے۔''6

اگست 1910 میں نواب مزمل خان مرحوم نے سرکاری خطاب پانے کی خوشی میں مولانا کو لکھا کہ وہ آپ کی یادگار میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں تصنیف و تالیف کے لیے ایک کمرہ تعمیر کرا دیں گے۔ تو علامہ شبلی نعمانی نے جواب میں اگست 1910 الندوہ میں لکھا کہ:

''جناب نواب صاحب موصوف نے ہم کو خط لکھا ہے کہ دار العلوم کی بورڈنگ کا ایک کمرہ ہماری تصنیفات کی یادگار میں بنوانا چاہتے ہیں۔ ہماری تصنیفات کی تو خیر کیا وقعت ہے لیکن نواب صاحب چونکہ علم دوست ہیں اس لیے انہوں نے علم پروری کا ایک بہانہ پیدا کر لیا ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ دار العلوم میں ایک عمارت ''دار المصنفین'' کے نام سے تعمیر ہو جس کا یہ مقصد ہو کہ اس میں تصنیف و تالیف کا ایک دفتر ہو اور اس سے متعلق باقاعدہ تصانیف ہوں، باہر کے مصنفین اگر چاہیں تو اس میں آ کر رہیں، ان کے لیے ہر قسم کا آرام و سکون مہیا کیا جائے، تمام ضروری علوم و فنون کی کتابیں مہیا رہیں۔ چونکہ ندوہ کا کتب خانہ اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ ہوتا جاتا ہے اور ندوہ

کے تعلیم یافتہ طلبہ میں تصنیف کا تالیف کا مذاق خصوصیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اس لیے دارالمصنفین کی تجویز ہر لحاظ سے موزوں ہے۔نواب مزمل اللہ خان صاحب سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی رقم کو اس مد میں منتقل فرمائیں لیکن شرط یہ ہے کہ ملک کے اور باہمت اور علم دوست حضرات اس سرمایہ میں اضافہ فرمائیں،اس وقت صرف عمارت اور ضروری سامان کے لیے دس ہزار روپے درکار ہوں گے۔''7

اس وقت علامہ شبلی نعمانی سیرت النبیؐ کی تالیف میں مصروف تھے اس کے علاوہ ندوۃ العلماء کی معتمدی ان کے ذمہ تھی اس لیے دارالمصنفین کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہیں نکال سکے۔اس کے بعد ندوہ میں اختلافات شروع ہو گئے۔جولائی 1913 میں جب ندوہ کی معتمدی سے مستعفی ہو گئے تو دارالمصنفین کی طرف یکسوئی ہوئی۔چنانچہ نومبر 1913 کے ایک خط میں محمد امین صاحب زبیری کو لکھتے ہیں:

''ہاں یہ دونوں (سید صاحب اور مولانا عبدالسلام ندوی) اچھے بن گئے ہیں،کم بخت مخالفین نے اوقات اور کام میں خلل ڈال دیا ورنہ اور بھی داغ بیل پڑ رہی تھی۔بہر حال یہ طے ہو لے کہ کہاں صدر مقام کروں تو پھر ارباب قلم کی تربیت شروع کروں،انشاءاللہ سیرت کا ہی دفتر اتنا وسیع کرتا ہوں کہ دائرالتالیف بن جائے،ہندوستان میں ہر کام کے لیے انجمنیں ہیں لیکن تصنیفی انجمن کا میدان خالی ہے اور یہ سب سے بڑا کام ہے۔ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں پر حکمرانی کرتا ہے۔''8

دارالمصنفین کے قیام کا خیال اب اس قدر پختہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے 1914 الہلال کلکتہ کے ذریعہ اس تجویز کو ملک کے سامنے پیش کیا اور انگریزی میں اس کے ترجمے کرائے اور اپنے احباب کو اس طرف خاص توجہ دلائی۔الہلال میں دارالمصنفین کے متعلق ''ایک اہم تجویز'' کے عنوان سے شائع ہوا تجویز کی اہم باتیں ملاحظہ ہو:

''خدا کا شکر ہے ملک میں تصنیف و تالیف کا مذاق پھیلتا جاتا ہے اور قابل قدر ارباب کرم پیدا ہوتے جاتے ہیں لیکن بایں ہمہ اس گروہ میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو مصنف کے بجائے مضمون نگار یا انشاء پرداز کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔کیوں کہ ان کی مستقل تصنیفیں نہیں ہیں۔بلکہ معمولی رسالے یا مضامین ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کو اعلیٰ درجہ تصنیف کی قابلیت نہیں ہے،بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تصنیف کے لیے جو سامان درکار ہیں وہ مہیا نہیں ہیں۔ان میں سے اکثر کے پاس کتابوں کا ذخیرہ نہیں جو انتخاب اور استنباط اور اقتباس کے کام آئے،اتفاق سے اگر کوئی مقامی کتب خانہ موجود ہے تو دل جمعی کے اسباب نہیں کہ اطمینان سے چند روز وہاں رک کر کتابوں کا مطالعہ اور اس سے استفادہ اور نقل و انتخاب کر سکیں۔ان باتوں کے ساتھ کوئی علمی مجمع بھی نہیں کہ ایک دوسرے سے مشورہ اور مبادلہ خیالات ہو سکے۔ان مشکلات کے حلاور

تصنیف وتالیف کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ایک وسیع ''دارالتصنیف'' امور ذیل کے موافق قائم کیا جائے۔1۔ایک عمدہ عمارت ''دارالتصنیف'' کے نام سے قائم کی جائے، جس میں وسیع ہال کتب خانہ کے لیے ہو، اور کے حوالی میں ان لوگوں کے قیام کے لیے کمرے ہوں جو یہاں رہ کر کتب خانہ سے فائدہ اٹھانا اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہنا چاہتے ہوں۔2 ۔یہ کمرے خوبصورت اور خوش وضع ہوں اور ان مشہور مصنفین کے نام سے موسوم ہوں جو تصنیف کی کسی خاص شاخ کے موجد اور بانی فن ہوں۔3۔ایک عمدہ کتب خانہ فراہم کیا جائے، جس میں کثرت تعداد ہی پر نظر نہ ہو بلکہ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جس فن کی کتاب ہو نادر اور کمیاب ہو۔4 ۔تصنیفی وظائف قائم کیے جائیں اور وظیفہ کنندہ کے نام سے موسوم کیا جائے یہ وظائف یا ماہوار ہوں گے یا کسی تصنیف وتالیف کے لئے صلہ کے طور پر دئے جائیں گے۔5۔جو لوگ کم از کم پانچ سو روپیہ یک مشت عطا فرمائیں گے ان کے نام اس عمارت پر کنندہ کئے جائیں گے۔میں یہ تجویز بلکل ایک سرسری صورت میں پیش کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ سردست محض ایک خاکہ کے طور پر اس کی بنیادی قائم ہو جائے، جو رفتہ رفتہ خود بخود وسعت حاصل کرتی جائے گی۔اس بات کا مجھ کو اطمینان ہے کہ ریاست ہائے اسلامی سے اس کے ماہوار مقرر ہو سکیں گے۔سردست ہم کو صرف دست ہم کو صرف دس ہزار روپیہ درکار ہے۔جس سے ایک مختصر تعمیر کی بنیاد ڈال دی جائے، اصل فنڈ کے لئے پچاس ہزار روپیہ کا تخمینہ کیا گیا ہے۔6۔دس ہزار کی رقم میں، میں سردست ایک ہزار اپنا پیش کرتا ہوں اور میں اس بات کا بھی مستدعی ہوں کہ جن بزرگوں کو میری تجویز سے دلچسپی ہو، مجھ سے خط وکتابت فرمائیں اور مناسب مشورے سے بری ہمت افزائی کریں، نیز ایڈیٹران ''ہمدرد، وطن، پیشہ، اخبار، مشرق، البشر، وکیل وغیرہ سے درخواست ہے کہ اس تجویز کو اپنے اپنے اخبار میں شائع فرمائیں۔''9

مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ شبلی نعمانی کے باہمی مشورہ سے یہ طے پایا کہ چند طلبہ علامہ شبلی نعمانی کے ساتھ رہیں جن کو بطور خاص الگ الگ فنون میں خود علامہ شبلی تیار کریں۔جن سے بعد میں مختلف علوم وفنون میں کام لیا جاسکے۔چناچہ اس سلسلے میں ایک خط سید سلیمان ندوی کو جون 1914 میں لکھتے ہیں:

''آزاد (مولانا ابوالکلام) سے مشورہ ہوا رائے یہ ٹھہری کی اصل غرض اشخاص کا تیار کرنا ہے۔اس لیے میں خود دو چار طلبہ اپنے ساتھ رکھوں اور ان کو کسی فن میں تیار کروں اور ان میں صحیح مذاق پیدا کرایا جائے، ان کے مصارف کی تکفیل بھی (جن کو ضرورت ہو) میرے ذمہ ہوگا، اگر تم اس رائے سے متفق ہو تو لکھو اور کوئی طالب علم اس کے قابل ہو اور میرے ساتھ رہنا چاہے تو اس کے نام سے مطلع کرو نیز ایک وظیفہ فنڈ قائم ہونا چاہیے اس میں کچھ ماہوار تم بھی دو۔''10

دارالمصنفین کے قیام کا منصوبہ حتمی ہو گیا تھا مگر یہ طے کر پانا مشکل ہو رہا تھا کہ دارالمصنفین کو کہاں قائم کیا جائے۔علامہ شبلی نے اس سلسلہ میں احباب سے مشورہ طلب کیا۔جبکہ مولانا کی دلی خواہش تھی کہ دارالمصنفین ندوہ میں قائم ہو۔مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی سے اس سلسلہ میں مشورہ چاہا تو انہوں نے اس سلسلہ میں سکوت اختیار کیا۔پھر 14 فروری 1914 کو ایک خط میں مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھتے ہیں:

''ہاں دارالمصنفین پر آپ نے کیوں سکوت کیا، آپ سے بڑھ کر اس کی شرکت کا حق کس کو ہے ۔میں عمارت کو انشاءاللہ پورا کر کے رہوں گا اور شاید وہی میرا مدفن بھی ہو۔'' 11

3 مارچ 1914 کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''دارالمصنفین کی تجویز میں قطعاً طے کر چکا ہوں، کہیں سے بندوبست نہ ہوا تو موجودہ ابتدائی عمارت کے لیے جس کا تخمینہ پانچ ہزار روپے ہیں۔خود اپنے پاس سے ادا کر دوں گا۔چھوٹے چھوٹے کمرے اور احباب سے بنوالوں گا، بہرحال صرف آپ سے مشورہ مطلوب ہے کہ کہاں بنے۔اگر علی گڑھ یا کہیں اور بنے تو لوگ مولوی سمیع اللہ کا مقلد کہیں گے۔اس لیے میں اتمام حجت کے طور پر چاہتا ہوں کہ پہلے ندوہ کے تمام ارکان سے پوچھ لوں، اگر وہ منظور نہ کریں تو پھر مجھ پر اعتراض نہ ہوگا۔پر لطف تجویز دارالمصنفین کے متعلق ذہن میں ہیں۔'' 12

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی علامہ شبلی نعمانی کے خط کا جواب لکھا اور دارالمصنفین کے قیام کے لیے اپنے وطن حبیب گنج کو پیش کیا لیکن وہ جگہ شبلی کو پسند نہیں آئی چنانچہ انہوں نے 9 مارچ 1914 حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام یہ مراسلہ لکھا:

''آپ دارالمصنفین کو حبیب گنج لے جانا چاہتے ہیں تو حضرت میں اعظم گڑھ کو کیوں نہ پیش کروں۔اعظم گڑھ میں اپنا باغ اور دو بنگلے پیش کر سکتا ہوں۔'' 13

مولانا کی دلی خواہش تھی کہ دارالمصنفین ندوہ ہی میں قائم ہو مگر دارالمصنفین کے قیام کے لیے وہاں حالات سازگار نہیں تھے بلکہ اکثر احباب شبلی بھی یہی چاہتے تھے چنانچہ مولانا مسعود علی ندوی نے بھی اس طرح کا خیال ظاہر کیا تو علامہ شبلی نے ان کو 27 جولائی 1914 کو ایک خط میں لکھا:

''بھائی وہ لوگ دارالمصنفین کو ندوہ میں بنانے کب دیں گے کہ میں بناؤں، میری اصل خواہش یہی ہے، لیکن کیا کیا جائے، حالانکہ اس میں انہی کا فائدہ ہے۔'' 14

دارالمصنفین کا قیام ندوہ میں کسی طرح نہ ہوسکا پھر بھی وہ اس کا مرکز لکھنؤ ہی کو بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ 18 جولائی 1914 کو ایک اور خط میں مولانا مسعود علی ندوی کو لکھتے ہیں:

''ایک کام کرنے کا تو یہ ہے کہ دارالمصنفین کا بندوبست کرو، راجہ صاحب محمود آباد نے مجھ سے کہا

تھا کہ میں نے نجف کے پاس زمین لی ہے چاہو تو وہیں تم کو بھی دلا دوں۔ کہو تو میں ان کو لکھوں اور تمام معاملات تمہارے ہاتھ سے انجام پائیں، اگر زمین مل جائے تو ایک مختصر پھونس کا بنگلہ اور چند چھپر کے کمرے بنوا لیے جائیں، پھر کام چلتا رہے گا۔ غالبا وہاں میری صحت بھی درست رہے۔'' 15؎

دارالمصنفین کے قیام کے سلسلے میں تبادلہ خیال جاری تھا ابھی مقام کا تعین نہیں ہو پایا تھا۔ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا کہ بقول سید سلیمان ندوی قاضی تقدیر نے خود اس کا فیصلہ کر دیا۔ چنانچہ اگست 1914 شبلی کے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اس حادثہ کی خبر سن کر مولانا اعظم گڑھ چلے آئے یہاں ان کو سکون نظر آیا تو یہیں اپنے کاموں کا مرکز اعظم گڑھ بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اپنے ایک مکتوب میں مولانا مسعود علی ندوی کو لکھتے ہیں:

''میں یہاں تکمیل کا درجہ کھول دونگا، تم طلبہ کے نام سے مطلع کرو اور خود ان کو لکھ دو کہ مجھ سے خط و کتابت کریں، میں نے یہاں اپنا مستقل انتظام کرلیا ہے، ہر طرح کا آرام اور پھیلاو ہے، تعلیم کے کام شروع ہوگئے ہیں، کسی طرح سے کوئی رکاوٹ نہیں بالکل ایک بادشاہت معلوم ہوتی ہے۔۔۔ باغ ہے، بنگلہ ہے، حکوت ہے، گریجویٹ ہیں، اسکول ہے، تعلیمی انجمن ہے اور سب حسب دل خواہ کا کرتے ہیں۔ دارالمصنفین بھی شروع ہوجائے گا۔'' 16؎

5 ستمبر 1914 کو اسی سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

''میں اب اعظم گڑھ میں ہوں، اور ارادہ ہے کہ یہیں مستقل قیام کروں، استقلال کا ہر طرح کا سامان کر رہا ہوں، دارالمصنفین کے لیے بنگلہ اور باغ وقف کرنا چاہتا ہوں، چونکہ خاندان کے اور لوگ شریک ہیں اس لیے ان کو بھی وقف پر آمادہ کر رہا ہوں۔ پندرہ بگہہ خام رقبہ ہے، اسی میں نیشنل اسکول بھی آجائے گا، درجہ تکمیل کے لیے شائقین کو اطلاع دینا ہے، اگر آؤ تو تمہارے قیام کے لئے ایک کمرہ مع ضروریات کے موجود ہے۔'' 17؎

بھائی کی وفات کے بعد علامہ شبلی نے اعظم گڑھ میں مستقل قیام کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اس لیے دارالمصنفین کا اعظم گڑھ میں قائم ہونا طے ہوگیا۔ اس فیصلہ کے بعد مولانا نے دارالمصنفین کے لیے اپنا ذاتی باغ اور بنگلہ وقف کیا۔ اپنے اعزہ سے بھی زمینیں وقف کرائیں۔ اپنی اور اپنے احباب کی کتابوں سے بھری کئی الماریوں کو مہیا کیا۔ دارالضیوف تعمیر کرایا۔ 10 اکتوبر 1914 کو سید صاحب کو خط لکھتے ہیں:

''تمہارا انتظار بہت رہا، مسعود آئے بھی اور چلے بھی گئے، وہ تو اس ویرانے کو علمی کوششوں (دارالمصنفین و تکمیل وغیرہ) کی جولانگاہ بننے کے قابل خیال کرتے ہیں، کتابیں بقدر ضرورت مہیا ہوگئی ہیں، چھ سات الماریاں بھرگئی ہیں، وقف نامہ باغ زیر تحریر ہے، بنگلہ کے

بغل میں مختصر سا دار الضیوف بن گیا ہے۔"18؎

علامہ شبلی نعمانی دار المصنفین کے انتظامات میں مصروف تھے۔ سیرت النبیؐ کا کام بھی چل رہا تھا۔ ان کی صحت دن بدن خراب ہوتی جارہی تھی۔ بھائی کی موت کا زخم تازہ تھا۔ انہیں دار المصنفین اور سیرت النبیؐ کی تکمیل کا خدشہ تھا۔ انہیں ہر وقت اس بات کا ڈر لگا رہتا کہ زندگی ساتھ نہ چھوڑ جائے اور سارے کام ادھورے رہ جائیں۔ چنانچہ مولانا حمید الدین فراہی صاحب جوان کے شاگرد اور ماموں زاد بھائی بھی تھے 16 اگست 1914 کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> "بھائی اچھا ہونا کیا، ولن یصلح العطار ما افسد الدھر دو دن اچھا رہا تو دو دن بیمار رہتا ہوں لیکن بات چیت کرتا رہتا ہوں، لوگ جانتے ہیں کہ کوئی شکایت نہیں، نظام جسم برہم ہو چکا، ابھی ابھی سخت سردی لگی حالانکہ دو پہر کا وقت ہے۔ افسوس یہ کہ سیرت پوری نہ ہوسکی اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کر سکے۔ وقف نامہ میں اسٹامپ کا جھگڑا تھا اس لئے کلکٹر کے یہاں درخواست دے دی، وہ طے کر دیں تو تکمیل ہو جائے، تمہارا نام متولیوں میں رکھا ہے اور اگر دار المصنفین کا قیام ہوا تو تمہارے سوا کون چلائے گا۔ الہ آباد کا معاملہ امید ہے کہ طے ہو جائے دس ہزار پر خاتمہ ٹھہرا، دستاویز لکھدی گئی رجسٹری باقی ہے۔ آج سید سلیمان آئیں گے اور کل پرسوں چند طلبہ تکمیل، لیکن بیماری سب منصوبے غلط کر رہی ہے۔"19؎

مولانا کی طبیعت ایک مدت سے خراب چل رہی تھی آخری ایام میں ان کی صحت بالکل بگڑتی چلی جارہی تھی۔ کھانا پینا نہ کے برابر تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی میں سخت بیمار پڑ جاتے تھے۔ ہر ایک دو دن کے بعد بخار کی شدت سے پریشان ہو جایا کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں مولانا عبد الباری ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "سلام و دعا خط ملا کشمیر کہاں آؤں، اب بمبئی کے قابل نہیں رہا یعنی دن بھر دروازہ بند رکھتا ہوں، ہوا ذرا سی خنک ہوگئی تو اس کی برداشت نہیں ہوسکتی، ایک مرتبہ اسی بے احتیاطی میں بخار بھی آچکا ہے، بھائی تیل تمام ہو چکا، اب مجھ میں کچھ نہیں رہا، غذا چوبیس گھنٹوں میں سب ملا کر پاؤ بھر، بات کرنا گراں ہوتا ہے حالانکہ بخار وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے۔"20؎

ان تمام مراحل کے بعد سب سے بڑا مسئلہ آمدنی اور وظائف کا تھا چونکہ ابھی تک اس کا کوئی مستقل انتظام نہ ہوسکا تھا۔ مولانا نے اپنے شاگرد مولانا حمید الدین فراہی سے درجہ تکمیل کے طلبہ کے لیے 30 روپیہ ماہوار مقرر کروایا اور خود اتنا ہی اپنے ذمہ لیا اس کے علاوہ طلبہ کی رہائش کے لیے مکان کرایا پر لیا۔ اس مختصر سے انتظام کے بعد انہوں نے دار المصنفین کا ایک تعلیمی خاکہ تیار کیا جو حسب ذیل ہے:

"1۔ مدت تعلیم دو سال۔

2۔ اس کی دوشاخیں ہوں گی، تکمیل وتصنیف

3۔ ہر طالب علم جو صرف ونحو کافی جانتا ہو، اس درجہ میں داخل ہوسکے گا۔

4۔ اس درجہ میں داخل ہونے کے لیے ایک سرسری امتحان لیا جائے گا۔

درجہ تکمیل:

اس درجہ میں دو مضمون لازم ہوں گے، ادب اور علوم ثلاثہ میں سے کوئی ایک یعنی قرآن مجید مع تفسیر، حدیث، علم الکلام مع فلسفہ۔

درجہ تصنیف:

1۔ اس میں وہ شخص شامل ہوسکے گا جس کو انشاپردازی کا فی الجملہ مذاق ہو اور عربی صرف ونحو کافی طور سے جانتا ہو اور ادب میں معمولی استعداد رکھتا ہو۔

2۔ اگر کوئی شخص عمدہ انشاپرداز ہو لیکن عربی سے ناواقف ہو تو اس کو موقع دیا جائے گا کہ عربی زبان حاصل کر سکے۔

طریقہ تعلیم فن تصنیف:

1۔ پہلے چھوٹے چھوٹے علمی عنوانات دئے جائیں گے اور مضامین لکھوئے جائیں گے۔

2۔ پھر چھوٹے چھوٹے علمی رسالے لکھوائے جائیں گے۔

3۔ ہر مضمون کے متعلق اس کے مآخذ بتائے جائیں گے اور تمام مآخذ مہیا کردیے جائیں گے کہ مطالعہ کیسے کریں۔

4۔ پھر جو (یوں ہی یہ عبارت ناتمام رہ گئی۔21)

دارالمصنفین کے لیے سارے ضروری انتظامات ہوچکے تھے۔علامہ شبلی نے خود اپنے ہاتھوں سے خاکہ بنایا تھا اور اب صرف ایسے طلبہ کی ضرورت تھی جو علامہ کے خواب کی تعبیر کرسکیں۔غرض مولانا نے خود کچھ لائق وفائق طلبہ کا انتخاب کیا جن میں مولوی ابوالحسنات، مولانا خلیل، مولانا عبدالرحمٰن، اور مولوی محسن بہاری قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ کچھ طلبہ ندوہ کے فارغین نے خود دارالمصنفین سے اپنی دلچسپی کو ظاہر کیا۔ان دنوں مولانا کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگی تھی۔حالت روز بروز بگڑ رہی تھی۔نومبر 1914 کے پہلے ہفتہ میں مولانا کی حالت کچھ زیادہ ہی بگڑ گئی ہر چند علاج ومعالجہ ہوا مگر سب بیکار ثابت ہوا۔جب زندگی سے بالکل مایوسی ہوگئی تو انہوں نے سیرت النبیؐ کے مسودہ کو کپڑے میں باندھ کر الماری میں رکھوا دیا اور اپنے اعزہ کو وصیت کی کہ یہ مسودہ مولانا حمیدالدین اور مولانا سید سلیمان ندوی کے علاوہ کسی کو نہ دیا جائے۔مولانا حمیدالدین کو حیدرآباد اور مولانا آزاد کو کلکتہ اور سید صاحب کو دسنہ بلانے کے لیے تار دیے۔مولانا ابوالکلام آزاد کے تار کا مضمون ملاحظہ ہو:

> ''اگر آپ اس اثنا میں مل جاتے تو سیرت النبیؐ کی اسکیم کا کچھ انتظام ہوجاتا، ورنہ سب کارروائی بے کار ہوجائے گی۔سید سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلان سمجھا دیتا۔''22

علامہ شبلی کا وقت آ چکا تھا۔موت ایک یقینی امر ہے اس سے ہر انسان کو دو چار ہونا ہے۔مولانا بھی بہت سارے ادھورے منصوبوں اور خوابوں کو چھوڑ کر جانے کا وقت قریب آ گیا تھا۔آخری چند دنوں کے بارے میں خود سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام کا کچھ پتہ نہ چلا،معلوم نہیں ان کو تار ملا کہ نہیں، میں اس وقت بانکی پور میں تھا، مجھے بھی ان میں سے کوئی تار نہیں ملا لیکن بلا اطلاع دل نے خود زیارت کی کشش ظاہر کی اور میں صبح سویرے کسی سے کہے بغیر چل کھڑا ہوا۔لیکن آہ! جب 15 نومبر کی شام کو میں پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی، میں سرہانے کھڑا تھا، میری آنکھوں سے آنسوں جاری تھے،مولانا نے آنکھیں کھول کر حسرت سے میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ اب کیا رہا، پھر زبان سے دوباہ فرمایا''اب کیا!اب کیا!لوگوں نے پانی میں جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ پلا دیا تو جسم میں ایک فوری طاقت آ گئی تو معاہدہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا''سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے،سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کردو''میں نے بھر آئی ہوئی آواز میں کہا''ضرور،ضرور!!'' 23؎

بالآخر 18 نومبر 1914 چہارشنبہ کی صبح علم وادب کا یہ سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ ہر طرف کہرام بپا ہو گیا۔عصر کے قریب اپنے خاندانی باغ میں مدفون ہوئے۔(انا للہ وانا الیہ راجعون)علامہ شبلی نعمانی کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں نے ان کی وصیت کی تکمیل میں 21 نومبر 1914 کو مولانا حمید الدین فراہی کی دعوت پر ''اخوان الصفا'' کے نام سے ایک مجلس کی تاسیس کی گئی۔جس کا اولین مقصد سیرت النبیؐ اور علامہ کے وصیت کردہ نامکمل کاموں کی تکمیل تھا۔اس مجلس کے حسب ذیل ممبر تھے:

1۔	مولانا حمید الدین فراہی (1864۔1930)	صدر
2۔	سید سلیمان ندوی (1884۔1953)	ناظم
3۔	مولانا عبدالسلام ندوی (1883۔1956)	رکن
4۔	مولانا مسعود علی ندوی (1889۔1967)	رکن
5۔	مولانا شبلی متکلم ندوی (1973)	رکن 24؎

اس مجلس نے سب سے پہلے سیرت النبیؐ کی تکمیل کے لیے سید سلیمان ندوی کو مقرر کیا اور مولانا حمید الدین فراہی اور سید صاحب نواب سلطان جہاں بیگم کی خدمت میں حاضر ہو کر سیرت النبیؐ کے لیے ملنے والے وظائف کو دارالمصنفین کے حق میں منظور کرایا۔اس کے علاوہ حیدرآباد سے ملنے والے وظائف کو دارالمصنفین کے حق میں بحال کرایا۔وقف کی کارروائی ابھی نامکمل تھی اس کے لیے ایوان شہر کی ایک مجلس بلا کر اس کی کارروائی مکمل کی گئی۔

4 جولائی 1915 کو باضابطہ طور پر لکھنؤ میں رجسٹری کرائی گئی۔ مولانا مسعود علی ندوی نے دارالمصنفین میں مستقل اقامت اختیار کر کے دارالمصنفین کے پورے نظام کو سنبھال لیا۔ اس وقت دارالمصنفین کا کل اثاثہ دو وسیع بنگلہ، ایک میں دفتر اور ایک میں کتب خانہ تھا اور دارالضیوف تھا۔ دو باغ جس کی آمدنی سالانہ تقریباً 500 ہو گی۔ ایک مختصر کتب خانہ جس میں اردو، عربی، انگریزی اور فارسی کی تقریباً 1500 کتابیں ہوں گی۔ حیدرآباد اور ریاست بھوپال سے ملنے والے وظائف کو دارالمصنفین کے نام منتقل کرایا گیا۔ 25 دارالمصنفین کے قیام کی خبر اخباروں میں چھاپی گئی اور باضابطہ طور پر دارالمصنفین کے اصول وضوابط اردو اور انگریزی میں چھاپے گئے۔ دارالمصنفین کے مقاصد حسب ذیل ہیں:

1۔ ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا

2۔ بلند پایہ کتابوں کی تصنیف وتالیف وترجمہ

3۔ ان کی اور دیگر ادبی وعلمی کتابوں کی طبع واشاعت کا سامان کرنا۔

25 مئی 1915 کو دارالمصنفین کا پہلا اجلاس ہوا۔ جس میں رفقاء دارالمصنفین نے باہمی اتفاق ومشورہ سے حسب ذیل حضرات کو دارالمصنفین کا رکن اساسی منتخب کیا:

1۔	مولانا حمید الدین فراہی	صدر
2۔	مولانا سید سلیمان ندوی	ناظم
3۔	مولانا مسعود علی ندوی	منیجر
4۔	جناب حامد علی نعمانی	رکن
5۔	مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی	رکن
6۔	نواب سید علی خان	رکن
7۔	پروفیسر شیخ عبدالقادر	رکن
8۔	علامہ اقبال	رکن
9۔	نواب عماد الملک بلگرامی	رکن
10۔	مولانا عبداللہ عمادی	رکن
11۔	مولانا عبدالماجد دریابادی	رکن 26

دارالمصنفین کے نظام کو چلانے کے لیے دو مجلسیں مقرر ہیں 1۔ مجلس انتظامیہ 2۔ مجلس عاملہ۔

مجلس انتظامیہ میں ممبران کی تعداد پندرہ ہوتی ہے۔ جس میں ہندستان ہر علاقہ اور خطہ سے مشاہیر اہل علم شامل ہوتے ہیں۔ ابتدا میں مجلس انتظامیہ کی صدارت نواب عماد الملک نے قبول فرمائی۔ اور جسٹس سید کرامت حسین

نائب صدر منتخب ہوئے۔ جبکہ مجلس عاملہ سات اراکین پر مشتمل ہوتی ہے۔ابتدا میں اس کے صدر مولانا حمید الدین فراہی مقرر ہوئے۔اس کے بعد علی الترتیب نواب صدر جنگ بہادر، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی، ڈاکٹر سید محمود، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی وغیرہ جیسے مشاہیر علم وادب قرار پائے۔ 27ے

دارالمصنفین کے شعبے:

1۔دارالکتب:

دارالکتب کی ابتدا مولانا شبلی نعمانی کی ندوہ کو ہدیہ دی گئی باقی ماندہ کتابوں اور ان کے اعزہ واقارب کی طرف سے ہدیہ کی گئی کتابوں سے ہوئی۔مگر کتابوں کا یہ مختصر سا سرمایہ دارالمصنفین کی ضرورتوں کے لیے ناکافی تھا۔رفقاء دارالمصنفین نے ابتدا سے ہی اس شعبہ کی طرف خاص توجہ دی۔کتابوں کی خریداری کی لیے باضابطہ رقم مقرر کی گئی۔جیسے جیسے رقوم کی فراہمی ہوتی گئی اور ذرائع اور وسائل دستیاب ہوتے گئے کتابوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا،اس طرح برسوں کی محنت کے بعد یہ کتب خانہ مشرقی ومغربی علوم کی کتابوں کا مجمع البحرین بن گیا۔آج بھی نووارد اہم کتابوں کی خرید سے کتب خانے کی توسیع کا سلسلہ جاری ہے۔الحمد اللہ ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد اردو،عربی،فارسی،انگریزی،تاریخ،حدیث،فلسفہ اور متعدد علوم وفنون کی معیاری کتابوں کا ایک ذخیرہ ہے مگر دارالمصنفین کی ضرورتوں کے حساب سے یہ ذخیرہ ناکافی ہے۔اس لیے ہر سال کتابوں کی خریداری کا کام کیا جاتا ہے۔دارالمصنفین کی چند نادر کتابوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو بمشکل ہی کسی اور کتب خانہ میں دستیاب ہے تاکہ دارالمصنفین کے کتب خانے کا اندازہ لگایا جاسکے۔دارالمصنفین کے تعارف نامہ میں عربی وفارسی کی 65 نادرونایاب کتابوں کی تفصیل درج ہے البتہ چند کتابوں کا یہاں تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ ’کتاب الجمل‘ یہ عربی میں فن نحو کی کتاب ہے جس کا پوارا نام الجمل فی اصول النحو ہے۔اس کتاب کے مصنف ابوالقاسم زجاجی ہیں۔دالمصنفین کی ذخائر میں یہ سب سے قدیم کتاب ہے جس کی کتابت ۷۱۸ ہجرہ میں ہوئی۔سید سلیمان ندوی نے ۱۳۴۷ھ میں اس کی نقل تیار کرائی۔یہ نسخہ چھوٹی تقطیع کے 230 صفحات پر مشتمل ہے۔کتاب کے مصنف کی خاص بات یہ ہے کہ وہ ہر باب کے اختتام کے بعد خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے۔

۲۔ شرح نہج البلاغہ یہ حضرت علیؓ کے خطبات نہج البلاغہ کی شرح ہے۔شارح کا نام عزالدین عبدالحمید مدائنی (المتوفی 655ھ) ہے۔جس کے مرتب سید رضی الدین محمد ہیں۔یہ شرح کئی اجزا پر مشتمل ہے جو وزیر ابن علقمی کے کتب خانہ کے لیے لکھی گئی تھی۔مذکورہ نسخہ بہت قدیم ہے اس پر سلاطین گولکنڈہ کی پانچ مہریں ثبت

ہیں۔کاتب کا نام اور کتابت کی تاریخ درج نہیں ہے۔

۳۔ 'نظام الغریب' یہ علی بن عیسی بن ابراہیم بن ربعی کی تصنیف ہے۔فن لغت کی کتاب ہے۔کاتب کا نام محمد شرف الدین ہے یہ ۹۹۸ھ کی مکتوبہ ہے۔تقطیع متوسط اور صفحات 192 ہیں۔

۴۔ 'کتاب المیز ان' امام عبد الوہاب بن احمد بن علی شعرانی کی تصنیف ہے جس کی اشاعت ۹۷۳ھ میں ہوئی۔اس موضوع پر مصنف کی ایک اور کتاب 'المنجج المبین فی ادلة المجتہدین' بھی ہے ۔1083ھ کا بیش قیمت نسخہ ہے۔

۵۔ 'رسائل اخوان الصفا' چوتھی صدی ہجری کے بعض اہل علم کی جماعت اپنے کو اخوان الصفا کے نام سے موسوم کرتی تھی۔یہ فرقہ باطنیہ سے تعلق رکھتے تھے۔اس نے مختلف فلسفیانہ مسائل پر 51 رسالے لکھے،انہیں رسائل کو'رسائل اخوان الصفا' کہا جاتا ہے۔زیرنظر مخطوطہ ابتدائی چند رسائل کا مجموعہ ہے جو علامہ شبلی کی ملکیت تھا۔528 صفحات پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ بہت سی نادر و نایاب کتابیں موجود ہیں جو ہندوستان کے کتب خانوں میں کمیاب ہیں جن میں عمدہ النسب فی نسب ابی طالب (۸۲۸ھ)،وفیات الاعیان،امام غزالی کی تصنیف احیام العلوم،تفسیر بیضاوی ،صحیح بخاری،شرح منارالانوار،المغنی فی اسماء الرجال،منہج العمال فی سنن الاقوال،انوارالتنزیل،تحریر اقلیدس اور التفسیرات الاحمد یہ قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ فارسی ،اردو کی قدیم و نایاب کتابوں میں اکبرنامہ مونس الارواح،سر اکبر،راضہ تاج محل،دانش نامہ جہاں،نفحات الانس، مثنوی فتوح الحرمین،مثنوی منطق الطیر،گلشن زار،بزک جہانگیری،فتاوی بابر،گلستاں،جواہر خمسہ،انیس الارواح،فرہنگ جہانگیری،کلمة الحقائق ،دیوان حافظ،سکندرنامہ،دارالمصنفین کے خزانے میں موجود ہیں۔28

۲۔دارالتصنیف:

یہ دارالمصنفین کا اہم شعبہ ہے۔جس کے تحت کتابوں کی تصنیف وتالیف کا کام کیا جاتا ہے۔اس کی دو نوعتیں ہیں۔دارالمصنفین سے کسی نوع کی وابستگی کرنے والے ادیب مصنف دوسرے وہ لوگ جو یہاں کے منصوبوں کے مطابق کوئی اہم کتاب تالیف کریں۔ابتدا میں اس شعبہ سے صرف دو مصنف سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی وابستہ تھے۔بعد میں اس میں اضافہ ہوتا گیا۔دارالمصنفین کو ہمیشہ سے ہی مختلف زبانوں کے مشاہیر علم وفن کی خدمت حاصل رہی ہے۔جن میں عبدالماجد دریابادی، پروفیسر عبدالباری ندوی،شاہ معین الدین ندوی،سید صباح الدین عبد الرحمٰن،مولانا ریاست علی ندوی،مولانا ابوالجلا ندوی،مولانا سید ابوظفر ندوی،سید نجیب اشرف ندوی،مولوی منصور نعمانی ندوی،مولانا شاہ نصیر الدین پھلواری،مولانا اویس نگرامی ندوی،مولانا مجیب اللہ ندوی،مولانا ضیاالدین اصلاحی، پروفیسر

اشتیاق احمد ظلی وغیرہ جیسے مشاہیر کی ایک فہرست ہے جنہوں نے مختلف موضوعات پر قلمی تعاون کیا۔

دارالاشاعت:

دارالمصنفین کے مقاصد اور علامہ شبلی نعمانی کی آرزوں کی تکمیل میں یہ شعبہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔اس شعبے کے ذریعے کتابوں کی اشاعت کا کام لیا جاتا ہے۔اب تک اس شعبے نے مختلف زبانوں میں متنوع موضوعات پر سیکڑوں کی تعداد میں اہم نادر کتابیں شائع کر چکا ہے۔دارالمصنفین کی آمدنی کا شعبہ دارالاشاعت ایک بڑا وسیلہ ہے۔دارالمصنفین کی مطبوعہ کتابوں میں بعض بہت نادر اور غیر معمولی شہرت کی حامل ہیں۔بعض کتابوں پر مختلف ہندوستان کی مختلف اکیڈمیوں سے انعام بھی مل چکے ہیں۔شعر العجم،موزنہ انیس ودبیر،شعر الہند،گل رعنا،اقبال کامل،الفاروق،سیرت عائشہؓ،تاریخ اسلام،ہماری بادشاہی،ابن خلدون اور رحمت عالم وغیر کتابیں ہندو پاک کی یونیورسٹیوں میں شامل نصاب ہیں۔سیرت النبیﷺ مطبوعہ دارالمصنفین کو غیر معمولی شہرت ومقبولیت حاصل ہے۔سیرت النبیﷺ کو ہندو پاک ہی نہیں بلکہ عالم اسلام اور یورپ میں بھی اعتبار حاصل ہے، بلکہ کئی اقوامی اور بین الاقوامی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔پاکستان کے صدر جمہوریہ ضیاالحق مرحوم نے قومی اسمبلی کے ممبروں کو اس کتاب کو پڑھنے کی تلقین کی تھی بلکہ اس کے نسخے مفت میں تقسیم بھی کرائے تھے۔سید سلیمان ندوی کی مشہور زمانہ کتاب الخیام کو فردوسی کے ہزار سالہ تقریب پر حکومت افغانستان نے ایران کو تحفہ میں پیش کیا تھا۔

پریس کا قیام:

اس شعبہ کا قیام جون ۱۹۱۶ میں عمل میں آیا۔ماہنامہ معارف اور دارالمصنفین کی کتابیں اسی شعبے کے زیر انتظام شائع ہوتی ہیں۔ابتدا میں لیتھو کا صرف ایک پریس تھا،پھر چھپائی کی دو اور مشینیں آ گئیں جس سے چھپائی کے آسانی ہوگئی اور پتھر کے بجائے پلیٹ کا استعمال ممکن ہوسکا۔ابتدا میں معارف کی کتابت ہاتھ سے اور طباعت پتھر سے کی جاتی تھی۔ایک مدت تک اس کی طباعت انجن سے بھی کی گئی۔اخراجات کی قلت کی وجہ سے کچھ وقت تک ونڈ ائک سسٹم سے چھپائی ہوتی تھی اور اب آفسیٹ پریس سے چھپائی ہوتی ہے اور کتابت کا پورہ کام کمپیوٹر کی مدد سے کیا جاتا ہے۔دارالمصنفین کی مطبوعات نہ صرف یہ کہ عمدہ ہوتی ہیں بلکہ مناسب قیمت پر بھی دستیاب ہیں۔سلسلہ دارالمصنفین کی کتابیں دیگر مطابع سے بھی شائع ہوتی ہیں۔چونکہ موجودہ پریس قدیم طرز کا ہے اس لیے عام طور پر وہاں سے صرف معارف ہی شائع ہوتا ہے۔شبلی صدی مطبوعات دہلی کے دیگر مطابع سے ہوئی تھیں۔

شعبہ معارف:

شعبہ ٔ معارف ٔ دارالمصنفین کا ایک اہم شعبہ ہے۔علامہ شبلی نے دارالمصنفین کا جو خاکہ بنایا تھا اس میں ٔ ماہنامہ معارف ٔ کا اجرا بھی تھا۔جس کی اشاعت جولائی ۱۹۱۶ میں معارف پریس کے قیام کے بعد ممکن ہوسکی۔یہ رسالہ

دارالمصنفین کا ترجمان ہے۔ یہ ہندوستان کے ان قدیم رسائل میں سے ایک جو ایک صدی سے زائد عرصے سے تسلسل سے نکل رہا ہے۔کبھی اس کی اشاعت میں ناغہ یا تاخیر نہیں ہوئی۔ یہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو بلا کسی تاخیر کے شائع ہوتا ہے ۔معارف دیگر رسائل سے کئی حیثیتوں سے منفرد ہے۔ ابتدا ہی سے اس رسالے کو معتبر مدیروں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔جن میں سید سلیمان ندوی، شاہ معین الدین ندوی، سید صباح الدین الرحمٰن، مولانا ضیا الدین اصلاحی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور پروفیسر اشتیاق احمد ظلی قابل ذکر ہیں ۔معارف کے حوالے سے تفصیلی گفتگو الگ سے ایک ذیلی عنوان کے تحت کی گئی ہے۔

شعبہ تعمیرات:

اس شعبے کے تحت دارالمصنفین میں عمارت سازی کا کام لیا جاتا ہے۔جس وقت دارالمصنفین کا قیام عمل میں آیا اس وقت دارالمصنفین کے احاطے میں علامہ شبلی کا عطیہ کیا ہوا صرف دو بنگلہ تھا۔دارالمصنفین کے مہتمم مولانا مسعود علی ندوی جو ایک فعال اور متحرک شخص تھے انہوں نے اپنی کارگزاری اور جانفشانی سے کتب خانہ، پریس، دفتر، رہائشی مکانات اور کمرے تعمیر کرائے اس کے علاوہ ایک خوبصورت مسجد، مہمان خانہ بھی دارالمصنفین کی چہار دیواری میں شامل ہے۔

دارالمصنفین کے قیام کو آج ایک صدی سے بھی زائد کا وقت گزر چکا ہے۔علامہ شبلی کے بنائے ہوئے منصوبوں پر یہ ادارہ روز اول سے سرگرداں ہے۔ملک اور بیرون ملک کے تشنہ لبوں کی پیاس بجھانے کا کام کر رہا ہے۔موجودہ دارالمصنفین میں سہولیتوں کا جائزہ حسب ذیل ہے:

1۔ اس ادارے میں ایک وسیع کتب خانہ،ایک پریس اور دارالاشاعت ہے۔کتب خانہ میں تقریباً 15000 کتابیں دستیاب ہیں۔اس کے علاوہ اردو اور عربی کے غیر مطبوعہ مخطوطے بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔کتب خانہ میں ایک وسیع دارالمطالعہ ہے جو مختلف شعبوں میں بٹا ہوا ہے۔شعبہ رسائل جس میں مختلف زبانوں کے متعدد رسائل موجود ہیں۔

2۔ شہر کے ہنگاموں سے دور پرسکون جگہ پر قائم یہ خوشنما اور دلکش ادارہ تقریبا 14 بگہہ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔جو چہار دیواریوں سے گھرا ہوا اور سرسبز وشاداب ہے۔اس کے حدود میں مسجد، قبرستان، مہمان خانہ، ملازمین اور مصنفین کے لیے رہائش گاہوں کا ابھی انتظام ہے۔

3۔ دارالمصنفین کا ترجمان ماہنامہ معارف جو ایک صدی سے رائد عرصے سے مسلسل بغیر کسی انقطاع کے جاری ہے۔

دارالمصنفین ہندوپاک بالخصوص عالم اسلام میں محتاج تعارف نہیں ۔ بلاشبہ ہندوستان کا مایہ ناز علمی و تصنیفی ادارہ ہے۔دارالمصنفین کی علمی وادبی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔مختلف علمی، ادبی اور دینی موضوعات پر

خدمات دارالمصنفین کی خدمات اس کا اعتراف علمی دنیا کرچکی ہے۔مولانا کلیم صفات اصلاحی نے دارالمصنفین کے سوسال میں لکھتے ہیں:

''دارالمصنفین علامہ شبلی نعمانی کی سب سے آخری اور مہتم بالشان یادگار ہے اور ایسا عظیم کارنامہ ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔اپنی علمی شناخت اور منفرد طرز و انداز کے سبب یہ ملک و ملت کے لئے مایہ ناز علمی و تحقیقی ادارے کی حیثیت سے نہ صرف برصغیر ہندو پاک میں مشہور معروف ہے بلکہ اپنی بلند پایا علمی خدمات کی وجہ سے اس کی شہرت و ناموری کا دائرہ دنیائے مغرب کے بیشتر مما لک تک وسیع ہے۔امریکہ، برطانیہ، فرانس، جنوبی افریقہ، اسکاٹ لینڈ، آسٹریلیا، ترکی وغیرہ جیسے مما لک میں بھی اس ادارے سے واقف ہونے والوں کی اچھی خاصی تعداد موجود اور اس کے اہم کارناموں کی معروف و قدرداں ہے۔''29

دارالمصنفین ہندستان کا قدیم بین الاقوامی شہرت یافتہ ادارہ ہے۔دارالمصنفین کی شہرت کا اندازا اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ملک کے ہر گوشہ سے صاحب علم اور اہل کمال یہاں تشریف لاتے رہے ہیں۔موتی لال نہرو جب بھی مشرقی یوپی کا دورہ کرتے تو دارالمصنفین میں ضرور قیام کیا کرتے تھے۔پنڈت جواہر لال نہرو کا بھی دارالمصنفین سے کافی لگاؤ تھا وہ جب بھی اعظم گڑھ آتے تو دارالمصنفین کے مہمان ہوتے تھے نیز انہوں نے دارالمصنفین کی لائف ٹائم ممبر شپ بھی لی تھی۔30اندرا گاندھی نے بھی اس روایت کو برقرار رکھا۔ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد علامہ شبلی کے رفقاء کار میں سے تھے انہوں نے دارالمصنفین کی تاسیس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔وہ سید صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

''دارالمصنفین کا پراسپکٹس پہنچا، مجھے اس سلسلہ میں جو کچھ بنانا چاہیں منظور ہے۔آنریری فیلو تو ایک عمدہ بات ہے، اگر اس میں کوئی جگہ قلی کی ہو جب بھی میں منظور کرلونگا۔''31

دارالمصنفین ابتدا ہی سے ہندوستان کے بڑے بڑے سیاست دانوں اور سماجی کارکنوں کا محبوب ادارہ رہا ہے۔مرکزی وزیر غذا جناب رفیع الدین قدوائی، پروفیسر ہمایوں کبیر کو بھی اس ادارے سے بہت دلچسپی تھی۔وہ مختلف حوالوں سے اس کی مدد کرتے رہتے تھے۔سابق مرکزی وزیر ڈاکٹر سید محمود عرصہ دراز تک دارالمصنفین کی مجلس صدارت پر فائز رہے۔جناب فخر الدین علی احمد بھی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔اس کے علاوہ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین شروع ہی سے دارالمصنفین کو بہت عزیز رکھتے تھے بلکہ مجلس انتظامیہ کے رکن بھی تھے۔دارالمصنفین کی جب گولڈن جبلی منائی گئی ان دنوں وہ نائب صدر جمہوریہ ہند تھے، صدارت کے لیے دارالمصنفین تشریف لائے انہوں نے دارالمصنفین پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا:

''دارالمصنفین اعظم گڑھ ایک سراج منیر، جس کے ساتھ مجھے کئی رشتوں سے وابستہ ہونے کا

شرف حاصل ہے۔ مجھے یہ ادارہ جو قوم کی بیش بہا دولت ہے دل سے عزیز ہے۔ دارالمصنفین کے موسس روحانی مولانا شبلی نعمانی کی گراں قدر علمی وادبی خدمات نے بلا واسطہ ہندوستان کے اور بالواسطہ ساری دنیا کے تہذیبی سرمائے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ علامہ شبلی اور دارالمصنفین کا علمی وادبی عطیہ زیادہ تر اسلامی تاریخ وسیرت، تاریخ ہند اور تاریخ وتنقید اور ادب کے میدانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی خصوصیت میں نفس مضمون کی معروضیت، لہجے کے اعتدال، زبان وبیان کی سلاست کے علاوہ اوران سے بھی زیادہ نمایاں قلب ونظر کی وسعت ہے۔ اس مکتب کے مصنفوں نے جہاں کہیں اسلامی تہذیب کے تعلقات یونانی، ایرانی، ہندی تہذیب سے دکھائے ہیں وہاں فصل کے بجائے وصل کے پہلو کو ابھارا ہے اور ''قصہ سکندر ودارا'' سنانے پر ''حکایت مہر ووفا'' بیان کرنے کو ترجیح دی ہے۔''32

دارالمصنفین کے قدردانوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس میں سابقہ والیان ریاست، ہندوپاک کے سربراہان حکومت اور اہم سیاسی لیڈروں اور ملک وبیرون ملک کے مشاہیروں کے نام آتے ہیں۔ گاندھی جی، جنان وی وی گری، سر تاج بہادر سپرو، جے پرکاش نرائن، لال بہادر شاستری، اشوک مہتہ، پیارے لال، کرشناراؤ، مالوی جی اور مسلمانوں میں مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اسعد مدنی، خواجہ عبدالمجید، بی اماں اور ادبا میں فراق گورکھپوری، رام بابوسکسینہ، حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفرعلی خاں وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ملک کے بیشتر اکابرین نے دارالمصنفین کا استقبال کیا البتہ مولوی بشیرالدین مرحوم کی ایک آواز مخالفت میں اٹھی۔ انہوں 26 ستمبر 1916 'البشیر' اخبار میں دارالمصنفین کی مخالفت میں ایک مضمون لکھا تھا۔ معارف اکتوبر 1916 سید صاحب کے جواب سے مخالفت کے اسباب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مولوی بشیرالدین صاحب جو 'البشیر' نام ایک زعفران زار اخبار کے ایڈیٹر ہیں ان کے اختراعات اور جدت طرازیوں کی داد دیتے دیتے گو ہم تھک گئے ہیں لیکن مسلمانوں کو فخر کرنا چاہیے کہ ان کا یہ مایہ ناز صناع اپنی صنعت گری کے نت نئے تماشا نمائیوں سے نہیں تھکتا، اس کی ایک تازہ ایجاد ۲۶ ستمبر کے البشیر میں ظاہر ہوئی ہے، غریب کے نزدیک دنیا اور اس کی ضرورتیں صرف ایک ہی گھروندے سے عبارت ہے، جس کا نام ان کی زبان میں 'علی گڑھ کی مرکزیت' ہے، حاشا کہ میں علی گڑھ تحریک کا مخالف نہیں لیکن اس کے نادان دوستوں کی حمایت پر بے اختیار ترحم آمیز ہنسی آتی ہے۔ دارالمصنفین کے قیام اور اس کی تاسیس وترقی کی داستان اگر ان کے لیے خوش آئند نہیں تو ہم دعا کریں گے کہ خدائے پاک انہیں وہ عمر دراز دے جو ملت مرحومہ کی ایک ایک ضرورت کی تکمیل کے لیے سیکڑوں مرکزی مجمع اور مجالس ان کی آنکھوں کے سامنے آجائیں، غالباً یہ متوقع الحصول موقع ان کے لیے سب سے زیادہ اندوہ گیں اور پرحسرت

ہوگا۔33

دارالمصنفین اپنے علمی وادبی اور تحقیقی کاوشوں کی بدولت صرف ہندوپاک ہی نہیں بلکہ بیرون ملک یورپ، ایشیا، افریقہ، فرانس، جرمنی، امریکہ بالخصوص عالم اسلام وغیرہ میں اپنی معرفت رکھتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی بعض یونیورسٹیوں میں دارالمصنفین کی مطبوعات کو نصاب میں داخل کیا گیا۔ بعض کتابوں کے تراجم بھی دیگر زبانوں میں ہوئے۔ الفاروق، سیرت عائشہؓ اور خلفاء راشدین وغیرہ کا ترجمہ ترکی زبان میں ہوا، شعرالعجم کا ترجمہ فارسی زبان میں ہوا، اس کے علاوہ سیرت النبیؐ جلد اول اور دوم کا ترجمہ حکومت مصر نے عربی میں کرایا۔ غرض دارالمصنفین ایک ایسا ادارہ ہے جس کی خدمات سے پوری دنیا مستفید ہو رہی ہے۔ کلیم صفات اصلاحی لکھتے ہیں:

> ''دمشق کی المجمع العلمی 1921 میں قائم ہوئی تو اس نے یہاں کی تالیفات پر حوصلہ افزا تقریظیں لکھیں۔ المقطتف وغیرہ میں معارف میں شائع شدہ مضامین کے ترجمے بھی شائع ہوئے، یہاں کے رفقاء کے متعلق قسطنطنیہ اور انگورہ کے رسائل واخبار میں مضامین شائع ہوئے، انگورہ کی تدقیقات وتالیفات ہیئت قائم ہوئی تو دارالمصنفین سے علمی تعلقات استوار گئے، فرانس کے علمی رسالہ ''ماندے مسلمان'' میں متعدد بار دارالمصنفین کا تذکرہ کیا گیا۔ امریکہ میں بھی اس کا آوازۂ شہرت بلند ہوا، زویمر اور مسٹر مرے نے اپنے مضامین میں دارالمصنفین کا تذکرہ کیا اور وہاں کے رسائل میں دارالمصنفین کو ''مسلمانوں کی جدید اصلاحی تحریک کا مرکز'' قرار دیا گیا۔ کیلیفورنیا یونی ورسٹی میں بھی اس کی علمی سرگرمیوں سے دلچسپی لی گئی۔ مشہور مستشرقین پروفیسر براؤن، ڈاکٹر نکلسن اور موسیو لیوی ماسنا وغیرہ کو علامہ شبلی نعمانی اور ادارہ سے قلبی لگاؤ تھا۔۔۔ اسلام اور داعی اسلام کے موضوع پر مار گولیتھ اور گولیم ورہم اور دارالمصنفین کے درمیان علمی اور نظریاتی معرکہ آرائی ہوئی تو انہوں نے اپنی غلطی تسلیم کی اور اسلام اور داعی اسلام پر لگائے گئے الزامات کو تسلیم کیا۔''34

دارالمصنفین نے اپنا ایک صدی کا سفر مکمل کر لیا ہے۔ ایک صدی کے دوران جس نوع کی علمی وادبی خدمات ادارے نے انجام دی ہے وہ بے مثال ہے۔ یہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے جو یورپین ممالک کے اداروں کی نہج پر کام کرتا ہے۔ ایک طرف یہ ادارہ جہاں تحقیق کا کام انجام دیتا ہے تو دوسری طرف طلبہ کی ذہن سازی اور شخصیت سازی کا بھی کام کرتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا یہ منفرد ادارہ ہے جس کی ہر تحقیق، ہر کاوش اور تجسس کا مقصد اسلام اور اسلامی علوم کی خدمت کرنا ہے۔ دارالمصنفین نے قدما کی کتابوں کی تلاش وتحقیق کر کے تحشیہ وتدوین کا کام کیا اور نئے موضوعات پر بھی کتابیں شائع کی ہیں۔ اس کے علاوہ معترضین کا مسکت جواب دیا۔ غرض یہ ادارہ ایک صدی سے بھی زائد عرصہ سے علامہ شبلی نعمانی کی فکر ورجحان اور وصیت کردہ احکام پر رواں دواں ہے اور لاکھوں تشنہ لبوں کی پیاس بجھا رہا ہے۔ دارالمصنفین کی مقبولیت اور کامیابی کا اندازہ سید سلیمان ندوی کے ایک واقعہ سے بھی لگایا

جاسکتا ہے:

''میں نے سفر افغانستان کے دوران ایک دن علامہ اقبال سے کہا کہ جب تک آپ کی شاعری زندہ رہے گی ہندوستان میں اسلام باقی رہے گا۔علامہ نے فرمایا نہیں جب تک دارالمصنفین کی تصانیف باقی رہیں گی ہندوستان میں اسلام باقی رہے گا۔سرراس مسعود بھی شریک بزم تھے انہوں نے کہا کہ اسے یوں کہہ لیجئے کہ جب تک اقبال کی شاعری اور دارالمصنفین باقی ہیں۔ہندوستان میں اسلام باقی رہے گا۔''35

سید سلیمان ندوی کے اس واقعہ سے دارالمصنفین کی کامیابی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔دارالمصنفین کا قیام اس وقت عمل میں آیا جب ہندوستان اور خصوصا مسلمانوں کوشدت سے ایک ایسے ادارے کی ضرورت محسوس ہورہی تھی جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اٹھ رہی انتہا پسندوں کی آواز کا جواب دے سکے۔ہمارے اسلامی شعار اور اسلاف سے ملی میراث کی حفاظت کرسے اسلام اور متبعین اسلام کی صحیح شناخت قائم کرسکے۔حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

''خصوصیت صرف دارالمصنفین کو حاصل ہے کہ وہ اسلام اور اسلامیات کا علم بردار ہے۔اسلامی کلچر کا اتنا عظیم الشان لٹریچر کوئی جماعت پیدا نہ کرسکی یہ بھی علامہ شبلی کی نیک نیتی کا ثمرہ ہے کہ ان کو سید سلیمان ندوی اوران کے رفقاء جیسے جانشین مل گئے ،جن کے قالب میں علامہ شبلی کوایک زندگی کھوکرکئی زندگیاں مل گئیں۔''36

مذکورہ اقتباس سے دارالمصنفین کی خدمات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دارالمصنفین نے علوم اسلامی پر غیر معمولی کتابیں تیار کی ہیں جن میں سیرت النبیﷺ ،سیرت صحابہؓ،سیرت عائشہؓ،تاریخ اسلام ،رحمت عالم،اسوۂ صحابہ،سیرت عمر بن عبدالعزیز وغیرہ کے نام شامل ہیں۔اس کے علاوہ ادبی موضوعات پر شعرالعجم ،شعرالہند،موزنہ انیس ودبیر،اقبال کامل، گل رعنا وغیرہ کتابیں ایسی ہیں جو ہندوستانی جامعات کے نصاب میں داخل ہیں۔دارالمصنفین کا ترجمان ماہنامہ معارف نے مختلف علمی وتحقیقی موضوعات پر مضامین شائع کئے ہیں۔اردوادب کے بہت سے ایسے پہلوؤں سے روشناس کرایا ہے جس سے ادبی دنیا ناواقف تھی۔الغرض ایک صدی گزرجانے کے بعد آج بھی یہ ادارہ اسی آب وتاب کے ساتھ علامہ شبلی کے خوابوں کی تکمیل میں سرگرداں ہیں۔

☆☆☆

ماهنامه معارف

ماہنامہ معارف

معارف کی اشاعت کا خیال علامہ کے ذہن میں دوران علی گڑھ سے ہی تھا۔ ترکی کے سفر میں علامہ شبلی کی نظر سے وہاں کے جو بلند پایہ علمی رسائل نظر سے گزرے ان میں ایک معارف بھی تھا۔ یہ ترکی کا ایک مشہور ہفت روزہ رسالہ تھا اس میں علوم جدیدہ کے اعلی درجہ کے مضامین ہوتے تھے۔ علامہ شبلی کو یہ نام ایسا بھایا کہ ترکی سے واپسی کے دوسرے ہی سال 1893 میں انہوں نے اسی نام سے ایک رسالہ کا خاکہ شائع کیا تھا غالبا امتیاز کے لیے اس پر لام تعریف داخل کر دیا اور رسالہ کا نام 'المعارف' رکھا۔[37] ماہنامہ معارف کے سابق مدیر پروفیسر اشتیاق ظلی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''علامہ شبلی قیام علی گڑھ کے دوران 'المعارف' کے نام سے ایک رسالہ نکالنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس کا ایک مفصل خاکہ منشی سراج الدین کے سرمور گزٹ میں ۳ فروری 1893 کی اشاعت میں شائع کیا تھا۔ اس میں ایڈیٹر کی حیثیت سے علامہ کے ساتھ پروفیسر آرنلڈ اور میر ولادت حسین کے نام شامل تھے۔ نامعلوم اسباب کی وجہ سے اس منصوبہ پر عمل نہیں ہوسکا۔ اس اعلان کے ایک مہینہ کے اندر 28 فروری 1892 کو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک اشتہار کے ذریعہ اطلاع دی گئی کہ مجوزہ رسالہ شائع نہیں ہوگا''[38]

تصنیف و تالیف کی مصروفیت اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین سے وابستگی کی وجہ سے اس وقت شبلی یہ رسالہ نہیں نکال سکے۔ میر ولایت حسین کی ڈائری میں ایک حوالہ ملتا ہے کہ کالج میگزین بند ہوا تو شبلی نے مجھ سے کہا دونوں مل کر 'معارف' کے نام سے رسالہ نکالیں گے شبلی اس وقت تو نہیں نکال سکے[39] اسی دوران مولوی وحید الدین سلیم نے 1898 میں معارف نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا جو علی گڑھ اور پھر پانی پت سے ساڑھے تین سال نکل کر بند ہو گیا۔ نام کی مشابہت کی وجہ سے اس کا نام لیا جاتا ہے مگر اب صرف اس کا نام ہی رہ گیا ہے۔ اس کا کوئی شمارہ دستیاب بھی نہیں ہے۔ علامہ شبلی نعمانی علمی و ادبی رسالوں کی ضرورت کے نہ صرف قائل رہے ہیں بلکہ الندوہ جیسا تاریخ ساز رسالہ وہ نکال بھی چکے تھے۔ ندوۃ العلماء سے علاحدگی کے بعد دارالمصنفین کا جو خاکہ علامہ نے بنایا تھا اس میں ایک علمی و تحقیقی رسالہ کا اجرا بھی شامل تھا۔ ماہنامہ کا نام 'معارف' وہ خود طے کر چکے تھے۔ مولانا کی ایک قلمی یاداشت کے مطابق معارف کا خاکہ ملاحظہ ہو:

1۔ نام معارف ہوگا۔

2۔ چیف ایڈیٹر شبلی

3۔ اسٹاف: مولوی سلیمان، مولوی عبدالماجد، مسٹر حفیظ، مولانا عبدالسلام۔

تنوعات مضامین: فلسفہ، تاریخ قدیم وجدید، سائنس۔

ادبیات: شعر، اردو شاعری کی تاریخ اور اسالیب متنوعہ۔

اقتباسات: مجلّا علمیہ یورپ اور مصر و بیروت۔

فن تعلیم: کتب نادرہ کا ذکر اوران کے اقتباسات یا ان پر اظہار رائے۔

تنقید: کتب یا علوم قدیمہ پر۔

مصر سے المقتطف، الہلال، المنار اور بیروت سے المقتبس منگوائے جائیں، بقیمت۔ یورپ کے علمی پرچے منگوائے جائیں۔''40

دارالمصنفین کے قیام کے وقت ادارہ کا اپنا پریس نہیں تھا۔اس لیے معارف فوری طور پر جاری نہ ہوسکا۔ادارہ کے قیام کے تقریبا دو سال بعد جولائی 1916 میں پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔دارالمصنفین کے علمی ترجمان ہونے کی وجہ سے معارف کے اغراض ومقاصد وہی تھے جو دارالمصنفین کے تھے۔معارف کے پہلے شمارہ میں دارالمصنفین کے ناظم اور معارف کے پہلے مدیر سید سلیمان ندوی رسالہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''رسالہ کا پہلا نمبر ہم رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں شروع کرتے ہیں کہ ہمارے علوم ومعارف کی سب سے پہلی کتاب اس ماہ مقدس میں نازل ہوئی تھی۔شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن.... علامہ شبلی نعمانی مرحوم دارالمصنفین کے ساتھ ساتھ معارف نامی ماہواری علمی ودینی رسالہ کا تخیل بھی رکھتے تھے۔حاشیہ نشینان بساط شبلی نے اس محسن کی یاد میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنی بساط بھر ان کی تمام تحریکوں کو زندہ رکھیں گے، دو سال کی گذشتہ مدت دارالمصنفین کے قیام وتاسیس میں صرف ہوگئی۔اب جب ادھر سے اطمینان میسر آیا تو دوسرے فرائض یاد آئے۔ان میں ایک معارف کا اجرا بھی تھا۔ہم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ملک ایک خاص علمی رسالہ کی اعانت کے لیے کہاں تک تیار ہے۔تاہم ہر شخص اپنے فرائض کا ذمہ دار ہے...... دارالمصنفین علامہ مرحوم کے ان ہی تخیلات کا نتیجہ تھا اور ہم اپنی کائنات کے مطابق ان ہی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کام شروع کرنا چاہتے ہیں۔مندرجہ بالا خیالات کے مطابق معارف سے جن خدمات کی توقع رکھنی چاہئے اور اس کے مقاصد میں جو نوعیت ہوگی وہ حسب ذیل ہے: فلسفہ حال کے اصول اور اس کے متعدد بہ حصہ پبلک میں لایا جائے، عقائد اسلام کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جائے۔علوم قدیمہ کو جدید طرز پر از سر نو ترتیب دیا جائے۔علوم اسلام کی تاریخ لکھی جائے اور بتایا جائے کہ اصل حصہ کہاں تک تھا اور مسلمانوں نے اس پر کیا اضافی کیا۔علوم مذہبی کی تدوین اور اس کے عہد بعہد کی ترقیوں کی تاریخ ترتیب دی جائے۔اکابر سلف کی سوانح عمریاں لکھی جائیں جن میں زیادہ تر ان کے مجتہدات اور ایجادات سے بحث ہو۔عربی زبان کی نادر الفن اور کمیاب کتابوں پر ریویو لکھا

جائے اور دیکھا جائے کہ ان خزانوں میں ہمارے اسلاف نے کیا کیا زروجواہرامانت رکھے ہیں اور سب سے آخرلیکن سب سے اول یہ کہ قرآن مجید کے متعلق عقلی، ادبی، تاریخی، تمدنی اور اخلاقی مباحث جو پیدا ہوگئے ہیں ان پر محققانہ مضامین شائع کیے جائیں۔''41

انگریزوں کے ہندوستان پر تسلط کے بعد ہندوستان کا تعلیمی نظام بالکل بدل گیا تھا۔ پرانی قدریں ختم ہورہی تھیں اور نئی تہذیب اپنی جگہ بنا رہی تھی۔ حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے اکثر رسائل بند ہورہے تھے بعض پر خود انگریزوں نے پابندی عائد کردی تھی، غرض مغربیت ہندوستان میں بہت تیزی سے پھیل رہی تھی۔ معترضین اسلام کے خلاف کھڑے تھے ایسے وقت میں معارف جیسے علمی و تحقیقی رسالے کی سخت ضرورت محسوس ہورہی تھی۔ معارف کی اشاعت اس وقت ہوئی جب ملک میں ایک بلند پایہ رسالہ کی ضرورت تھی، اہل علم نے نہ صرف اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا بلکہ متعدد اخبارات اور رسائل میں ان پر خوش کن تبصرے کیے گئے۔ بعض رسائل نے معارف کے مضامین کو اپنے کالموں میں جگہ دی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ معارف اپنی طرز کا منفرد رسالہ تھا۔ بہت کم مدت میں نہ صرف علمی وادبی حلقوں میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوگیا بلکہ ہندستان کی موقر رسالوں میں شمار ہونے لگا۔ معارف کی تقلید میں متعدد رسالے جاری کیے گئے۔ رسائل میں لکھنے والوں کو انگلیوں پر گنا جاسکتا تھا معارف نے بڑی تعداد میں لکھنے والے پیدا کیے۔ اس سلسلہ میں معارف جنوری 1917 کے شذرات میں سید صاحب لکھتے ہیں:

''معارف کی نسبت ملک کے کثیر وقیع اور مشہور اخبارات ورسائل نے جن مادحانہ اور قدردانا الفاظ کا اظہار کیا ہے وہ ہمارے لئے نہایت حوصلہ افزا ہے، اکثر معاصرین اس کے مضامین کو اپنے اخبار ورسائل میں نقل کرنے کا شرف بخشتے ہیں۔ ملک کا تمام روشن خیال اور علم دوست طبقہ بحیثیت مجموعی اس کو وقعت دیتا ہے اور عزیز رکھتا ہے، تاہم اپنے عیوب سے ہم بے خبر نہیں، اس لئے اپنے بعض دوستوں کے نیک مشوروں کو ہم نے خوشی سے سنا اور قبول کیا، کہتے ہیں کہ علمی مضامین کی خشکی اور تلخی کو گوارہ بنایا جائے وہاں نفاست پسند مریضوں سے بھی التجا ہے کہ ان کو اپنی زبانوں کی قوت ذائقہ کی درستی کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔''42

معارف کی مقبولیت اور پذیرائی میں رفقاء دارالمصنفین اور سید صاحب کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ معارف کی اشاعت جس دور میں ہوئی علمی و تحقیقی مضامین لکھنے والواں کو انگلیوں پر گنا جاسکتا تھا۔ مگر معارف نے سیکڑوں لکھنے والے پیدا کردیے۔ ماہنامہ معارف میں چھپنے والے معتبر محققین بھی ہیں جن کی تحقیقات کو علمی دنیا نے اہمیت کا حامل قرار دیا ہے اور انہیں میں کتنے ایسے بھی ہیں کہ جب معارف میں ان کا مضمون شائع ہوا تو ان کی شہرت کا آفتاب ابھی طلوع ہورہا تھا۔ معارف کو اپنی نوعیت کا معیاری رسالہ بنانے کے لیے سید صاحب نے شب وروز محنت ومشقت کی بلکہ روزآنہ 12 گھنٹہ مسلسل تحریر وتالیف کا کام کیا۔ ہر مہینے ایک دو مضامین لکھنا کئی کئی صفحات کے شذرات تیار

کرنا،متعدد کتابوں پر تبصرے کرنا اس کے علاوہ بہت سے کام سید صاحب کے ذمہ تھا۔معارف کے معیار کو بلند کرنے اور اپنے مقصد میں کامیاب کرنے کی غرض سے سید صاحب نے انگریزی،عربی،فارسی اور اردو کے بہت سارے رسائل منگوائے اور اس سے استفادہ کیا۔سید صاحب نے ان تجربات سے فائدہ اٹھایا جو الندوہ اور الہلال کی صحافت سے حاصل کیا تھا۔اس کے علاوہ ملک کے مشاہیر علماء واد باسے بہت سارے مضامین لکھوائے۔مولانا ابوالکلام آزاد سے خالص فقہی موضوعات پر مقالے حاصل کیے۔معارف علمی وتحقیقی رسالہ ہے،ادب معارف کا اولین حوالہ نہیں ،نثری تخلیقی ادب اس کے تصور سے باہر ہے۔اس کا تصور ادب اسلامی ہے۔اس کے باوجود بھی معارف نے چند سالوں میں صحافتی ادب کے صف اول میں جگہ بنالی۔سید صاحب جنوری 1926 کے شذرات میں رقم طراز ہیں:

''معارف کی عمر کا یہ بارہواں سال ہے،بارہ سال کا زمانہ کوئی بڑی مدت نہیں ہے،تاہم ان بارہ برسوں میں اردو رسائل کی دنیا میں کافی انقلاب اور تغیر ہو گیا ہے۔معارف جب نکلا تھا،تو زمانہ (کانپور) الناظر(لکھنؤ) نقاد(آگرہ) اور مخزن(لاہور) کے سوا کوئی قابل ذکر رسالہ موجود نہ تھا۔اور ان میں سے الناظر کے سوا بقیہ تمام رسائل کا سرمایہ تمام تر ادبیات تھا،سنجیدہ،ٹھوس،علمی اور محققانہ مضامین کی ملک میں نہ مانگ تھی نہ درآمد تھی،معارف اس غیر مطلوبہ سامان کو لیکر جب بازار میں آیا تو خلاف توقع قدردانوں نے اس کو پسند کیا اور ہاتھوں ہاتھ لیا۔43

معارف کی اہمیت ومقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ملک اور بیرون ملک ادیب ودانشور نہ صرف معارف کو پابندی کے ساتھ پڑھتے تھے بلکہ اس کی جلدوں کو محفوظ بھی رکھتے تھے۔علامہ اقبال کو دارالمصنفین سے دلی لگاو تھا وہ نہ صرف معارف کو پڑھتے تھے بلکہ اپنا کلام بھی معارف میں شائع ہونے کے لیے بھیجتے رہتے تھے۔سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''یہی ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔''44

مولانا آزاد سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں صرف یہی ایک پرچہ ہے اور ہر طرف سناٹا ہے۔بحمد اللہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائگاں نہیں گئیں اور صرف آپ کی بدولت ایک ایسی جگہ بن گئی جو خدمت علم تصنیف کے لیے وقف ہے۔''45

مولانا محمد علی جوہر معارف کی متعلق سید صاحب کو لکھتے ہیں:

''میرے پاس متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں یہ صرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرالی جائیں''46

مولانا عبدالمجید سالک نے اپنے ایک مضمون میں معارف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

''1916 میں دارالمصنفین کا مشہور ومعروف علمی پرچہ معارف جاری ہوا جو بلا مبالغہ دنیائے اسلام کا بہترین علمی وتحقیقی رسالہ ہے اور جس نے ہمارے تاریخ وتحقیق کے ذخیرہ کو مالا مال کیا۔''47

آصف فیضی صاحب سید سلیمان ندوی کو کیمبرج سے لکھتے ہیں:

''معارف میں ڈاکٹر نکلسن پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو انہوں نے پسند کیا اور معارف کے ناقدانہ مباحث، علمی مقالات، مستشرقانہ معلومات اور مشرقی ومغربی علوم وخیالات کی آمیزش کی داد دی۔اور اس حیثیت سے ہندستان کی ترقی پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔''48

مولانا عبدالماجد دریابادی معارف کی مقبولیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''آئندہ مؤرخ کا قلم جب ہندستان کی علمی ودینی صحافت کی تاریخ لکھے گا تو اسے معارف کو چار وناچار ایک بلند وممتاز مرتبہ اور ایک سنگ میل کا امتیاز دینا ہوگا اور بتانا ہوگا کہ اس شمع نے ملت کے کتنے اندھیرے گھروں میں اجالا پھیلا دیا اور پھر اسی ایک چراغ سے کتنے اور چراغ جلائے گئے۔''49

مدیر معارف شاہ معین الدین احمد ندوی معارف کی خدمات کے اعتراف میں لکھتے ہیں:

''معارف نے سیکڑوں علمی موضوعات اور مسائل پر اور اسلامیات کی مختلف شاخوں پر مضامین کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے کہ جس سے علوم اسلامی کی انسائیکلوپیڈیا مرتب کی جا سکتی ہے۔''50

ڈاکٹر حمیداللہ معارف کی گراں قدر خدمات پر لکھتے ہیں:

''میں معارف کو دنیا کا سب سے بلند پایہ رسالہ سمجھتا ہوں۔وہ ہمارے تاریخ حال کا مستقبل میں ایک وثیقہ ایک ماخذ ہوگا۔وہ مرجع انام ہے۔اور لوگ اب بھی اور آئندہ بھی اس سے استفادہ کریں گے۔51

محمد عبدالملک جامعی معارف کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

''سارے رسالے اگر کوئی موجود ہے، اپنا مقام کھو چکے، معارف اپنے مقام پر ہے۔''52

معارف کی ستائش اور قدر شناسی پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا یہ جملہ بھی قابل غور ہے جو انہوں نے مدراس کے خطبہ صدارت کے موقع پر کہا تھا۔

''معارف کا وجود ندوۃ العلماء کی کامیابی پر ایک برہان قاطع ہے۔''53

سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی دارالمصنفین اور معارف کے متعلق لکھتے ہیں:

''آپ کے دارالمصنفین کو کسی سند کی ضرورت نہیں..... دارالمصنفین ایسا کام انجام دے رہا ہے

جو آج تک ہندستان میں شروع تک نہیں ہوا، خود معارف اس کا بین ثبوت ہے۔'' 54

معارف کی انفرادیت اور مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ معارف کو ہمیشہ سے بلند پایہ مدیران کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی سے لے کر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی تک علم وادب کی ایک کہکشاں ہے۔ مدیران معارف حسب ذیل ہیں:

مولانا سید سلیمان ندوی	۱۹۱۶	تا	۱۹۵۱
شاہ معین الدین ندوی	۱۹۵۱	تا	۱۹۷۴
سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۱۹۷۵	تا	۱۹۸۵
مولانا ضیاالدین اصلاحی	۱۹۸۸	تا	۱۹۹۹
پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	۱۹۹۹	تا	۲۰۲۱
ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں	۲۲۲۱	تا	حال

مذکورہ مدیروں کے علاوہ مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ریاست علی ندوی نے بھی کچھ مدت تک ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یہاں مدیران معارف کا تعارف پیش کیا جاتا ہے تاکہ ان کے کارناموں سے کسی قدر واقفیت ہو سکے۔

دارالمصنفین کے معماروں میں سے ایک علامہ سید سلیمان ندوی کی ہمہ جہت شخصیت محتاج تعارف نہیں ان کا شمار ممتاز عالم دین، محقق، ادیب، صحافی اور سیرت نگار کے طور پر ہوتا ہے۔ ان کی ولادت 1884 صوبہ بہار کے ایک گاؤں دسنہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، مزید تعلیم کے لیے پھلواری شریف تشریف لے گئے۔ 1901 میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا جہاں 1904 میں ان کی ملاقات شبلی نعمانی سے ہوئی اور استفادہ کا موقع ملا۔ 55

1907 سے 1912 تک الندوہ کے سب ایڈیٹر رہے۔ یہی زمانہ سید سلیمان ندوی کی علمی لیاقت کے چمکنے کا ہے۔ انہوں نے اس رسالہ میں بڑی تعداد میں علمی و تحقیقی مضامین لکھے ان میں 'علم ہیئت اور مسلمان، عربی زبان کی وسعت (1907) مسئلہ ارتقا اور قرآن مجید، ابن خلقان، جرجی زیدان کی تمدن اسلامی پر تنقید (1908) مکررات قرآن، اسلامی رصد خانے، علماء سلف میں کتب بینی کا شوق، سود اور صحف انبیا، تحریم شراب (1909) کتب خانہ اسکندریہ، ندوہ کے لیے ایک کتب خانہ کی ضرورت (1910) اشتراکیت اور اسلام، مذہب اسلام اور عقل، الاحتساب فی الاسلام، اسماء القرآن (1911) فرق حنفیہ عقائد میں کس کا مقلد ہے، عذاب (1912) قابل ذکر ہیں۔ ندوہ کے ہی زمانے میں 'دروس الادب' لکھی اور 'لغات جدیدہ' کے نام سے جدید عربی الفاظ کی لغت بھی مرتب کی۔ شعبہ تصحیح اغلاط تاریخی کا قیام ہوا تو اس کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ علامہ شبلی نے سیرت النبیؐ کی تالیف

وتدوین کا آغاز کیا تو سید صاحب کو اپنا لٹریری اسسٹنٹ بنایا۔ 1913 میں مولانا آزاد کے اخبار الہلال سے وابستہ ہو گئے۔ 1913 دکن کالج پونہ کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ علامہ شبلی کے انتقال کے بعد لیکچرر کے منصب سے مستعفی ہو کر 1915 میں اعظم گڑھ آ گئے اور دارالمصنفین کے ناظم مقرر ہوئے۔ 1916 میں جب معارف کا اجرا ہوا تو ماہنامہ معارف کی ادارت سنبھالی۔ 37 سال تک اس فرائض کو بحسن خوبی انجام دیتے رہے۔ 1946 میں والی بھوپال کی دعوت پر بھوپال گئے جہاں 1949 تک وہ بھوپال کے دارالقضا اور عربی مدارس کی سربراہی کا فریضہ انجام دیا۔ 1950 میں پاکستان ہجرت کر گئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ پاکستان کے متعدد علمی ادبی بورڈ کے ممبر اور اسلامی بورڈ کے صدر بنائے گئے۔ 1953 میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی معارف دسمبر 1953 کے وفیات میں انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''آہ گذشتہ مہینہ ۲۲ نومبر کی رات کو کراچی ریڈیو اسٹیشن سے یہ جانکاہ خبر بجلی بن کر گری کہ حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہ نے ۲۲ اور ۲۳ کی درمیانی شب کو ڈیڑھ بجے اس جہان فانی کو الوداع کہا، یہ خبر وابستگان دامن سلیمانی کے لیے ایسی ناگہانی اور ہوش ربا تھی کہ کچھ دیر تک سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہو گیا، مگر مشیت الٰہی پوری ہو کر رہی اور بالآخر یقین کرنا پڑا کہ اس مسیحا نفس نے بھی جان جان آفرینی کے سپرد کر دی، جو عمر بھر اپنی زبان و قلم سے مردہ دلوں میں روح حیات پھونکتا رہا اور امراض ملت کا وہ ماہر طبیب اٹھ گیا۔ جس نے اس کے ناتواں جسم میں نئی طاقت و توانائی پیدا کی، وہ چشمہ فیض خشک ہو گیا جس کی آبیاری سے دین و ملت کا چمن سیراب تھا۔ وہ شیخ کامل اٹھ گیا جس نے دلوں کی دنیا منور کی، وہ شمع خاموش ہو گئی جو نصف صدی تک علم و فن کی ہر مجلس میں ضیا بار رہی، وہ تاجدار رخصت ہو گیا جس کا سکہ علم و فن کی پوری اقلیم میں رواں تھا۔ اسلامی علوم کا وہ امام و مجدد اٹھ گیا جس نے ان کو نئی زندگی بخشی، مذہب اسلام کا وہ متکلم اور اسلامی تاریخ و تمدن کا وہ محقق اٹھ گیا جس نے ان کو ان کی اصل شکل اور نئے لباس میں جلوہ گر کیا، پیغام محمدی کا وہ شارح و ترجمان خاموش ہو گیا جس نے اپنی دینی بصیرت سے اس کے اسرار و حکم بے نقاب کیے اور اس کی ذات جامع الصفات پر علوم کی جامعیت کا خاتمہ ہو گیا۔'' 56

سید سلیمان ندوی نے مدۃ العمر تصنیف و تالیف اور تحقیق و تدقیق میں مصروف رہے۔ مختلف موضوعات پر دو درجن کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں ارض القرآن، سیرت النبی ﷺ، سیرت عائشہؓ، خطبات مدراس، خیام، نقوش سلیمانی، رحمت عالم، حیات شبلی، عرب و ہند کے تعلقات وغیرہ کتابیں قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ انہوں نے معارف کے لیے شذرات، وفیات اور علمی و تحقیقی مضامین لکھے۔ سید صاحب کے اہم علمی و تاریخی مقالات تین جلدوں میں 'مقالات سلیمانی' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ علامہ اقبال نے اسی جامعیت اور ہمہ گیری کے بنا پر علامہ شبلی کے

بعد انہیں استاذ الکل، رئیس العلماء اور علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد قرار دیا تھا۔57

سید صاحب شبلی کے پروردہ تھے، الندوہ اور الہلال میں کام کرنے کا تجربہ تھا۔ معارف کو بہتر سے بہتر بنانے اور اردو کے موقر رسائل میں جگہ دلانے کے لیے انہوں نے اپنی تمام تر علمی وصحافتی صلاحیتوں کو صرف کیا۔ ہر شمارے کے لیے مقالے اور کئی صفحات کے شذرات لکھنا، متعدد کتابوں پر تبصرہ لکھنا سب سید صاحب کے ذمہ تھا۔ عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ معارف کے ابتدائی دور میں انہیں بارہ بارہ گھنٹہ مسلسل تصنیف وتالیف کا کام کرنا پڑا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے نہ صرف یہ کہ شذرات ومقالات تحریر کیے بلکہ معارف میں بعض اہم تبدیلیاں بھی کیں۔ معارف پہلا شمارہ شذرات اور مقالات کے علاوہ چار ابواب پر مشتمل تھا سید صاحب نے ادبیات، مباحث حاضرہ، مطبوعات جدیدہ، انتقاد وتقریض اور استفسارات علمیہ جیسے کالموں کا اضافہ کر کے اس کی تلخی کو دور کرنے کی کوشش کی۔

معارف کے اجرا کے بعد سے جملہ فرائض سید سلیمان ندوی انجام دیتے رہے۔ البتہ 1920 میں جب یورپ کے سفر پر گئے تو آٹھ ماہ تک مولانا عبدالماجد دریابادی نے رسالہ کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ تلخیص وتبصرہ، اخبار علمیہ جیسے اہم باب اور کئی جدتیں مولانا عبدالماجد دریابادی کی دین ہے۔ مثلا معارف جب شروع ہوا تو اس میں مضمون نگار کا نام ابتدا یا آخر میں ہوتا تھا 1919 سے فہرست مضامین میں نام لکھا جانے لگا۔ معارف کی ایک جلد بارہ شماروں پر مشتمل ہوتی تھی عبدالماجد دریابدی کی ادارت میں چھ شماروں پر مکمل ہونے لگی۔ ضخامت 58 سے 80 اور سالانہ رقم چار روپے سے پانچ روپے کردی گئی۔ مولانا عبد الماجد دریابادی شذرات معارف جون 1919 'معارف کے جدید تغیرات' کے عنوان سے معارف میں کی جانے والی تبدیلی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''1۔ معارف کے کسی گذشتہ رسالہ میں ہم نے ناظرین کو اطلاع دی تھی کہ نئے سال سے معارف میں نئے سامان نظر آئیں گے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ معارف کی ضخامت بڑھا دی جائے گی۔ اب تک رسالہ ساڑھے تین جز پر شائع ہوتا تھا، اب آئندہ کم سے کم پانچ جز پر شائع ہوگا اور اگر حالات نے اجازت دی تو انشاء اللہ اس کا ہر شمارہ 100 صفحہ پر شائع ہوگا۔ 2۔ چونکہ رسالہ کی ضخامت بڑھ جائے گی اس لیے اس کی جلد ۶ نمبروں پر ختم کی جائے گی۔ 3۔ مضامین کے لحاظ سے جدت خاص یہ ہوگی کہ شذرات جس میں ہر مہینہ کے اہم علمی حوادث کے متعلق تبصرہ ہوگا۔ اس کا اندازہ پچھلے چند مہینوں کے شذرات سے آپ کر رہے ہوں گے کہ اس کی نوعیت کیا ہوگی۔ مقالات وغیرہ کی سرخیوں کے نیچے مشرقی ومغربی علوم ومسائل، خصوصا یورپ کی جدید تحقیقات ومسائل وعلوم ونظریات پر محققانہ مضامین ہوں گے۔ سائنٹفک اور فلسفیانہ مضامین جو یورپ کے اہم ترین رسائل کے نچوڑ اور عطر ہوں گے اور مشاہیر اہل قلم کی کوششوں کے نتائج ہوں

گے پیش کیے جائیں گے۔ ریویو اور تنقید کا حصہ خاص طور سے اہم ہوگا اور جس میں نہایت سنجیدگی ،متانت اور وسعت نظر کے ساتھ ماہانہ اردو مطبوعات پر تبصرہ ہوگا۔ یورپ اور امریکہ کے تمام علمی رسائل کا ماہوار خلاصہ درج کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مشرقی علوم کے متعلق بھی معارف اپنا فرض فراموش نہیں کرے گا۔ اکثر نمبروں میں سیر العلم یا دنیا یا دنیا کی علمی رفتار کے نام سے ہر مہینہ کے اکتشافات و ایجادات و نظریات کی علمی خبریں شائع کی جائیں گی۔ غرض معارف کا ہر نمبر ہر مہینہ کی علمی ترقیوں کا آئینہ ہوگا جس میں ہر پڑھنے والے کو یہ نظر آئے گا کہ دنیا کی علمی سطح روزانہ کس قدر بلند ہو رہی ہے اور اس کی ترقی کی رفتار کس قدر تیز ہے۔ 4۔ بہترین علمی مضامین پر معارف کی طرف سے مضمون نگار کو معاوضہ دیا جائے گا۔ از راہ عنایت اس کے لیے نو آموز اور نومشق اصحاب قلم کوشش نہ فرمائیں۔ 5۔ کیا ان حالات میں ہمارے شائقین اجازت دیں گے کہ معارف کی سالانہ قیمت للعہ /کے بجائے ۵ کر دی جائے اور اس کی توسیع اشاعت کے لیے جس کی ہم نے عام رسائل کی روسمی درخواستوں کی طرح کبھی تحریک نہیں کی۔ ان سے کوشش کی توقع کی جائے۔ بغیر آمدنی میں اضافہ ہوئے ان کثیر مصارف کو رسالہ برداشت نہیں کر سکتا، اگر ہم کو کسی اچھے رسالے کی ضرورت ہے جو ہماری زبان کی وقعت وحیثیت کے مطابق ہو تو یہ خفیف اضافہ مالی، امید ہے کہ ان پر گراں نہ گزرے گا''۔58؎

سید سلیمان ندوی 1946 میں ریاست بھوپال کے امور مذہبی کے اعلی افسر ہو کر گئے تب بھی ادارت میں ان کا نام چھپتا تھا لیکن ان کی عدم موجودگی میں عملی طور پر شاہ معین الدین احمد ندوی رسالہ کی ادارت کا فریضہ انجام دے رہے تھے البتہ 1947 میں مولانا ریاست علی ندوی اس کے مدیر رہے۔ انہوں نے شذرات اور تبصرے بھی لکھے جو پہلے سید صاحب خود لکھتے تھے۔ 1949 سے شریک مدیر کی حیثیت سے شاہ معین الدین احمد ندوی کا نام رسالہ کے سرورق پر آنے لگا۔ 1951 میں سید صاحب کے پاکستان چلے جانے کے بعد باضابطہ طور شاہ معین الدین احمد ندوی کا نام آنے لگا۔ انہوں نے ادارت قبول کرنے کے بعد اپریل 1951 میں معارف کی مجلس ادارت کی تشکیل دی۔ مجلس ادارت کے اراکین میں مولانا عبد الماجد دریابادی (صدر)، سید مناظر احسن گیلانی (رکن)، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی (رکن)، عبدالسلام ندوی (رکن)، شاہ معین الدین احمد ندوی (مرتب) سید صباح الدین عبدالرحمٰن (شریک مرتب) مقرر ہوئے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''چنانچہ اس (اپریل) کے مہینہ سے راقم نے اپنی ذمہ داری کو ہلکا کرنے کے لیے معارف کی مجلس ادارت قائم کر دی ہے، جس کے اسماء گرامی ٹائیٹل کے دوسرے صفحہ پر درج ہیں۔''59؎

شاہ معین الدین احمد ندوی (1902۔1974) رودولی ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے نانا شاہ شرف الدین سے حاصل کی، پھر وہ دارالعلوم نظامیہ فرنگی محل پڑھنے گئے، مزید تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ

العلماء میں داخلہ لیا۔ وہاں سے فراغت کے بعد 1924 میں دارالمصنفین سے وابستہ ہو گئے۔ چنانچہ شاہ صاحب کو تاریخ اسلام کی ترتیب وتدوین کا کام سپرد ہوا جس کی چار جلدیں لکھ کر خراج تحسین حاصل کیا۔ 1951 میں سید سلیمان ندوی کے جانشین کی حیثیت سے دارالمصنفین کے ناظم اور 'معارف' کے مدیر مقرر ہوئے۔ انہوں نے مسلسل اکیس برس تک معارف کے مدیر کی حیثیت سے کام کیا، اس کے علاوہ سید سلیمان ندوی کی ادارت میں بھی جب سید صاحب بھوپال یا پاکستان چلے گئے تو ادارت سنبھالی۔ شاہ صاحب تقریبا نصف صدی تک دارالمصنفین سے وابستہ رہے۔ ان کے دوست نامور اہل قلم مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے ایک موقع پر کلکتہ میں تاریخ اسلام کی پروفیسری کے لیے اصرار کیا مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا اور شاہی پر دارالمصنفین کی فقیری کو ترجیح دے کر علم دوستی اور دارالمصنفین سے اپنے تعلق کو واضح کر دیا۔ 60 شاہ معین الدین احمد ندوی نے جس دور میں دارالمصنفین کی نظامت سنبھالی وہ ہندستان کا پر آشوب دور تھا۔ دارالمصنفین کو تعاون دینے والی بھوپال اور حیدرآباد کی ریاستوں کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ ایسے وقت میں بھی شاہ صاحب نے نہ صرف یہ کہ دارالمصنفین کے وجود کو باقی رکھا بلکہ تمام علمی وتحقیقی کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

مولانا کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ تصنیف وتالیف کا شوق بچپن سے تھا۔ تاریخ اسلام پر انہوں نے بہت عمدہ کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی تصانیف میں تاریخ اسلام، سیر صحابہ، مہاجرین، تابعین، خلفاء راشدین، حیات سلیمان، دین رحمت اور ادبی نقوش وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف یونی ورسٹیوں میں زبان اور علوم اسلامی کے رکن رہے۔ حکومت ہند اور شاہان عرب کی طرف سے اعزاز سے بھی نوازے گئے۔ بالآخر 1974 میں دارالمصنفین میں انتقال فرمایا۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن شذرات میں لکھتے ہیں:

> ''آہ شاہ صاحب! شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دارالمصنفین اور اڈیٹر معارف جو شاہ صاحب کے نام سے یہاں یاد کیے جاتے ہیں اب اپنے پاک دل، پاک ذات اور پاک صفات کے ساتھ آغوش رحمت الٰہی میں ہیں۔ ۱۳/ دسمبر 1974 کو جمعہ کے روز اپنے تمام روزمرہ کے معمولات میں مشغول رہے، دس بجے دن کو بال بنوایا، غسل کیا، کھانا کھایا، جمعہ کی نماز پڑھی، ڈھائی بجے تک عاجز راقم سے ملاقات رہی اخبار پڑھتے پڑھتے سو گئے، گہری نید سوئے چار بجے اٹھے اپنے ایک دیرینہ ہم جلیس مولوی عزیز الرحمٰن صاحب کے ساتھ بیٹھے باتیں کرنے لگے، عصر کی نماز کے لیے وضو کا پانی منگوایا، کرسی سے اٹھ کر وضو کے لیے اٹھنا چاہتے تھے کہ زمین پر گر گئے، خیال ہوا کہ بیہوش ہو گئے ہیں، ان کے دوست ڈاکٹر عبدالحفیظ انصاری بلائے گئے تو انہوں نے اعلان کیا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ نہ بیمار پڑے نہ سکرات کی تکلیف ہوئی نہ کسی کو خدمت کرنے کا موقع دیا، ایسا معلوم ہوا کہ زمین پر سے یکا یک اٹھا لیے گئے اور دارالمصنفین کے در و دیوار کو اداس نہیں بلکہ

روتا چھوڑ گئے۔ان کی وصیت کے مطابق میت ان کے وطن رودولی دارالمصنفین کے کارکنوں اور ان کے قدردانوں کے جلوس میں لے جائی گئی، جہاں وہ چودھری خلیل احمد کی مسجد کے احاطہ میں سپرد خاک کیے گئے۔اللہم اغفرہ والرحمتہ وادخلہ الجنۃ۔ان کی رحلت دارالمصنفین کے لیے حقیقی معنوں میں جانکاہ حادثہ ہے۔استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی نے دارالمصنفین کو چھوڑا تو مولانا مسعودعلی ندوی کا انتظامی سلیقہ،مولانا عبدالسلام کی علمی شہرت اور اس ادارے سے خود جناب شاہ صاحب کی شگفتگی بروے کار رہی، عاجز راقم کو اس کی خدمت میں گیارہ سال گزر چکے تھے۔استاذی المحترم جناب سید صاحب خوش تھے کہ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی زندگی کے بعد کے دارالمصنفین کا نقشہ دیکھ لیا،ان کے بعد اس علمی تاج محل پر چودھویں چاند کی چاندنی تو نہیں چھٹکی مگر یہ برقرار رہا، 1957 میں مولانا عبدالسلام ندوی داغ مفارقت دے گئے تو ایک بڑا خلا پیدا ہوا جو پر نہ ہوسکا۔لیکن دارالمصنفین کی علمی سرگرمیاں بدستور باقی رہیں 1954 میں مولانا مسعودعلی ندوی کی صحت خراب ہوئی تو 1967 تک ان کی علالت کا سلسلہ جاری رہا، اپنے انتظامی امور کا بار اس راقم کے دوش ناتواں پر ڈالا، وہ بھی خوش رہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے بعد کا نقشہ دارالمصنفین دیکھ لیا،مگر شاہ صاحب کی وفات سے دارالمصنفین ایک زبردشت آزمائش میں مبتلا ہے، وہ دارالمصنفین کی دونسلوں کی جلا کے تراشے ہوئے ہیرے بن گئے تھے اور اس کی انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے تھے، اب یہ نگینہ نکل گیا ہے تو انگوٹھی بے رونق ہو رہی ہے ،ان کی جگہ کو پر کرنے والا اب کوئی نہیں، دارالمصنفین اپنی زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے۔موت العالم موت العالم۔'' 61

شاہ معین الدین ندوی احمد کے انتقال کے بعد سید صباح الدین عبدالرحمٰن دارالمصنفین کے ناظم اور معارف کے مدیر بنائے گئے۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا تعلق پٹنہ ضلع کے دسنہ گاؤں سے تھا۔گاؤں کے مکتب سے ہی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ابتدائی تعلیم کے بعد میٹرک نالندہ کالج سے کیا۔پٹنہ یونی ورسٹی سے گریجویشن اور علی گڑھ یونی ورسٹی سے بی ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد پٹنہ یونی ورسٹی سے ہی اردو اور فارسی میں ایم اے کیا۔تعلیم سے فراغت کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ گئے جہاں پروفیسر مجیب کے زیر تربیت ایک مدت تک تحقیق میں مصروف رہے۔سید سلیمان ندوی نے ان کے تاریخی شعور کو دیکھتے ہوئے دارالمصنفین آنے کی دعوت دی۔

1935 میں دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے۔اپریل 1951 میں شاہ معین الدین احمد نے معارف کی مجلس ادارت قائم کی تو سید صباح الدین عبدالرحمٰن کو اس میں شریک مرتب کے حیثیت سے شامل کیا گیا۔شاہ معین الدین احمد ندوی کی غیر موجودگی میں معارف کی ترتیب وتدوین اور شذرات لکھنے کا ذمہ داری ان ہی کی ہوتی تھی۔شاہ معین الدین احمد ندوی کے انتقال کے بعد معارف کے مدیر مقرر ہوئے۔اور تیرہ برس تک مسلسل معارف کے مدیر

رہے۔سید سلیمان ندوی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن سید سلیمان ندوی کی پروردہ تھے۔اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں:

''یہاں (دارالمصنفین) آکر میری زندگی کا رخ ہی بدل گیا،حضرت سید صاحب نے مجھ کو قلم پکڑنا سکھایا تو میرے مضامین معارف اور انگریزی کے مختلف رسالوں میں چھپنے لگے۔''62

سید صباح الدین الرحمٰن یونیورسٹی کے پروردہ تھے مگر ان کے اندر تصنیف وتالیف کا خاص ملکہ تھا۔ان کا خاص موضوع تاریخ تھا۔انہوں نے تاریخی موضوعات پر متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔جن میں بزم تیموریہ (تین جلد)،بزم صوفیہ،بزم مملوکیہ،ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک،ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں،اسلام اور مستشرقین (۴ جلدیں) مولانا شبلی پر ایک نظر،مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف:ایک مطالعہ،مولانا سید سلیمان ندوی کی دینی وعلمی خدمات،غالب مدح قدح کی روشنی میں،عہد مغلیہ مسلمان وہندو مؤرخین کی نظر میں،ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام،ہندوستان سلاطین وعلماء ومشائخ کے تعلقات پر ایک،بزم رفتگاں اس کے علاوہ ان کے کتابوں کی ایک طویل فہرست ہے۔سید صباح الدین الرحمٰن کی تصنیف وتالیف کے سلسلے میں حضرت مولانا ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں:

''ان کے تصانیف کی تعداد پچاس کے قریب ہوتی ہے،جن کے مجموعی صفحات دس ہزار سے کم نہیں ،یہ تو ان کی تصنیفات وصفحات کی کمیت کا معاملہ ہے لیکن جہاں تک ان کی تصنیفات کے موضوعات،عصر حاضر کے تقاضے کی تکمیل کی اہمیت،ان کے مواد ومضامین کی قدر وقیمت اور ان کتابوں کی افادیت اور ان کے ذریعے سے وقت اور ملک وملکت کی ضرورت اور مسائل کا تعلق ہے وہ کمیت سے فزوں تر ہے اور تعداد تصنیفات وصفحات سے بھی اہم تر ہے۔''63

مذکورہ اقتباس اور کتابوں کی فہرست سے ان کی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔انہوں نے تاریخی موضوعات پر اہم کتابیں لکھی ہیں۔سید صباح الدین الرحمٰن ۵۲ برس تک دارالمصنفین کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کرتے رہے۔الغرض ۱۸نومبر 1987 کو لکھنؤ میں رکشہ سے گر کر فوت ہوگئے۔دارالمصنفین کے احاطے میں علامہ شبلی سے متصل مدفون ہیں۔مولانا ضیاء الدین اصلاحی سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے انتقال پر شذرات معارف میں لکھتے ہیں:

''آہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن!مسند شبلی وسلیماں اجڑ گیا' جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دارالمصنفین واڈیٹر معارف ہم سب کو چھوڑ کر اب خدائے رحمٰن کے آغوش رحمت چلے گئے،گذشتہ ماہ ۱۸/ نومبر کو ٹیلی فون ارریڈیو سے دن میں ڈھائی بجے کے درمیان ان کی المناک شہادتکی خبر دارالمصنفین میں بجلی بن کر گری اور ان کے متعلقین وابستگان دارالمصنفین کی امیدوں

اور آرزوؤں کے خرمن کو خاک سیاہ کرگئی ،مولانا سید سلیمان ندوی،مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے بعد دارالمصنفین کی بزم علم وادب اسی چراغ سے روشن تھی لیکن افسوس کہ بادحوادث کے جھونکوں نے اسے بھی گل کردیا....ان کی وفات دارالمصنفین کے لیے واقعی جانکاہ حادثہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے،وہ اس وقت جس آزمائش میں مبتلا ہے اس میں ان کی رہنمائی اور سربراہی کی بڑی احتیاج تھی مگر مصلحت خداوندی کو کون جانتا ہے وہ عمر طبعی کو ضرور پہنچ گئے تھے مگر ان کی قوت کار، جوش علم ،قلم کی تازگی و شگفتگی اور تحریر کی رعنائی ودلکشی پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی ،وہ مزید سرگرمی وجانفشانی سے اس کے علمی وانتظامی کاموں کو انجام دے رہے تھے ،ان کی ذات دارالمصنفین کے لیے بڑا سہارا تھی ،آج دارالمصنفین کا چپہ چپہ ان کی جدائی پر اشکبار اور ماتم گسار ہے۔"64

یقیناً سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا جانا ایک بڑا علمی نقصان تھا۔ان کا شمار معتبر مورخوں میں ہوتا ہے۔ان کا خاص موضوع تاریخ ہند رہا۔انہوں نے نہ صرف یہ تاریخ پر اہم کتابیں لکھیں بلکہ ماہنامہ معارف میں سیکڑوں تاریخی وتحقیق مقالات بھی تحریر کیے۔یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شاہ معین الدین احمد ندوی کے انتقال کے بعد مولانا عبد السلام قدوائی ندوی (1907-1979) کو 1975 میں معارف کا نائب مدیر اور شریک ناظم بنایا گیا۔ایسا مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے ایما پر کیا گیا۔بقول سید صباح الدین عبدالرحمٰن 'دارالمصنفین کی کشتی کے بادبان بن کر آئے'65 یہ عہدہ ان کے علاوہ کسی کو نہیں دیا گیا۔تقریبا چار برس وہ دارالمصنفین کی خدمت کرتے رہے۔معارف کے سرورق پر باقاعدہ ان کا نام شریک مرتب کی حیثیت سے شائع ہوتا تھا۔غالبا یہ ان کا امتیاز بھی ہے کہ ان سے پہلے اور نہ ان کے بعد معارف کے ٹائیٹل پر کسی کا نام شریک مرتب کے طور پر شائع ہوا۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی ادارت میں ان کی غیر موجودگی میں نہ صرف معارف کا انتظام سنبھالا بلکہ ستمبر تا دسمبر 1975،اپریل تا دسمبر 1976،دسمبر 1977،فروری،جولائی اور اکتوبر 1978 کے شماروں کے شذرات بھی تحریر کیے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے انتقال کے بعد دارالمصنفین کی ادارت مولانا ضیاءالدین اصلاحی کے سپرد ہوئی۔مولانا شاہ معین الدین صاحب کے خصوصی تربیت یافتہ تھے۔مولانا ضیاءالدین اصلاحی اپنے نانہال جیراج پور اعظم گڑھ میں 1937 میں پیدا ہوئے۔ان کا آبائی گاؤں اعظم گڑھ کا موضع سہریا ہے۔ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ نظام آباد میں حاصل کی ،ابتدائی تعلیم کے بعد 1947 میں مدرستہ الاصلاح میں داخلہ لیا۔تعلیم سے فراغت کے بعد 1957 میں دارالمصنفین کے علمی قافلے میں شامل ہوئے۔نومبر 1987 میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے بعد دارالمصنفین کے ناظم اعلی مقرر ہوئے اور ماہنامہ معارف کی ادارت سنبھالی۔تقریبا ۲۲ سال دارالمصنفین کی نظامت اور معارف کی ادارت کو بحسن خوبی انجام دیا۔معارف میں شذرات،تحقیقی وعلمی مضامین کے علاوہ متعدد کتابیں بھی

لکھیں جن میں تذکرہ محدثین(تین جلدیں)ہندوستان عربوں کی نظر میں (دوجلد)مولانا آزاد کے افکار وآثار،ایضاح القرآن،انتخاب کلام اقبال سہیل،چندار باب کمال وغیرہ اہم ہیں۔۱۵ اگست 1996 میں صدر جمہوریہ ہند سے عربی کی مسلہ لیاقت پرایوارڈ سے نوازے گئے۔اردواکیڈمی یوپی سے انہیں صحافتی خدمات پرایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔اس کے علاوہ مختلف مدارس کے رکن بھی رہے۔یکم فروری 2008 میں ایک سڑک حادثہ میں جاں بحق ہوئے اوردارالمصنفین کے احاطہ میں مدفون ہوئے۔پروفیسر اشتیاق احمدظلی ضیاءالدین اصلاحی کے انتقال پرشذرات معارف میں لکھتے ہیں:

''آہ!مولاناضیاءالدین اصلاحی؛دارالمصنفین ناظم اورمعارف کے مدیرجناب ضیاءالدین اصلاحی ۲/فروری۲۰۰۸ کی صبح کواپنے خالق حقیقی کےحضورپہنچ کراس کی رحمت سے جاملےلیکن اپنے پیچھے دارالمصنفین کے ہرفردبلکہ درودیوارکوروتابلکتا چھوڑ گئے،شبلی وسلیمان کا یہ گلشن ویرانی کی تصویربن گیا،اس جہان علم ودانش کی روح بھی جیسےان کی موت کے ساتھ رخصت ہوگئی اورسچ یہ ہے کہ علامہ شبلی ،مولانا سیدسلیمان ندوی ،مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اورسید صباح الدین عبد الرحمٰن کی قابل فخرروایات کی مسنداوربزم جس شمع سے روشن تھی ،ایک حادثہ نے اسے گل کردیا،انا اللہ وناالیہ راجعون۔.... کیا حوصلہ اورکیاولولہ تھا کہ شبلی وسلیمان کی نسبت سےسمینارہوں،علوم اسلامیہ پرلکچرہوں،کتابوں پرمقدمہ لکھنے ہوں،تقریظیں ہوں،تمام مصروفیات کے باوجودان کا وقت سب کے لیے تھا۔ان کی شرکت سےعلمی مجلسوں کی رونق بڑھ جاتی اورسمیناروں میں جان پڑجاتی،پی ایچ ڈی کے بیسیوں مقالات میں ان کی معاونت کا اعتراف ان کے مقالہ نگاروں نے کیا اور یہ ساری تگ ودومحض اپنےعظیم المرتبت پیش رو بزرگوں کی روایت کے قیام اور دارالمصنفین کےعلمی استحکام کے لیےتھی۔ان کے زیرنگرانی رابطہ ادب اسلامی کااورعلامہ شبلی سمینار دارالمصنفین میں شان سے منعقدہوا۔توسیعی خطبات کا سلسلہ بھی انہوں نے جاری رکھا،پروفیسر عبدالمغنی،پروفیسرریاض الرحمٰن شروانی وغیرہ کےخطبات ان کے دورمیں ہوئے،اورفروری میں اسی سلسلے میں انہوں نے پروفیسرعبدالحق سےفرمائش کی تھی۔دارالمصنفین میں تعمیرات کااضافہ بھی ان کے دورمیں ہوا۔ان کاموں کی اہمیت اس لیےبھی ہے کہ حالات نامساعداوردشوار تھےایسے میں نشاط اورتازگی کی گنجائش کم تھی،تاہم ربط وارتباط،خط وکتابت اورگفت وشنید میں انہوں نے کبھی تھکن یامایوسی کااظہارنہیں ہونے دیا۔''66

پروفیسر اشتیاق احمدظلی کی پیدائش ۲مئی 1942 چھاؤں اعظم گڑھ میں ہوئی۔1962 میں مدرستہ الاصلاح اعظم گڑھ سے فضیلت کرنے کے بعدمزیدتعلیم کے لیے مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔1966 میں لکھنؤیونیورسٹی سے بی اےاور 1968 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم اے کیا۔1968ہی میں علی گڑھ یونیورسٹی میں

بحثیت استاد مقرر ہوئے۔1969 میں ایم فل اور 1978 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ادارہ علوم القرآن علی گڑھ کے بانی اور 1987 سے اس کے صدر بھی ہیں۔ادارہ علوم القرآن سے نکلنے والے تحقیقی جرنل کے مدیر بھی ہیں ۔مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کے انتقال کے بعد 2000 میں دارالمصنفین کے رکن متعین ہوئے۔مولانا ضیاالدین اصلاحی کے انتقال کے بعد 2008 میں دارالمصنفین کی نظامت قبول کی اور ماہنامہ معارف کے مدیر مقرر ہوئے۔پرفیسر اشتیاق احمد ظلی نے اپنے بارہ سالہ دورنظامت میں دارالمصنفین میں گراں قدر اضافہ کیا۔اہم کتابوں کے نئے ایڈیشن تیار کرائے،کمپیوٹر کا اضافہ کیا،مخطوطات کو ڈیجیٹل کرایا اور دارالمصنفین کے کتابوں کی فہرست توضیحی صورت میں شائع کرائی،اس کے علاوہ عمارتوں کی مرمت اور جدید سہولتیں مہیا کرائی۔رفقا و ملازمین کی تنخواہوں میں بھی اضافہ کیا۔

اشتیاق احمد ظلی صاحب نے بعض انقلابی اقدامات اٹھائے جسے اس رسالے کی اولیات میں شمار کیا جاتا ہے۔انہوں نے معارف کو آن لائن کر کے دنیا بھر کے بالخصوص بیرون ملک قارئین معارف کے لیے استفادہ کو آسان بنایا،ویب سائٹ پر نہ صرف معارف کا تازہ شمارہ اپلوڈ کیا جاتا ہے بلکہ تمام قدیم شمارے بھی ویب سائٹ پر دستیاب ہیں جنہیں انٹرنیٹ کی مدد سے آسانی سے پڑھا جاسکتا ہے۔معارف کے تمام شماروں کو سی ڈی کی شکل بھی دی جاچکی ہے۔اس سلسلے میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی لکھتے ہیں:

> ''جولائی 1916 میں معارف کا پہلا شمارہ شائع ہوا،اس طرح 2010 میں اس نے اپنی زندگی کے ۹۴ سال پورے کیے۔سخت حالات اور سنگین مسائل کے باوجود اس طویل مدت میں یہ مجلّہ پوری پابندی سے شائع ہوتا رہا۔اردو زبان کے علمی مجلّات کی تاریخ میں یہ امتیاز کسی دوسرے مجلّہ کو حاصل نہیں۔اس احسان عظیم کے لیے اللہ رب العزت کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے،کم ہے۔اس کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے مقصد سے دارالمصنفین کی مجلّہ انتظامیہ نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۲/ جولائی میں فیصلہ کیا کہ جولائی 2010 کے شمارے سے جس سے معارف کے پنچانوے سال کی ابتدا بھی ہوگی،اس انٹرنیٹ پر دستیاب کرایا جائے۔چناچہ دنیا کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے قدرداں جن کے لیے معارف حاصل کرنا مشکل تھا۔اب وہ اکیڈمی کی ویب سائٹ پر اس کا مطالعہ کرسکیں گے۔''67

ماہنامہ معارف کے حوالے سے اشتیاق احمد ظلی صاحب کا ایک اور انقلابی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ معارف کا آن لائن کیا بلکہ پریس ریڈر کے پلیٹ فارم تک پہنچایا،غالبا معارف اردو کا پہلا سالہ ہوگا جو پریس ریڈر پر دستیاب ہے۔اس کی انفرادیت میں ظلی صاحب نے ایک اور اضافہ کیا کہ معارف کو سرچ ایبل بنادیا،اب معارف کی ورق گردانی کے بجائے فہرست مضامین میں متعلقہ مضمون کی سرخی کلک کرنے سے مطلوبہ مضمون

سامنے آجائے گا۔ظلی صاحب کی عہدادارت میں نہ صرف شبلی صدی بلکہ معارف صدی تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔اس حوالے سے شبلی صدی کے موقع پر شبلی نمبراور معارف صدی کی مناسبت سے شذرات معارف کا دوجلدوں میں انتخاب 'ہندستانی مسلمان شذرات معارف کے آئینہ میں' شائع کیا۔اس کے علاوہ کئی اہم کتابیں،معارف کا اشاریہ اور سمینار کا انعقاد کیا گیا۔

پروفیسر اشتاق احمد ظلی کی شخصیت بہت فعال اور متحرک ہے۔انہیں مختلف اداروں اور شعبوں میں کام کرنے کا ایک تجربہ بھی ہے۔انگریزی، فارسی، عربی اور اردو میں دسترس حاصل ہے۔ان کی بیشتر کتابیں انگریزی میں ہیں۔ان کا خاص موضوع تاریخ ہے۔اشتیاق احمد ظلی کو ترجمہ کے فن ورموز سے بھی واقفیت ہے۔ان کی کتاب ''سلطنت مغلیہ کا مرکزی نظام حکومت'' جوانگریزی کی کتاب دی سینٹرل اسٹرکچر آف دی مغل امپائر کا ترجمہ ہے علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔اس کے علاوہ ان کی دوسری کتاب ''مغل اسٹیٹ آف کلچر'' تاریخ کی عمدہ کتابوں میں سے ایک ہے۔اس کے علاوہ اشتیاق احمد ظلی نے مختلف موضوعات پر پر مغز مقالے بھی تحریر کیے ہیں۔

جولائی 1951 میں معارف کے نظام کو چلانے کے لیے مجلس ادارت کی تشکیل دی گئی۔1951 سے تاحال معارف کی ادارت میں جن افراد کے نام شامل رہے ہیں ان کا شمار اپنے دور کے ممتاز اہل علم ودانش میں ہوتا ہے۔زمانی ترتیب سے ان کے نام درج کیے جاتے ہیں۔مولانا عبدالماجد دریابادی،سید مناظر احسن گیلانی،ڈاکٹر عبدالستار صدیقی،مولانا ابوالحسن علی ندوی،مولانا محمد اویس نگرامی ندوی،عبدالسلام قدوائی ندوی،ڈاکٹر نظر احمد،مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی،مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور پروفیسر مختارالدین احمد۔شمس الرحمٰن فاروقی،ریاض الرحمٰن شروانی۔

معارف کی ادارت وسرپرستی ہمیشہ سے بڑے قلم کاروں کی رہی ہے۔دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ معارف میں لکھنے والے بھی ہمیشہ سے بڑے پایے کے عالم،ادیب ونقادرہے ہیں۔اس لیے معارف بہت جلد ایسا رسالہ بن گیا جس میں شائع ہونا باعث افتخار سمجھا جانے لگا۔کم ہی ایسے لکھنے والے ہوں گے جن کی نگارشات معارف میں نہ شائع ہوئی ہو۔اکبرالہ آبادی، علامہ اقبال اور جگر مرادآبادی جیسے اپنے عہد کے ممتاز شاعروں کا کلام معارف میں شائع ہوا۔علامہ شبلی اور علامہ اقبال کے گہرے مراسم تھے۔شبلی نے نہ صرف انہیں ترجمان حقیقت کا خطاب دیا تھا بلکہ بڑے شاعر ہونے کی پیشن گوئی بھی کی تھی۔علامہ شبلی کے انتقال کے بعد ان کے جانشین سید سلیمان ندوی سے بھی کافی لگاو رہا۔دارالمصنفین کے قیام کے بعد علامہ اقبال نے اس ادارے سے نہ صرف دلچسپی لی بلکہ تاحیات اس کے رکن بھی رہے۔اقبال کی متعدد نظمیں اور غزلیں سب سے پہلے معارف ہی میں شائع ہوئیں۔یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی کی کتاب 'اقبال کامل' آزاد ہندستان میں اقبال پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔علامہ اقبال

نے اپنے کلام پر سید سلیمان ندوی کی تنقید کو ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا اور ان کے بعض اصلاحوں اور تجویزوں کو قبول کیا۔ معارف کے چند قلمی معاونین کے نام بطور مثال درج کیے جاتے ہیں:

اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر محمد ابراہیم ڈار، ابوالحسن علی ندوی، ابواللیث صدیقی، احمد میاں اختر جوناگڑی، خواجہ احمد فاروقی، حافظ احمد علی خان شوق، پروفیسر اکبر حیدری کشمیری، پروفیسر اکبر رحمانی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، امیاز خان عرشی، ڈاٹر امیر حسن عابدی، پروفیسر نذیر، ڈاکٹر ایوب قادری، پروفیسر تاثیر، تحسین سروری، تمکین کاظمی، جعفر علی خان اثر لکھنو، مولوی حامد حسن قادری، ڈاکٹر حامد اللہ ندوی، حبیب الرحمٰن خان شیروانی، پیر حسام الدین راشدی، پروفیسر سید حسن، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، خلیق احمد نظامی، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، سخاوت مرزا، پروفیسر محمد سلیم، شاہ عظیم آبادی، شبیر احمد خاں غوری، ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، شوکت سبزواری، پروفیسر ضیا احمد، ضیاالدین احمد، ضیاالدین برنی، عابد رضا بیدار، سید عبدالباری ندوی، عبدالحلیم چشتی ندوی، پروفیسر خواجہ عبد حمید، ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی، عبد الحیٔ ندوی، عبدالرحمٰن نگرامی ندوی، عبد اللہ چغتائی، عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر عبدالغنی، ڈاکٹر عطش درانی، علی جوواد زیدی، غلام رسول مہر، ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین ربانی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، کالی داس گپتا رضا، کبیر احمد جائسی، کلب علی خان، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، مالک رام، حافظ حبیب اللہ ندوی، مولوی محفوظ حق، محمد علی خان اثر رامپوری، ڈاکٹر مختار الدین آرزو، پروفیسر مسعود حسن، پرفیسر مسعود احمد، مسعود عالم ندوی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، سید مقبول احمد، مولانا مناظر حسن گیلانی، مولانا عبدالعزیز میمنی، نظیر اشرف ندوی، حفظ نذیر احمد، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، سید وحید اشرف ندوی، سید وقار عظیم، سید ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر عارف نوشاہی اور ڈاکٹر راہی فدائی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ماہنامہ معارف ظاہری اور معنوی طور پر کئی حیثیتوں سے عصری صحافت اور معاصر رسائل سے مختلف اور بہت سارے تخصصات کا حامل ہے۔ معارف کی سو سالہ صحافتی سفر کو مدنظر رکھتے ہوئے چند اہم خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ معارف (جولائی 1916) آج اپنے معاصر رسائل میں قدیم ہونے کا اعزاز رکھتا ہے۔ آج تک اس کی اشاعت میں ناغہ نہیں ہوا، مسلسل بغیر کسی انقطاع کے روز اول سے جاری ہے۔ ماہنامہ معارف کا ابتدا سے ہی اشاعت کا وقت مقرر ہے جس کی پابندی ہمیشہ سے کی جاتی رہی ہے۔ ابتدائی دور میں معارف مہینہ کے آخر میں شائع ہوتا تھا البتہ جولائی 1918 سے ہر ماہ کے اوائل یعنی مہینہ کی پندرہ تاریخ کو پابندی سے شائع ہونے لگا بلکہ اس سے قبل ہی قارئین کے لیے ویب سائٹ پر لوڈ کر دیا جاتا ہے۔ 1916 سے 2016 تک کے سارے شمارے دستیاب ہیں بلکہ ان تمام شماروں کو سی، ڈی کی شکل دے دی گئی ہے۔ معارف آج بھی اپنی پرانی وضع پر قائم ہے۔ معارف میں عموماً اشتہارات شائع نہیں کیے جاتے بلکہ بعض تعلیمی اداروں اور نوع کے علمی و ادبی اداروں کے اشتہارات ضرور شائع

کیے جاتے ہیں۔کتب موصولہ پر ستمبر 1916 سے اندرونی صفحات میں رسالوں اور کتابوں کے اشتہار دینے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔رسالہ نے ایک صدی میں صرف تین خاص نمبر سید سلیمان نمبر، حبیب الرحمٰن خان شیروانی نمبر اور شبلی نمبر شائع کیے ہیں۔معارف کا سرورق ہمیشہ سے سادہ اور متن پر وقار، طباعت معیاری اور کاغذ ہمیشہ سے عمدہ قسم کا استعمال کیا جاتا ہے۔ابتدا میں معارف 60 صفحات پر مشتمل ہوتا البتہ جولائی 1918 سے ہر شمارہ 80 اور جلد 480 صفحات پر مشتمل ہوتی ہے اس سے انحراف صرف دوران جنگ کاغذ کی قلت کے سبب کیا گیا۔معارف کی ضخامت میں ہونے والی تبدیلی کو یہاں عہد بہ عہد نقل کیا جاتا ہے۔

جولائی1916	تا	فروری1917	60صفحات
مارچ1917	تا	جون1919	56صفحات
جولائی1919	تا	دم تحریر	80صفحات

جنگ عظیم کے دوران کاغذ کی قلت اور اسباب کی گرانی کے سبب ستمبر 1944 سے دسمبر 1946 تک معارف ضخامت متاثر رہی ہے۔ستمبر 1944 سے 1945 تک 26صفحات، مئی جون 1945 میں 32 صفحات، جولائی، اگست 1945 میں 64 صفحات، اکتوبر تا دسمبر 1945، 74 صفحات۔

معارف کا ہر شمارہ موضوعاتی طور پر متنوع ہوتا ہے، ہر شمارہ تاریخ، ادب، سیرت، شاعری، فلسفہ، منطق وغیرہ موضوعات سے مزین ہے۔الہلال کے بعد معارف نے ہر نئی جلد میں گذشتہ جلد کے مشمولات کا اشاریہ شامل کرنے کی روایت جاری رکھی ہے۔ابتدائی تین جلدیں ایک سال کے بارہ شماروں پر مشتمل ہوتی تھی مگر جولائی 1919 سے ہر چھ شماروں کی ایک جلد ہونے لگی اور تاہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔معارف کا پہلا شمارہ جولائی 1916 میں منظر عام پر آیا اس لیے جولائی تا جون ایک جلد ہوا کرتی تھی مگر تین جلدوں کے بعد چھ ماہ پر جلد بدلنے لگی۔ یہاں معارف کی جلدوں کو سن کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے تاکہ معارف کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے آسانی ہو سکے۔

جلد1	جولائی1916	تا	جون1917
جلد2	جولائی1917	تا	جون1918
جلد3	جولائی1918	تا	جون1919

تین جلدوں کے بعد ہر چھ ماہ پر ایک جلد مکمل ہونے لگی تو اس طرح سے ایک سال میں دو جلد ایک جولائی تا دسمبر اور دوسری جنوری تا جون ہونے لگی یہی سلسلہ آج بھی چل رہا ہے۔ یہاں کچھ جلدوں کی مثالیں نقل کی جارہی ہیں تاکہ قارئین معارف کو قدیم سے قدیم شماروں کو پڑھنے میں آسانی ہو سکے۔

جلد4	جولائی1919	تا	دسمبر1919

جلد5	جنوری1920	تا	جون1920
جلد6	جولائی1920	تا	دسمبر1920
جلد7	جنوری1921	تا	جون1921
جلد8	جولائی 1921	تا	دسمبر1921
جلد9	جنوری1922	تا	جون1922
جلد10	جولائی1922	تا	دسمبر1922

یہاں معارف کی دس جلدوں کو بطور مثال پیش کیا گیا بقیہ جلدوں کو اسی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔جلد نمبر کی صورت یہ ہے کہ مثلاً جلد ۶/۱۰ کا مطلب ہے جلد دس کا چھٹا شمارہ اسی طرح ۲/۱۷ کا مطلب جلد سترہ کا دوسرا شمارہ۔ معارف کا سائز ابتدا سے ۸/۲۰x۲۶ رہا ہے۔معارف کی ضخامت ابتدا میں ہمیشہ سے 80 صفحات رہی البتہ زمانہ جنگ میں اس میں کمی بیشی کی گئی۔معارف کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے سید سلیمان ندوی نے ۱۰۰ صفحات کرنا چاہ رہے تھے مگر بعض دشواریوں کے سبب نہ ہوسکا۔معارف کے صفحات کا نمبر شمار پورے ایک جلد پر مشتمل ہوتا ہے۔معارف طباعت اور قیمت ہمیشہ سے معتدل اور سادہ رہی ہے۔معارف کا ایک منفرد اور خاص طریقہ یہ بھی رہا ہے کہ مقالہ نگار کے مضمون کی اشاعت کے بعد اس کے مضمون کو الگ سے جلد بنا کر دیا جاتا ہے۔کاغذ کی گرانی اور مصارف طبع میں اضافہ کے مطابق اس کی قیمت میں ہمیشہ سے تبدیلی ہوتی رہی ہے۔معارف کی بدلتی ہوئی سالانہ قیمتیں حسب ذیل ہیں:

جولائی1916	تا	جون1919	4روپیہ
جولائی1919	تا	جنوری1951	5روپیہ
فروری1951	تا	دسمبر1952	6روپیہ
جنوری1953	تا	نومبر1970	8روپیہ
دسمبر1970	تا	جون1974	10روپیہ
جولائی1974	تا	جون1975	12روپیہ
جولائی1975	تا	دسمبر1980	15روپیہ
جنوری1981	تا	دسمبر1984	20روپیہ
جنوری1985	تا	دسمبر1989	30روپیہ
جنوری1990	تا	جولائی1991	40روپیہ

اگست1991	تا	جون1995	60روپیہ
جولائی1995	تا	جون2001	80روپیہ
جولائی2001	تا	جون2002	100روپیہ
جولائی2002	تا	جولائی2007	120روپیہ
اگست2007	تا	اکتوبر2008	150روپیہ
نومبر2008	تا	جون2013	220روپیہ
جولائی2013	تا	تادم تحریر	350روپیہ

معارف علمی وادبی رسالہ ہے اس کے کچھ اختصاص بھی ہیں، یعنی رسالوں میں کالم وغیرہ کی ابتدا معارف کی دین ہے۔ معارف نے مختلف عنوانات کے تحت کالموں کو خاص کر رکھا ہے۔ مثلا اداریہ کی جگہ شذرات کا لکھا جانا۔ اجمل ایوب اصلاحی شذرات کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شذرات سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو کہتے ہیں جو سونے کی کان سے چنے جاتے ہیں۔ اداریے میں مختلف موضوعات پر جو علاحدہ علاحدہ ٹکڑے لکھے جاتے ہیں ان کے لیے علامہ شبلی نے اس بلیغ لفظ کا انتخاب کیا تھا۔ پھر تو ایسا عام ہوا کہ بہت سے لوگ اسے اداریے کا ہم معنی سمجھنے لگے۔'' 68

مختلف عنوانات کے تحت کالموں میں بٹا ہونا۔ جس کے متعلق سید سلیمان ندوی معارف کے شذرات میں رقم طراز ہیں:

''رسائل کی دنیا میں معارف کیے بہت سارے اولیات ہیں جن میں ایک رسالہ کے مضامین کو مختلف ابواب میں تقسیم کرنا ہے۔'' 69

معارف میں شائع ہونے والے کالموں کی تعداد کم وبیش بیس ہے۔ ان میں سے کچھ ایسے باب ہیں جو ہر شمارے میں شائع ہوتے ہیں جبکہ کچھ عنوان ایسے ہیں جو کبھی کبھی شائع ہوتے ہیں۔ ہر باب کی ایک روداد ہے کہ اسے کب اور کس مدیر نے شروع کیا، ہر کالم مختصر تعارف پیش جائے گا البتہ یہاں ان تمام کالموں کا نام اور سن آغاز پر روشنی ڈالی جاری ہے:

1۔	شذرات	جولائی1916
2۔	مقالات	جولائی1916
3۔	مباحث حاضرہ	جولائی1916

4۔	باب التقریض والانتقادیات	جولائی1916
5۔	مسائل وفتاوی	اگست1916
6۔	ادبیات	ستمبر1916
7۔	مطبوعات جدیدہ	ستمبر1916
8۔	آچار علمیہ وتاریخیہ	ستمبر1916
9۔	باب التعلیم والتربیہ	جنوری1917
10۔	اخبار وسیر	مارچ1917
11۔	استفسار علمیہ	جون1917
12۔	باب المراسلہ والمناظرہ	اکتوبر1918
13۔	مقتبسات	جولائی1919
14۔	مترجمات	اگست1919
15۔	تلخیص وترجمہ	اگست1919
16۔	اخبار علمیہ	اگست1919
17۔	اوراق پارینہ	جون1922
18۔	باب الاستفسار والجواب	نومبر1931
19۔	وفیات	جون1943
20۔	معارف کی ڈاک	جولائی1985

یہاں معارف کے خاص کالموں پر مختصر روشنی ڈالی جارہی ہے تاکہ معارف کی انفرادیت اور ندرت معلوم ہوسکے۔ یہ کالم مقالات کے اعتبار سے گھٹتے بڑھتے رہے ہیں بلکہ کچھ کا ابتدا سے ہی التزام کیا جارہا ہے۔ کالموں کی تاریخ اور خصوصیت ملاحظہ ہو:

شذرات:

معارف نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے اداریہ کی جگہ شذرات لکھنے کی روایت ڈالی۔ شذرات کے معنی سونے کے ٹکڑے یا ڈلے کے ہیں۔ یہ کالم مدیر کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ اس کا آغاز اولین شمارے سے تا حال برقرار ہے۔ شذرات میں عموما حالات حاضرہ اور ملکی وملی مسائل کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ قرآن وحدیث، فقہ، ادب، سیاست، شعروشاعری، وغیرہ موضوعات پر بھی دلچسپ شذرات ملتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی کے

شذرات سے لے کر اشتیاق احمد ظلی تک کے شذرات کو جمع کیا جائے تو ایک تاریخی انسائیکلو پیڈیا تیار ہوسکتا ہے۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے معارف صدی کے موقع پر شذرات معارف کا دو جلدوں میں خصوصی نمبر شائع کیا اور اس کا عنوان رکھا 'ہندستانی مسلمان شذرات معارف کے آئینہ میں'۔اس میں دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان سے متعلق اتنی چیزیں جمع ہوگئی ہیں کہ آزادی کے بعد سے اب تک کہ پوری جدوجہد جو اس زبان سے عبارت ہماری نگاہوں کے سامنے روشن ہوجاتی ہیں۔ جون، جولائی 2016 پر مشتمل ان دو شماروں کی ضخامت 717 صفحات ہے۔ شذرات معارف کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ سید سلیمان ندوی کے شذرات تین جلدوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ ماہنامہ معارف نے اس وقت شذات لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جب بمشکل کسی اور رسالے میں اس کا التزام کیا جاتا رہا ہو۔شذرات کا باب معارف کے پہلے شمارہ جولائی 1916 سے مسلسل شائع ہو رہا ہے البتہ چھ شمارے بغیر شذرات کے شائع ہوئے، خاص بات یہ رہی کہ بیشتر مہینوں میں عدم اشاعت کے معقول اسباب بھی تحریر کیے گئے۔ یہ تمام شمارے سید سلیمان ندوی کی ادارت میں شائع ہوئے۔ بغیر شذرات کے شائع ہونے شماروں ماہ وسن کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔

مارچ 1918

ستمبر 1923

اکتوبر 1927

اکتوبر 1929

مئی 1936

دسمبر 1947

اخبار علمیہ:

اس کالم کا آغاز 1919 میں کیا گیا۔اگست 1919 سے اپریل 1943 تک بجز چند شماروں کے مسلسل شائع ہوتا رہا۔ پھر کسی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ جون 1988 سے دوبارہ اس کالم کو شروع کیا گیا درمیان کے چند شماروں کے علاوہ 1919 تک شائع ہوتا رہا۔ چند برس کے انقطاع کے بعد 2003 سے اس کالم کو پھر سے شائع کیا جانے لگا۔معارف کے اس کالم میں کسی اہم وقوع پذیر واقعات وخبروں کو دیگر زبانوں سے اردو میں تبصرہ کیا جاتا ہے۔ایک عرصہ تک اخبار علمیہ کے مرتب کا نام شائع نہیں ہوتا تھا مگر بعد میں مرتب کا نام شائع ہونے لگا۔ معارف کا یہ کالم اتنا دلچسپ اور معلومات خیز ہے کہ بعض قارئین معارف کے مطالعہ کے وقت اس کو سب سے پہلے پڑھتے ہیں۔ ابتدا میں تو اس کا معیار بہت بلند تھا۔عربی اور انگریزی کے اہم اخبارات ورسائل سے علمی، ادبی وسیاسی خبریں

شائع ہوتی تھیں۔البتہ حالیہ ایک عشروں سے عام طور پر اردو اخبارت سے ہی کالم کو مزین کیا جاتا ہے۔اس کالم کے مرتبین کے نام حسب ذیل ہیں:مولانا سید سلیمان ندوی،نجیب اشرف ندوی،مولانا ریاست علی ندوی،مولانا عبد الماجد دریابادی،شاہ معین الدین احمد ندوی،مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور ڈاکٹر محمد عزیز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

باب التقریض والانتقادیات:

معارف کا ایک اہم کالم ہے،اس کے تحت ہر ماہ کسی کتاب پر نقد وتبصرہ کیا جاتا ہے۔کتابوں کے علاوہ اہم رسائل کے نمبروں پر بھی تبصرہ کیا جاتا ہے۔بجز چند شماروں کے اس کا التزام ہمیشہ سے کیا جاتا رہا ہے۔کسی کتاب پر نقد وتبصرہ کرتے وقت تنقیدی توازن کا خاص التزام کیا جاتا ہے اور تنقیص سے احتراز کیا جاتا ہے۔معارف میں تبصرے دو نوعیت کے ہوتے ہیں۔ایک تو صرف تعارف تک محدود ہوتا ہے جبکہ دوسرا تبصرہ باقاعدہ کتاب پر سیر حاصل گفتگو کی جاتی ہے،اور اس کے حسن وقبیح کو واضح کیا جاتا ہے۔مولانا مجیب اللہ ندوی،مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے بعض تبصرے اس سلسلے میں یادگار ہیں۔اس کالم کا شعبہ معارف میں ایک بڑا ذخیرہ ہے جس کے مطالعہ سے معارف کی تنقیدی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

ادبیات:

ادبیات معارف کے مستقل اور دلچسپ کالموں میں سے ایک ہے۔اس کالم کے تحت شعری تخلیقات نظم، غزل،رباعی،نعت،مرثیہ اور قطعات تاریخ وفات وغیرہ شائع ہوتی ہیں۔اس میں اقبال،اکبر،جوش،جگر،فراق، نشور واحدی،شاد عظیم آبادی،امجد حیدرآبادی،اثر صہبائی،احسان دانش،یحیٰ عظیم،حفیظ ہوشیار پوری،روشن صدیقی، حسرت موہانی،اقبال سہیل،اثر لکھنوی،عزیز لکھنوی،مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی،وحید الدین سلیم،نیاز فتح پوری،محمد علی جوہر،ماہر القادری،تسکین قریشی،جوش ملیح آبادی،ثاقب کانپوری،حمید صدیقی،روش صدیقی،بسنت کمار،چندر پرکاش جوہر،شفیق جون پوری،فضا ابن فیضی،چندر پرکاش جوہر،جگن ناتھ آزاد،رئیس احمد نعمانی اور کیفی اعظمی جیسے ممتاز شعرا کے کلام کو شائع کر کے رسالہ کی تازگی کو برقرار رکھا جاتا ہے۔اس میں بہت سے ایسے شعرا کے کلام شائع ہوئے بعد میں ملک کے بڑے شاعر تعلیم کیے گئے۔صرف یہی ایک کالم معارف کو ادبی دنیا میں نمایاں مقام دلانے کے لیے کافی ہے۔

آثار علمیہ وادبیہ یا اثار علمیہ وتاریخیہ:

یہ کالم بھی ابتدائی شمارے سے قائم ہے جو ہر ماہ تو نہیں مگر چند ماہ بعد اس عنوان کے تحت کوئی نہ کوئی نادر تحریر ضرور شائع ہوتی ہے۔مزید اس باب میں مشاہیر علم وادب کے ان خطوط کو بھی شائع کیا جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً معارف کو بھیجے جاتے ہیں۔اس کالم کے مطالعہ سے معارف کی انشاء پردازی کا اندازہ ہوتا ہے۔اس عنوان کے تحت بھی اس قدر

مواد جمع ہے کہ ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔مزید نظم ونثر کے متعلق مطبوعہ وغیر مطبوعہ شکل میں نادر ونایاب تحریریں بھی پیش کی جاتی ہیں۔معارف کے ذخیرہ میں جن مشاہیر کے خطوط محفوظ ہو گئے ہیں ان میں علامہ اقبال،مولانا آزاد،علامہ شبلی،علامہ الطاف حسین حالی،اکبرالہ آبادی،مناظر احسن گیلانی،حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور خود سید سلیمان ندوی کا نام خصوصیت کے ساتھ شامل ہے۔

تلخیص وتبصرہ:

معارف کا یہ باب مستقل طور پر شائع نہیں ہوتا مگر وقتاً فوقتاً اس کے تحت عربی،انگریزی اور فارسی کے اہم علمی وادبی مقالات اور ممتاز قلم کاروں کے مضامین کا جامع خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔یہ مضامین عموماً اسلامی فکر کے ہوتے ہیں۔اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے اہم مضامین کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا تھا۔ان مضامین کا ایک ضخیم مجموعہ ’’دنیا میں اسلام‘ کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

مطبوعات جدیدہ:

اس کالم میں مختلف زبانوں میں شائع ہونے والی نئی کتابوں کی اطلاع دی جاتی ہے،جس سے تازہ مطبوعات کی اہمیت وافادیت کا اندازا ہوتا ہے۔معارف کے تبصرے اپنے توازن اور علمی انداز کے لیے ممتاز ہیں۔معارف کی اشاعت سے ہی یہ سلسلہ جاری ہے۔اس کے لکھنے والوں میں مولانا سید سلیمان ندوی،نجیب اشرف ندوی،ریاست علی ندوی،شاہ معین الدین احمد ندوی جیسے اہم ادیب ومعلم ہمیشہ سے رہے ہیں۔

معارف کی ڈاک:

معارف کے اس باب میں معارف کے نام لکھے گئے ان خطوط کو شائع کیا جاتا ہے جس میں کسی غلطی کی طرف توجہ دلائی گئی ہو۔

باب المراسلہ والمناظرہ:

اس کالم کے تحت کسی شائع شدہ مقالہ یا کتاب کی غلطیوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔اس کالم کا شمار معارف کے اہم کالموں میں ہوتا ہے۔

وفیات:

معارف میں اس عنوان کے تحت کسی عالم،شاعر وادیب کے سانحہ ارتحال پر تعزیت پیش کی جاتی ہے۔اس کے علاوہ تاریخ وفات اور مختصر تعارف کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ابتدا میں شذرات ہی میں اس کا تذکرہ ہوتا تھا مگر اس کی معنویت اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے مشورے سے جون 1943 سے باضابطہ وفیات کے نام سے ایک کالم کی شکل دی گئی۔وفیات عموماً مدیر کے قلم سے تحریر کیا جاتا ہے۔وفیات کے لکھنے والوں میں سید سلیمان

ندوی،شاہ معین الدین احمد ندوی،مولانا عبدالسلام ندوی،سید صباح الدین الرحمٰن ندوی،ضیاء الدین اصلاحی،مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام قابل ذکر ہیں۔وفیات کی ایک خاصی تعداد دارالمصنفین کے رفقا کے علاوہ دوسرے اہل علم کے قلم سے بھی ہے،ان میں رشید احمد صدیقی،شیخ نذر حسن،ڈاکٹر محمد اسلم،پروفیسر مختار الدین احمد اور پروفیسر مسعود حسین خان کے نام قابل ذکر ہیں۔معارف کی وفیات کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اب کتابی شکل دے دی گئی ہے۔معارف میں وفیات کے قیام کے سلسلہ میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ''آپ بعض اوقات کسی عالم کی موت کا ذکر اپنے سحر بھرے الفاظ میں بیان کر جاتے ہیں،جن کو پڑھ کر آنکھیں آبدیدہ ہوجاتی ہیں۔اگر آپ مستند یورپی رسائل کی طرح ایک الگ موضوع وفات بنالیں تو اچھا ہے''۔یہ مشورہ آیا اور اسی پرچہ اس کی پیروی بھی شروع کردی گئی اور اس کا عنوان 'وفیات' قرار دیا گیا۔70

ترجمات:

ماہنامہ معارف کا یہ کالم مقالات وکتابوں کی تلخیص وتراجم کے لیے مخصوص ہے۔

استفسارات علمیہ:

اس باب میں قارئین معارف کے علمی سوالوں کے مفسرین کے جواب ہوتے ہیں۔مسائل وفتاوی کے نام سے ابتدا سے ہی ایک باب قائم تھا۔بعض اہل علم کی جانب سے یہ مشورہ آیا کہ معارف میں ایک باب استفسار علمیہ بڑھایا جائے۔سید سلیمان ندوی نہ صرف اسے قبول کیا بلکہ جون 1917 سے یہ باب معارف میں باضابطہ طور پر شائع ہونے لگا۔ایک مدت کے بعد اسے بند کردیا گیا،البتہ اس کی افادیت کو دیکھتے ہوئے 1931 میں کچھ شرطوں کے ساتھ دوبارہ جاری کیا گیا۔سید صاحب اس باب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ہمارے بعض ناظرین کا اصرار ہے کہ معارف مین سوال وجواب کا ایک باب بھی قائم کریں جس میں لوگوں کے علمی وادبی وتاریخی ومذہبی سوالات کے جاب دئے جائیں۔معارف کے شروع میں یہ باب 'مسائل وفتاوی' کے عنوان سے قائم تھا۔جون 1917 میں ہم نے اعلان کیا کہ 'استفسارات علمیہ' کے نام سے ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا دارالمصنفین جب سے قائم ہے علمی سوالات کے تحریری جوابات اور خطوط ومراسلات کا غیر منقطع سلسلہ قائم ہے اور کوئی دن ایسا کم گزرتا ہے کہ کسی استفسار کے تحریری جواب کی نوبت نہ آتی ہو،تاہم اس سوال وجواب کی اشاعت مناسب نہ معلوم ہوئی کہ خواہ مخواہ ایک شخصی معاملہ کو عمومی حیثیت کیوں دی جائے اور اس لیے اس باب کو بند کردیا گیا۔اب احباب کا اصرار ہے اور یہ کہنا ہے کہ اکثر اعتراضات وشکوک وشبہات یکساں ہوتے ہیں،اس لیے ایک کے سوال کا جواب چھپ جانے سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔بہر

حال ہم کو کچھ عذر نہیں فرق صرف یہ ہوگا کہ جو کام نج کے طور پر ہوتا تھا وہ اب اشاعت بھی پائے گا۔مگر ضروری ہے کہ اہل استفسار ان دفعات کو پیش نظر رکھیں۔

1۔استفسار کے خط کو دفتری معاملات سے الگ کاغذ پر لکھا جائے۔

2۔استفسار مختصر سے مختصر لفظوں میں ہو۔

3۔استفسار کی عبارت سنجیدہ ہو۔

4۔فریقانہ دل آزاری کے سوالات نہ ہوں۔

5۔استفسار صرف ایک صفحہ پر لکھا جائے اور دوسرا صفحہ خالی ہو۔

6۔ہر استفسار کا جواب رسالہ مین شائع کر دینا ضروری نہ ہوگا۔71

بنیادی طور پر معارف تحقیقی رسالہ ہے۔جس کا مقصد نئے گوشوں کی تلاش اور ادب کا معیار متعین کرنا ہے۔ معارف نے ہمیشہ سے تحقیقی مضامین کو اہمیت دی ہے۔بہت سے ایسے ادبی و علمی پہلو کا انکشاف کیا ہے جس سے ادبی دنیا نا آشنا تھی۔ان پہلووں پر معارف کی تحقیقی خدمات کے تحت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس کی تلاش و تحقیق میں معارف کو اولیت حاصل ہے۔یہاں چند مقالات کا ذکر کیا جاتا ہے۔:

۱۔ کلیات بالک جی نایک ذرہ،ایک گمنام ہندو دکنی شاعری کا غیر مطبوعہ کلام۔مکتوبہ 1192ھ (معارف ۲۲/۱)

۲۔ کلیات عشق عظیم آبادی،مرزا محمد رفیع سودا کے معاصرت شاعر کا غیر مطبوعہ کلام۔(۲۳/۵)

۳۔ اردو کی قدیم و زخیم رزمیہ مثنوی ''خاور نامہ'' از کمال خان رستمی کے برٹش میوزئم میں موجود مخطوطے،مکتوبہ ۱۰۹۷ھ کا تعارف۔(معارف ۲۶/۵)

۴۔ اردو کی اولین منظوم داستان جسے ڈاکٹر جمیل جالبی نے مبسوط مقدمہ کے ساتھ مثنوی ''کدم راو پدم راؤ'' کے عنوان سے مدون و مرتب کیا،اس مثنوی کی دریافت،تفہیم و اشاعت اردو کے حوالے سے دنیائے تحقیق کا ایک اہم واقعہ ہے۔نصیرالدین ہاشمی نے اکتوبر ۱۹۳۲ء کے معارف میں اس مثنوی کے واحد ناقص قلمی نسخے کا تعارف تحریر کیا

۵۔ غلام ہمدانی مصحفی کے دیوان پنجم قلمی کے حوالے سے قاضی عبدالودود کی معلوماتی تحریر۔معارف (۴۰/۱)

۶۔ معروف دکنی شاعر میراں ہاشمی کی اہم مثنوی ''احسن القصہ''،قلمی،پر مضمون۔(معارف ۴۲/۶)

۷۔ حبیب گنج میں موجود قلمی دیوان خاکی کا تعارف ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کے قلم سے اولا معارف میں شائع ہوا ہے۔معارف (۴۹/۳)

۸۔ میر حسن کی غیر مطبوعہ مثنوی ''رموز العارفین'' کا تعارف۔(معارف ۵۲/۴)

۹۔ اشرف علی خان فغاں کا قلمی دیوان۔(معارف ۶۱/۱)

۱۰۔ فارسی اور دکنی منظومات پر مشتمل قلمی بیاض،ارگجہ،کا تعارف (معارف ۶۴/۵)

۱۱۔ شیخ داود ضعیفی دکنی کی تصنیف، نصیحت مدن، یا نقل نامہ (معارف ۳/۱۷)

۱۲۔ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود عبدالمحمد ترین کی قلمی مثنوی، شمائل النبی (معارف ۱۲۲/۳)

۱۳۔ قدیم دکنی مثنوی ''احوال قادر ولی عرف میراں شاہ کا جائزہ''۔ (معارف ۲،۳،۴/۱۴۷)

۱۴۔ دکنی شاعر عالم مسکین کی مثنوی ''بفات نامہ حیات النبیؐ''، قلمی۔ (معارف ۱۵۱/۱)

۱۵۔ مدراس کے شاعر مستقیم جنگ نامی کی مثنویاں۔ ''نہارستان عشق، سلیمان نامہ، گنج قدرت اور وفات نبیؐ'' (معارف ۱۵۸/۳)

۱۶۔ سید محمد موسوی صفوی دہلوی عرب موب الدولہ کا مرتبہ کشکول ''مرغب دل''، قلمی۔ (معارف ۱۵۴/۱)

۱۷۔ مولانا الطاف حسین حالی کی غیر مطبوعہ خود نوشت سوانح عمری۔ (معارف ۱۹/۵)

۱۸۔ محمد حسین آزاد اور مولانا شبلی نعمانی کی دو نادر تحریریں۔ (معارف ۸۹/۶)

۱۹۔ ''خوب ترنگ'' اور ''امواج خوبی'' کے مصنف شاہ محمد (1614ء) سے متعلق چار اہم مقالات۔ (معارف فروری، اپریل، ستمبر 1931ء)

۲۰۔ غلام ہمدانی مصحفی کے سال وفات سے متعلق قاضی عبدالودود کی اہم تحریر۔ (معارف ۴۰/۴)

۲۱۔ مرزا مظہر جان جاناں کے حوالے سے اہم مضامین خصوصا ''مرزا مظہر جان جاناں کا سال وفات'' (معارف ۷۰/۶)

۲۲۔ غالب و مومن کے ہم عصر میر حسن تسکین پر عابد رضا خاں بیدار کا تحقیقی مقالہ۔ (۱/۱۷)

۲۳۔ فتح یاب علی اخگر شاگرد غالب کے والد مظفر خاں گرم رام پوری کے حوالہ سے محمد علی خاں اثر کی تحریر (معارف ۴/۱۷)

۲۴۔ خواجہ حیدر علی آتش کی حیات سے متعلق ایک اہم ماخذ قلمی روزنامچہ نجات حسین خاں عظیم آبادی کا تعارف (معارف ۸۳/۵)

۲۵۔ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد طالب علی خان عیشی کے حالات کی تحقیق (۸۵/۴)

۲۶۔ شاہ نصیر اور غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد، کرامت علی خان شہیدی (1840) کے حوالے سے تحقیق۔ (معارف ۹۳/۱)

۲۷۔ روہیل کھنڈ کے نواب حافظ رحمت خاں کے فرزند، نواب محبت خاں محبت (1809) کی زندگی اور شاعری پر مقالہ۔ (معارف ۵،۹۳/۶)

۲۸۔ تلمیذ مصحفی، شیخ علی بخش بیمار (1856) کی حیات کے اہم گوشے۔ (معارف ۹۸/۶)

۲۹۔ اردو کے اولین اخبار ''جام جہاں نما'' سے متعلق تین مقالات کی اشاعت۔ (معارف ۱،۴/ ۶۷)

۳۰۔ اردو شہ پارے، مولفہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی فروگذاشتوں پر مشتمل نہایت معلوماتی مقالہ، ڈاکٹر نذیر احمد کی قلم سے۔ (معارف ۵،۶/ ۶۹)

۳۱۔ عبدالرزاق قریشی کے قلم سے اردو کے چند ابتدائی ساقی ناموں کا تذکرہ۔ (۱۰۱/۲)

۳۲۔ مرزا محمد رفیع سودا اور مرزا فاخر مکیں کی معرکہ آرائی کے بارے میں چند تاریخی دست آویزات کے حوالے سے اہم انکشافات۔ ۱۳۱/۲)

۳۳۔ بھوپال کے کتب خانہ حمیدیہ میں دیوان غالب کے ایک اہم قلمی نسخے کی اطلاع جو بعد میں نسخہ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا۔ (شذرات، معارف ۳/ ۳)

۳۴۔ ''دستور العمل اودھ'' کی روشنی میں غالب کے مذہبی عقائد پر دست آویزی تحقیق۔ (معارف ۴، ۹/۵)

۳۵۔ غالب کے ایک منظوم مکتوب اور نواب علاء الدین خاں علائی والی لوہار کی طرف سے منظوم جواب کی اشاعت۔ (معارف ۱۰/۶)

۳۶۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے کتب خانہ حبیب گنج (علی گڑھ) میں موجود غالب سے متعلق ایک دست آویز (مکتوب، 1815,1816) کی تحقیق۔ (معارف ۱۷/۵)

۳۷۔ غالب وصہبائی کے دو خطوط بہ نام شمس العلماء مولوی ضیاالدین خاں کی اشاعت۔ (معارف ۱۹/۳)

۳۸۔ کتب خانہ ممبئی یونیورسٹی میں موجود تذکرہ مخزن الشعراء قلمی کے حاشیے پر درج تحریر کی اشاعت۔ (معارف ۲۹/۳)

۳۹۔ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے دوران بہادر شاہ ظفر کی شہنشاہی کے اعلان پر غالب کی طرف سے سکۂ شعر۔ اس اہم موضوع پر خواجہ احمد فاروقی اور مالک رام کے دو دو مقالے معارف کی زینت بنے۔ (معارف ۸۲/۵۔ ۲، ۳۸/۵۔ ۱، ۲، ۸۴/۲)

۴۰۔ الیگزینڈر ہیدر لے آزاد (ALEXANDER HEATHERLY AZAD) فرانسیسی نژاد شاگرد غالب کی حیات اور کلام پر ایک معلوماتی مقالہ (معارف ۹/۱)

۴۱۔ بریلوی میں غالب کے چھ شاگردوں کے احوال (معارف ۱۰۳/۲)

۴۲۔ کتب خانہ ندوۃ العلماء میں موجود، مصحفی کے تذکرہ الشعراء معروف بہ تذکرۂ ہند (قلمی) کا اولین تعارف۔ (معارف ۱۲/۲)

۴۳۔ قلمی ''تذکرہ مخزن الغرائب'' از ملا احمد علی ہاشمی سندیلوی سے انشاء اللہ خان انشاء کے حالات کی تحقیق۔

(معارف۳/۱۳۱)

۴۴۔ قلمی ''تذکرہ ریختہ گویاں'' (مکتوبہ ۱۱۷۳ھ) پر مقالہ۔(معارف۲/۲۱)

۴۵۔ ''تذکرہ گل عجائب''مملوکہ کتب خانہ آصفیہ کا تعارف۔(معارف۲/۷۵)

۴۶۔ جارج فانتوم متخلص بہ صاحب کے مرتبہ تذکرۂ شعراء رام پور کا اولین تعارف۔(معارف۱/۵۷)

۴۷۔ قلمی ''تذکرۂ نشترعشق'' نسخہ ڈھاکا کے حوالے سے ریختہ گو شعراء کے احوال کی تحقیق (معارف۲/۷۳)

مذکورہ مقالات سے ماہنامہ معارف کی تحقیقی خدمات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ان مقالات کے علاوہ شعبہ معارف میں اردو تحقیق کا ایک بڑا خزانہ ہے۔ماہنامہ معارف کی تحقیقی خدمات کے عنوان سے باضابطہ ایک باب قائم کیا گیا ہے جس میں تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔معارف کا اجرا 1916 میں ہوا جب اردو میں تحقیق کا باضابطہ رواج نہیں تھا اس کے اصول وضوابط نہیں مرتب ہوئے تھے۔اردو میں پہلی سندی تحقیق 1940 کے بعد ملتی ہے۔ابتدا میں یہی رسائل اردو میں تحقیق کا واحد ذریعہ تھے۔بے شمار ایسے مخطوطات،قدیم کتابیں اور شعرا کے دواوین ہیں جن کی بازیافت انہیں رسائل بطور خاص ماہنامہ معارف سے ہوئی ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

1۔ علامہ شبلی نعمانی، سفرنامہ روم ومصر وشام، ص126

2۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، آثار شبلی، ص283

3۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص36,37

4۔ ماہنامہ معارف، ستمبر 1916ص3،9

5۔ الندوہ مارچ، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ 1910

6۔ الندوہ، مئی، ص10، 13 دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ 1910

7۔ الندوہ اگست، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ 1910

8۔ سید سلیمان ندوی، مکاتیب شبلی جلد اول، ، ص236،

9۔ الہلال، کلکتہ، 11 فروری 1914

10۔ سید سلیمان ندوی، مکاتیب شبلی جلد دوم، ص108، 109

11۔ سید سلیمان ندوی، مکاتیب شبلی جلد اول، ، ص199

12۔ ایضا، ص200

13۔ ایضا، ص200

14۔ سید سلیمان ندوی، مکاتیب شبلی جلد دوم، ص109

15۔ ایضا، ص110

16۔ ایضا، ص118

17۔ ایضا، ص101

18۔ ایضا، ص101

19۔ ایضا، ص47

20۔ ایضا، ص135

21۔ سید سلیمان ندوی, حیات شبلی، ص698

22۔ سید سلیمان ندوی, مکاتیب شبلی، ص289

23۔ سید سلیمان ندوی, حیات شبلی، ص724

24۔ ڈاکٹر شباب الدین, دارالمصنفین کی ادبی خدمات کا تعارف 1980 تک، ص38
25۔ شاہ معین الدین احمد ندوی, حیات سلیمان، ص86
26۔ تعارف: دارالمصنفین اعظم گڑھ، ص12
27۔ ایضا، ص12
28۔ ایضا، ص19 تا 28
29۔ کلیم صفات اصلاحی، دارالمصنفین کے سو سال، ص9
30۔ تعارف دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ص32
31۔ سید سلیمان ندوی, مشاہیر کے خطوط، ص177
32۔ فہرست کتب، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ص2
33۔ شذرات معارف اکتوبر 1916
34۔ کلیم صفات اصلاحی, دارالمصنفین کے سو سال، ص17، 18
35۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی, اقبال اور دبستان شبلی، ص34
36۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، ص730
37۔ ماہنامہ معارف، مئی 2017 ص347
38۔ ماہنامہ معارف، مارچ، 2016 ص162
39۔ شائستہ خان، ماہنامہ معارف کا اشاریہ 1916۔1970، ص4
40۔ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی, علامہ سید سلیمان ندوی: شخصیت اور ادبی خدمات، ص365
41۔ شذرات معارف، جولائی، 1916
42۔ شذرات معارف، جنوری، 1917
43۔ شذرات معارف، جنوری، 1926
44۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، حصہ اول، ص80
45۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری، مکاتیب ابوالکلام آزاد، ص327
46۔ محمد سرور، خطوط محمد علی جوہر، ص66
47۔ عبدالمجید سالک، رسالہ ماہ نور کراچی، جنوری 1954 ص25
48۔ شذرات معارف، اپریل، 1923

49۔ کلیم صفات اصلاحی، معارف کی کہانی مدیران معارف کی زبانی، ص16

50۔ ایضاً، ص32

51۔ ڈاکٹر حمید اللہ، دارالمصنفین کی علمی خدمات، ص111

52۔ ڈاکٹر برہان الدین، معارف نامہ، ص75

53۔ شذرات معارف، اپریل1917

54۔ شذرات معارف مئی 1922 ص2

55۔ شاہ معین الدین احمد ندوی, حیات سلیمان، ، ص23

56۔ شذرات معارف دسمبر1953

57۔ مشاہر کے خطوط، بنام سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ص98

58۔ شذرات معارف، جون1919 ص263، 264

59۔ ماہنامہ معارف، اپریل1951 ص243

60۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنفین کی تاریخی خدمات، ص248

61۔ شذرات معارف، جنوری، 1975 ص2، 3

62۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، یار عزیز، ص66

63۔ مولانا ابوالحسن ندوی، پرانے چراغ، حصہ سوم، ص198

64۔ شذرات معارف، دسمبر 1987 ص402، 408

65۔ معارف ستمبر 1979 ص163

66۔ شذرات معارف، مارچ2008 ص162، 164

67۔ معارف، جولائی2010 ص4

68۔ معارف مئی، 2017 ص354

69۔ شذرات معارف، جون1943

70۔ ماہنامہ معارف جون1943 ص403

71۔ ماہنامہ معارف، اکتوبر1931 ص246

باب دوم

اردو رسائل و جرائد کی تاریخ

۱۔ ابتدائی نقوش

۲۔ چھاپہ خانہ اور مطبوعہ صحافت

۳۔ اردو صحافت کا ابتدائی زمانہ

۴۔ ادبی صحافت کے روشن نقوش

۵۔ بیسویں صدی کے ادبی رسائل

ابتدائی نقوش

ترسیل وابلاغ انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے۔اپنے ہم جنسوں کے احوال سے باخبر رہنا انسانی جبلت ہے۔یہی انسانی فطرت اور جذبہ اسے اپنے گردہونے والے واقعات وحادثات سے آگہی کے لیے بے چین رکھتا ہے۔اللہ نے انسان کوقوت گویائی دے کر دیگر حیوانوں سے ممتاز کیا۔انسان بالمقابل دوسرے حیوانوں کے زیادہ حساس ہوتا ہے۔اپنے احساسات وجذبات کودوسروں تک بخوبی پہنچا سکتا ہے۔تاریخ بتاتی ہے کہ انسانی وجود سے ہی زمین پرخبررسانی کےنقوش ملنےشروع ہوگئے تھے۔عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

''آج تک انسان کا یہی جذبہ رہا کہ وہ اپنے ہم جنسوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرے۔تجارتی قافلوں کے سفر نےتجسس کا جذبہ تیز کیااور جب زماں ومکاں کی قیودٹوٹنے لگیں توجدیداخبارنویسی نے جنم لیااوراس کی کوکھ سے ریڈیواور ٹیلی ویژن پیدا ہوئے جوچشم زدن میں دنیامیں کی ایک کونے سے خبر دوسرے کونے تک پہنچادیتے ہیں۔'' 1ؔ

اخبارنویسی اورفن صحافت چھاپہ خانوں کی دین ہے۔لیکن خبررسانی کا آغاز انسان کی تمدنی زندگی کے ساتھ ہو گیا تھا۔خبررسانی کو ہر زمانے میں اہمیت حاصل رہی ہے۔ابتدا میں اس کام کے لیے کبوتروں، تیز رفتار گھوڑوں اور مخبروں کا استعمال ہوتا تھا۔خبررسانی کا فریضہ مسافر،سیاح اور تاجروں کے قافلے انجام دیا کرتے تھے۔قلم وکاغذاور رسم الخط کی دریافت سے قبل اطلاعات اورمعلومات کا یہ تبادلہ سینہ بہ سینہ ہوا کرتا تھا۔وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اس میں ترقی ہوتی گئی۔قدیم زمانے میں آمدرفت کے وسائل کم تھے۔اس زمانے میں عموماً سفر طویل اورصبر آزما ہوتے تھے۔پھربھی لوگ حالات کی آگہی اور ذوق تجسس کی تسکین کے لیے سفر پرنکل جاتے تھے۔یہی مسافر دور دراز ملکوں کے ابتدائی خبررساں ہوتے تھے۔

قدیم زمانے میں حکومت کا نظام چلانے کے لئے جاسوس،مخبراورخبرنویس ہی بنیادی ذرائع تھے جو بادشاہ کو عوام الناس اوراس کے ماتحت علاقوں کی خبریں پہنچاتے تھے۔حکومت کے خلاف شازسوں سے بھی یہی باخبر کرتے رہتے تھے۔حکومت کے فرامین اور ہدایتیں عوام الناس تک پہنچانے کے لیےصحیفہ نگاروں کا طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ اس قسم کے فرامیں عام گزرگاہوں اورعبادت خانوں پر لٹکا دئے جاتے تھے۔لوگ اس مقام سے گزرتے ہوئے فرامین اپنے ساتھ لے جاتے اوردوسروں تک پہنچاتے تھے۔مصر میں اس قسم کے اشتہارات کی تصویروں کی شکل میں عبادت خانوں،خانقاہوں کے دروازوں پرکندہ کیے جاتے تھے۔رومی حکمرانوں نے بھی اسی طریقے کو کثرت سے استعمال کیا۔اسی طرح عراق میں حمورابی اور ہندوستان میں اشوک نے خبروں کی ترسیل کے لیے کتبے بنوائے اوران پراپنے احکامات نقش کرائے۔

قدیم زمانے میں خبررسانی کے وسائل کم تھے۔خبریں ایک کان سے دوسرے کان،ایک شہر سے دوسرے شہر

پہنچتی تھی جس سے زیادہ تر خبروں کا مفہوم بدل جاتا تھا اور اس کی صداقت متاثر ہو جاتی تھی۔ چنانچہ زبانی کے بجائے تحریری شکل کو عمل میں لانے کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے لئے اخباری خطوط (News Letters) کا طریقہ عمل میں لایا گیا۔ سب سے پہلے روم میں اس قسم کے اخبارات عام گزرگاہوں اور مشہور مقامات پر معلق کئے گئے۔ 2 انہیں ایکٹا ڈائی ارنا (Acta Diarna) کہا جاتا تھا۔ چین میں بھی نشریات کے اس طور کو استعمال میں لایا گیا۔ انہیں پاؤ (PAO) یا رپورٹ کہا جاتا تھا۔ غالباً اس کے بعد ہی بہت سے ممالک نے اسے اپنایا۔ یہ الگ الگ ناموں سے جانا جاتا رہا۔

پیارے نبی ﷺ نے مختلف بادشاہوں کو دین کی دعوت دینے کے لیے خطوط لکھے۔ صحابہ کرام نے ان خطوط کو پہنچایا۔ ان خطوط میں اسلامی تعلیمات دین حق کے بارے میں لکھا گیا تھا اور انہیں دین کی دعوت بھی دی گئی تھی۔ آپ کے بعد خلفاء راشدین نے بھی اس طریقہ کو اختیار کیا اور اس طرح حضرت معاویہ کے زمانے میں ڈاک نظام (البرید) کا آغاز ہوا۔ اس زمانے میں گھوڑوں کی مدد سے مکتوبات کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچایا جاتا تھا۔ اس کے لیے ایک خاص طرح کا نظام وضع کیا گیا تھا اور اس کے تحت چوکیاں قائم کی گئیں تھیں۔

ہندوستان میں چندر گپت موریہ نے خفیہ معلومات جمع کرنے کے لیے مکتوب کا سلسلہ شروع کیا۔ موریہ کے عہد میں جاسوسی کرنے کا یہ نظام کوٹلیہ نے وضع کیا تھا۔ جو موریہ کا وزیر اعظم تھا۔ قدیم ہندوستان میں خبر رسانی کے نظام کے بارے میں منو کی منوسمرتی سے پتا چلتا ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ منو نے حکومت کا نظام چلانے کے لیے محکمہ اطلاعات قائم کیا تھا۔ جس میں دو محکمے ہوتے تھے ایک داخلہ دوسرا خارجہ۔ خارجہ امور کے شعبہ کے لئے ایک ایسا سفیر مقرر کیا جاتا تھا جو نہ صرف عالم فاضل ہوتا بلکہ صاحب فہم و فراست بھی ہو۔ اس منصب کے لیے ایک اہتمام یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ اعلی ذات کا فرد ہو۔ منو کی حکمرانی کے اکثر علاقے گاوں پر مشتمل تھے اور ہر گاوں کا ایک چودھری ہوتا تھا۔ اس لیے ان کو یہ ہدایت تھی کہ ایک گاوں کا چودھری دس گاوں اور دس گاوں کا چودھری بیس گاوں کے چودھری کو اسی ترتیب سے گاوں کے چودھریوں کو اطلاعات پہنچانی ہوتی تھی۔ اس طرح خبریں باسانی رعایا سے اٹھ کر درجہ بہ درجہ مراحل طے کرتے ہوئے سلطنت کے حکمرانوں تک پہنچتی تھی۔ خبروں کی تصدیق کے لیے مخبر معین تھے۔ خبر جھوٹ ہونے کی صورت میں مخبروں کو سخت سے سخت سزا بھی دی جاتی تھی۔ 3

ہندوستان میں اطلاعات کی معلومات کے علم کا دوسرا ذریعہ کوٹیلہ کی کتاب ارتھ شاستر ہے جس کی اشاعت ۳۰۰ ق م ہوئی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کہ اس عہد میں خبروں کے حصول کے لئے باضابطہ محکمہ خبر رساں قائم تھا۔ ایک ہی خبر تین مختلف ذرائع سے حاصل کی جاتی تھی، جس کا آپس میں تقابل کر کے صداقت کا اندازا لگایا جاتا تھا۔ اگر خبر غلط ثابت ہوتی تو مخبروں کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ اس زمانے میں مخبر جوگیوں، فقیروں

،سادھوؤں، بدمعاشوں اور طالب علموں کے بھیس میں کام کرتے تھے۔ تاکہ سامنے والے کو ذرا بھی شک نہ ہو۔ ارتھ شاستر سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جاسوسی اور مخبری کے لیے یتیموں، لاوارثوں، سرمنڈی عورتیں، ناچنے گانے والی عورتیں، اور طوائفوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ جو صرف عوام ہی نہیں بلکہ شاہی افسروں پر بھی کڑی نظر رکھتی تھیں۔ 4؎

مہاراجہ اشوک کے عہد (۲۵۰ ق م) میں اطلاعات کی فراہمی کے باضابطہ محکمے قائم تھے۔ محکمے کے نامہ نگاروں کو پلسانی جاسوس کہا جاتا تھا۔ پلسانی فاحشہ عورتوں سے جاسوسی کا کام لیتے تھے۔ یہ خفیہ رسم الخط میں خبریں لکھتے اور تربیت یافتہ کبوتروں کے ذریعے منزل مقصود تک پہنچاتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی خبر رسانی کے مختلف ذرائع تھے۔ مثلاً زبانی، ذاتی دستاویز، عام گزرگاہوں پر دستاویز چسپاں کیا جاتا اکثر صورتوں میں کتبوں پر شاہی فرامین کندہ کیے جاتے، اشوک کے عہد میں پتھروں پر لکھے کتبوں کا استعمال کثرت سے کیا گیا۔ پھر پتھروں کی جگہ تانبوں کی چادروں کا استعمال ہونے لگا۔

سلاطین دہلی نے حضرت امیر معاویہؓ کے ایجاد کردہ البرید کا نظام ہندوستان میں متعارف کرایا۔ برید کو لے جانے کے لیے برق رفتار گھوڑے رکھے جاتے تھے جو خطوط کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچاتے تھے۔ ہندوستان میں البرید کا استعمال سب سے پہلے خاندان غزنوی نے ۹۹۶ء میں کیا تھا۔ بعد میں جسے سلطان غیاث الدین بلبن نے غیر معمولی ترقی دی۔ البرید صرف خطوط ہی نہیں بلکہ خبر رسانی کا بہت بڑا ذریعہ تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے حکومت کو مستحکم رکھنے میں اس سے بڑا کام لیا اور اس نظام کو ایک نئی زندگی بخشی۔ تاریخ فیروز شاہی میں ضیاالدین برنی لکھتا ہے:

> ''سلطان بلبن عدل گستری کا خاص اہتمام کرتا تھا۔ اس کے عہد میں مملکت کے ولایات واقطاعات میں صرف معتبر بریدوں کا تقرر ہوتا۔ بڑوے شہروں، مشہور خطوں اور دور دراز علاقوں میں خود اپنے پاس سے برید مقرر کر کے بھیجتا جب تک وہ کسی شخص کے متعلق یہ جان نہ لیتا کہ وہ سچا اور ایمان دار ہے وہ کسی بڑی جگہ کا اس کو برید مقرر نہ کرتا۔ اگر کسی برید کی غلط کاری کا اس کو علم ہوجاتا تو اس کو نظر انداز نہ کرتا اور انصاف کرتے وقت کسی کی رعایت نہ کرتا۔ چناچہ اس کی سلطنت کے کسی حصہ میں بریدوں کے ڈر سے مقطعوں، والیوں، کارکنوں اور عاملوں یا ان کے بیٹوں، مقربوں اور غلاموں کو یہ جرأت نہ ہوتی کہ بے قصور اور بے وجہ کسی کو دکھ پہنچائیں۔'' 5؎

اطلاعات کا یہ نظام غزنوی سے غوری میں منتقل ہوا۔ خاندان غوری نے اس نظام کو مزید وسعت دی۔ انہوں اخبار نویس کا مستقل ایک محکمہ قائم رکھا۔ جو سلطنت کو مستحکم بنانے میں کافی کارآمد رہا۔ خلجی خاندان میں سلطان علاؤالدین خلجی نے برید کے نظام کو مزید ترقی دی۔ انہوں نے حالات سے باخبر رہنے کے لئے ڈاک چوکیاں بنوائیں

جس سے خبروں کے حصول یابی میں مزید ترقی ہوئی:

''سلطان کا قاعدہ تھا کہ جب دہلی سے کہیں لشکر روانہ کرتا تو تلپت سے جو پہلی منزل پر واقع تھا، اس جگہ تک جہاں لشکر جاتا، جہاں جہاں تھانے چوکیاں قائم کرنا ممکن ہوتا وہ قائم کر دیتا۔ ہر منزل پر الاغ (وہ ڈاک جو گھوڑوں سے بھیجی جاتی تھی) کے گھوڑے بندھوا دیے جاتے اور تمام راستے پر آدھا کوس یا کوس کے ایک چھوٹے حصے پر دھاوے (دس افراد کا دستہ جو ڈاک لے کر دوڑتا ہوا اگلی منزل تک پہنچتا تھا) قائم کر دئے جاتے۔ راستے پر جن قصبوں اور گاؤں میں الاغ کے گھوڑے باندھے جاتے تھے، وہاں عہدہ دار اور کیفیت نویس بھی متعین کر دیے جاتے۔ ہر روز یا دوسرے روز یا تیسرے روز یہاں اطلاع آجاتی کی لشکر کیا کر رہا ہے۔ اس کی خبر سلطان کو پہنچا دی جاتی اور اس طرح سلطان کی اطلاع لشکر کو پہنچا دی جاتی تھی۔ اس انتظام کی وجہ سے نہ تو شہر میں کوئی غلط خبر مشہور ہو سکتی تھی اور نہ لشکر میں شہر کے متعلق کوئی افواہ اڑائی جا سکتی تھی۔ بادشاہ اور لشکر کی سلامتی کی خبر ملتی رہنے سے بہت فائدہ ہوتا تھا۔'' 6

محمد بن تغلق نے جب سلطنت کا بار سنبھالا تو اس نے بھی اس نظام کو برقرار رکھا بلکہ خبر رسانی کے نظام کو تیر رفتار بنانے کے لیے اس کی طرف خاص توجہ دی۔ محمد بن تغلق کے زمانے میں خبر موصول ہونے کے دو ذرائع تھے۔ ایک گھڑ سوار اور دوسرے ہرکارے۔ گھوڑ سواری میں ہر چار کروہ مسافت پر گھوڑے بدلے جاتے تھے جبکہ ہرکاروں کے لئے ہر چوتھائی کروہ مسافت پر ایک اڈہ ہوتا تھا۔ ہر اڈے پر تین چھپرے ہوتے تھے جن میں پہلے سے ہی آدمی تیار بیٹھے ہوتے تھے جو خط پاتے ہی دوسری چوکی کی طرف تیزی سے دوڑ جاتے تھے۔ ہر دوڑنے والے ہرکارے کے پاس ایک لاٹھی ہوتی تھی جس میں گھنگھرو بندھا ہوتا تھا۔ جس کی آواز اس بات کی علامت تھی کی کوئی ہرکارہ آرہا ہے۔

سوری خاندان کے بانی شیر شاہ سوری نے بھی اس نظام کو قائم رکھا بلکہ شیر شاہ سوری نے ڈاک کے نظام میں تاریخی کردار ادا کیا۔ اس نے اس نظام میں تیزی لانے کے لئے طویل سڑکیں بنوائیں اور ہر سڑک کے کنارے سرائے تعمیر کیے جس میں ڈاک چوکی کا اسٹیشن بھی قائم کیا۔ ہر سرائے میں خطوط کو لے جانے کے لئے ہمہ وقت تیز رفتار گھوڑے تیار رہتے تھے۔ اور اس طریقے سے کسی بھی خبر کو باسانی ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچایا جاتا تھا۔

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی کا تخت سنبھالا تو اس نے بھی خبروں کو جمع کرنے کے لیے باضابطہ عملہ مقرر کیا بلکہ خبر رسانی کے شعبہ میں بیش بہا اضافہ کیے۔ اس نے اس نظام میں تیزی لانے کے لیے دہلی سے کابل تک گھوڑوں کی ڈاک کا سلسلہ بھی قائم کیا۔ جلال الدین محمد اکبر پہلا مغل حکمراں تھا جس نے سلطنت کے بہتر انتظام کے لیے محکمہ خبر رسانی میں انقلابی تبدیلیاں کی۔ اکبر نے واقعات کو قلمبند کرنے اور محفوظ کرنے کے لیے چار قسم کے افراد مقرر کیے تھے۔ ۱۔ تنکچی ۲۔ واقعہ نویسی ۳۔ خوش نویسی ۴۔ تعلقہ نویسی۔ تنکچی اور

واقعہ نویس کا کام واقعات کو تحریر کرنا تھا۔انہیں اس دور کا شاہی رپوٹر کہا جا سکتا ہے۔جبکہ خوش نویس اور تعلقہ نویس کی ذمہ داری یہ تھی کہ ان روزنامچوں کو نفاست کے ساتھ نقل کریں اور اس کی تلخیص کریں۔اکبر نے چودہ جفاکش، دیانت دار اور تجربہ کار تبکچی مقرر کیے تھے۔جن میں سے دو دو افراد باری باری اپنی ذمہ داری انجام دیتے تھے۔یہ افراد بادشاہ کی جملہ مصروفیات اور مشاغل کے ساتھ ساتھ رعایہ کے حالات ،افواج کے حالات،محاصل کی کمی زیادتی،خرید وفروخت ،جنگ وصلح،معاہدات،سال کی فصلوں کی کیفیت ،غرض حکومت سے متعلق ہر کارروائی کو محفوظ کرتے تھے۔اکبر کے زمانے میں چار ہزار ہرکارے مقرر تھے۔ہر پانچ میل کی مسافت پر ڈاک چوکیاں تھیں اور ہر چوکی میں ڈاک لے جانے والے گھوڑے معمور تھے۔اس زمانے میں عام ڈاک پیادہ ہرکاروں کے ذریعے سات سو میں کا فاصلہ دس دن میں کرتے تھے۔اسی طرح شاہی ڈاک پانچ دن میں پہنچائی جاتی تھی جو موجودہ عہد کے ڈاک نظام سے موازنہ کریں تو اندازا ہوتا ہے کہ اس زمانے کا نظام آج کے نظام سے کم نہیں تھا۔اکبر کے عہد میں محکمہ ڈاک ،محکمہ سراغ رسانی اور ان شعبوں میں کام کرنے والے تمام افراد ایک بڑے افسر کے ماتحت ہوتے تھے۔جسے دروغہ ڈاک چوکی کہا جاتا تھا۔

شہنشاہ اکبر کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے اس نظام کو مزید ترقی دی۔اس کے عہد میں پہلی بار واقعہ نویسوں کے لکھے ہوئے واقعات اخبار کہلانے لگے۔ان کے عہد میں خبروں کے جمع کرنے کے لیے چار قسم کے افراد متعین تھے۔

۱۔ وقائع نویس

۲۔ سوانح نگار

۳۔ خفیہ نویس

۴۔ ہرکارہ

یہ افراد داروغہ ڈاک کے ماتحت ہوتے تھے۔اور اپنے مراسلات تحریری شکل میں ارسال کردیا کرتے تھے۔پھر داروغہ ڈاک ان مراسلات کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کردیا کرتا تھا۔اخبار نویسوں کی ذمہ داریاں مخصوص اور واضح تھیں۔وقائع نویس کا کام پابندی سے واقعات کی اطلاع فراہم کرنا تھا۔جبکہ سوانح نگار کا کام خاص اور اہم واقعات کی اطلاع دینا تھا۔اور خفیہ نویس کا کام جاسوسی کرنا تھا۔اور ہرکاروں کو معمول کے مطابق زبانی خبروں کو پہنچانا تھا۔یہ تمام اخبار نویس چوبیس گھنٹوں میں دو مرتبہ مراسلات بھیجتے تھے۔دن بھر کی رپورٹ شام اور شام کی رپورٹ صبح کو بھیج دی جاتی تھی۔اخبار نویسوں کی نگرانی سختی سے کی جاتی تھی اور خبر کے غلط ہونے پر سخت سے سخت سزا دی جاتی تھی۔عہد مغلیہ میں وقائع نگاری کے علاوہ روزنامچوں کی روایت کو بھی مستحکم کیا گیا۔دور دراز علاقوں کے راجہ مہاراجہ

اپنے اپنے روزنامچے شاہی دربار میں برابر بھیجتے رہتے تھے۔خبروں کے محکمہ کی نگرانی بادشاہ خود کرتے تھے۔ ہمیشہ بااعتماد افراد کو ہی اس محکمہ میں رکھا جاتا تھا۔سلاطین دہلی کے دور حکومت میں محکمہ برید نے ملک کے نظام کو چلانے کے لیے غیر معمولی کارنامے انجام دیے۔ ہر بادشاہ نے اپنی ضرورت کے مطابق اس نظام میں تبدیلیاں کیں مگر مرکزی نظام ہر سلطنت میں یکساں رہا۔مختصریوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک قسم کی خبرایجنیسیاں تھیں جو بادشاہ کے وزیر کے ماتحت ہوتی تھی۔جو برید ممالک کہلاتا تھا۔اس کے نمائندے ملک کے ہر خطے میں پھیلے ہوتے تھے اور ضروری خبروں سے مطلع کرتے رہتے تھے۔ ہر نمائندہ برید کہلاتا تھا۔ برید کے لیے ایماندار انسان کا انتخاب ہوتا تھا۔اسے حسب معقول تنخواہ بھی دی جاتی تھی تاکہ رشوت کی لالچ سے محفوظ رہے۔ برید کے اختیارات بہت وسیع ہوتے تھے۔ برید کے معاونین مخبر ہوتے تھے۔ جو تمام اہم خبریں ان کو پہنچاتے تھے۔ برید کے دائرہ کار میں حکومت کی سرگرمیاں، علاقے کے عام حالات، سماج کے حالات وغیرہ شامل تھے۔ برید کی خبریں لکھنے کا طریقہ موجودہ طریقوں کی طرح تھا۔ پہلے تمام خبروں کو موضوع کے اعتبار سے تقسیم کر دیا جاتا تھا اور پھر ان کو الگ الگ زمروں مین تقسیم کیا جاتا تھا۔تقسیم بعد ان تمام خبروں کو مرکزی دفتر بھیج دیا جاتا تھا۔ بادشاہ خبروں کے موصول کرنے کے بعد ہر خبر کو متعلقہ محکمے کو سونپ دیتا تھا۔

۱۷۰۷ میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کمزور پڑنے لگی۔مختلف علاقوں کے صوبے داروں نے خودمختاری کا اعلان کر دیا جس سے مغلیہ سلطنت کی عمارت بالکل ہی منہدم ہوگئی۔اور دھیرے دھیرے پورے ہندستان پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوگیا۔انگریزی حکومت کے قیام کے بعد انہوں نے بھی اس نظام کو برقرار رکھا۔ سیاسی ضرورت کے تحت پورے ملک میں اپنے مخبروں اور وقائع نگاروں کو مقرر کیا۔ یہ وقائع نگار اپنے مراسلے انگریز ریذیڈینٹوں کو بھیجتے تھے۔جس کا فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کیا جاتا۔ پھر اس کو انگریزی ریذیڈینٹ اپنے تبصرے کے ساتھ اسے ہیڈکواٹر کلکتہ بھیج دیتے تھے۔

☆☆☆

چھاپہ خانہ اورمطبوعہ صحافت

ہندوستان میں مطبوعہ صحافت پر نظر ڈالنے سے قبل مناسب ہوگا کہ طباعت کی ابتدا پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے۔ چھپائی کا آغاز دنیا میں سب سے پہلے ملک چین میں ہوا۔ کاغذ کی دریافت میں بھی ملک چین کو اولیت حاصل ہے۔ دنیا کی سب سے پہلی مطبوعہ کتاب چین میں منظر عام پر آئی۔ اس سلسلے میں عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

''چین کے صوبہ کانسو میں دنیا کی قدی ترین کتاب دریافت ہوئی ہے۔ اس میں لکھا تھا کہ اس کتاب کو وانگ چی لانے ۱۱ مئی ۸۶۸ کو مفت تقسیم کرنے لیے چھاپا تھا۔ تا کہ اس کے والدین کی یاد کو دوام ہو۔''7

ملک چین کے بعد عربوں نے کاغذ سازی کا فن اور مشینی طباعت کو عمل میں لایا اور کتابوں کی طباعت کا سلسلہ شروع کیا۔ بغداد نے بھی کاغذ بنانے کے فن اور چھاپا خانوں کے فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ وہاں سے یہ فن پندرہویں صدی عیسوی میں یورپ پہنچا اور 1556 میں یہ فن ہندوستان پہنچا۔ ہندوستان میں طباعت کی تاریخ عیسائیت کی تبلیغ سے جڑی ہوئی ہے۔8 ہندوستان میں گوا، مدراس اور بنگال عیسائیت کے خاص مراکز تھے سب سے پہلے ان مراکز پر طباعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہندوستان میں سب سے پہلے گونسالیوس جو ایک ماہر لوہار تھا اس نے 1577 میں تامل زبان کا ٹائپ تیار کیا۔ اس زبان میں پہلی مطبوعہ کتاب 1578 میں شائع ہوئی۔ ممبئ میں فن طباعت کو فروغ دینے کے لیے گجرات کے ایک تاجر بھیم جی پاریکھ نے 1674 میں ایک مطبع قائم کیا۔9 اس پریس کا قیام بھی عیسائیت کو فروغ دینا تھا۔ ممبئ کے بعد ٹرانکور مدراس میں 1712 میں قائم کیا گیا، یہ مطبع انگلستان کی ایک سوسائٹی نے بھیجا تھا۔ ابتدا میں اس میں پرتگالی زبان میں چھپائی کا کام ہوتا تھا لیکن بعد میں دیگر زبانوں میں بھی طباعت کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ طباعت میں تیزی لانے کے لیے 1716 میں کاغذ کا ایک کاخانہ بھی قائم کیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1772 میں بنگال کی حکومت سنبھالی۔ تو وہاں بھی مطبع قائم کیا۔ جس مطبع سے بنگلہ زبان سیکھنے کے لیے بنگلہ زبان کے قواعد کی ایک کتاب 1778 میں چھپی۔

ہندوستان میں مطبوعہ صحافت کا باقاعدہ آغاز اٹھارویں صدی عیسوی میں چھاپا خانوں کی ایجاد کے بعد ہوا۔ سب سے پہلے چین میں 868ء میں چھاپہ خانہ کی بنیاد پڑی۔ جبکہ ہندوستان میں 1550 کے بعد اس کا قیام عمل میں آیا۔ چناچہ بنگال کے شہر کلکتہ میں پہلا مطبع جیمس آگسٹس ہکی نے 1777 میں قائم کیا۔ اس کے علاوہ کمپنی کے ایک محرر چارلس ولکنس نے بنگالی، دیناگری پھر فارسی کے نستعلیق ٹائپ ڈھالے۔10 ٹائپ کے ان حروف اور چھاپہ خانوں کے باوجود ملک میں کوئی اخبار جاری نہ ہوسکا۔ لیکن عیسائیت کے فروغ کے لیے کتابیں برابر شائع کی جاتی رہیں۔ دراصل انگریزی حکومت چاہتی ہی نہیں تھی کی کوئی اخبار نکالا جایے وہ صرف اشتہارات چھاپ کر اپنی سیاست اور کتابوں کی اشاعت سے اپنے مذہب کو پروان چڑھا رہی تھی۔ 1766 میں جب کمپنی کے ایک ناراض

ملازم ولیم بولٹس نے کلکتہ سے اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا جس کے لیے اس نے کلکتہ کونسل ہاؤس اور دیگر مقامات پر اشتہارات چسپاں کیے۔اس نے اعلان کیا کہ وہ ایک ایسے شخص کی تلاش میں ہے جو خبر رسانی کے فن سے واقف ہو اور طباعت کے فن میں دلچسپی رکھتا ہو۔تو حکومت نے ملک میں بدامنی پھیلانے کے جرم میں یورپ چلے جانے کا حکم صادر کر دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1779 چھاپہ خانہ قائم کیا جس کے ایک سال جیمس آگسٹس ہکی نے اپنا اخبار'' ہکی بنگال گزٹ'' جاری کیا اور یوں ہندوستان میں مطبوعہ صحافت کی بنیاد رکھ دی۔جیمس 1772 میں تجارت کی غرض سے ہندوستان آیا۔مگر شومئی قسمت اسے تجارت میں زبردست گھاٹا اٹھانا پڑا۔1776 میں قرض نہ ادا ہونے کی وجہ سے اسے جیل بھی جانا پڑا۔جیل سے رہائی کے بعد اس نے بمشکل ۲۰۰ روپیوں کا بندوبست کر کے ایک چھاپہ خانہ قائم کیا۔ممبئی کے اشتہارات چھاپنے کا اس کو ٹھیکہ مل گیا اور ایک مدت تک اس میدان میں اس کی اجارہ داری رہی۔جب کمپنی نے اپنے اشتہارات اور دیگر کاغذات چھپوانے بند کر دیے تو اس نے ایک اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا۔'' ہکی گزٹ'' چار صفحات پر مشتمل ایک سیاسی اور تجارتی اخبار تھا۔یہ اخبار دو سو کی تعداد میں چھپتا تھا۔جس میں خبریں، اشتہارات، مراسلے،اور شاعروں کے نادر نمونے ہوتے تھے۔ہکی گزٹ نے کمپنی اور اسکی پالیسی، کمپنی کے ملازمین کے احوال،سماج میں ہو رہی بدعنوانیاں پر خوب مراسلے شائع کیے۔جس سے کلکتہ کی سیاسی اور سماجی زندگی میں زبردست انقلاب پیدا ہو گیا۔

ہکی گزٹ کی تقلید میں 1780 میں انڈیا گزٹ جاری ہوا۔یہ اخبار میسنک اور پیٹر ریڈ کی ادارت میں نکلتا تھا۔انڈیا گزٹ تین کالم اور چار صفحات پر مشتمل تھا۔طباعت بہت عمدہ تھی۔انڈیا گزٹ کی پالیسی شروع میں ہکی گزٹ کی طرح تھی جو بعد میں حالات کے مدنظر تبدیل ہوگئی۔اجرا کے وقت ہفت روزہ تھا پھر پندرہ روزہ اور آخر میں روزنامہ بن گیا۔ہکی گزٹ کی طرح اس اخبار کی زبان بھی انگریزی تھی۔۴ مارچ 1784 کو کلکتہ گزٹ منظر عام پر آیا۔جس کے ایڈیٹر فرانسس گلیڈون تھے۔یہ کمپنی کا اخبار تھا اس لیے اس خبار کی پالیسی کمپنی اور حکومت کے مطابق تھی۔اخبار کے متن میں خبروں کے علاوہ مراسلے،نظمیں، سماجی سرگرمیوں کی رودادیں شائع کی جاتی تھیں۔اس اخبار کی زبان بھی عام رواج کے مطابق انگریزی ہی تھی۔

کلکتہ کے بعد مدراس میں صحافت کا آغاز ہوا۔مدراس کا پہلا اخبار 1785 کو''مدراس کوریئر'' رچرڈ جانسٹن کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔جس کے بعد یہ شہر بھی صحافتی سرگرمیوں کا گہوارہ بن گیا۔مدراس کے بعد ممبئی سے مطبوعہ اخبار نکلنا شروع ہو گئے۔ممبئی سے 1790 میں ''ممبئی گزٹ'' کا اجرا ہوا۔اس طرح ممبئی ہندوستان کا تیسرا صحافتی مرکز بن گیا۔غرض یہ کہ کمپنی نے ہندوستان کے جن جن میں شہروں قدم جمایے اور چھاپہ خانہ قائم کئے وہ شہر صحافت کا مرکز بن گیا۔اٹھارہویں صدی کے اختتام تک ہندوستان صحافتی مرکز بن گیا۔جیسے جیسے چھاپہ خانہ کی

سہولیت بڑھتی گئی اخبارات کی یہ فہرست طویل تر ہوتی چلی گئی۔ ڈاکٹر طاہر مسعود کی کتاب ''اردو صحافت انیسویں صدی میں،، سے چند ابتدائی اخبارات کی فہرست یہاں درج کی جاتی ہے۔

۱۔	ہکی گزٹ	کلکتہ	1780	جیمس آگسٹس ہکی
۲۔	انڈیا گزٹ	کلکتہ	1780	بی میسنک
۳۔	کلکتہ گزٹ	کلکتہ	1784	فرانس گلیڈون
۴۔	مدراس کوریئر	کلکتہ	1785	رچرڈ جانسٹن
۵۔	دی بنگال جرنل	کلکتہ	1785	اسٹیفن کیسن / ٹامس جونس
۶۔	کلکتہ کرانیل	کلکتہ	1786	اے اپ جان
۷۔	کلکتہ ایڈورٹائزر	کلکتہ	1787	
۸۔	ایشیاٹک مرر	کلکتہ	1788	چارلس کے برور
۹۔	بمبئی ہیرالڈ	بمبئی	1789	
۱۰۔	بمبئی کوریئر	بمبئی	1790	ڈکلس نکلسن
۱۱۔	بمبئی گزٹ	بمبئی	1790	ڈبلیو ایس کوپر
۱۲۔	کلکتہ سنڈے ریکارڈ	کلکتہ	1790	
۱۳۔	بنگال یونیورسل انٹلی جنسر	کلکتہ	1790	
۱۴۔	کلکتہ جرنل ایڈورٹائزر	کلکتہ	1791	
۱۵۔	دی ورلڈ	کلکتہ	1791	ولیم ڈواں
۱۶۔	دجرنل	کلکتہ	1791	
۱۷۔	دی ٹائمز	کلکتہ	1792	
۱۸۔	فرائیڈے مارننگ پوسٹ	کلکتہ	1792	
۱۹۔	ہرکارو	مدراس	1793	ہیو بوائیڈ
۲۰۔	اورینٹل اسٹار	کلکتہ	1793	ریچرڈ فلیمنگ
۲۱۔	مدراس گزٹ	مدراس	1795	رابرٹ ولیم
۲۲۔	انڈین ہیرالڈ	مدراس	1795	ایس ہیمفرے
۲۳۔	دی بنگال ہرکارو	کلکتہ	1795	ولیم ہنٹر

۲۴۔	انڈین اپولو	کلکتہ	1795	
۲۵۔	کلکتہ ٹیلی گراف	کلکتہ	1796	
۲۶۔	کلکتہ مارننگ پوسٹ	کلکتہ	1798	ارچیبالڈ تھامس
۲۷۔	کلکتہ کوریئر	کلکتہ	1798	ٹامس ہولنگ بیری
۲۸۔	ریلیٹر	کلکتہ	1799	جان ہالول

فارسی مطبوعہ صحافت کی ابتدا انگریزی صحافت کے بعد انیسویں صدی میں مراۃ الاخبار سے ہوئی۔مگر اس سے قبل بھی انگریزی کے بعض اخباروں میں فارسی کے کالم اور متون شامل کیے جاتے تھے۔فرانس گلیڈون پہلا صحافی ہے جس نے 1784 میں اپنے اخبار ''کلکتہ گزٹ''میں ایک کالم فارسی زبان کا شروع کیا۔گلیڈ ون فارسی دانی میں کافی شہرت رکھتا ہے۔اس نے فارسی کی کئی اہم کتابوں کے انگریزی میں ترجمہ بھی کیے تھے۔اس کے علاوہ ''ایشیاٹک مسی لینی''1785، ہندوستان اینٹلی جنسر 1801 جس کے مدیر ٹامس ہولنگ بیری تھے میں فارسی کے مشہور شعرا کے کلام بھی شائع کئے جاتے تھے۔انگریزی صحافت کے علاوہ بنگالی صحافت میں بھی فارسی کالم شائع کیے جاتے تھے۔جن میں بنگال گزٹ، بنگال دت اور سماچار سبھا راجندرا قابل ذکر ہیں۔

فارسی صحافت کی روایت بہت قدیم ہے مگر مطبوعہ فارسی صحافت کی ابتدا راجہ رام موہن رائے کے رسالہ مراۃ الاخبار سے ہوئی۔جو ۲۰/اپریل 1822 کو پہلی بار شائع ہوا۔یہ اخبار برصغر کا پہلا مطبوعہ فارسی اخبار بھی کہا جا سکتا ہے۔فارسی کا دوسرا مطبوعہ اخبار''جام جہاں نما''مئی 1822 ہے۔ابتدائی چھ شمارے اردو زبان میں نکلے جس کے بعد اس کی زبان فارسی کر دی گئی۔اس لیے یہ اردو کا پہلا اخبار بھی ہے۔گویا فارسی اور اردو صحافت تقریباً ایک ساتھ شروع ہوئی۔اس اخبار کے بعد فارسی اخبار کا دور شروع ہوگیا اور کلکتہ فارسی صحافت کا مرکز بن گیا۔کلکتہ سے شائع ہونے والے فارسی اخبارات جن میں شمشم الاخبار، آئینہ سکندری، ماہ عالم افروز،سلطان الاخبار،مہر منیر، گلشن نو بہار، وغیرہ قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ دہلی سے سراج الاخبار، صادق الاخبار اور دیگر اخبارات جاری کیے گئے ۔چونکہ فارسی زبان ہندوستان میں امکانات کے آکری حد پر پہنچ گئی تھی۔لہذا فارسی اخبارات کا اجرا عمل میں جاری تو رہا لیکن اردو صحافت فارسی صحافت پر غالب آ گئی۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ملک میں فارسی زبان کا چلن کم ہور ہا تھا اور اردو زبان بہت تیزی سے پروان چڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

اردو صحافت کا ابتدائی زمانہ

اردو کا صحافت کا آغاز انگریزی کے صحافت کے تقریبا نصف صدی بعد 1822 میں کلکتہ سے ہوا۔اردو صحافت اپنے ابتدائی دور میں ہفت روزہ اور سہ روزہ اخبارات کی شکل میں سامنے آئی البتہ روزنامے کی صورت بعد میں نمایاں ہوئی۔ ہندوستان میں اردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما ہے۔جس کا اجرا27 مارچ 1822 کوعمل میں آیا۔اس اخبار کے مالک ہری دت تھے اور منشی لالہ سدا سکھ اس اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ یہ ہفتہ واری اخبار ہر بدھ کوشائع ہوتا تھا۔جام جہاں نما کے بعد اردو کا پہلا باضابطہ اور شمالی ہند کا پہلا اخبار ''دہلی اردو اخبار'' ہے۔جو 1836 میں جاری ہوا۔11جس کے ایڈیٹر محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر تھے۔اس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں سیاسی اور معاشی خبروں کے علاوہ غالب، ذوق، مومن، بہادر شاہ ظفر وغیرہ کے کلام بھی شائع کیے جاتے تھے۔اس کے علاوہ ادبی مضامین کی اشاعت کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی۔ یہ اردو پہلا اخبار تھا جس نے خوب ترقی کی اور لمبے عرصے تک نکلتا رہا۔ستمبر 1857 میں بند کردیا گیا۔اس اخبار کی اشاعت سے اردو صحافت کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔صحافت کا یہ سلسلہ کلکتہ اور دہلی سے نکل کر دکن، گجرات، پنجاب، ممبئی، غرض پورے ملک سے اردو اخبارات نکلنے لگے۔جن میں سید الاخبار، قرأن السعدین، فوائد الناظرین، صدر الاخبار، کوہ نور، نور البصار، آفتاب ہند، علی گڑھ انسی ٹیوٹ گزٹ، نصرت الاخبار، نجم الاخبار، پیسہ اخبار، دبدبۂ سکندری، آگرہ اخبار، اودھ پنچ، اودھ اخبار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔غرض سیاسی وسماجی، مذہبی اخبار، طنزیہ ومزاحیہ اخبار، تعلیمی اخبار، طبی اخبار، خواتین کے اخبار، پیشہ وارانہ اخبار، تجارتی اخبار اور ذولسانی اخبارات بڑی تعداد میں نکلے اور اب بھی سیکڑوں اخبار نکل رہے ہیں۔ان تمام اخباروں کا اصل مقصد خبروں کی ترسیل تھا۔مگر خبروں کے ساتھ ساتھ شعرا کے کلام اور متعدد موضوعات پر متنوع مضامین شائع کیے جاتے تھے۔دراصل اس وقت اردو میں ادبی جریدے کا تصور نہیں تھا اخبار ہی میں ادبی مضامین شائع کردیے جاتے تھے۔اس کے عالاوہ حالات حاضرہ، سیاسی، سماجی خبروں کے علاوہ ادبی، ثقافتی اور نظریاتی امور سے واقفیت کا ذریعہ تھے۔

☆☆☆

ادبی صحافت کے روشن نقوش

اردو میں اخباری صحافت کے پندرہ سال بعد ادبی صحافت کی ابتدا ہوئی۔قبل اس کے کی ادبی صحافت /رسائل کی تاریخ پر روشنی ڈالی جائے اس بات کا جاننا بے حد ضروری ہے کہ ادبی صحافت کیا ہے؟ صحافت اور ادبی صحافت کے مابین بنیادی فرق کیا ہے؟ ادبی صحافت کی اہمیت کیا ہے؟ ایک متعینہ مدت کے بعد شائع ہونے والے مجموعے کو مجلّہ، رسالہ کہتے ہیں۔ یہ رسالے ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہانہ، سہ ماہی، شش ماہی اور سالانہ بھی ہو سکتے ہیں۔ رسائل کی تعریف کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''رسالہ یا جرید آج کل یہ دونوں لفظ اس اعتبار سے ہم معنی ہیں کہ دونوں سے ہم ایسا اخبار یا کتاب مراد لیتے ہیں جس میں مختلف اصناف پر مبنی تحریریں ہوں اور جو کسی مقررہ وقفے سے نکلتا ہو۔ جریدہ اب ذرا کم سنائی دیتا ہے۔ رسالہ کے اور بھی معنی ہیں۔ مثلاً فوجیوں کا دستہ یا کوئی مختصر کتاب جو ایک ہی موضوع پر ہو۔ جریدہ کے اصل معنی تنہا ہیں۔ چونکہ اخبار یا رسالہ کا بھی ایک ایک شمارہ مقررہ وقت پر نکلتا ہے اس لیے رسالہ سے اخبار کے معنی بھی پیدا ہو گئے۔ جریدہ بہ معنی تنہا اب بہت کم سننے میں آتا ہے۔ صفحہ کے معنی میں اور فوجی دستہ کے معنی میں بھی جریدہ پہلے بولا جاتا تھا۔ اب جریدہ عالم کی ایک ترتیب (غالباً حافظ کے ایک شعر کی وجہ سے) ہی مستعمل نظر آتی ہے۔ اکیلے جریدہ بمعنی صفحہ شاذ ہے اور بمعنی فوجی دستہ بالکل مستعمل نہیں۔''12

مذکورہ اقتباس سے رسالہ کی جو تعریف سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ رسالہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کسی بھی زبان کے متنوع موضوعات پر تحریروں کو مقررہ مدت پر شائع کیا جائے۔ جہاں تک رسالہ اور اخبار میں فرق کا سوال ہے تو اخبار میں خبروں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ حالات حاضرہ پر روشنی ڈالنا اور سے واقف کرانا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس رسائل میں ادبی، سماجی، سیاسی، معاشی، غرض مختلف موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ مضامین اخبارات کی طرح صرف وقتی دلچسپی سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس کا مقصد قاری کو مختلف موضوعات سے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے۔ اخبارات کی اہمیت ایک مدت تک رہتی ہے جبکہ رسائل اردو ادب کا اہم ترین سرمایہ ہیں جن کی ضرورت ہر دور میں محسوس کی جاتی ہے۔ انور سدید اس افتراق کو واضح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''صحافت آج یا اب کو بلا واسطہ اور شعوری انداز میں موضوع بناتی ہے۔ اور اس کا مقصد معروضی ہے۔ ادب میں تینوں زمانے تماشہ گاہ بن جاتے ہیں اور ہر دور کے قاری کو متاثر کرتے ہیں ۔ادب کی اقدار کو دوام حاصل ہے۔ ایک انسان کا تجربہ بنی نوع انسان کا تجربہ بن جاتا ہے اور نہ صرف ایک لطیف و نفیس انبساط پیدا کرتا ہے بلکہ اس سے ذہنی تشنج بھی دور ہو جاتا ہے اور فرد سماج اور سب سے عظیم تخلیق کار خدا کے درمیان ایک مضبوط تعلق پیدا کر دیتا ہے۔ آخری بات یہ کہ ادب فنون لطیفہ میں سے ہے اور اس کا پر اسرار تخلیقی عمل دوسرے لطیف فنون کی طرح ہمیشہ داخلی

آمد کا اور زیرِ سطح تحریک کا محتاج ہوتا ہے۔صحافت کا معیار بلند بھی ہو جائے تو اسے ادب شمار نہیں کیا جاتا لیکن ادب میں اگر پروپیگنڈے کا عنصر شامل ہو جائے تو یہ نہ صرف اپنا ادبی معیار کھو دیتا ہے بلکہ اس قسم کے ادب کو بالعموم صحافت میں بھی شامل کر دیا جاتا ہے۔''[13]

اردو ادب کی خدمات میں اردو رسائل وجرائد کو بہت اہمت حاصل ہے ۔رسائل اپنے عہد کے ادبی رجحانات ومیلانات اوراسی مزاج کے عکاس بھی ہوتے ہیں۔مختلف عہد میں شائع ہونے والے رسائل کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اردو رسائل کی تاریخ تغیر وتبدل کے عمل سے گزری ہے۔اردو زبان وادب کے فروغ میں ادبی رسائل کی افادیت مسلمہ ہے۔رسائل نے ہمیشہ ادب کی ترویج واشاعت کے لئے اہم کردار ادا کیا ہے۔رسائل عوام کی ذہنی سطح بلند کرنے میں بہت مؤثر اور معاون ثابت ہوتے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید''اپنی پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' کے پیش لفظ میں ادبی رسائل کہ اہمیت وافادیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو زبان وادب کے ارتقا میں ادبی رسائل نے ہمیشہ بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ادبی رسالہ عوام کی ذہنی تربیت میں ایک مؤثر اور فعال قوت کے طور پر کام کرتا ہے۔اس کا حلقۂ قرأت جتنا وسیع ہو ادب کا عمل اتنا ہی زود اثر ثابت ہوتا ہے۔ادبی جریدہ کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں ممتاز ادبا کے ساتھ نئے لکھنے والوں کو چھپنے کا موقع ملتا ہے۔کلاسکی روایت کے ساتھ نئی رومانی تحریکات کو فروغ دینے اور پرانی اصناف میں تخلیق کاری کے علاوہ نئے تجربات کو منظرِ عام پر لانے کی کاوش بھی کی جاتی ہے۔ادبی رسالہ بیک وقت مکتب بھی ہے اور مخزن بھی ۔یہ اپنی ایک شخصیت بھی رکھتا ہے۔اور اسے ایک انجمن کا درجہ بھی حاصل ہے۔ادبی رسالہ نئے لکھنے والوں کو پروان چڑھاتا ہے اور ایک نسل کی میراث آنے والی نسلوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ادبی رسالہ محض حال کا ترجمان نہیں ہوتا بلکہ آج کا ادب جب ماضی کا حصہ بن جاتا ہے تو ادبی رسالہ ہی اس خزانہ کو تحفظ عطا کرتا ہے۔اور یہ تنقید وتحقیق کے لئے بنیادی ماخذ کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔کسی قوم کی تہذیبی رفعت کا اندازہ کرنا ہو تو صرف یہ دیکھنا ہی کافی ہوگا کہ اس میں کس معیار کے ادبی رسائل شائع ہوتے ہیں۔ان رسائل کا حلقۂ قرأت کتنا وسیع اور عرصہ حیات کتنا طویل ہے۔[14]

درج بالا اقتباس اردو رسائل کی اہمیت کا غماز ہے۔اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ اردو کے معروف وممتاز ادیبوں کے ساتھ نوجوان قلم کاروں کو بھی شائع کیا جاتا رہا ہے۔جس سے ان کے اسلوب نگارش اور موجودہ عہد کے ادبی منظر نامے سے بھی آگہی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ رسائل سے قاری کے ذہنی پرورش وپرداخت بھی ہوتی ہے۔اردو زبان وادب کے علاوہ شعرا وادبا کو رسائل وجرائد کی وجہ سے شہرت ومقبولیت ملی ہے۔ڈاکٹر عابد سہیل لکھتے ہیں:

''مشہور ومعروف ادیبوں اور شاعروں سے لے کر آج کے کم معروف شعرا اور ادبا اور نو واردین

بساط ادب تک سب ہی ادبی دنیا میں رسائل کے ذریعے ہی متعارف ہوئے ہیں ۔کرشن،منٹو،فراق،فیض،سردار،قرۃالعین حیدراور عصمت وغیرہ کی عظمت اپنی جگہ مسلم ہے۔لیکن ان کی تخلیقات چھاپنے والے ادبی رسائل نہ ہوتے تو نہ انہیں یہ شہرت ملتی اور نہ شاید ان کی بہت سی تخلیقات جنم ہی لے پاتیں شاعری تو ایک حد تک رسائل کے بغیر بھی پروان چڑھ سکتی ہے لیکن نثری اصناف کی ترقی ادبی جرائد کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں اور اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ زبان کا مستقبل بہر حال نثر سے وابستہ ہے۔''15

اس روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسائل کی اشاعت سے نہ صرف نثری اصناف کو فروغ ملا بلکہ شاعری کی بھی ترویج ہوئی ہے۔غالب، اقبال، سردار جعفری،فیض اور فراق جیسے بڑے شعرا کو رسائل نے شہرت عطا کی ۔مختلف حالات میں تحریکوں اور رجحانوں کو اردو رسائل نے فروغ دیا ہے۔جن میں علی گڑھ تحریک،ترقی پسند تحریک ،حلقہ ارباب ذوق قابل ذکر ہیں۔اسی حوالے سے ڈاکٹر انوارالدین لکھتے ہیں۔

''رسائل کے اجرا سے مختلف تحریکات کے کے فروغ میں بھی مدد ملی۔اردو میں ترقی پسند ادب اور جدید ادب کی تحریکوں کو مقبول بنانے میں ان رسائل کا بڑا حصہ ہے جو کسی خاص مسلک کی ترجمانی کرتے تھے۔مثال کے طور پر ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں نیا ادب،ادب لطیف،شاہ راہ،سویرا اور صبا جیسے رسائل نے نمایاں حصہ لیا۔اسی طرح حلقہ ارباب ذوق کے مسلک کو فروغ دینے میں رسالہ ادبی دنیا کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔گزشتہ چند برسوں میں شب خون،سطور،شعر وحکمت اور فنون جیسے رسائل کی وجہ سے ہمارے ادب میں جدیدیت کی تحریک جڑیں مضبوط ہوئیں۔اسی طرح آج کل جو سیکڑوں افسانوں کے مجوعے شائع ہو رہے ہیں یہ سب رسائل کی دین ہیں۔رسائل کی اشاعت سے پہلے ان کا کوئی وجود نہیں تھا۔''16

اردو زبان وادب کی ترویج ترقی میں اردو رسائل کا اہم کردار رہا ہے۔اس کے مطالعے سے مختلف ادوار میں ادب کے بدلتے ہوئے منظر نامے سے آگہی ہوتی ہے۔سائل جرائد کی روایت بہت قدیم ہے۔اردو کا سب سے پہلا ادبی رسالہ خیر خواہ ہند ہے۔جو 1837 میں جاری ہوا۔17 جس میں خبروں کے بجائے مضامین شائع کیے جاتے تھے۔یہ رسالہ ٹائپ میں چھپتا تھا اس کے ایڈیٹر ایک عیسائی پادری آرسی ماتھر تھے۔خیر خواہ ہند مرزا پور سے نکلتا تھا۔خیر خواہ ہند کے متعلق امداد صابری لکھتے ہیں:

''یہ رسالہ بارہ صفحات پر نکلتا تھا۔مالک پادری ایف جی برایت صاحب ،ایڈیٹر پادری ماتھر صاحب،مہتمم ڈاکٹر حیدر صاحب تھے۔سالانہ چندہ تین روپیہ تھا۔مطبع اسکول میں چھپتا تھا۔اس رسالے کا مقصد ہندوستانیوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ تھا۔یہ امریکن مشنری سوسائٹی کا آرگن تھا لیکن عیسائیوں کے فرقے پروٹسٹنٹ مشنریوں کے مضامین اس میں چھپتے تھے۔اس رسالے میں

معلوماتی، تاریخی مضامین بھی چھپتے تھے۔'' 18

رسالہ خیر خواہ ہند کا بنیادی مقصد عیسائیت کی تبلیغ تھا مگر اردو کا رسالہ ہونے کی وجہ سے اردو زبان وادب کو بھی خاطر خواہ فائدہ پہنچا۔ 1845 میں مسٹر اسپرنگر دلی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تو انہوں نے ایک ہفت روزہ رسالہ قران السعدین نکالنا شروع کیا۔ دہلی کالج میں شعبہ انگریزی کے پروفیسر پنڈت دھرم نارائن رسالے کے ایڈیٹر مقرر کیے گئے۔ یہ ایک باتصویر اخبار تھا۔ جس میں سائنس، ادب اور سیاسی مضامین کے علاوہ خبریں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ اس کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مغربی خیالات کو فروغ دینا بھی شامل تھا۔ دہلی کالج کے طلبہ کا علمی وادبی ذوق کے تربیت کرنے میں قرن السعدین کا نمایاں کردار رہا ہے۔ دلی کالج کے استاد ماسٹر رام چندر مغربی علوم سے بہت متاثر تھے بلکہ اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے ہندو دھرم چھوڑ کر عیسائی مذہب اختیار کرلیا تھا۔ ان کی ذاتی زندگی جو بھی رہی ہو مگر اردو کی ادبی صحافت کے فروغ میں ان کے اہم کردار کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ غیر ملکی رسائل کی طرز پر انہوں نے اردو میں ماہانہ ادبی رسائل کو فروغ دیا۔ ستمبر 1847ء میں رسالہ ''خیر خواہ ہند'' جاری کیا۔ چونکہ اس نام سے آرسی ماتھر پہلے سے ایک رسالہ نکال رہے تھے اس لئے اس کا نام بدل کر 1848 میں محبّ ہند کر دیا گیا۔ نادر علی خان لکھتے ہیں:

''چونکہ ہم کو اس کی بالکل اطلاع نہ تھی کہ کوئی اخبار خیر خواہ ہند ہندوستان میں اجرا ہوتا ہے ہم نے اپنے رسالے کا نام خیر خواہ ہند رکھا تھا۔ اب ہم کو معلوم ہوا کہ اخبار مسمّی خیر خواہ ہند مرزا پور سے جاری ہوتا ہے تو ہم کو مناسب نہیں کہ ہم اپنے رسالے کا نام بھی خیر خواہ ہند رکھیں۔ اس واسطے ہم نے اس رسالے کا نام تبدیل کیا اور بجائے خیر خواہ ہند کے محبّ ہند رکھا۔'' 19

ماسٹر رام چندر اس سے قبل 1845 میں ایک پندرہ روزہ رسالہ 'فوائد الناظرین' نکال چکے تھے۔ اسے اردو کا پہلا پندرہ روزہ رسالہ کہا جاتا ہے۔ اس رسالے میں تاریخی، سائنسی، ادبی اور علمی مضامین کے علاوہ دیگر زبانوں سے ترجمہ کر کے بھی مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ 1847 میں ماہوار علمی و ادبی رسالہ ''محبّ ہند'' جاری کیا تو اس کے مقاصد وہی تھے جو اس سے قبل فوائد الناظرین کے تھے۔ محبّ ہند کے پہلے شمارے میں ماسٹر رام چند اس رسالے کے بنیادی مقاصد کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''اس میں مضامین مدام ایسے چھپیں گے جو خلقت ہند کو مفید ہوں گے اور تاریخ ہر دیار کے مثل ہندوستان ،فرنگستان، ایران، افغانستان وغیرہ کے اور مضامین پندونصائح درج ہوں گے۔۔۔ عجیب وغریب حالات واشعار آبدار بڑے بڑے استادوں کے حتی المقدور مع تصویرات ان کی لکھی جائیں گی۔ 20

ماہنامہ محبّ ہند کی بنیادی نوعیت علمی تھی مگر اس نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا

کیا۔محبِّ ہند میں تاریخی نوعیت کے جو علمی مضامین شائع ہوئے ان میں یوسف خاں کمبل پوش کے سفر نامہ کے علاوہ بہادر شاہ ظفر، شاہ نصیر اور اس دور کے دیگر اہم شعرا کی غزلیں قابل ذکر ہیں۔21 انیسویں صدی کے ادبی رسائل کی ایک شکل گل دستہ بھی ہے۔جس نے نہ صرف کہ اردو شاعری کو فروغ بخشا بلکہ اردو رسائل کی تاریخ کا ایک اہم باب بھی ہے۔گلدستہ کی اصطلاح دراصل ان رسائل کے لئے استعمال کی جاتی تھی جن کا واحد مقصد شعر و شاعری کی اشاعت اور ترویج تھا۔اس قسم کا پہلا گلدستہ ''گل رعنا'' مولوی کریم الدین نے 1845 میں جاری کیا۔دراصل مولوی صاحب اس زمانے میں اپنے گھر پر مشاعرے منعقد کرتے تھے اور اس مشاعرے میں جو کلام پیش کیا جاتا اسے گلدستہ کی شکل میں 'گل رعنا' میں شائع کرتے تھے۔مولوی کریم الدین اس بات کے مدعی بھی تھے کہ گل رعنا اردو کا پہلا ادبی رسالہ ہے مگر بعد میں تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی کہ خیر خواہ ہند اردو کا پہلا رسالہ ہے۔البتہ گل رعنا کو اردو کا پہلا گلدستہ ضرور کہا جا سکتا ہے۔جیسا کہ عتیق احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''یہ خیال تو صحیح نہیں ہے کہ گل رعنا اردو کا پہلا رسالہ تھا۔لیکن یہ ضرور ہے کہ گل رعنا اردو کا غالبا پہلا گلدستہ تھا،جس کو مولوی کریم الدین نے 1845 میں نہیں تو کچھ آگے چل کر جاری ضرور کیا۔''22

مولوی کریم الدین کا گلدستہ گل رعنا اس عہد کے مشاعروں کا قیمتی سرمایہ ہے،جس میں اس دور کے متعدد ایسے شعرا کے کلام بھی ملتے ہیں جو کم یاب تھے۔رسائل کی دنیا میں مولوی کریم الدین نے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی جس کی جدت کو دیکھتے ہوئے ہندوستان کے مختلف شہروں سے ادبی گلدستے جاری ہوئے۔جن میں آگرہ سے نکلنے والا گلدستہ معیار الشعرا 1840، بنارس سے گلدستہ گلزار نوبہار 1849، لاہور سے کوہ نور 1854 قابل ذکر ہیں۔ مولوی کریم الدین گلدستہ کے علاوہ ایک اخبار کریم الاخبار بھی نکالتے تھے۔

اس دور کے کچھ اہم رسائل جن میں مفید ہند ہے جو دلی سے 1848 میں جاری ہوا۔ پنڈت ایودھیا پرشاد اس کے ایڈیٹر تھے۔ہمائے بے بہا لاہور سے 1853 میں جاری ہوا جس کے مالک منشی دیوان چند تھے، یہ ایک پندرہ روزہ رسالہ تھا۔اسی طرح اس دور کا ایک اہم رسالہ معلم العملہ ہے۔ 1855 سے یہ شروع ہوا۔یہ ادبی اور تاریخی نوعیت کا رسالہ تھا، اس دور کے ضخیم رسالوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔اس رسالہ کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس کے خریداروں میں سرسید احمد خاں کا نام شامل تھا۔

مذکورہ رسالوں کے اجمالی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ 1857 سے قبل اردو رسالوں کی کوئی واضح سمت نہیں تھی ان کے خطوط کار بھی متعین انداز میں نہیں تھے۔ابتدا میں ہفتہ وار، پندرہ روزہ، ماہانہ جو بھی رسائل شائع ہوتے تھے اس میں خبروں کے ساتھ ساتھ مضامین بھی شائع کیے جاتے تھے۔علمی، سائنسی اور مذہبی مضامین کو فوقیت

دی جاتی تھی۔جبکہ 1857 کی پہلی ناکام جنگ آزادی نے برصغیر کی تاریخ میں اہم کردار انجام دیا۔اس تحریک نے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو بیدار کردیا۔اس زمانے میں مسلمانوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی پروان چڑھایا۔ان تبدیلیوں نے جہاں سیاسی،سماجی اور معاشرتی حالات کو متأثر کیا وہاں ادبی رجحان بھی بدلا اور رسائل بھی اس سے متاثر ہوئے۔وسائل کی قلت کے سبب پہلے سے ہی اردو رسائل کی کمی تھی 1857 کے ہنگاموں کے بعد باقی ماندہ رسائل بھی بند ہوگئے۔ایک مختصر سے عرصہ کے بعد جو رسائل منظر عام پرآئے ان میں اہل علم کی دلچسپی اور عوام کی سرگرم عیانت خوب نظر آئی۔ان رسائل نے 1857 کے بعد آنے والے رسائل کے لئے زرخیز مٹی تیار کی اس دور کے اہم رسائل کا تذکرہ کیا جارہا ہے تاکہ 1857 کی ادبی صحافت کا اندازا لگایا جاسکے۔

1857 کی جنگ کے بعد پورے ملک میں خوف ودہشت کا ماحول تھا۔انگریز ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں پر مظالم ڈھارہے تھے۔ایسے ماحول میں بھی علم وادب سے تعلق قائم رکھنا فخر کی بات تھی۔اودھ اخبار کا اجرا ایسے ہی ماحول میں جنوری1859 میں ہوا۔ابتدامیں یہ ہفت روزہ تھا1873 میں اخبار سہ روزہ ہوا،1876 میں ہر دوسرے روز نکلنے لگا بالآخر 1877 سے اس نے روزنامے کی شکل اختیا کرلی۔خبروں کے علاوہ اس اخبار کا ادبی پہلو بہت نمایاں تھا۔اس کے قلم کاروں میں ملک کے نامور ادبا وشعرا اور انشاء پرداز شامل تھے جن میں مولوی ہادی علی اشک،مولانا عبدالحلیم شرر،پنڈت رتن ناتھ سرشار،پیارے لال شاکر،مرزا محمد عسکری،مولانا جالب دہلوی،مولوی غلام بخش تپش وغیر قابل ذکر ہیں۔مولانا امداد صابری اخبار کی ادبی پالیسی کے سلسلے میں متعلق لکھتے ہیں:

''یہ اخبار اپنے عہد کی ادبی،تمدنی،معاشرتی اور سیاسی تاریخ کی مستند اور باوقار دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے''23؎

اودھ اخبار کے صحافتی پہلو میں حالات کے اعتبار سے تبدیلیاں آتی رہیں لیکن اس کی ادبی حیثیت ہمیشہ مسلم رہی اور اسی وجہ سے اودھ اخبار اردو کو ادبی اور تہذیبی تاریخ کے ایک بنیادی ماخذ کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔اس کی ادبی خدمات کا روشن سلسلہ فسانہ آزاد سے عبارت ہے۔جو قسط وار اودھ اخبار میں شائع ہوا۔

1857 کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کے حالات خراب ہوتے چلے گئے تعلیم وتربیت کے علاوہ سماجی ومعاشی طور پر بھی صورت حال نہایت افسوسناک تھی کیوں کہ اس جنگ کا الزام مسلمانوں پر لگایا گیا تھا۔سرسید احمد خاں ملک میں مسلمانوں کے حالات اور انگریزوں کی پالیسی سے بخوبی واقف تھے۔مسلمانوں کے مستقبل کے لئے بہت فکر مند تھے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں اپنا وقار برقرار رکھنا ہے اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکال پھینکنا ہے تو تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنا ہوگا۔ان کی دلی خواہش تھی کہ مسلمانوں کی خراب صورت حال اور تعلیم تربیت کے لیے کوئی ایسا رسالہ جاری کریں جو انہیں خواب غفلت سے بیدار کرسکے۔چناچہ 1870 میں سرسید

احمد خاں جب انگلستان سے واپس آئے تو انہوں نے اسی سال دسمبر میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ پہلے شمارے میں تہذیب الاخلاق کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس پرچے کے اجرا کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے۔ بذریعہ اس پرچے کے جہاں تک ہم سے ہو سکے ان کے دین و دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں اور جو نقص ہم میں ہیں گو ہم کو نہ دکھائی دیتے ہوں مگر غیر قومیں ان کو بخوبی دیکھتی ہیں ان سے ان کو مطلع کریں اور جو عمدہ باتیں ان میں ہیں ان میں ترقی کرنے کی ان کو رغبت دلائیں''24ے

تہذیب اخلاق صرف علمی و ادبی مضامین کے لیے وقف تھا۔ یہ رسالہ مہینے میں ایک بار، دو بار اور کبھی تین بار بھی شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے میں زیادہ تر مضامین مسلمانوں کی تعلیم، سماجی اور معاشی حالت، مذہبی اور اصلاحی مضامین شائع ہوتے تھے۔ درحقیقت اس رسالے نے زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا۔ سنجیدہ اور علمی مباحث کے لیے اردو زبان کا استعمال کیا جس سے اس زبان کو فروغ دینے میں تہذیب الاخلاق نے نمایاں کردار ادا کیا۔ مسلمانوں کی ذہن سازی کے لیے بھی اسے ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

تہذیب الاخلاق کو ہمیشہ سے بلند پایہ قلم کار ملے۔ تہذیب الاخلاق کا اداریہ سرسید خود لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ مضمون نگاروں میں سرسید احمد خاں، مولوی نذیر احمد، مولانا حالی، مولانا شبلی، مولوی چراغ علی، وحید الدین سلیم، مرزا عابد علی، منشی مشتاق حسین، مہدی علی، حافظ محمد عبدالرزاق اور حافظ عبدالرحمٰن قابل ذکر ہیں۔ سرسید اردو کے معتبر ادیب اور بلند پایہ صحافی تھے۔ 1870 سے 1898 کے دوران تہذیب الاخلاق اور انسی ٹیوٹ گزٹ میں سب سے زیادہ مضامین سرسید نے لکھے۔ انہوں نے ادبی صحافت کو فکر و نظر کی روشنی عطا کی اور موضوعات میں تنوع پیدا کیا۔ انہوں نے ادیبوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جس نے ادب کو پیشے کے بجائے ہدف کے طور پر قبول کیا۔ سرسید نے صحافت کو تجارت کے برعکس قومی اور تہذیبی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی طرح ڈالی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ سرسید کی صحافتی فکر اور خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علمی مضامین میں سرسید کی مخصوص معقولاتی سپرٹ اور حیات قومی کی تشکیل جدید اور زندگی کی تمدنی اساس کا پورا پورا احساس پایا جاتا ہے۔ یہ عقلی اور تجزیاتی اصول صحافت سرسید کی اخبار نویسی کے خاتمے کے بعد آج تک اردو اخبار نویسی میں پیدا نہیں ہو سکی۔''25ے

تہذیب الاخلاق تعطل کا شکار رہا۔ درمیان میں کئی بار بند ہوا۔ 1876 میں پہلی بار بند ہوا، تین سال بعد دوبارہ جاری ہوا لیکن تین سال پانچ ماہ کے بعد پھر بند ہو گیا۔ تیرہ چودہ سال بعد اس کا تیسرا دور شروع ہوا جو تین سال تک قائم رہا اور پھر رسالہ کی اشاعت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ فروری 1897 کو اسے علی گڑھ انسی ٹیوٹ گزٹ

میں شامل کرلیا گیا اور اس طرح تہذیب الاخلاق کا اپنا وجود باقی نہ رہا 1960 میں اسے دوبارہ شروع ہوا اسے چوتھا دور قرار دیا جاسکتا ہے۔اب بھی یہ رسالہ پابندی سے جاری ہے۔۔تہذیب الاخلاق اور انسی ٹیوٹ گزٹ کی پالیسی کو دیکھتے ہوئے یقین سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سچے اور ایماندارانہ اصولوں کے ساتھ بھی صحافت کی کی جاسکتی ہے۔سرسید ان مخلص صحافیوں میں سے ہیں جنھوں نے نہ صرف اردو صحافت کو فروغ بخشا بلکہ اردو صحافت کے معیار کو اس قدر بلند کیا کہ دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے رسالوں کے سامنے فخر کر کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

> ''دراصل تہذیب الاخلاق ہی وہ رسالہ ہے جس نے اردو میں صحافت کی داغ بیل ڈالی۔سید احمد صحافت کی اعلی قدروں کے ترجمان تھے۔انہوں نے اردو صحافیوں کو بتایا کہ سچائی،صداقت روی اور سنجیدگی ایک صحافی کا اسوۂ زندگی ہونا چاہئے۔اس کے علاوہ انہوں نے اظہار خیال کی آزادی پر بھی زور دیا۔وہ صحافت کو سچائی اور رائے عامہ کا ترجمان بنانا چاہتے تھے۔26ے

تہذیب الاخلاق کی طرح ایک اصلاحی رسالہ ''انجمن مناظرہ،، 1871 میں منصۂ شہود پر آیا۔جس کے سیکریٹری نذیر علی اور اسسٹنٹ سیکریٹری سید میر نصیر علی تھے۔اس رسالے کا ابتدائی نام پبلک سوشل میٹنگ تھا۔اس رسالے میں مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے،تعلیم کے فروغ،تعلیمی اداروں اور سوسائٹیوں کے قیام کے متعلق مضامین شائع کیے جاتے تھے۔اس کے مضمون نگاروں میں مولانا الطاف حسین حالی،فائق دہلوی،منشی میر نصیر علی،عبد الرحیم خاں بیدل اور سید میر شاہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

لکھنؤ سے منشی سجاد حسین نے 1877 میں اودھ پنچ کا اجرا کیا۔منفرد نوعیت کا یہ مزاحیہ اخبار تھا،جس کا مقصد مزاحیہ صحافت کو فروغ دینا تھا۔اودھ پنچ میں مزاحیہ نظمیں،لطیفے،تمسخر و تضحیک پر مبنی مضامین شائع کئے جاتے تھے۔اس اخبار نے متعدد مزاح نگاروں کو روشناس کرایا اور اردو کے مزاحیہ ادب کو فروغ بخشا۔اس کے قلم کاروں میں اکبرالہ آبادی،رتن ناتھ سرشار،منشی جوالا پرشاد برق،احمد علی شوق،مچھو بیگ ستم ظریف،تربھون ناتھ ہجر،اور نواب مرزا آزاد جیسے مزاح نگار شامل تھے۔اودھ پنچ کی جدت اور غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس کے بعد متعدد مزاحیہ رسالے منظر عام پر آئے۔ان میں سر پنچ ہند لکھنؤ 1877،پنجاب پنچ،لاہور 1878،کلکتہ پنچ 1879،دہلی پنچ 1880،باوا آدم پنچ،بنارس 1881،سر پنچ،سید پور 1882،ظریف ہند،1885،تیس مار خان،لاہور 1886،شریر،لاہور 1887 وغیرہ کے نام شامل ہیں جنہوں نے نہ صرف مزاحیہ ادب کو فروغ بخشا بلکہ اردو کو بلند پایہ کے مزاح نگار بھی دیے۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں جو رسائل منظر عام پر ان میں میر ناصر علی کا رسالہ ''تیرہویں صدی

’’1879 میں آگرہ سے جاری کیا گیا۔اس رسالے کے دو حصے تھے۔حصہ نثر کے مدیر میر ناصر علی تھے اور حصہ نظم کی ادارت حافظ رحیم اللہ صابری اکبرآبادی کے سپرد تھی۔اس رسالے نے سرسید اور حالی کی پرزور مخالفت کی اس کے علاوہ حالی کی مسدس کی طرح 379 بند پر مشتمل ایک مسدس لکھی جو مقبول نہ ہوسکی۔میر ناصر علی نے رسالہ صلائے عام بھی جاری کیا۔میر ناصر علی منفرد اسلوب کے مالک تھے انہوں نے ان رسالوں میں ادبی موضوعات اور علمی مسائل کے علاوہ قابل قدر انشائیہ نگاری کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔مولانا عبدالحلیم شرر کا شمار تاریخی ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔انہوں نے لکھنؤ سے 1887 میں دل گداز جاری کیا۔اس قبل وہ ادبی رسالہ محشر اور مہذب نکال چکے تھے۔اودھ اخبار اور اودھ پنچ میں مضامین لکھ کر اپنے انداز واسلوب سے ادبی دنیا کو واقف کرا چکے تھے۔رسالہ دلگداز کو ادبی خدمات اور تاریخی مضامین کی وجہ سے کافی شہرت تھی۔یہ رسالہ ایک عرصے تک جاری رہا اور ادبی حلقوں میں کافی مقبول بھی رہا۔مولانا عبدالحلیم شرر نے دلگداز میں ناولیں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا اور حسن انجلینا ،منصور موہنا ،فلورا فلورنڈا جیسی ناولیں قسط وار شائع کی تھیں۔امداد صابری اس رسالے کے متعلق لکھتے ہیں:

> ’’اس رسالے میں ادبی سیاسی مضامین بہت کم اور تاریخی مضامین بہت زیادہ ہوتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ مولانا شرر نے جب سے اس میں ناولوں کو بالاقساط چھاپنا شروع کیا تھا تو لوگوں کی زیادہ توجہ ناولوں پر ہوگئی تھی اور لوگ ناولوں کی مانگ کرنے لگے تھے۔چناچہ اس میں کافی ناول بالاقساط شائع ہوئے۔‘‘ 27؎

ادبی صحافت میں مولانا عبدالحلیم شرر کی جدت یہ ہے کہ انہوں رسالوں میں قسط وار ناول شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا، مقالہ نگاری میں استدلال اور توازن کو قائم رکھا۔

1897 میں حیدرآباد سے ’ماہنامہ افسر‘ جاری ہوا۔ابتدا میں اس کی ادارت محبّ حسین نے سنبھالی۔دو سال بعد مولوی عبدالحق اس مدیر مقرر ہوئے اور بہت جلد ایک علمی وادبی رسالے کی شہرت حاصل کرلی۔ماہنامہ افسر کے قلمی معاونین میں مولانا حالی، چراغ علی، ذکاءاللہ، عمادالملک، مولوی غلام الثقلین، مولوی عزیز مرزا اور ظفر علی خان کے نام قابل ذکر ہیں۔جن کا نہ صرف اس زمانے کے بلکہ اردو ادب کے معتبر قلم کاروں میں شمار ہوتا ہے۔انیسویں صدی اواخر میں جو رسائل شروع ہوئے ان میں ایک نام معارف کا بھی ہے۔1898 میں علی گڑھ سے شائع ہونا شروع ہوا۔جس کے مدیر مولوی وحیدالدین سلیم تھے۔اس رسالے نے بہت جلد ادبی حلقوں میں اپنی شناخت قائم کی تھی لیکن محض چار سال میں ہی بند ہوگیا۔امداد صابری لکھتے ہیں:

> ’’اس رسالے نے چار سال کی زندگی پائی اور 1902 میں بند ہوگیا تھا۔اس کے بند ہونے پر علمی طبقے میں بہت افسوس کیا گیا اور مسلمانوں کی غفلت اور لاپرواہی کا ماتم کیا گیا۔اس میں

نواب مہدی حسن خاں صاحب بھی شامل تھے۔اس رسالے میں علمی ،فلسفی ،اخلاقی ،مذہبی،ملکی ،تاریخی اوراد بی مضامین شائع ہوتے تھےاورمشرقی اورمغربی طرز کی عمدہ نظمیں اور پاکیزہ ناول قسط وار درج کیا جاتا تھا۔28؎

تلاش کے باوجود اس کا کوئی شمارہ دستیاب نہیں ہے ۔مختصراًیوں کہا جاسکتا ہے کہ انیسویں صدی میں صحافت کا بنیادی مقصد خبر رسانی تھا۔اس دور میں اخبارات ورسائل میں خبروں کے ساتھ ساتھ ادبی مضامین بھی شائع کئے جاتے تھے۔اور جو رسائل صرف مضامین کے لئے خاص تھے اس میں بھی عہد حاضر کی طرح خالص ادبی مضامین نہیں شائع کئے جاتے تھے ۔انیسویں صدی میں ادب کی پیش کش میں ہفت روزہ ،سہ روزہ اور روزانہ اخبارات اور رسائل نے گراں قدر حصہ لیا۔ماہانہ رسائل کے پیش قدمی ہو چکی تھی ۔مگر ادبی رسائل کی اشاعت میں باقاعدگی کا فقدان تھا۔اکثر رسائل مدیر کی ذاتی دلچسپی پر سامنے آتے مگر خریداروں کی کمی اور مالی مشکلات کا شکار بن جاتے تھے۔بیسویں صدی سے قبل اردو صحافت جس نے اپنا صحافتی سفر اخبارات اور پمفلٹ سے شروع کیا تھا اب ادبی گلدستوں ،پندرہ روزہ ،ماہانہ پرچوں اور رسائل کی شکل اختیار کر چکی تھی ۔

☆☆☆

بیسویں صدی کے ادبی رسائل

بیسویں صدی سے قبل ادبی رسائل کی روایت مستحکم ہوچکی تھی۔ایسے رسائل کا اجرا شروع ہو چکا تھا جو خالص ادبی تھے۔ان رسائل نے علمی ،فکری،معاشرتی ،سیاسی وسائنسی موضوعات سے گریز کرتے ہوئے ادب اوراس کی مختلف اصناف تک اپنے دائرے کومحدودکرلیا۔یہی زمانہ ملک پرانگریزوں کے قبضے کا بھی تھا وہ اگر چہ پورے ملک پر قابض ہو چکے تھے مگر ہندوستانیوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت وبغاوت کے شعلے بلند ہورہے تھے۔ ہر طرف آزادی کے نعروں کی گونج تھی۔اس وقت اخبارات ورسائل بھی اس سے متاثر ہوئے اور آزادی کی جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔رئیس الدین فریدی لکھتے ہیں۔ :

> بیسویں صدی ہندستان کے لیے زبردست انقلاب لے کرآئی۔کانگریس نے جواس سے پہلے ہی قائم ہوچکی تھی ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنی شروع کی ۔مسلم لیگ کا قیام،تقسیم بنگال کی تجویز،ایشیااورافریقہ پرمغربی ملکوں کی تاخت وتاراج،کانپور کی مسجد کا واقعہ،ترکی سلطنت کی تباہی کا آغاز،پہلی عالمی جنگ،جلیاں والا باغ کی خوں ریزی وغیرہ نے جمع ہوکر سوراج اور خلافت کی تحریک کا راستہ تیار کیا۔اس سے اردواخبار بھی شدت سے متاثر ہوئے اور نئے نئے اخبار نکلنے لگے۔ایک خاص بات یہ بھی ہوئی کہ انگریزوں کے خوشامدی اخبار دب گئے اور اردو صحافت انگریزوں کی مخالفت کے لیے شمشیرعریاں ہوگئی۔یعنی پچاس سال سے بھی کم کی مدت میں 1857 کا سماں پھر پیدا ہوگیا۔ان دنوں اردواخباروں کی اشاعت بھی خوب بڑھ گئی۔ یہ دوراردو صحافت کا سنہرادورتھا۔'' 29؎

مذکورہ اقتباس سے آزادی کی تحریک میں رسائل کی اہمیت اور صحافیوں کی جدوجہد کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔بیسویں صدی کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس دور میں سیدامیرعلی،علامہ اقبال،شیخ عبدالقادر،مولانا حالی ،مولانا شبلی،خواجہ حسن نظامی اور اکبرالہ آبادی جیسے تعلیم یافتہ لوگ ملے۔جنہوں نے نہ صرف اردوزبان وادب کوفروغ بخشا بلکہ اردوصحافت کو بھی خوب ترقی دی۔ چناچہ اب ایسے رسائل کی ضرورت محسوس کی جانے لگی جنہیں کتاب کی طرح پڑھا جائے اور محفوظ رکھا جائے۔ذیل میں ان رسائل کا تذکرہ کیا جارہا ہے جنہوں نے اردو رسائل کی تاریخ میں اہم کردارادا کیا۔

مخزن:

بیسویں صدی میں ادبی رسائل کی ابتدا شیخ عبدالقادر کے رسالہ مخزن سے ہوئی۔اپریل 1901 میں لاہور سے انجمن پنجاب کے تحت جاری ہوا۔مخزن کی ادارت شیخ عبدالقادر کے ذمہ تھی لیکن 1904 میں ان کے لندن چلے جانے بعد شیخ محمد اکرام مدیر مقرر ہوئے۔شیخ عبدالقادر کی وطن واپسی کے بعد ستمبر 1907 میں مخزن لاہور سے دہلی منتقل ہوگیا اور راشدالخیری ان کے معاون مدیر مقرر ہوئے۔مخزن کی دلی آمد پر نظم الدین ثاقب بدایونی نے طویل نظم

'دلی کا مہمان' کے عنوان سے لکھی جو مخزن میں شائع ہوئی۔یہ نظم 25 اشعار 16 بند وں پر مشتمل تھی۔30

1909 میں مخزن پھر لاہور واپس آ گیا اور 1910 میں مولوی غلام رسول نے اس رسالے کو خرید لیا مگر اس کے بعد بھی شیخ عبدالقادر کا نام سرورق پر اعزازی مدیر کے طور پر چھپتا رہا۔1917 میں مولووی غلام رسول مہر نے اس دار فانی کو الودع کہا تو اس کے معاون مدیر تاجور نجیب آبادی مقرر ہوئے۔اس کے علاوہ حفیظ جالندھری اور ہری چند اختر نے بھی مخزن کی ادارت کی۔اس مجلّے کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں نئے شاعروں اور ادیبوں کو متعارف کرایا جاتا تھا اور ان کی سفارشات اس رسالے میں شائع کی جاتی تھی۔مخزن پر تبصرہ کرتے ہوئے روشن آرا لکھتی ہیں:

''بیسویں صدی کے آغاز میں ابھرنے والے ادیب و شاعر مخزن کی پیداوار کہے جاسکتے ہیں۔اس مجلّے نے نئے ادیبوں کو متعارف کروایا۔علامہ اقبال،ظفر علی خاں،راشد الخیری،ناصر،نذیر ،فراق،سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریریں اس مجلّے میں خصوصیت سے شائع ہوئیں۔افسانے کی صنف کو متعارف کروانے میں بھی مخزن کا نام آتا ہے۔سجاد حیدر یلدرم اور سدرشن کے افسانوں کی اشاعت کا اہتما ہوتا رہا۔افسانے،لطیف طنز و مزاح،فن تنقید،آپ بیتیاور سوانح عمری کی اصناف کو جدید رنگ میں پیش کیا گیا۔شیخ عبدالقادر،علامہ اقبال،ظفر علی خاں ،ابوالکلام ازاد،حسرت موہانی،جدید انگریزی زبان وادب پر بھر پور گرفت رکھتے تھے ان کی تحریروں سے مخزن کو خصوصی مقام ملا۔مخزن کی رومانی تحریک کے اثرات اردو ادب پر اس درجہ راسخ ہوئے کہ ترقی پسند تحریک کے آغاز تک ادب کی تمام اصناف پر رومان پسندی کا غلبہ رہا۔مخزن کے عہد میں ابھرنے والے تمام مجلّات اسی تحریک کے پیداوار تھے۔''31

مخزن کا ایک مقصد مذہبی اور سیاسی طبقوں سے الگ رہ کر اردو ادب کی خدمات کرنا تھا۔اس کے پہلے ہی شمارے میں علامہ اقبال کی معروف نظم ''ہمالیہ'' شائع ہوئی،مولوی احمد دین کا نادر مضمون ''مطالعہ الفاظ''،شیخ عبدالقادر کا مقالہ 'بناوٹ اور سادگی' لالہ سری رام تاریخی مضمون 'دہلی غدر سے پہلے' شائع ہوا۔مخزن کو ہمیشہ سے بلند پایہ کے قلمی معاونین کا تعاون رہا ہے جن میں محمود شیرانی،مولانا حالی،مولانا شبلی محمد حسین آزاد،سجاد حیدر یلدرم،آغا حشر کاشمیری،راشد الخیری،چکبست،داغ دہلوی،حسن نظامی،اکبر الہ آبادی،ریاض خیر آبادی،حسرت موہانی،طالب بنارسی،شوق قدوائی،شاد عظیم آبادی،امداد امام اثر،پنڈت دتا تریہ کیفی،مولانا ظفر علی خان،عزیز لکھنوی،محسن کاکوروی،ابوالکلام آزاد،جوش ملیح آبادی،جگر،فانی،اصغر اور متعدد دیگر شعرا و ادبا کے نام شامل ہیں۔یہ مخزن کی خوش نصیبی تھی کہ اسے اپنے عہد کے ممتاز قلم کاروں کا تعاون حاصل تھا۔مخزن کی ادبی خدمات سے پورے ایک عہد نے استفادہ کیا اور اسے بیسویں صدی کے رسائل کا مینار نور تسلیم کیا گیا۔مخزن نے مضامین کے علاوہ خصوصی شمارے بھی شائع کیے ان میں دربار نمبر،دسمبر 1902،دوسرا دربار نمبر جنوری 1903،سالگرہ نمبر مارچ 1928،سالگرہ نمبر مارچ

1929، سالگرہ نمبر مارچ 1930، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

زمانہ:

مخزن کے بعد بیسویں صدی کا دوسرا اہم رسالہ زمانہ ہے۔فروری 1903 میں بریلی سے جاری کیا گیا۔ جس کے پہلے ایڈیٹر منشی شیو برت لال تھے ۔اکتوبر تک کے نوشمارے ان کی ادارت میں شائع ہوئے ۔نومبر 1903 سے اس کی ادارت کی دیانارائن نگم نے سنبھالی۔جنوری 1904 میں کانپور منتقل ہوگیا اور پھر یہیں سے نکلتا رہا۔ رسالہ زمانہ کا بنیادی مقصد اردو زبان میں مغربی اور مشرقی خیالات کے اتحاد کی تصویر پیش کرنا تھا۔فروری 1903 کے شمارے میں مدیر زمانہ اغراض ومقاصد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔ اردو زبان میں مغربی ومشرقی خیالات کے اتحاد کی تصویر پیش کرنا۔

۲۔ ان علوم وفنون اور ضروری واقعات پر خامہ فرسائی کرنا جو علم وزندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جس کی معمولی واقفیت تہذیب وشائستگی کا معیار قرار دی جاتی ہے۔

۳۔ گورمنٹ کے پروگرام اور منشا کو عوام تک پہنچانا اور عوام الناس کی خواہش اور تمنا کو حکومت تک پہنچانا اور فریقین کی لاعلمی دور کرنے میں ممدومعاون ثابت ہونا۔

۴۔ مضامین مذہبی، سوشل، پولیٹیکل زیر بحث آئیں گے۔

۵۔ ایسے مضامین لکھے جائیں گے جس سے ملک کی سب قومیں باہم شیر وشکر کی طرح مل کر قومی اتحاد کے اصول پر عمل کریں۔

۶۔ یورپین اہل الرائے اور مصنفوں کے دلچسپ مضامین درج ہوں گے اور اس کی ایڈیٹری پنڈت شیو برت برمن ایم اے سے متعلق ہوگا۔

۷۔ انگریزی میگزین کی تقلید وتتبع۔

۸۔ ابتدائی صفحات 32 ہوں گے بعد کو کامل 50 صفحات کردیے جائیں گے۔

۹۔ قیمت سالانہ سے /روپے مع محصول ڈاک۔

درج بالا اغراض ومقاصد کی تکمیل حتی الوسیع کی گئی کہا جاتا ہے کہ مقاصد کی تکمیل کے لیے جس سنجیدگی سے رسالہ زمانہ نے کوشش کی اس کی نظیر صحافت کی دنیا میں کم ملتی ہے۔اہم ادبی تخلیقات اور کتابوں پر تبصرہ یہ خاص سلسلے تھے جس کو نہ صرف پسند کیا جاتا بلکہ اسے پذیرائی بھی حاصل تھی۔ایسے مضامین کو ترجیح دی جاتی تھی جو سماجی اصلاح پر مبنی ہوتے تھے۔رسالہ زمانہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس نے ہندوؤں کو اردو زبان کے قریب لانے کی کوشش کی اور ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ سائنسی مضامین پر اعلی پائے کے مضامین شائع کیے۔رسالہ نے نئے لکھنے والے شعراو ادبا کو

متعارف کرایا ۔اقبال کی نظم'' قومی ترانہ'' پہلی بار رسالہ زمانہ ہی میں شائع ہوئی ۔رسالہ زمانہ میں جہاں تاریخی،ادبی، معاشرتی ،سماجی وسیاسی مضامین شائع کیے جاتے تھے وہیں دوسری طرف خالص سائنسی ،فلسفہ،علم نجوم اور معاشی معاملات پر بھی مضامین چھپتے تھے۔ اقبال،چکبست ،فراق،اکبر،تلوک چند محروم،جوش،جگر،احسن مارہروی،اثرلکھنوی،بسمل الہ آبادی، ماہرالقادری اوراثرعظیم آبادی وغیرہ رسالہ زمانہ کے مستقل قلم کاروں میں شامل تھے۔اس رسالے کوایک طویل عمرملی اوردیانارائن نگم کی وفات تک چھپتا رہالیکن 1943 کے بعداس کی اشاعت بند ہوگئی۔زمانہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے صرف ادباوشعراہی کی تربیت نہیں کہ بلکہ دیانارائن نگم کوبھی حیات دوام عطا کیا۔زمانہ کی فائلوں کے مطالعہ سے اندازا ہوتا ہے کہ یہ بلند پایہ صحافت کا ترجمان تھا۔رام بابوسکسینہ نے جریدہ نگاری میں انہیں نوجوانوں کے لیے خضرطریقت کے طور پرشمار کیا ہے۔32؎

اردوئے معلیٰ:

اردوئے معلیٰ کوعلی گڑھ سے حسرت موہانی نے جولائی1903 میں جاری کیا۔یہ خالص ادبی اورسیاسی رسالہ تھا۔حسرت موہانی شاعر بھی تھے اور سیاست داں بھی اس لئے اردوئے معلیٰ کے ان سا سی تصورات کا نقیب اورادبی مزاج کا آئینہ دار کہا جاسکتا ہے۔حسرت موہانی بے باک اورنڈرصحافی تھے یہی وجہ ہے کہ انہیں متعدد مرتبہ قیدو بند کی صعوبتیں بھی جھلنی پڑیں۔انہوں نے مشاہدات زنداں کے نام سے اپنی قید بند کی داستان اسی رسالے میں قسط وار شائع کی تھی۔مسلسل قید بند کی صعوبتیں اٹھانے کے باوجودوہ ادب کی پاسداری کرتے رہے۔روشن آرالکھتی ہیں:

> ''یہ سیاسی مقصد کے تحت جاری ہونے والا پہلا مجلّہ تھا جوایک مسلمان مدیر کی زیرادارت نکلنا شروع ہوا۔اردوئے معلیٰ نے پہلی بارسیاست کا رخ موڑ کر بے باک اورنڈرانداز میں لکھنا شروع کیا کیوں کہ اس سے بیشتراسلامی صحافت معتدل مزاج کی حامی تھی۔مولانا حسرت موہانی بیباک لیڈر،حریت پسند،آزادخیال سیاسی رہنما اورصحافی تھے۔ان کے ان نظریات کی ترجمانی اورعکاسی اردوئے معلیٰ کررہا تھا۔چناچہ مسلمانوں کے سیاسی شعور کی بیداری میں اردوئے معلیٰ کوخصوصی اہمیت حاصل ہے۔علمی وادبی اعتبار سے بھی یہ اپنے دورکا بہترین مجلّہ تھا۔''33؎

حسرت موہانی انگریزوں اوران کے پرستاروں کے خلاف لکھتے رہے۔ان کی اس جرأت مندانہ صحافت نے اردوئے معلیٰ کوایک نئی سمت اور مقام عطا کیا۔انہوں نے اردومعلیٰ کوادبی ،سیاسی اورتاریخی معلومات کا خزانہ بنا دیا۔شعراوادبا کی نگارشات پرتنقیداس رسالے کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔مولانا 1908 میں جب قید کر لیے گئے تو رسالہ بند ہوگیا،اکتوبر1909 میں دوبارہ نکلنا شروع ہوالیکن 1913 میں ضمانت طلب کی گئی جس کی عدم ادائیگی میں اسے1925 میں ہمیشہ کے لیے بند کردیا گیا۔

عصمت:

علامہ راشد الخیری نے 1908 میں سہلی سے رسالہ عصمت کا اجرا کیا۔ یہ خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ عصمت سے پہلے خواتین کے متعدد رسالے نکل چکے تھے مثلاً اخبار النساء (دہلی) شریف بی بی (لاہور) تہذیب نسواں (لاہور) خاتون (علی گڑھ) پردہ نشین (آگرہ) لیکن کسی کو بھی طویل عمر نہیں مل سکی۔

ابتدا میں شیخ محمد اکرام نے اس کی ادارت سنبھالی۔ 1924 میں اس کی ادارت کی ذمہ داری مولانا رازق الخیری کے سپرد کی گئی۔ انہوں نے بڑی دلجمعی سے اس کی ادارت کی اور عصمت کے معیار اور وقار میں اضافہ کیا۔ تقسیم ہند کے بعد مولانا رازق الخیری کے ہمراہ کراچہ منتقل ہو گیا۔ مولانا کی اہلیہ آمنہ نازلی نے بھی ایک عرصہ تک اس کی ادارت کی۔ مولانا کے انتقال کے بعد اس رسالے کی ادارت کی ذمہ داری صائمہ خیری نے قبول کی۔ اسی سالہ طویل مدت کے بعد 1988 میں اس رسالے کو بند کر دیا گیا۔ جبیں انجم لکھتی ہیں:

> ''چنانچہ مسلم خواتین کو معلومات کے ساتھ دلچسپ مضامین بہم پہنچانے کے لیے جناب شیخ محمد اکرام صاحب نے مخزن پریس دہلی سے جون 1908 میں عصمت کے نام سے ایک ماہنامہ شائع کیا جس کا مقصد عالم نسواں کی ترقی تھا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ کسی شہر میں خواتین کی ترقی سے دوسرے شہروں کی خواتین کو بھی واقفیت حاصل ہو جاتی۔ عصمت نے اس ترقی کے تمام حالات مختلف ذرائع سے جمع کر کے ان کی طرف دوسری خواتین کو متوجہ کرایا اور ان کے لئے تبادلہ خیال کا ایک مؤثر ذریعہ فراہم کیا۔'' 34

عصمت کے اجرا کا مقصد اصلاح نسواں تھا۔ اس میں خواتین کے متعلق ہر قسم کے موضوعات کو شامل کیا جاتا تھا۔ علمی، تاریخی، ادبی، سماجی، اور معاشرتی مضامین کے علاوہ امور خانہ داری، بچوں کی تربیت سے متعلق مضامین شائع کئے جاتے تھے۔ مثلاً خواتین میں علم وادب کا ذوق پیدا کرنا، غیر مذہبی اور غیر فطری زندگی اور فرسودہ رسم ورواج سے آزاد کر کے اسلامی تعلیمات واقف کرانا، انہیں خواتین کے حقوق اور فرائض سے روشناس کرانا۔ اس رسالے کا بنیادی مقصد خواتین کو تعلیم کے میدان میں آگے بڑھانا تھا۔ عصمت کے اشتہار سے اس کے اغراض مقاصد کا بخوبی اندازا ہوتا ہے جو پابندی سے ہر شمارے میں شائع ہوتا تھا:

> ''خواتین کے واسطے 'عصمت' میں دینی اور دنیاوی دونوں قسم کی فلاح و بہبود ملحوظ ہے۔ کنواری لڑکیوں کو عصمت بتائے گا کہ کنوارے پن کی زندگی انہیں کس طرح گزارنی ہے۔ ماں باپ کا ادب، بھائی بہن کی خدمت۔ بڑوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے۔ بیاہی لڑکیوں کو خانہ داری، گھر کے حساب کتاب اور بچوں کی پرورش۔ روپے پیسے کا مقصد کیا ہے۔۔۔ خاندان کس طرح بسر کرنی چاہئے۔'' 35

رسالہ عصمت میں پابندی سے شائع ہونے والے اشتہار سے عصمت کے اغراض ومقاصد کا اندازہ ہوتا ہے۔اس کے علاوہ راشدالخیری پہلے شمارے کے اداریے میں اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں کے یہاں ہندوستان سے باہر بھی عرب، ایران، مصر، اندلس میں ایسی خواتین ہو گزریں ہیں جن سے علماء سبق پڑھتے تھے اور اب بھی تعلیم وتربیت کے معاملے میں اسلامی مما لک میں وہ تنگ خیالی نظر نہیں آتی جو ہندوستان پر مسلط ہے۔اس میں شک نہیں کہ ابھی بھی ملک میں ایسی خواتین کی تعداد محدود ہے جو اہل الرائے ہوں۔۔۔یہ ماہواری رسالہ اسی غرض سے جاری کیا گیا ہے کیوں کہ ہر شریف بی بی کی سیرت کے لئے 'عصمت' سے زیبا تر زیور دنیا میں نہیں۔حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت ہو اور حسن سیرت زیور عصمت سے آراستہ ہو۔۔۔عصمت خود مستورات کے تقاضے سے جاری ہوا ہے۔ایک خاص ضرورت اس رسالے کے جاری کرنے کی پیدا ہوئی اور وہ ہے مقامی ضرورت کہ دلی کے شریف خاندانوں میں شرافت کا ایک نشان باقی ہے کہ عورتوں کی خواندگی کس حد تک جاری ہے اور اس لئے اس رسم میں تھوڑا سا تغیر کرنے سے بہت سی لڑکیاں مروجہ تعلیم سے بہرہ ور ہوگئی ہیں۔ان کو آرزو تھی کہ دہلی میں ایک پرچی ایسا ہو جسے وہ آسانی سے پڑھ سکیں اور اپنے مضامین شائع کراسکیں۔چونکہ یہ رسالہ بیبیوں کا رسالہ ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ اول بیبیوں کے مضامین اس میں درج ہوا کریں اور مردوں کے ان کے بعد صرف نمونہ اور مثال کے طور پر۔''36

مولانا راشدالخیری کا واحد مقصد یہی تھا کہ وہ خواتین جو تعلیم وتمدن میں مردوں سے پیچھے ہیں ان میں تعلیم کو فروغ دیا جائے تاکہ وہ اپنے منصب اور فرائض کو سمجھ سکیں اور آئندہ کی زندگی میں وقار واحترام حاصل کرسکیں۔ 1908 میں جب عصمت منظر عام پر آیا اس وقت بمشکل چند خواتین تھیں جو علمی ذوق رکھتی تھیں۔لیکن عصمت اور اس عہد کے دیگر مستورات کے رسائل نے وہ فضا پیدا کی کہ بہت جلد خواتین قلم کاروں کی تعداد سیکڑوں میں پہنچ گئی۔اور آج بھی علم وادب کے کسی بھی میدان میں وہ مردوں سے پیچھے نہیں نظر آتی ہیں۔

رسالہ عصمت مختلف کالموں پر مشتمل تھا۔جن میں کچھ کالم ایسے تھے جو مستقل شائع ہوتے تھے۔'چند باتیں' کے نام سے رسالے کا اداریہ ہوتا تھا۔'بزم عصمت' نامی کالم بہت دلچسپ ہوتا اس کے تحت خواتین کے خطوط شائع کیے جاتے تھے۔'سیر بین (دوربین)' اس مستقل عنوان کے تحت ملکی وغیر ملکی سطح پر ہونے والے حالات وواقعات کی خبریں شائع کی جاتی تھیں۔اس کے علاوہ ایوان نعمت، خانہ داری وغیرہ بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔عصمت نے اپنے اسی (80) سالہ طویل سفر میں متعدد خاص نمبر نکالے۔ان کی تفصیل ذیل میں دی جاری ہے۔رسول نمبر جنوری ،فروری 1917، جوبلی نمبر جون 1928، سالگرہ نمبر جولائی اگست 1933، پچاس سالہ جوبلی نمبر جولائی

اگست 1958،الماسی جوبلی نمبر جولائی اگست 1968،رازق الخیری نمبر ستمبر 1981،بیگم شائستہ اکرام نمبر اگست 1986،سالگرہ نمبر اکتوبر 1992وغیرہ اہم ہیں۔

رسالہ عصمت کے قلمی معاونین مردعورت دونوں ہوتے تھے مگر مضامین صرف عورتوں کے متعلق شائع کئے جاتے تھے۔خاتون قلم کاروں میں زہرہ فیضی،عطیہ فیضی،نذر سجاد،سلطانہ بیگم،صالحہ عابد حسین،حجاب امتیاز علی،زاہدہ خاتون،حامدہ بیگم،بیگم بھوپال،برج کماریاورامیر النسا فیضی شامل ہیں۔اس کے علاوہ مرد قلم کاروں میں نذیر احمد ،مولانا حالی،حکیم اجمل خاں،شیخ عبد القادر،حسن نظامی،عزیز لکھنوی،شوق قدوائی،سرور جہان آبادی،اعظم کریوی،قادری زور،نصیر الدین ہاشمی،ماہر القادری،سید وقار عظیم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔خواتین میں تعلیمی بیداری کے سبب یہ رسالہ اردو کی ادبی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔

الناظر:

ظفر الملک علوی کی ادارت میں لکھنؤ سے 1909 میں جاری ہوا۔اس رسالے کے مالک منشی سخاوت علی علوی تھے۔الناظر میں اصناف ادب کے مختلف عنوانات کے علاوہ تاریخ ،سائنس،اسلامیات،سیاست اور دیگر عنوانات کے تحت مضامین شائع ہوتے تھے۔لیکن ادبی مضامین کو فوقیت دی جاتی تھی۔ابتدا سے ہی اسے مایہ ناز قلم کاروں کا تعاون حاصل رہا جن میں علامہ شبلی،سید سلیمان ندوی،عبدالسلام ندوی،تاجور نجیب آبادی،شاد عظیم آبادی،اختر جوناگڑھی،عبدالماجد دریابادی،مسعود حسن رضوی ادیب،حسرت موہانی،اثر لکھنوی،اور شرر کاکوروی شامل ہیں۔اثر لکھنوی جن کی عالمی شناخت بحیثیت شاعر ہے وہ ابتدا میں افسانہ بھی لکھا کرتے تھے ان کا ایک طویل افسانہ 'ناکام' کے عنوان سے الناظر میں تین قسطوں میں شائع ہوا تھا۔'نظرے خوش گزرے' اس رسالے کا ایک مستقل باب تھا جو اداریے کے لیے مخصوص تھا۔اسے الناظر کے مدیر ظفر الملک علوی لکھا کرتے تھے۔الناظر کا اداریہ ایک قسم کا خبر نامہ تھا جس میں سیاسی، مذہبی، علمی، تعلیمی، اور عصر حاضر پر تبصرہ بھی شامل ہوتا تھا۔دیگر رسائل کی طرح وسائل کی قلت کے سبب الناظر بھی 1937 میں بند کر دیا گیا۔مدیر زمانہ دیا نرائن نگم لکھتے ہیں:

> ''حال میں مجھے بہت افسوس سے معلوم ہوا ہے کہ ہم عصر 'الناظر' بھی نقصان عظیم کے ساتھ جاری ہے۔اس کے ایڈیٹر میرے دوست مولانا ظفر الملک صاحب بھی اردو کی ترقی کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکے ہیں اور گو موصوف تحریک عدم تعاون کی بدولت کچھ عرصہ قید فرنگ میں رہے لیکن ان کی عدم موجودگی میں ان قابل بیگم صاحبہ نے جس طرح ہوسکا الناظر کی اشاعت جاری رکھی ۔مولانا ظفر الملک نے حال میں ہم کو لکھا تھا کہ الناظر کی اشاعت میں کافی توسیع نہیں ہوئی تو آخر رسالہ بند ہی کرنا پڑے گا۔''37

معارف:

دارالمصنفین ہندوپاک بالخصوص عالم اسلام میں محتاج تعارف نہیں بلاشبہ ہندوستان کا مایہ ناز علمی و تصنیفی ادارہ ہے۔ماہ نامہ معارف دارالمصنفین کا علمی ترجمان ہے،جس کا خاکہ علامہ شبلی نے تیار کیا تھا۔معارف کا پہلا شمارہ جولائی 1916 میں منظر عام پر آیا۔اس دن سے آج تک یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری ہے۔اردو زبان کا شاید ہی کوئی رسالہ ان خصوصیات کا حامل ہو۔ماہنامہ معارف اپنے عہد کے بلکہ اب تک کے تمام رسالوں سے کئی حیثیتوں سے انفرادیت کا حامل ہے۔مثلاً اداریہ کی جگہ شذرات کا ہونا،مختلف عنوانات کے تحت کالموں کی تقسیم۔علمی،ادبی،تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ اسلامی مضامین کا شائع کرنا۔معارف کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اسے جس پایے کے مدیر،مضمون نگار اور اداریہ نویس ملے شاید ہی کسی دوسرے رسالے کو ملے ہوں۔سید سلیمان ندوی معارف کے اغراض و مقاصد کے متعلق معارف کے پہلے شمارے میں رقم طراز ہیں:

>''رسالہ کا پہلا نمبر ہم رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں شروع کرتے ہیں کہ ہمارے علوم و معارف کی سب سے پہلی کتاب اس ماہ مقدس میں نازل ہوئی تھی۔شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن۔حاشیہ نشینان بساط شبلی نے اس محسن کی یاد میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنی بساط بھران کی تمام تحریکوں کو زندہ رکھیں گے،دو سال کی گذشتہ مدت دارالمصنفین کے قیام و تاسیس میں صرف ہوگئی۔اب جب ادھر سے اطمینان میسر آیا تو دوسرے فرائض یاد آئے۔ان میں ایک معارف کا اجرا بھی تھا۔ہم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ملک ایک خاص علمی رسالہ کی اعانت کے لئے کہاں تک تیار ہے۔تاہم ہر شخص اپنے فرائض کا ذمہ دار ہے۔دارالمصنفین علامہ مرحوم کے ان ہی تخیلات کا نتیجہ تھا اور ہم اپنی کائنات کے مطابق ان ہی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کام شروع کرنا چاہتے ہیں۔مندرجہ بالا خیالات کے مطابق معارف سے جن خدمات کی توقع رکھنی چاہئے اور اس کے مقاصد میں جو نوعیت ہوگی وہ حسب ذیل ہے: فلسفہ حال کے اصول اور اس کے متعدد بہ حصہ پبلک میں لایا جائے،عقائد اسلام کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جائے۔علوم قدیمہ کو جدید طرز پر از سر نو ترتیب دیا جائے۔علوم اسلام کی تاریخ لکھی جائے اور بتایا جائے کہ اصل حصہ کہاں تک تھا اور مسلمانوں نے اس پر کیا اضافی کیا۔علوم مذہبی کی تدوین اور اس کے عہد بعہد کی ترقیوں کی تاریخ ترتیب دی جائے۔اکابر سلف کی سوانح عمریاں لکھی جائیں جن میں زیادہ تر ان کے مجتہدات اور ایجادات سے بحث ہو۔عربی زبان کی نادرالفن اور کمیاب کتابوں پر ریو یو لکھا جائے اور دیکھا جائے کہ ان خزانوں میں ہمارے اسلاف نے کیا کیا زرو جواہر امانت رکھے ہیں اور سب سے آخر لیکن سب سے اول یہ کہ قرآن مجید کے متعلق عقلی،ادبی،تاریخی،تمدنی اور اخلاقی مباحث جو پیدا ہوگئے ہیں ان پر محققانہ مضامین شائع کئے جائیں۔''38

معارف کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال اس رسالہ کو باقاعدہ پڑھتے تھے اورانھوں نے سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے:

''یہی ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔39''

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں! صرف یہی کہ ایک پرچہ ہے اور ہر طرف سناٹا ہے ۔بحمد اللہ شبلی مرحوم کی تمنائیں رائگاں نہیں گئیں اور صرف آپ کی بدولت ایک ایسی جگہ بن گئی جو خدمت علم وتصنیف کے لیے وقف ہے۔''40

اس کے علاوہ بھی کئی اہم شخصیات نے معارف کے متعلق اپنے تأثرات کا اظہار کیا ہے۔معارف کے سابق مدیر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اپنی ایک تحریر میں ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ ایک صاحب ہارورڈ یونیورسٹی میں مطالعہ کے لیے گیے تو لائبریرین نے ان سے پوچھا کہ کہاں سے تشریف لائے ہیں،انہوں نے کہا اعظم گڑھ سے ،لائبریرین نے کہا وہی اعظم گڑھ سے جہاں سے رسالہ معارف نکلتا ہے۔اس تمام باتوں سے معارف کی بین الاقوامی شہرت کا اندازہ ہوتا بلکہ یہ سچ ہے کہ معارف صرف ایک رسالہ نہیں ایک تاریخ،ایک روایت اور ایک بیش بہا خزانہ ہے۔معارف انفرادیت اور مقبولیت کی کا ایک سبب اس کے مدیران بھی ہیں جن میں سید سلیمان ندوی،مولانا عبدالماجد دریابادی،شاہ معین الدین ندوی،سید صباح الدین عبدالرحمٰن،عبدالسلام قدوائی ندوی،مولانا ضیاء الدین اصلاحی،مولانا ریاست علی ندوی،مولانا عبدالماجد دریابادی،مولانا ضیاء الدین اصلاحی،پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اور مولانا عمیر الصدیق ندوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

معارف نے الگ الگ کالموں کے تحت اردو ادب کے الگ الگ شعبوں کی خدمت کی ہے۔معارف نے اداریہ کی جگہ شذرات لکھے ہیں اور ان شذرات میں بین الاقوامی سطح پر مسائل حاضرہ سے متعلق قارئین کو عالمی مسائل سے آگاہ کیا ہے۔معارف نے وفیات نگاری کے ذریعہ ماضی کی یادوں کا ایک البم تیار کر دیا ہے۔علماء وادبا،سماجی اور سیاسی شخصیات کی موت پر وفیات نگاری کی طرح ڈالی جسے پڑھ کر آنکھیں آبدیدہ ہو جاتی ہیں۔معارف کے کالموں میں شذرات،اخبار علمیہ،اثار علمیہ وادبیہ ،وفیات،مترجمات،ادبیات،باب المراسلہ والمناظرہ،تلخیص و تبصرہ،مطوعات جدیدہ اور باب التقریض والانتقادیات قابل ذکر ہیں ان میں سے اکثر مسلسل اور بعض وقفہ وقفہ سے حسب ضرورت شائع ہوتے رہے ہیں۔ماہنامہ معارف کی ایک خوبی جو شاید اسی رسالہ کے ساتھ خاص ہو کہ اس کا کوئی شمارہ ناغہ نہیں ہوا ہے۔ایک صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مسلسل شائع ہو رہا ہے اور اس کے تمام شمارے نہ صرف محفوظ ہیں بلکہ اہل قلم کے استفادہ کے لیے آن لائن کر دیے گئے ہیں۔

معارف بنیادی طور پر ایک علمی اور تحقیقی رسالہ ہے۔جس کے زیادہ تر مضامین علمی اور تحقیقی ہوتے ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے ان کا تنوع بھی دیدنی ہے۔ مثلاً سیرت،قرآن وحدیث،تاریخ،تصوف،تعلیم وتربیت،سیاست،زبان وادب،علوم وفنون،تحریکات،لسانیات،اقبالیات،غالبیات،قلمی نسخے،مخطوطات اور متفرقات وغیرہ جیسے موضوعات کا شعبہ معارف ایک خزانہ ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ معارف کے لکھنے والے بھی ہمیشہ سے بلند پایہ کے عالم،ادیب اور نقاد رہے ہیں جن میں اکبرالہ آبادی،علامہ اقبال،جگن ناتھ آزاد،ڈاکٹر محمد ابراہیم ڈار،ابوالحسن علی ندوی،ابوالیث صدیقی،احمد میاں اختر جونا گڑی،خواجہ احمد فاروقی،حافظ احمد علی خان شوق،پروفیسر اکبر حیدری کشمیری،پروفیسر اکبر رحمانی،ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، امیاز خان عرشی،ڈاٹر امیر حسن عابدی،پروفیسر نذیر،ڈاکٹر ایوب قادری،پروفیسر تاثیر،تحسین سروری،تمکین کاظمی،جعفرعلی خان اثر لکھنو،مولوی حامد حسن قادری،ڈاکٹر حامداللہ ندوی،حبیب الرحمٰن خان شیروانی،پیرحسام الدین راشدی،پروفیسر سید حسن،ڈاکٹرمحمد حمید اللہ،خلیق احمد نظامی،رشید احمد صدیقی،ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی،سخاوت مرزا،پروفیسرمحمد سلیم،شاہ عظیم آبادی،شبیر احمد خاں غوری،ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی،ڈاکٹر شریف حسین قاسمی،ڈاکٹر محمد حمید اللہ،شوکت سبزواری،پروفیسر ضیا احمد،ضیاالدین احمد،ضیاالدین برنی،عابد رضا بیدار،سید عبد الباری ندوی،عبدالحلیم چشتی ندوی،پروفیسر خواجہ عبد حمید،ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی،عبدالحیٔ ندوی،عبدالرحمٰن نگرامی ندوی،عبداللہ چغتائی،عبدالماجد دریابای،ڈاکٹر عبد الغنی،ڈاکٹر عطش درانی،علی جوواد زیدی،غلام رسول مہر،ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین ربانی،صوفی غلام مصطفیٰ تبسم،کالی داس گپتا رضا،کبیر احمد جائسی،کلب علی خان،گوپی چند نارنگ،ڈاکٹر لطیف حسین ادیب،مالک رام،حافظ حبیب اللہ ندوی،مولوی محفوظ حق،محمد علی خان اثر رامپوری،ڈاکٹر مختارالدین آرزو،پروفیسر مسعود حسن،پرفیسر مسعود احمد،مسعود عالم ندوی،ڈاکٹر معین الدین عقیل،سید مقبول احمد،مولانا مناظر حسن گیلانی،مولانا عبد العزیز میمنی،نظیر اشرف ندوی،حفظ نذیر احمد،نصیرالدین ہاشمی،ڈاالکٹرنورالحسن ہاشمی،راہی فدائی،سید وحید اشرف ندوی،سید وقار عظیم،سید ہاشمی فرید آبادی قابل ذکر ہیں جنہوں نے اپنی عمدہ تحروروں سے معارف کو زینت بخشی۔

علی گڑھ میگزین:

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ترجمان ماہنامہ علی گڑھ میگزین کا اجرا1920 میں عمل میں آیا۔یہ علمی وادبی نوعیت کا رسالہ تھا۔جس کے مدیر رشید احمد صدیقی تھے۔علی گڑھ میگزین دراصل علی گڑھ منتھلی کا بدلا ہوا نام تھا جو جنوری 1903 میں جاری ہوا تھا۔رشید احمد صدیقی کے بعد ادارت یونیورسٹی کے طلبہ کے ذمہ کردی گئی اور اساتذہ میں سے کوئی اس کے نگراں مقرر ہوتے رہے۔بنیادی طور پر یہ ایک میگزین تھی مگر اس کی اہمیت اور خدمات کسی رسالے سے کم نہ رہی۔ہمیشہ سے اسے نمایاں قلم کاروں کا تعاون حاصل رہا۔اس کے قلمی معاونین میں مولوی ذکاءاللہ،اکبرالہ

آبادی، وحید الدین سلیم ،اسلم جیراجپوری ،اقبال سہیل ،ذاکر حسین ، یلدرم ،مولوی عبدالحق ،جگر، جوش ،فانی ، جاں نثار اختر، جذبی ،خلیل الرحمٰن اعظمی ،آل احمد سرور ،اسلوب احمد انصاری اور مسعود حسین خاں وغیرہ شامل ہیں ۔علی گڑھ میگزین نے علمی وادبی مضامین ،تخلیقی نگارشات کے علاوہ اہم خصوصی شمارے بھی شائع کئے ۔جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔اقبال نمبر 1938 ،علی گڑھ نمبر 1939 ،احسن مارہروی نمبر 1941 ، غالب نمبر 1943 ، اکبرالہ آبادی نمبر 1950 ،طنزوظرافت نمبر 1953 ،علی گڑھ نمبر 1953,55 ،مجاز نمبر 1945 وغیرہ۔

رسالہ اردو:

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کا یہ سہ ماہی رسالہ جنوری 1921 میں جاری کیا گیا۔اس کے ایڈیٹر مولوی عبد الحق تھے۔انجمن ترقی اردو ہند کا قیام 4 جنوری 1903 عمل میں آیا۔لیکن باضابطہ عملی اقدام اپریل 1903 سے ہوا۔انجمن کا مقصد اردو زبان کی اصلاح ،اردو زبان وادب کا فروغ ،اردو کے قدیم ذخیروں کی حفاظت اور ادبی کتابوں کی اشاعت تھا۔اس کے صدر پروفیسر سرٹامس واکر آرنلڈ تھے۔نائب صدر ڈپٹی نذیر احمد ،مولوی ذکاء اللہ،الطاف حسین حالی رہے۔علامہ شبلی نعمانی نہ صرف اس رسالے کے سیکریٹری تھے بلکہ انجمن ترقی اردو کا دستورعمل بھی تیار کیا تھا۔اس کے علاوہ اقبال ،عبدالحلیم شرر ،حسرت موہانی ،شاد عظیم آبادی ،مولانا آزاد ،مولوی وحید الدین سلیم ،سید احمد دہلوی ،عبدالرحمٰن بجنوری ،مولوی عبدالحق ،عبدالماجد دریابادی ،ڈاکٹر تاراچند وغیرہ بھی مختلف اوقات میں منسلک رہے۔مولوی عبدالحق 1912 میں انجمن کے سکریٹری منتخب ہوئے ۔انجمن کو جب ذرا استحکام حاصل ہوا تو مولوی عبدالحق نے انجمن کا ترجمان رسالہ اردو جنوری 1921 میں جاری کیا ۔ 1947 تک یہ رسالہ نکلتا رہا مگر تقسیم ہندوپاک کے بعد پاکستان اور ہندوستان میں الگ الگ انجمن قائم ہوئیں ۔ ہندوستان کی انجمن کا قیام علی گڑھ میں عمل میں آیا۔جس کے بعد یہ رسالہ اردو کے بجائے اردو ادب ہو گیا۔اس سلسلے میں آل احمد سرور لکھتے ہیں:

> ''تقسیم ہند کے بعد جو ہولناک واقعات پیش آئے ۔ان کا اثر تہذیبی اور علمی اداروں پر بھی پڑا ۔دہلی میں جب قیامت صغریٰ قائم ہوئی تو انجمن ترقی اردو ہند کا دفتر بھی اس محفوظ نہ رہ سکا۔اگر مولانا ابوالکلام آزاد آخری وقت میں کتب خانے کی حفاظت کے لئے فوجی انتظام نہ کرتے تو شاید یہ قیمتی خزانہ بالکل برباد ہو جاتا ، پھر بھی فوجی گارڈ کے آنے سے پہلے سیکریٹری کا سامان اور دفتر اور کتب خانے کا ایک حصہ ضائع ہو چکا تھا۔جب یہ طے ہوا کہ موجودہ حالات میں انجمن ترقی اردو ہند کا کام ہندوستان اور پاکستان میں بالکل علاحدہ آزاد اور خودمختار حیثیت سے ہوگا۔تو علی گڑھ میں اس کا صدر دفتر قائم کیا گیا۔ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اس کے صدر اور قاضی عبدالغفار اس کے سیکریٹری مقرر ہوئے ۔مجلس نظما کی نئے سرے سے تشکیل ہوئی ۔انجمن کا نیا دستور وضع ہوا اور یکم مئی 1950 کے جلسے میں متفقہ طور پر منظور ہوا۔انجمن کا پندرہ روزہ اخبار

ہماری زبان جنوری1950 سے نکل رہا ہے اور اب جولائی 1950 سے اس کا سہ ماہی ادبی رسالہ اردو ادب شائع کیا جا رہا ہے۔'' 41

رسالہ اردو ادب اردو زبان وادب اور اردو زبان کی تعلیم وترقی کے لئے وقف تھا۔اس میں علمی وادبی مضامین کے ساتھ ساتھ انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں کو بھی شائع کیا جاتا تھا۔اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں اس کا اہم رول رہا ہے۔رسالہ اردو پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر محمد یونس رقم طراز ہیں:

''رسالہ اردو ایک خالص ادبی رسالہ تھا۔یہ جس وقت جاری ہوا اس وقت دلگداز،الناظر،اردوئے معلیٰ،العصر اور بزم جیسے متعدد اور مختلف النوع اعلی پائے کے رسالے شائع ہو رہے تھے۔لیکن'اردو' نے ان تمام رسائل کے مقابلے اپنی انفرادیت ہمیشہ برقرار رکھی چنانچہ خالص ادبی نقطہ نظر سے اس کا مقام ان تمام رسالوں سے بلند ہے۔یہ خصوصیت ثمرہ تھی ان اغراض ومقاصد کا جن کا تعین اس کے اجرا کے وقت بھی کر دیا گیا تھا۔'' 42

رسالہ اردو ہمیشہ سے اپنے معیار پر باقی رہا۔اردو کے ایک بڑے محقق مولوی عبدالحق کی سرپرستی میں اس رسالے نے تنقید کے ساتھ ساتھ اہم تحقیقی خدمات بھی انجام دی۔نہ صرف اردو کے ادبی صحافت کو بلند کیا بلکہ اردو کے بہت سے گم شدہ اوراق کے تلاق وتحقیق کا بھی کام کیا۔آل احمد سرور رسالہ اردو کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انجمن ترقی اردو ہند کے رسالہ اردو نے 1922 سے 1947 تک اردو میں تحقیق وتنقید کا ایک اعلی معیار قائم کیا۔اس نے ماضی کے سیکڑوں تاریک گوشوں کو روشن کیا۔اس نے ادبی بت توڑے اور بنائے۔اس نے تنقید کو تحسین وتاثر سے آگے بڑھا کر علمی اور سائنٹفک بنایا۔'' 43

انجمن ترقی اردو ہند سے ایک ہفتہ وار اخبار'ہماری زبان' بھی نکلتا ہے۔یہ ادارہ اپنے قیام سے لے کر آج تک اردو کی اشاعت اور ترقی میں منہمک ہے۔اس نے ہمیشہ سے اردو کے خلاف اٹھنے والے آواز کا منھ توڑ جواب دیا ہے۔اس کے علاوہ اردو کی ترویج کے لئے مختلف زبانوں سے اردو میں ڈکشنریاں،اور اصطلاحین تیار کی ہیں۔اردو شعرا کے تذکرے،قدیم کتابوں کی اشاعت،اردو زباب کے قواعد اور علمی وادبی کتابوں کے تراجم سے اردو کی خدمت کی ہے۔انجمن کا ترجمان رسالہ'اردو' میں علمی،ادبی اور تحقیقی وتنقیدی مضامین کی اشاعت کر کے ادبی صحافت کے معیار کو مستحکم کیا ہے۔ڈاکٹر رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''انجمن کا مشہور ومعروف سہ ماہی رسالہ'اردو' ہندوستان کے نہایت کارآمد اور مشہور رسائل وجرائد میں سے ہے اور اس میں زبان وادب اردو کے متعلق نہایت قابل قدر اور دل چسپ مضامین ہوتے ہیں۔'' 44

انجمن ترقی اردو ہند ایک مدت کے بعد علی گڑھ سے دہلی منتقل کر دیا گیا۔ادارت کی ذمہ داری خلیق انجم کے سپرد ہوئی اور آج بھی یہ رسالہ تسلسل کے ساتھ ہر تیسرے ماہ شائع ہو رہا ہے۔رسالہ اردو ادب اپنے خصوصی نمبروں کی وجہ سے بھی ادبی حلقوں میں منفرد شناخت رکھتا ہے۔اس کے خصوصی شماروں میں قلی قطب شاہ نمبر،شبلی نمبر،عبدالحق نمبر،غالب نمبر،قاضی عبدالغفار نمبر،اختر انصاری نمبر،اشرف صبوحی نمبر،فراق نمبر،فیض احمد فیض نمبر،ذوق نمبر،آنند نارائین ملا نمبر،اس کے علاوہ خصوصی نمبروں کی ایک بڑی تعداد ہے اور ہر شمارہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔رسالہ اردو کا عام رسالہ بھی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہمایوں:

ایک علمی جریدہ تھا جس کی ابتدا جنوری 1922 میں ہوئی۔اسے میاں بشیر نے اپنے والد جسٹس شاہ دین ہمایوں کی یاد میں لاہور سے جاری کیا تھا۔اس رسالے میں علمی،ادبی اور سیاسی مضامین کو خاص طور پر جگہ دی جاتی تھی۔رسالہ میں مختلف عناوین قائم کیے گئے تھے،مثلا بزم ہمایوں،جہاں نما،محفل ادب،آپ اور ہم،مطبورات ومراسلات وتبصرات۔بزم ہمایوں یہ سالانہ اداریہ تھا جو ہر سال جنوری کے مہینہ میں لکھا جاتا تھا۔آپ اور ہم یہ بھی ایک قسم کا اداریہ تھا جو ہر سال دسمبر میں لکھا تھا جاتا تھا۔جس میں قارئین (آپ) اور ایڈیٹر (ہم) کے درمیان گفتگو ہوتی تھی۔ہمایوں کے اغراض ومقاصد کا انداز ااس اشتہار سے لگایا جاسکتا ہے جو قواعد کے عنوان سے ہر شمارے کے بیک ٹائٹل پیج پر شائع ہوتا تھا۔چند نمایاں مقاصد یہاں درج کئے جارہے ہیں:

۱۔ ہمایوں ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی وادبی،تمدنی واخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیار ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ خلاف تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جائیں گے۔

ہمایوں کے ادارتی معاونین میں تاجور نجیب آبادی،حامد علی خاں،یوسف ظفر،مظہر انصاری،ناصر علی کاظمی اور اس کے علاوہ علامہ اقبال اور سر عبدالقادر اس رسالے کے سرپرست رہ چکے ہیں۔جنوری 1922 کے شمارے میں مدیر بشیر احمد لکھتے ہیں:

> ''چار سال ہوئے کہ 'ہمایوں' والد مرحوم ومغفور کی یاد بن کر اردو ادب کی محفل میں حاضر ہوا۔اس مدت میں اس سے جو کچھ بن پڑا اس نے پیش کیا اور اس بات سے میں مطمئن ہوں کہ اس کی خوبیاں حضرت ہمایوں کی یاد کا نتیجہ ہیں۔''45

ہمایوں علمی وادبی اور ثقافتی رسالہ تھا جس ہندوستان کے بلند پایہ اور معیاری جریدوں میں شمار ہوتا تھا۔یہ

رسالہ 1957 تک مسلسل جاری رہا 1958 میں اس کا سالنامہ چھپا اور پھر یہ رسالہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔

نگار:

نگار کا اجرا اردو کے مشہور ادیب نیاز فتح پوری نے فروری 1922 میں بھوپال سے کیا۔لیکن کچھ عرصہ بعد اسے لکھنؤ منتقل کر دیا گیا جہاں بڑے آب وتاب کے ساتھ 1957 تک نکلتا رہا۔1962 میں نیاز فتح پوری کے پاکستان ہجرت کرنے بعد یہ رسالہ بھی پاکستان منتقل ہوگیا اور پاکستان سے نگار پاکستان کے نام سے شائع ہونے لگا ۔نیاز فتح پوری کی جدت پسند طبیعت کا اندازہ نگار کے صفحات سے عیاں ہے۔نگار مختلف عنوانات پر مشتمل تھا ۔'ملاحظہ' جس کے تحت حالات حاضرہ پر روشنی ڈالی جاتی اور تبصرہ کیا جاتا تھا۔اس میں اکثر سیاست پر تبصرے شائع کیے جاتے لیکن اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے مسائل کو بھی موضوع بنایا جاتا تھا ۔نگار کا ایک اور عنوان 'باب الاستفسار' تھا۔اس کالم کی نوعیت علمی تھی ۔اس باب کا بنیادی مقصد روشن خیالی اور عقلیت پسندی کا فروغ تھا۔علمی موضوعات پر سوال وجواب بھی شائع ہوتے تھے۔'مالہ وماعلیہ' عنوان کے تحت شعری محاسن اور معائب پر بحث کی جاتی تھی ۔جوش،جگر، سیماب اکبر آبادی، ماہر القادری، اثر لکھنوی اور علی سردار جعفری جیسے ممتاز شعرا کے کلام پر تنقید کی گئی اور ان کی بد احتیاطیوں سے متنبہ کیا گیا۔اس علاوہ نئے لکھنے والوں کی رہنمائی اور تربیت بھی کی جاتی تھی ۔مثال طور پر سیماب اکبر آبادی کا ایک شعر دیکھئے جس کی اصلاح کرتے ہوئے نیاز فتح پوری نے لکھا تھا:

"کبھی مدعا سے گریز پا کبھی مدعا کی تلاش ہے

اس شعر پر نیاز فتح پوری کو اعتراض تھا کہ لفظ 'گریز پا' ناپائیدار کے معنی میں مستعمل ہے۔انہوں نے مصرعہ یوں تبدیل کرنے کا مشورہ دیا۔

کبھی مدعا سے گریز ہے کبھی مدعا کی تلاش ہے۔" 46

نگار کا سلسلہ 'مالہ وماعلہ کافی ہنگا خیز ہوتا تھا۔نگار کو مشاہر قلم کاروں کا تعاون حاصل تھا۔نیاز فتح پوری اور فرمان فتح پوری جیسے بلند پایہ ادیب اس کے مدیر تھے۔انہوں نے اپنے رسالے کے ذریعے نہ صرف ادبی صحافت کو مستحکم کیا بلکہ نگار کو صف اول کے رسالوں میں جگہ دلائی۔نگار کی مقبولیت ایک سبب ہر سال نکلنے والے خصوصی نمبر ہیں۔نگار کے خصوصی نمبر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ملاحظات نمبر جنوری 1926،مومن نمبر جنوری 1928، بہادر شاہ ظفر نمبر جنوری 1930،غالب کی سوخیاں نمبر جنوری 1932،اسلامی ہند نمبر جنوری 1938،نظیر نمبر جنوری 1940،معاصر غزل گو نمبر جنوری 1941،معاصر غزل گویوں پر تنقید نمبر جنوری 1942،جدید شاعری نمبر جنوری 1944،مآخذ القرآن نمبر جنوری 1945،تنقید نمبر جنوری ،فروری 1950،حسرت نمبر جنوری، فروری 1952،اصناف سخن نمبر جنوری 1957،نظیر نمبر مئی 1962،سرسید نمبر حصہ اول نومبر، دسمبر 1970،سرسید

نمبر حصہ دوم جنوری ،فروری 1971 ،جشن طلائی نمبر، نیاز ونگار نمبر جنوری ،فروری 1982 ،فن تاریخ گوئی نمبر نومبر، دسمبر 1982، ہندی شاعری نمبر فروری ،مارچ 1984 ،کتابیات تحقیق نمبر ستمبر 1991 ،مولوی عبدالحق نمبر اگست 1992 ،عورت اور فنون لطیفہ نمبر دسمبر ,1992 ،مشکلات غالب از نیاز فتح پوری اکتوبر 1993 ،وغیرہ۔ڈاکٹر شرف الدین نگار کے نمبرات کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اس رسالے کی سب سے عمدہ خوبی یہ تھی کہ یہ سال کے آخر میں کسی اہم موضوع پر خصوصی شمارہ پیش کرتا تھا۔نگار نے بہت سے اہم شعرا کے نمبر نکالے جیسے مومن ،غالب ،بہادر شاہ ظفر وغیرہ۔''47

اردو کی ادبی صحافت اور جریدہ نگاری پر نگار کے اثرات غیر معمولی ہیں۔اس رسالے نے تجدید کا آفتاب روشن کیا اور فکر ونظر کی کرنوں کو دور دور تک پھیلانے میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔اس پرچے کی خدمات سے آج بھی لوگ استفادہ کرر ہے ہیں۔

جامعہ:

جامعہ ملیہ اسلامیہ 1920 میں علی گڑھ میں قائم ہوئی۔قیام کے بعد اس کے ترجمان کی ضرورت محسوس ہوئی تو رسالہ جامعہ جنوری 1923 میں جاری کیا گیا۔یہ ایک علمی وفکری رسالہ ہے۔اس میں جامعہ کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ وقیع علمی وادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔قومی وبین الاقوامی حالات، سیاست اور نئے علوم کے تعارف وتنقید کا زریں سلسلہ بھی جامعہ کے صفحات میں جاری وساری تھا۔رسالہ جامعہ کا بنیادی مقصد فروغ تعلیم اور قومی نصب العین ہے۔

1947 کے بعد تین سال اشاعت کا سلسلہ منقطع ہوگیا بعد میں اسے 1960 میں پھر شروع کیا گیا اور اس کے بعد سے آج تک یہ رسالہ تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔اس رسالے کے مدیروں میں ڈاکٹر عابد حسین ،نورالحسن ہاشمی، اور، پروفیسر محمد عاقل، اسلم جیراج پوری، پروفیسر عمادالحسن ،آزاد فاروقی، پروفیسر شمیم حنفی اور پروفیسر اختر الواسع جیسے لوگوں کے نام شامل ہیں۔رسالہ جامعہ اس معنی میں اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں پنڈت جواہر لعل نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، شفیق الرحمٰن قدوائی، سید وقار عظیم ،قاضی عبدالغفار، آل احمد سرور، اختر انصاری، امداد صابری، مرزا فرحت اللہ بیگ، نصیر الدین ہاشمی ،عبدالماجد دریابادی، اور شوکت سبزواری جیسے معتبر قلم کاروں کا تعاون حاصل رہا ہے۔رسالہ جامعہ کے مقاصد اور اس کے اجرا کی غرض وغایت کو سمجھنے کے لئے جنوری تا جون 1923 کے اداریہ بقلم نورالرحمٰن پیش کیا جاتا ہے:

> ''ہر دارالعلوم کی یہ بھی قدیمی سنت ہے کہ اس کا ایک مخصوص علمی رسالہ ہو لیکن جامعہ ملیہ اسلامیہ

نے اس کو اس وقت تک ضروری نہیں سمجھا کہ طلبہ کے علمی ذوق ،مشاغل تصنیف وتالیف کی مقبولیت اور جامعہ کی علمی زندگی کی تدریجی ترقی کے ساتھ خود رسالہ کا وجود بھی مسئلہ ارتقا کے عالمگیر اثر میں پیدا نہ ہو جائے ۔چناچہ تقریبا ایک سال تک طلبائے جامعہ اپنے رسالہ جوہر کو قلمی نکالتے رہے اور اس طرح وہ تمام اسباب جو ایک علمی رسالہ کی اشاعت کے لئے ناگزیر ہوتے ہیں خود ہی فراہم ہو گئے جن کی موجودگی میں مجلس تعلیمی کو رسالہ جامعہ کی طبع واشاعت کی منظوری دینا ضروری ہو گیا۔اس عرصہ میں شعبہ تصنیف وتالیف کی گذشتہ یک سالہ کوششوں کے نتائج بھی ظاہر ہونے لگے تھے اور آئندہ کے لئے بھی تنظیم وترتیب کے ابتدائی مدارج سے فراغت حاصل ہو چکی تھی لہذا اس بارگراں کا اس شعبہ کو ذمہ دار قرار دینا زیادہ دشوار نہ ہوا اس اظہار سے غالبا یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ رسالہ جامعہ جو بفضل خدا آج آپ کے ہاتھوں میں ہے کسی رسمی ضرورت یا خارجی اثر سے نہیں بلکہ خود ہی عالم وجود میں آیا ہے۔۔۔اور یہ جامعہ جیسے تعلیمی مرکز کے لئے ہرگز قابل تعجب نہیں ۔جامعہ کے متعلق اس قدر عرض کرنا ضروری ہے کہ گرچہ یہ رسالہ شعبہ تصنیف وتالیف کے زیر نگرانی شائع ہوگا لیکن یہ طلبہ جامعہ کا ہی رسالہ ہے انہیں کا ہاتھ اس کی ترتیب وتہذیب میں انہیں کی ششیں اس کی طبع واشاعت میں اور انہیں کی کاوش ومحنت اس کی علمی وادبی مضامین میں نظر آئے گی۔''48

رسالہ جامعہ چونکہ ایک علمی رسالہ تھا اس لئے ہمیشہ سے اس کی کوشش رہی کی ایسے مضامین شائع کئے جائیں جس سے قارئین تعلیم وتعلم کی طرف متوجہ ہوں ۔یہ متعدد عنوانات کے تحت بٹا ہوا ہے۔اس کی جدت میں سے یہ بھی ہے کہ پورے سال تک صفحات کا شمار ہوتا تھا۔جامعہ کی فائلوں کے مطالعہ سے اندازا ہوتا ہے کہ جامعہ نے ایسے نادر ونایاب موضوعات پر اعلی مضامین پر شائع کئے ہیں جو دیگر رسالوں میں کم نظر آتے ہیں۔

جامعہ کے مختلف کالموں میں ایک کالم ادب کے لئے مخصوص ہے جس میں تنقیدی وتحقیقی مضامین کے علاوہ تخلیقی نگارشات کو بھی شائع کیا جاتا ہے ۔پریم چند کا مشہور افسانہ 'کفن' پہلے پہل رسالہ جامعہ میں ہی شائع ہوا تھا۔رسالہ نے ابتدا سے ہی اپنے معیار کو بنائے رکھا تقریبا ایک صدی کا عرصہ ہونے کو آرہا ہے مگر اس کے باوجود بھی اس کے معیار اور قدر ومنزلت میں کمی نہیں آئی۔

نیرنگ خیال:

جولائی 1924 میں لاہور سے جاری ہوا۔یہ ایک علمی وادبی رسالہ تھا۔اس کے مدیر حکیم محمد یوسف خاں تھے۔اس کے مدیروں میں سلطان رشک اور محمد صدیقی کے نام بھی شامل ہیں۔نیرنگ خیال اردو کے معیاری رسالوں میں سے ایک ہے۔اس کے نادر مضامین ،خوبصورت تصاویر اور پیش کش عمدہ انداز نے قبول عام حاصل کیا۔انہیں

خصوصیات کی بدولت بہت جلد اس نے ممتاز ادیبوں اور باذوق قارئین کا حلقہ بنالیا۔اردو کی ادبی صحافت میں سالناموں اور خاص نمبروں کا سلسلہ نیرنگ خیال ہی کی دین ہے ۔اس کے خاص نمبر اور سالنامے بہت اہمیت کے حامل ہیں ۔اس کے اہم کارناموں میں سے یہ بھی ہے کہ نیرنگ خیال نے اقبال کی زندگی ہی میں 1932 میں اقبال نمبر شائع کیا تھا ۔اپنی انہیں خصوصیت کے بنا پر یہ رسالہ 1947 کے دوران ہندوستان کا سب سے زیادہ چھپنے والا رسالہ بن گیا۔لیکن تقسیم ہند کے بعد عام انسانوں کی طرح اسے بھی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ حکیم یوسف حسن نے اسے پہلے راولپنڈی منتقل کیا اور پھر 1967 میں نیرنگ خیال کی ملکیت سلطان رشک کے نام منتقل ہوگئی اور اب حکیم صاحب مدیر اعلی اور سلطان رشک مدیر ہوئے ۔چونکہ یہ رسالہ باتصویر تھا جسے اس کی جدت تصور کیا گیا۔اسی سے متاثر ہو کر دوسرے رسائل بھی مضمون نگاروں کی تصویر شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ۔ نیرنگ خیال وقت کی پابندی کرتا تھا اور ہر ماہ کی مقررہ تاریخ پر شائع ہوتا ہے ۔جولائی 1925 کے شمارے میں مدیر حکیم محمد یوسف حسن لکھتے ہیں:

> ''نیرنگ خیال کے اجرا سے ہندوستان کے رسائل میں ایک قسم کی سرگرمی پیدا ہوگئی ہے ۔جو رسائل کئی کئی ماہ دیر نکلتے تھے وہ اب نیرنگ خیال کی طرح پابندی اوقات پر مجبور ہیں ۔نیز تمام رسائل کو تصویر شائع کرنے پر مجبور کیا جارہا ہے ۔آگرہ کا علمی اور تاریخی رسالہ 'شمع' بھی نیرنگ خیال کی طرح باتصویر شائع ہونے لگا ہے۔''[49]

نیرنگ خیال میں علمی ،ادبی اور تخلیقی مضامین شائع ہوتے تھے اور یہ تمام مضامین معیاری ہوتے تھے ۔ نیرنگ خیال کے تاریخ ساز مضامین میں شوکت تھانوی کا مضمون 'سودیسی ریل' قاضی عبدالغفار کا مضمون 'لیلی کے خطوط' عظیم بیگ چغتائی کا ظریفانہ افسانہ 'انگوٹھی کی مصیبت' وغیرہ شامل ہیں جو بہت مقبول ہوئے ۔علمی وادبی مضامین کے علاوہ قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے کثرت سے مضامین شائع کیے ۔مسلمانوں کو ہندو مذہب کو جاننے اور سمجھنے کے لیے رامائن نمبر اور ہندو مذہب کے رہنماوں اور رسم ورواج پر بھی کثرت مضامین شائع کئے ۔ نیرنگ خیال کی مقبولیت کا ایک سبب اسکے خاص نمبر کا بے مثل ہونا ہے۔خاص نمبر وں میں عید نمبر 1925،ادبی نمبر 1926،ایڈیٹر نمبر 1930،اقبال نمبر 1932، جوبلی نمبر 1934،افغانستان نمبر 1938،مختصر افسانہ نمبر 1959،غزل نمبر 1967،چینی افسانہ نمبر 1968،فن اور شخصیت ایڈیشن 1984،صبا اکبرآبادی نمبر 1993،ماہیا نمبر 1999 اس کے علاوہ کئی سالنامے بھی شائع ہوئے ۔خاص نمبروں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ قارئین ہمیشہ ان نمبروں کے منتظر رہتے تھے اور نمبر کی اشاعت سے قبل ہی فرمائشیں آنے لگتی تھیں اور اشاعت کے مشاہیر قلم کے توصیفی خطوط بھی آتے تھے ۔ نیرنگ خیال نے صرف اردو ادب کو ہی فروغ ہی نہیں بخشا بلکہ اردو صحافت کے معیار کو بھی بلند کیا ہے ۔ نیرنگ خیال کی مقبولت اور شہرت کا اندازا مشاہیر ادب کی پذیرائی سے بھی لگایا جاسکتا ہے ۔مولانا ظفر علی خان

اپنے اخبار زمیندار میں لکھتے ہیں:

''ادب اردو پر پنجاب نے جو جو احسان کیے ہیں وہ زائد از حد شمار ہیں۔۔۔۔ نیرنگ خیال جس اہتمام سے حکیم یوسف حسن صاحب کے باسلیقہ ہاتھوں میں ہے ان سب کا سرتاج ہے۔۔۔اس کی بے مثال خوبیوں پر نظر ڈال ڈال کر لسان الغیب کی زبان میں بے اختیار پکار اٹھتا ہوں۔'' 50

نیرنگ خیال کی اشاعت کے بعد ادیبوں اور شاعروں نے جس سرگرمی سے اس میں حصہ لیا وہ قابل داد ہے۔مولانا عبدالمجید سالک مدیر انقلاب لکھتے ہیں:

''نیرنگ خیال جب سے جاری ہوا ہے ادبی رسائل کی دنیا میں ایک نمایاں انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔۔۔ہندوستان کے بہترین نثاروں اور شاعروں نے اس کی تزئین میں حصہ لیا ہے۔ظاہر محاسن اس قدر دل آویز ہیں کہ بہت کم یوروپین رسالے اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔'' 51

بہارستان:

اختر شیرانی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ان کا شمار اردو کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ان کے والد محمود خاں شیرانی بھی اردو کے مشاہیر ادبا میں سے تھے۔اختر شیرانی کو رومانی شاعر کی حیثیت سے شہرت ملی۔انہوں نے شعروشاعری کے علاوہ کئی رسالے بھی نکالے۔ 1925 میں ادبی رسالہ انتخاب،1930 میں خیالستان اور 1933 میں رومان جاری کیا۔لیکن ان کا سب مقبول رسالہ بہارستان ہے جس کا آغاز 1926 میں ہوا۔اس میں علمی،ادبی،تنقیدی اور تحقیقی مضامین شائع کئے جاتے تھے۔تخلیقی نگارشات کو ترجیح دی جاتی تھی۔رسالے میں تصاویر کے چھاپنے کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔رسالہ مختلف کالموں پر مشتمل تھا۔ہر کالم کے تحت اس سے متعلق مواد شائع کیے جاتے تھے۔اس رسالے کی مقبولیت کا ایک اہم سبب اردو ادب میں نئے الفاظ وتراکیب کا اضافہ کرنا ہے۔غرض اس نے جہاں اردو ادب کو فروغ بخشا ہے وہیں ادبی صحافت کے معیار کو بھی بلند کیا۔

ادبی دنیا:

ادبی دنیا کا اجرا 1929 لاہور سے ہوا۔اس کے بانی تاجور نجیب آبادی تھے۔1932 سے 1938 کے درمیان منصور احمد،حفیظ ہوشیار پوری،اور عاشق حسین بٹالوی نے ادارتی فریضہ انجام دیا۔1938 سے اس کا دارت کی ذمہ داری خود مولانا صلاح الدین نے لے لی اور معاون مدیر کی حیثیت سے میرا جی ساتھ رہے۔میرا جی کے بعد معاون مدیر کے طور پر وزیر آغا وابستہ ہوئے۔1965 میں اس کے ادارت محمد عبداللہ قریشی نے لی اور آخری شمارہ یعنی اپریل 1974 تک اس کے مدیر رہے۔52

ادبی دنیا کی خدمات اور مختلف حالات میں اس کی تبدیلی کو دیکھتے ہوئے چھ ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا دور 1929 سے 1933 محض تین سالوں پر مشتمل ہے۔ پہلے دور کے مدیر مولانا تاجور نجیب آبادی تھے جو اس رسالے کے مالک بھی تھے۔اس دور کی خاص بات یہ رہی ہے کہ ادبی دنیا عام رسالوں کے بالمقابل بڑے سائز (جہازی سائز) میں شائع ہوتا تھا۔عمدہ کاغذ اور عکسی تصاویر سے مزین ہوتا تھا۔متنوع موضوعات اور تخلیقی نگارشات کی اشاعت کے لئے حال وقال، آئینہ عالم، مشرق اور اہل مشرق وغیرہ عناوین قائم تھے۔جس کے تحت بلند پایہ معیاری مضامین اور شعری ونثری نگارشات شائع کی جاتی تھیں۔اس دور کے قلم کار بھی بلند پایہ ادیب وشاعر تھے۔جن میں حسن نظامی، پنڈت دتا تریہ کیفی، وحیدالدین سلیم، جوش ملیح آبادی، احسن مارہروی، فراق، عبدالرزاق ملیح آبادی وغیرہ اہم ہیں۔

مارچ 1932 میں تاجور نجیب آبادی نے اس کی ملکیت مولانا صلاح الدین کے ہاتھوں فروخت کردی اور اس طرح پہلے دور کا اختتام ہوا۔دوسرے دور میں منصور احمد مدیر ہوئے۔اس دور میں تنقیدی اور تخلیقی نگارشات کے علاوہ تراجم کی اشاعت کا خاص اہتمام کیا گیا۔مئی 1937 میں منصور احمد کے انتقال کے بعد ادبی دنیا کی ادارت کی ذمہ داری حفیظ ہوشیار پوری اور عاشق حسین بٹالوی نے انجام دی۔جنوری 1938 میں مولانا صلاح الدین نے اس کی ادارت کی ذمہ داری خود سنبھالی۔اس دور میں ادبی دنیا نے سالناموں کا سلسلہ شروع کیا،اس کے علاوہ ہر ماہ دوسرے رسائل کے منتخب مضامین کا خلاصہ بھی شائع کیا جانے لگا۔دوسرے دور کا اختتام 1947 میں ہوا،ادبی دنیا کے اس دور کو عہد ساز شمار کیا جاتا ہے۔

تیسرے دور میں اردو کے جدید شاعر میراجی مولانا صلاح الدین کے معاون مدیر مقرر ہوئے۔میراجی کی جدیدیت نے اردو نظم ونثر دونوں کو متاثر کیا۔'اس نظم میں' اور دیگر تنقیدی مضامین ادبی دنیا میں شائع ہوئے۔واضح رہے کہ میراجی دوڈھائی برس تک ادبی دنیا میں مختلف شاعروں کی نظموں کا جائزہ شروع کیا ان کی کتاب ''اس نظم میں'' کا یہی ورود مسعود ہے۔یہ کتاب پہلی بار ساقی بک ڈپو نے 1944 میں شائع کی تھی۔میراجی کے اس رسالے سے منسلک ہونے کے بعد اردو زبان وادب کے ساتھ مجلسی تنقید اور حلقہ ارباب ذوق کو خوب فروغ ملا۔اردو زبان کے فروغ کے لئے شروع کی گئی تحریک 'اردو بولو تحریک' کو بھی پروان چڑھنے کا موقع ملا۔1947 کے فسادات میں مولانا صلاح الدین کے گھر اور کتب خانے کو جلا دیا گیا جس سے صرف مولانا ہی کو نہیں بلکہ اردو ادب کو بھی بڑا نقصان پہنچا اور اس طرح سے ادبی دنیا کے ایک دور کا اختتام ہوگیا۔

1948 میں 16 ماہ کے تعطل کے بعد ادبی دنیا کی اشاعت دوبارہ شروع ہوئی جسے ادبی دنیا کا چوتھا دور کہا جاسکتا ہے۔ادبی دنیا میں کئی تبدیلیاں کی گئیں۔مثلاً اس کی ضخامت کو دوگنا کردیا گیا اور مروجہ کالم کو حذف کرکے 'مباحثہ امروز' آئینہ عالم، ادبیات خارجہ، دفتر پارینہ اور مکتوبات جیسے کالم کا اضافہ کیا گیا۔ادبی دنیا کا یہ دور کم وبیش بارہ

برسوں پر محیط ہے۔پانچواں دور 1959 سے شروع ہوا۔وزیر آغا، مولانا صلاح الدین کے معاون مدیر مقرر ہوئے۔وزیر آغا حصہ نظم کی ادارت دیکھتے تھے۔انہوں جدید نظموں کو خوب فروغ بخشا اور جدید شعرا سے متعارف کرایا۔وزیر آغا نے خود جدید شاعری کے حوالے سے متعدد مضامین لکھے۔اردو ادب کی ایک جدید صنف 'انشائیہ' سے بھی متعارف کرایا۔ادبی دنیا کا یہ دور تقریباً پانچ سالوں پر منحصر تھا۔جون 1964 میں مولانا کا انتقال ہو گیا۔چھٹے دور کی ابتدا 1964 سے ہوئی۔مولانا کے انتقال کے بعد وزیر آغا مدیر اور محمد عبداللہ قریشی ان کے معاون مدیر مقرر ہوئے۔جنہوں نے 1974 تک ادبی دنیا کی خدمت کی اور اس دوران عام رسالوں کے علاوہ خصوصی شمارے بھی شائع کیے۔ادبی دنیا کا ایک کالم بزم ادب ہے جو اداریے کے لئے مخصوص ہے۔مدیر مولانا صلاح الدین 1939 کے سالنامے کے بزم ادب میں لکھتے ہیں:

''ادبی دنیا کا دور جدید 1933 کے آغاز سے شروع ہوتا ہے۔اردو میں نئے اسلوب بیان داخل کرنے، ہندوستان کی لنگوا فرینکا کے مسئلہ پر فیصلہ کن اور سیر حاصل مباحثہ شائع کرنے، دنیا کے دیگر زبانوں کے بہترین لٹیریچر بالخصوص شاعری سے اردو کا دامن بھرنے اور تاریخ ادب کے کئی فراموش شدہ اوراق کو از سر نو روشن کرنے میں ادبی دنیا نے جو کام کیا وہ یقیناً اہل نظر کے لئے قابل توجہ ہے۔۔۔ادبی دنیا کی ایک اور قابل ذکر خدمت یہ ہے کہ اس نے گذشتہ چند سالوں میں ایسے متعدد نوجوانوں کو دنیائے ادب میں روشناس کرایا ہے جن کے انداز خیال کی رعنائیاں اور جن کے قلم کی جولانیاں ایک شاندار مستقبل کی نوید دیتی ہیں۔ہمیں یہ کہنے میں ذرہ برابر تامل نہیں کہ ہماری پالیسی ہمیشہ یہی رہی اور آئندہ بھی رہے گی کہ جہاں کہیں جوہر قابل کو دیکھیں اسے پلکوں سے اٹھالیں اسے جلا دیں۔اس کی تراش خراش میں اپنی پوری کوشش صرف کر دیں اور پھر اسے موقع دیں کہ وہ اپنی آب وتاب سے نگاہوں کو خیرہ کرے۔''53

ادبی دنیا نے علمی، ادبی مضامین کے علاوہ متعدد خصوصی شمارے بھی شائع کئے ہیں اس کے علاوہ سالناموں کو شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔خصوصی نمبر حسب ذیل ہیں۔نوروز نمبر جنوری 1932، ڈرامہ نمبر جون، جولائی 1935، اشاعت خاص، نومبر، دسمبر 1951، یادگار نمبر مولانا صلاح الدین احمد 1965، اقبال نمبر اپریل 1967، وحشت نمبر 1973 وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔جدید افکار وخیالات کو فروغ دینے میں اس رسالے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ساقی:

ماہنامہ ساقی 1930 میں دہلی سے شرع ہوا۔اس مدیر شاہد احمد دہلوی تھے جو اردو ادب کے مشہور ناول نگار نذیر احمد کے پوتے اور خود صاحب طرز ادیب تھے۔1946 تک دہلی سے بڑی آب وتاب کے ساتھ نکلتا رہا۔تقسیم

ہند کے بعد شاہد احمد دہلوی پاکستان ہجرت کر گئے۔ تقسیم ہند کے بعد ستمبر 1948 میں کراچی سے رسالہ کی اشاعت جاری رکھی۔ 1967 میں شاہد احمد دہلوی کے انتقال کے بعد آخری شمارہ شاہد احمد دہلوی نمبر شائع ہوا جس کے مرتب ڈاکٹر جمیل جالبی تھے۔ 54 شاہد احمد دہلوی کے بعد ساقی کی ادارت انصار ناصری نے سنبھالی۔ ساقی میں جھلکیاں اور باتیں کے عنوان سے مستقل کالم تھے جنہیں قارئین کی جانب سے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اس رسالے سے رومانی تحریک، کلاسکی ادب، ترقی پسند ادب غرض متعدد تحریکوں اور رجحانوں کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ منٹو، بیدی، عصمت، میراجی، فیض احمد فیض، خان محبوب طرزی، سردار جعفری، جیسے مشاہر ادب کی تحریریں ساقی میں برابر شائع ہوتی رہی ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کو اردو کی متعدد اصناف کے علاوہ ترجمہ نگاری میں بھی مہارت حاصل تھی۔ فاؤسٹ، رومیو جولیٹ، ہیملیٹ، اور راسیلاک جیسے انگریزی شاہکار نگارشات کا ترجمہ بھی ساقی کی زینت بنا۔ ماہنامہ ساقی پر تبصرہ کرتے ہوئے امداد صابری لکھتے ہیں:

> ''ساقی کا شمار ان رسالوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے عہد میں ادیبوں کی ایک پوری نسل کی تربیت کی۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، اختر حسین رائے پوری، اور بہت سے ادیب اس افق سے طلوع ہوئے۔ جن ادیبوں کی شخصیت اور تحریروں سے عصمت چغتائی متاثر ہیں ان میں شاہد احمد بھی ہیں۔ ساقی بک ڈپو نے بھی اردو ادب کی بڑی خدمت کی اور ڈیڑھ سو کے قریب کتابیں شائع کیں۔'' 55

ساقی کا ہر شمارہ بہت ضخیم ہوتا تھا۔ اس میں علمی، ادبی، سائنسی مضامین کے علاوہ تخلیقی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ اس کی مقبولیت کا ایک سبب اس کے خاص نمبر ہیں۔ خاص نمبروں کی تفصیل درجہ دیل ہے۔ افسانہ نمبر جولائی 1930، دہلی نمبر نومبر 1930، ظریف نمبر اپریل 1933، جاپان نمبر جنوری 1936، راشد الخیری نمبر ستمبر 1936، طنز و مزاح نمبر اپریل 1945، ناولٹ نمبر جولائی 1960، مشرقی پاکستان نمبر 1963، جوش نمبر 1963، اشاعت خاص اپریل 1966، شاہد احمد دہلوی نمبر 1970 وغیرہ۔ متعدد مضامین اور خصوصی شماروں کے علاوہ ساقی میں تحریری سلسلوں کا بھی رواج تھا۔ فراق 'باتیں' اور حسن عسکری 'جھلکیاں' کے عنوان سے لکھا کرتے تھے۔ ان کالموں کو ادبی حلقوں میں بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ ساقی خالص ادبی رسالہ تھا۔ برصغیر کے تمام اردو ماہناموں ساقی کو مختلف حیثیتوں سے امتیاز حاصل تھا۔ اردو کے بہترین ادبی رسالوں کی ایک فہرت تیار کی جائے تو ساقی ان میں سرفہرست ہوگا۔

ماہنامہ شاعر:

سیماب اکبرآبادی کا شمار اردو کے ممتاز شعرا اور بڑے صحافیوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے متعدد اخبار اور

رسالے نکالے جن میں اجمیر سے ’فانوس خیال‘ آگرہ سے ادبی رسالہ ’پیمانہ‘ دلی سے ایک اخبار ’تاج‘ شامل ہیں۔اس کے علاوہ انہوں کئی اہم رسالوں کی ادارت بھی کی۔ رسالہ ’شاعر‘ آگرہ سے فروری 1930 میں جاری کیا۔ شاعر کو ہفت روزہ بنانا چاہتے تھے مگر اس کا اولین شمارہ غالب کی یوم ولادت کے موقع پر 15 فروری 1930 کو پندرہ روزہ کی شکل میں منظر عام پر آیا۔اس کے نگراں خود سیماب اکبرآبادی اور مدیران کے صاحبزادے منظر صدیقی تھے۔1932 میں منظر اکبرآبادی کی علالت کی وجہ سے اس کی ادارت کی ذمہ داری علامہ سیماب اکبرآبادی نے خود اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔1950 میں علامہ سیماب کراچی چلے گئے اور رسالہ شاعر اعجاز صدیقی کی ملکیت میں آ گیا اور ممبئی منتقل ہو گیا۔انہوں نے 1978 تک اس کی ادارت کی۔ان کے بعد احتشام صدیقی مدیر مقرر ہوئے جو 1981 تک اس کے مدیر رہے۔احتشام صدیقی کی وفات کے بعد امام صدیقی اس کے مدیر مقرر ہوئے۔اس کے علاوہ اس کے معاونین میں جمیل مہدی، شکیل الرحمٰن، آغا رشید مرزا، ظانصاری، محمد حسن اور یونس کے نام قابل ذکر ہیں۔رسالے کے ایک جانب غالب کی تصویر ہوتی تھی اور دوسری جانب ’جمعتہ الشعرائے ہند کا واحد اخبار‘ لکھا ہوتا تھا اور اسکی کے ساتھ سیماب اکبرآباد کا یہ شعر درج ہوتا تھا:

پیدا ہوا ہے فکر کی مشکل کشائی کے لیے
شاعر ہے آواز خدا ساری خدائی کے لیے

رسالہ شاعر کا بنیادی مقصد شعرا کی تربیت اور شاعری کو پروان چڑھانا، اس کے علاوہ تمام شعرا کو ایک پلیٹ فارم پر لانا تھا۔ماہنامہ شاعر کا مقصد تخلیقی ادب کو فروغ دینا تھا۔سیماب اکبرآبادی خود ایک با کمال شاعر تھے، ان کا سلسلہ داغ سے ملتا ہے اس لیے انہوں نے ابتدا ہی میں کچھ اس طرح کی بنیاد فراہم کر دی تھی کہ یہ رسالہ تخلیقی ادب کے فروغ کے لیے مختص ہو گیا۔رسالے کے بارے میں شاعر کے ایک اداریے میں لکھتے ہیں:

> ’’میں عرصہ دراز سے ایک ایسے خالص ادبی اخبار کے اجرا کا خواب دیکھ رہا تھا جو صرف جماعت شعرا کا متفقہ آرگن ہو اور جس کے ذریعے مشرقی فن شاعری کو موجودہ انحطاط کی پستیوں سے نکال کر معراج ترقی پر پہنچایا جا سکے۔الحمد اللہ کہ آج اس خواب کی تعبیر شاعر کی سورت میں پیش نظر ہے۔ہندوستان میں اردو کے تحفظ و تہذیب کے لئے بے شمار انجمن قائم ہو چکی ہیں لیکن شاعری کی تہذیب اور شعرا کی تعظیم کے لئے کوئی عملی قدم اب تک نہیں اٹھایا گیا ہے اور وہ شاعری جو کبھی مایہ صد نازش تھی آج صرف سرمایہ تفریح و تضحیک بن کر رہ گئی ہے۔یوں تو کوئی اخبار اور کوئی رسالہ نہیں جو ہماری جماعت کا مرہون قلم نہ ہو بلکہ مجھے یوں کہنے دیجئے کہ آج ہندوستان کی صحافت ہماری جماعت کی توجہ سے دلچسپ اور قابل بنی ہوتی ہے۔پھر بھی شعرا کسی اخبار اور کسی رسالہ کو اپنی جماعت کا نمائندہ اور ترجمان نہیں کہہ سکتے۔اسی ضرورت کے احساس نے اجرا ’شاعر‘ پر مجھے

آمادہ کیا اور میری آمادگی کا یہ پہلا قدم ہے۔حضرت سیماب کے اختراعی ذہن اور شاعر کے جدید مزاج نے جلد ہی عاشقان شعر و ادب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ادھر خود ان کی اپنی مصروفیت میں روز افروں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔شاعر کو پندرہ روزہ نکالنا کسی حد تک دشوار بھی ہو چلا تھا اس لئے اسے ماہانہ کر دیا گیا اور جون 1932 سے یہ اخبار رسالہ ہو گیا۔‘‘56

شاعران رسائل میں سے ایک ہے جس کا معیار ہمیشہ سے ادبی رہا ہے۔ماہنامہ شاعر نے اردو کے نامور شعرا وادبا کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی اپنے صفحات میں جگہ دی۔اردو شعر و ادب کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ اردو صحافت کو بھی مستحکم کیا ہے۔شاعر کی کامیابی کا ایک سبب یہ بھی رہا ہے کہ شعر و ادب کی باکمال شخصیات کی سر پرستی حاصل رہی ہے۔۔اس اہمیت اور مقبولیت اندازہ علامہ اقبال کے اس اقتباس بھی لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے شاعر کے متعلق لکھا تھا:

’’رسالہ شاعر اب مبتدیوں کے مذاق سے گذر کر منتہیوں کے مفاد کا باعث ہوتا جاتا ہے۔خدا اس کی عمر دراز کرے۔میں چاہتا ہوں کہ ہر صوبے کے سر رشتہ تعلیم میں شاعر کو منظور کر لیا جائے۔خود بھی کوشش کر رہا ہوں۔آپ بھی توجہ فرمائیں۔‘‘57

شاعر نے تخلیقی نگارشات اور تحقیقی و تنقیدی مضامین شائع کئے ہیں وہ اپنے آپ میں بے مثال ہیں۔شاعر کے اکثر نمبرات کی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی ہے۔کچھ اہم نمبروں کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔افسانہ نمبر اکتوبر،نومبر 1945،منٹو نمبر مارچ،اپریل 1955،ڈراما نمبر 1964،کرشن چندر نمبر 1967،غالب نمبر فروری مارچ 1969،بیاد مچھلی شہری دسمبر 1973،قومی یکجہتی نمبر 1974،ہم عصر اردو ادب نمبر مئی جولائی 1977،خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر اپریل تا جون 1980،اقبال نمبر جنوری تا جون 1988،عالمی اردو قلم کار خواتین ادب نمبر جنوری 1999،اردو کی نئی بستیاں جون 1999،وغیرہ۔1980 میں شاعر کا ایک شمارہ 1980 کے نام شائع ہوا تھا۔شاعر خصوصی نمبروں میں یہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ڈاکٹر شمیم نکہت لکھتی ہیں:

’’ایک شمارہ 1980 کے نام شاعر کے خاص نمبروں میں انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔اردو میں اس طرح کا نمبر پہلی بار شائع ہوا ہے جس میں 1980 میں انتقال کرنے والے ادیبوں اور شاعروں پر تنقیدی مضامین،خاکے،منتخب تخلیقات،1980 میں منعقد ہونے والے سیمینار،کانفرنس اور دوسرے ادبی پروگرام،انعمات وایوارڈ وغیرہ کی تفصیلات،1980 کی اہم مطبوعات اور غالب،اقبال،پریم چند،حسرت،فانی،اور آغا حشر صدی کے سلسلے میں نذرانہ عقیدت شامل ہے۔‘‘58

شاعر نے وقت کے ساتھ اپنے اندر تبدیلیاں کیں اور نت نئے طریقوں سے رسالے کو بلندی عطا کی۔یہ

صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرون ملک میں پذیرائی حاصل کی۔ بیرون ملک کے شعرا وادبا کی تخلیقات کو بھی اپنے صفحات میں جگہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ رسالہ شاعر اردو مقبول اور کثیر الاشاعت ادبی جریدہ ہے۔ آج بھی اسی گرمجوشی سے جاری ہے۔

ادب لطیف:

چودھری برکت علی نے 1935 میں لاہور سے جاری کیا۔ یہ ترقی پسند تحریک کا ترجمان تھا۔ تحریک کے فکر ونظر کو فروغ دینے میں اس رسالے کا اہم کردار رہا ہے۔ اردو کے بیشتر ترقی پسند ادیب وشاعر کو اس میں جگہ دی جاتی تھی۔ رسالہ میں علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین کے علاوہ تخلیقی نگارشات بھی شائع ہوتی تھیں۔ ادب لطیف کے مدیروں میں طالب انصاری، فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی، قتیل شفائی، فکر تونسوی، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، کشور ناہید، صدیقہ بیگم، مسعود اشعر، ذوالفقار تابش، اظہر جاوید وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ادب لطیف کو اہم قلمکاروں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ اسے معیاری تخلیقات کی اشاعت، سالناموں اور بے شمار خاص نمبروں کی وجہ سے اردو رسائل کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس کے خصوصی شماروں میں افسانہ نمبر جون جولائی 1937، مولوی عبد الحق نمبر نومبر 1961، جوبلی نمبر اگست 1963، غالب نمبر جنوری 1969، فیض نمبر مارچ اپریل 1985، نظم وغزل نمبر مارچ 1995، کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ادب لطیف کتابی شکل میں شائع ہوتا ہے۔ اپنے خاص نمبروں اور سالنامہ کی وجہ سے ادبی دنیا میں منفرد مقام رکھتا ہے۔ اب بھی یہ رسالہ جاری ہے۔ جولائی 1920 کو اس کے مدیر مظہر سلیم مقرر کیے گئے جو نہ صرف صحافت اصول کے ماہر ہیں بلکہ زبان وادب پر دسترس بھی رکھتے ہیں۔

ماہنامہ ایشیا:

مشہور شاعر ساغر نظامی نے 1935 میں میرٹھ سے جاری کیا۔ بعد میں ایشیا ممبئی منتقل ہوگیا، جہاں ذکیہ سلطان معاون مدیر ہوئیں۔ ایشیا کا آخری شمارہ فروری 1951 میں شائع ہوا۔

ساغر نظامی کی شب وروز کی محنت سے بہت جلد یہ رسالہ اس دور کے اہم ادبی رسائل کی فہرست میں شمار کیا جانے لگا۔ ماہنامہ ایشیا کے پہلے شمارے میں مدیر نے اس کے اغراض ومقاصد پر روشنی دالی ہے۔ اغراض ومقاصد میں اقوام مشرق میں ایک کلچرل اتحاد کا تصور، مشرقیت کا احیا، مشرقی فنون لطیفہ اور اس کے متعلقات سے بحث کرنا، اس کے علاوہ ہندوستان کی قومی زبان اردو کی ہر ممکن خدمت کرنا شامل تھا۔ ماہنامہ ایشیا میں ادبی، علمی، تنقیدی وتحقیقی مضامین شائع کئے جاتے تھے۔ تخلیقی نگارشات کو خاص طور سے جگہ دی جاتی تھی۔ 1935 سے 1945 کے درمیان شائع افسانوں کا ایک مجموعہ کتابی شکل میں شائع کیا گیا تھا۔ مجموعے میں ملک اور بیرون ملک کے افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ مولانا عبد الباری آسی، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، سہیل عظیم آبادی، مختار الدین آرزو، دیوندر

ستیارتھی جیسے ممتاز قلم کار ایشیا میں شائع ہوتے تھے۔جنوری 1940 کے شمارے میں غالب کا غیر مطبوعہ منظوم خط،اور اسی طرح اکتوبر کے شمارے میں مختار الدین نے تبرکات غالب کے نام سے غالب کے ایسے کلام کو شائع کیا جو اب تک غیر مطبوعہ تھا۔

سب رس:

حیدر آباد میں ادارہ ادبیات اردو کا قیام 1920 میں ہوا تھا۔اس کی عمارت کو ایوان اردو کے نام سے جانا جاتا ہے۔جس کے بانی دکنی ادب کے ممتاز اسکالر ڈاکٹر محی الدین قادری زور تھے۔ڈاکٹر زور محقق،نقاد،ادیب اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے بھی اہم کتابیں لکھی ہیں۔جنوری 1938 میں ادارہ ادبیات کے ترجمان کے طور پر ماہنامہ سب رس جاری کیا گیا۔جس کے پہلے مدیر صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش تھے جبکہ اشاعت کا اہتمام خواجہ حمید الدین کے ذمہ تھا۔

سب رس اپنے وقت کا سب سے اہم رسالہ تھا اور آج بھی جنوبی ہند سے شائع ہونے والے رسالوں میں ممتاز ہے۔اس رسالے کا مقصد اردو زبان وادب کی ترقی،غیر ملکی زبانوں کے شہ پاروں کو اردو میں شائع کرنا اور اردو میں تنقید وتحقیق کو فروغ دینا تھا۔سب رس کے پہلے شمارے کے پیش لفظ میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

> ''سب رس ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان ہے جو ہر مہینے اردو زبان اور ادب کی خدمت کے لئے شائع ہوا کرے گا۔اس ادارے نے اب تک سنجیدہ علمی وادبی کتابیں شائع کرکے اردو کی جو خدمت کی ہے وہ علم دوست احباب سے مخفی نہیں ہے لیکن اس خدمت سے خاص خاص اہل ذوق ہی مستفید ہوسکتے تھے اس لئے ادارہ ابتدا ہی سے دھیان لگائے ہوئے تھا کہ ایسا رسالہ بھی نکالا جائے جس کی رسائی سب تک ہو اور جس میں سب کی دلچسپی کا خیال رکھا جائے۔'' 59

اس رسالے میں ابتدا سے ہی اس بات کی کوشش کی گئی کہ نامور قلم کاروں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی موقع دیا جائے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو۔اس کے علاوہ اردو کے ساتھ دیگر زبانوں کے نامور ادیبوں کی تخلیقات کی بھی اشاعت کی جاتی تھی۔رسالے کو دلچسپ بنانے کے لئے تصویروں کی اشاعت کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔بڑی تعداد میں رسالے نے خاص نمبر بھی نکالے۔سب رس کے کچھ اہم خاص نمبر حسب ذیل ہیں۔محرم نمبر مارچ 1938، اقبال نمبر جون 1938،مرقع دکن نمبر جنوری 1939، ریڈیو نمبر جنوری 1941،افسانہ نمبر ستمبر 1949،جشن سیمیں نمبر فروری،مارچ 1955،صفی نمبر مارچ 1956،امجد نمبر جولائی 1956،قلی قطب شاہ نمبر اپریل تا جون 1958، ٹیگور نمبر جون 1961،نجیب اشرف نمبر ستمبر 1969،غالب نمبر 1969،ترقی پسند ادب نمبر 1944،ظفر نمبر 1963 اس کے علاوہ اردو ادب نمبر،عبد علی نمبر،ولی نمبر،دکنی ادب نمبر،سراج نمبر،وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس رسالے

میں کچھ اوراق بچوں کے لیے خاص تھے جس میں بچوں کی دلچسپی کے مطابق مواد شائع کئے جاتے تھے۔آج بھی یہ رسالہ اسی آب وتاب سے جاری ہے۔ جب بھی رسائل کی تاریخ مقرر کی جائے تو رسالہ سب رس کو جلی حروف میں لکھا جائے گا۔

ماہنامہ سہیل:

بسمل سنسہاروی نے 1939 میں بہار سے جاری کیا تھا۔ چند ہی شمارے نکلے تھے کہ اسے بند کر دیا گیا اور پھر 1954 میں اسے ادریس سنسہاروی نے دوبارہ شروع کیا۔ترقی پسند اور اشتراکیت کے فروغ میں اس رسالے اہم کردار رہا ہے۔ ماہنامہ سہیل بہار سے شائع ہونے والے رسائل میں کافی اہم تصور کیا جاتا ہے۔اس نے اردو زبان وادب کی کافی خدمت کی اور صحافت کی معیار کو بھی باقی رکھا۔مضامین کے علاوہ کئی معروف اور اہم نمبر بھی نکالے جن میں جمیل مظہری نمبر 1958، بھاگل پور کا ادبی ماحول نمبر 1960،منشی پریم چند نمبر 1980، سہیل عظیم آبادی نمبر 1981،کیفی اعظمی نمبر 1984،کلام حیدری نمبر وغیرہ اہم ہیں ۔اس کے علاوہ اس کے قلمی معاونین میں جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی،علیم اللہ حالی،کلام حیدری،مظہر امام،سید احمد قادری جیسے مشاہیر ادب،کہنہ مشق ادیب اور شاعر شامل تھے۔اجرااور تجدید اجرا کے بارے میں عاصم شہنواز لکھتے ہیں:

> ’’میرے پاس سہیل کا پہلا شمارہ موجود ہے جس میں واضح طور پر درج ہے کہ 1939 میں اس رسالے کا رجسٹریشن ہوا تھا اور اسی سال اس رسالے کے ایک یا دو شمارے منظر عام پر آئے تھے۔اس کی تحقیق میں نے بسمل صاحب کے پوتے اور ادریس صاحب کے لائق فرزند جناب جمیل منظر اور ممتاز شاعر مظہر امام سے بھی کی اور دونوں نے ستمبر 1939 کی تاریخ کو صحیح بتایا۔رہی بات اس کے تجدید اجرا اور ادریس سنسہاروی کی اس میں شمولیت تو ادریس سنسہاروی نے سہیل کی ادارت 1954 میں سنبھالی تھی۔سہیل کے شماروں سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔‘‘ 60

بہار میں ادبی ماحول کی تیاری اور اس کی زرخیزی میں اس رسالہ کا اہم کردار رہا ہے۔اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ بہار میں ادبی صحافت کے فروغ اور پروان چڑھانے میں ماہنامہ سہیل کا نمایاں کردار رہا ہے۔

آج کل:

حکومت برطانیہ نے ایک ادارہ یونائیٹڈ پبلی کیشنز کے نام سے قائم کیا تھا۔جس کے ذریعے وہ اپنی سرگرمیوں کو اسلامی ممالک ایران،افغانستان،عرب وغیرہ بھیجتے تھے۔اس دارے سے عربی، فارسی،پشتو زبان میں کتابیں اور رسائل شائع کئے جاتے تھے۔اسی ادارے سے مئی 1941 کو ایک رسالہ پشتو زبان میں نن پرون کے نام سے شروع کیا گیا۔جس کا اردو ایڈیشن جون 1942 سے شروع کیا گیا۔ یہ پندرہ روزہ جریدہ تھا۔اس میں زیادہ تر سیاسی

مضامین اور پشتو ادب کو قارئین کی دلچسپی کے لیے بعض مضامین شائع کیا جاتا تھا۔اردو ایڈیشن نکلنے کے تقریباً پانچ مہینے بعد اس میں لفظ آج کل جوڑ دیا گیا کیوں کہ یہ پشتو زبان کا لفظ تھا۔پشتو میں نن کے معنی آج اور پرون کے معنی کل کے ہوتے ہیں۔نومبر 1942 کا وہ پہلا شمارہ تھا جس میں نن پرون آج کل لکھا ہوا تھا۔61؎۔جون 1943 سے نن پرون کو ہٹا دیا گیا اور صرف آج کل لکھا جانے لگا۔15 اگست 1947 تک رسالہ پندرہ روزہ رہا۔1947 میں حالات کے ناموافق ہونے کی وجہ سے اسے بند کر دینا پڑا۔پھر حالات کی بہتری کے بعد دسمبر 1947 میں دوبارہ شروع کیا گیا تو ماہنامہ کر دیا گیا۔1948 سے انگریزی حکومت کے بجائے حکومت ہند کے ذریعے شائع کیا جانے لگا اب یہ پبلی کیشنز ڈویژن کا ایک باوقار رسالہ ہے۔

آج کل کی ادارت اردو شعر و ادب کی اہم شخصیات سے وابستہ رہی ہے جن میں آغا محمد یعقوب، معین احسن جذبی، سید وقار عظیم، جوش ملیح آبادی، عرش ملسیانی، مہدی عباس، شہباز حسین، راج نارائن راز، عابد کرہانی، اور محبوب الرحمٰن فاروقی وغیرہ شامل ہیں۔رسالہ آج کل اپنے معیار اور مزاج کے اعتبار سے اردو رسائل میں انفرادیت کا حامل ہے۔اس نے اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ ادبی صحافت کے وقار کو بڑھایا ہے۔ڈاکٹر جمیل اختر آج کل کی ادبی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آزادی سے قبل اور اس کے بعد بھی ہندوستان میں شائع ہونے والے ادبی جریدوں میں آج کل کی اپنی ایک انفرادیت رہی ہے۔آج کل ابتدا ہی سے ایک خاص طریقہ کار کا حامل رہا ہے۔جس کی بدولت اس کی اپنی پہچان بنی جو شروع سے آج تک قائم ہے۔اس جریدے نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ہر طرح کے نظریاتی اختلافات، ادبی گروہ بندی اور سیاست سے الگ رہ کر ،نظریے اور ہر طبقے کے لوگوں کی نمائندگی کی ہے۔کسی ایک نظریے سے آج کل کی وابستگی نہ پہلے کبھی تھی اور نہ اب ہے۔یہ تمام تعصّبات سے اوپر اٹھ کر علم و ادب کی خدمت کرتا رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس رسالے نے ترقی پسند، غیر ترقی پسند اور جدیدیت کے حامی ادیبوں و دانشوروں کی تخلیقات کو اپنے صفحات میں جگہ دی اور ان کو یکساں مواقع فراہم کئے۔آج کل کی اسی غیر جانب داری نے اس رسالے کو ہر طرح کے لوگوں میں یکساں طور پر مقبول بنایا۔۔۔ادبی جریدوں میں جو امتیاز آج کل کو حاصل ہے وہ شاید کسی اور کو حاصل نہیں ابتدا ہی سے حکومت کا ترجمان ہونے کے باوجود اس نے علم و ادب کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔اس کا ماضی اور حال اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔''62؎

آج کل نے علمی و ادبی مضامین کے علاوہ تحقیقی مضامین کے ذریعے اردو ادب کے بے شمار گوشوں کی بازیافت بھی کی ہے۔اس کے علاوہ اس رسالے میں چھپنے والے خاص نمبروں کی اپنی الگ انفردیت ہے۔آج کل

کے خصوصی شماروں میں گاندھی نمبر جنوری1948،جمہوریت نمبرفروری 1905،غالب نمبر فروری 1952، شعروشاعری نمبراگست 1953،ابوالکلام ازادنمبراگست 1958،جگرنمبر 1961،بہادر شاہ ظفر نمبر نومبر 1962،افسانہ نمبر اگست 1963،تحقیق نمبر اگست 1967،اردونمبر اگست 1968،جدید ہندوستانی شاعری نمبر 1969،جوبلی نمبر 1970،اردوطباعت واشاعت نمبر 1970،طنزوظرافت نمبر 1974،امیر خسرونمبر 1974۔ حسرت موہانی نمبر 1981،سہیل عظیم آبادی نمبر 1982،چکبست نمبر 1983،میرتقی میر نمبر 1984،اردوصحافت نمبر 1984،اختر الایمان نمبر 1994 شامل ہیں۔آج کل اپنی اشاعت کا ۷۷ سال پورہ کر چکا ہے،آج بھی ادبی صحافت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

آج کل میں علم وادب اورشعروشاعری کے علاوہ علوم وفنون سے متعلق بھی اہم علمی مضامین شائع ہوتے تھے۔علوم وفنون کے ذخیروں سے متعلق مضامین بھی چھپتے تھے۔موسیقی،قوالی اور راگوں کے متعلق بے شمار مضامین شائع ہوئے۔آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔رسالہ آج کل کی اہمیت کا اندازہ فراق گورکھپوری کی اس تحریر سے کیا جا سکتا ہے:

> ''رسالہ آج کل اردوعلمی لسانی اورملکی خدمات انجام دے رہا ہے۔اس کے اغراض ومقاصد بلند ہیں۔رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔مضامین اکثر دلچسپ اور پرازمعلومات ہوتے ہیں۔جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگان علم وادب برابراپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔''63

خواجہ احمد فاروقی بھی اس کی علمی وادبی خدمات کے معترف ومداح ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

> ''میں رسالہ آج کل بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دلکش پرچہ اردو میں نہیں اس کواردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے۔جنھوں نے اس کومفیداور جاذب نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔''64

آج کل کا تخلیقی گوشہ بھی نہایت اہم رہا ہے۔اس کے مطالعہ کا نمایاں پہلو اردو کی ہمہ گیریت کا احساس ہے کیونکہ بلاتفریق مذہب وملت ادباوشعرا کی تحریریں یہاں پڑھنے کوملتی ہیں۔ایسا وقیع حلقہ شاید ہی کسی دوسرے رسالے کومیسر ہو۔رسالہ آج کل اپنے تراجم کی وجہ سے بھی ممتاز رہا ہے۔بہت سی اہم تحریریں ترجمہ کی شکل میں یہاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔

افکار:

افکار 1946 میں بھوپال سے جاری کیا گیا۔اس کی ادارت کی ذمہ داری صہبا لکھنوی اور رشدی بھوپالی

کے سرتھی۔1950 تک یہ رسالہ بھوپال سے شائع ہوتا رہا۔صہبا لکھنوی کے پاکستان ہجرت کرجانے کے بعد 1951 سے یہ کراچی سے نکلنے لگا۔2002 میں صہبا لکھنوی کے انتقال کے بعد حنیف فوق نے اس کی ادارت سنبھالی۔2004 میں اس کی اشاعت کا سلسلہ بند ہوگیا۔65

تنقیدی وتخلیقی مضامین کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی زبانوں سے ترجمے بھی شائع کئے جاتے تھے۔افکار میں فیض احمد فیض، احمد ریاض، ن م راشد، ساقی فاروقی، اختر الایمان، سردار جعفری، کنور مہندر سنگھ بیدی تحریریں برابر شائع ہوتی رہی ہیں۔اردو رسائل کی تاریخ میں رسالہ افکار اپنے خاص نمبروں کے لیے ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔افکار کے خصوصی نمبرات درجہ ذیل ہیں۔آزادی نمبر 1952، مجاز نمبر 1956، رائٹرس کنونشن نمبر 1959، جوش نمبر 1961، حفیظ نمبر 1963، افسانہ نمبر 1964، غالب نمبر 1966، ندیم نمبر 1975، امیر خسرو نمبر 1975، برطانیہ میں اردو نمبر 1981 وغیرہ۔

افکار کا ایک بڑا عطیہ یہ ہے کہ اس میں علاقائی زبانوں کے ادب کو تراجم کی شکل میں بڑے پیمانے پر پیش کیا ۔جس میں ہندی، پنجابی، بلوچی، سندھی، پشتو اور بنگالی زبانیں شامل ہیں۔اس کے علاوہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے بھی ترجمہ کیا جاتا تھا۔رسالہ افکار مختلف کالموں پر مشتمل تھا۔'محفل' افکار کے کالموں میں ایک دلچسپ کالم تھا، جس میں قارئین کے خطوط اور ان کے ردعمل کو شائع کیا جاتا تھا۔اس کے علاوہ ایک حصہ نووارد کتابوں پر تبصروں اور ادبی خبروں کے لیے مخصوص تھا۔

سویرا:

چودھری نذیر احمد، چودھری برکت علی کے رسالہ 'ادب لطیف' سے منسلک تھے۔لیکن کچھ باہمی اختلاف کی وجہ سے وہ ادب لطیف سے الگ ہوگئے اور اپنا ایک نیا ادارہ قائم کیا، جس کے تحت رسالہ سویرا کا اجرا عمل میں آیا۔اس کا پہلا شمارہ جنوری 1947 میں لاہور سے شائع ہوا۔چودھری نذیر احمد سویرا کے پہلے شمارے میں لکھتے ہیں:

> ''میں اسے فنکاروں کے جدید تجربوں اور اشاعتی محاسن کی جدید ترین قدروں کا وہ یادگار اور مثالی پیکر بنادونگا جس کے نقوش ایک مدت تک سرمایہ دارانہ دباو نے میرے ذہن کے نہاں خانوں میں بھینچ رکھے تھے۔''66

سویرا ایک وسیع المشرب رسالہ تھا۔اس کے یہاں کسی نوع کی نظریاتی پابندیاں نہیں تھی اور نہ اس نے اپنے قارئین کے لیے کسی خاص دائرے کی پابند قرار دی تھی۔یہ بات بالکل واضح تھی اس لیے پہلے ہی شمارہ میں اس کا اعلان اس طرح کیا گیا:

> ''کسی خاص گروہ کا نمائندہ نہیں بلکہ یہ ایسی تخلیقات کو اپنے دل میں جگہ دے گا جو نئے تقاضوں

سے شناساں ہیں اور سچے شاعر کی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہیں۔سویرا نے لکھا کہ یہ ایک ادبی ڈکٹیٹر کی طرح پڑھنے والوں پر اپنے نظریات کو نہیں ٹھونسے گا۔''67ؐ

ترقی پسند ادب کے لیے اس رسالے کو شروع کیا گیا تھا۔ساحر لدھیانوی،علی سردار جعفری،احمد ندیم قاسمی،راجندر سنگھ بیدی،کیفی اعظمی،ظہر کاشمیری،عبدالمتین،طفیل احمد جیسے ترقی پسند مصنفین کی تحریریں اس رسالے میں شائع ہوتی رہی ہیں۔اس کے علاوہ قرۃ العین حیدر،عصمت چغتائی،مجروح سلطان پوری،اختر الایمان،ناصر کاظمی وغیرہ کی تخلیقی نگارشات برابر شائع ہوتی رہتی تھیں۔سویرا کے مرتبین میں احمد ندیم قاسمی،فکر تونسوی،چودھری نذیر احمد،عارف عبدالمتین،ظہیر کاشمیری،احمد راہی،ظفر اقبال،محمد سلیم الرحمٰن،ریاض چودھری،صلاح الدین محمود وغیرہ شامل ہیں۔سویرا کو چالیس سال کی عمر ملی اور اس درمیان 47 شمارے شائع کیے۔سویرا اشاعتی اعتبار سے تعطل کا شکار رہا۔سویرا کے ابتدائی مدیر نذیر احمد نے اسے خود مختار اور آزاد رسالہ بنانے کا عہد کیا تھا،لیکن آزادی کے بعد اس رسالے نے خالص ترقی پسندانہ روش کو قبول کیا اور انتہا پسندی کا شکار ہو کر بند کر دیا گیا۔68ؐ

نقوش:

لاہور پاکستان سے محمد طفیل نے مارچ 1948 میں اس کا اجرا کیا۔1950 تک احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور اس کے مدیر رہے۔دونوں ابتدائی مدیر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے جس کا اثر نقوش کے شماروں پر بھی پڑا اور سیاسی سرگرمیوں کی پاداش میں چھ ماہ کے لیے اس پر پابندی عائد کردی گئی۔ممتاز فکشن ناقد سید وقار عظیم اس کے دوسرے مدیر مقرر ہوئے۔ان کی ادارت (1950۔1951) میں صرف آٹھ شمارے ہی چھپے مگر ان کی ادارت میں معیاری مقالات شائع ہوئے جس سے نقوش کا کھویا ہوا وقار واپس مل گیا۔1951 سے 1986 تک رسالے کے مالک محمد طفیل نے خود ادارت کی۔وہ طلوع کے عنوان سے اداریہ لکھتے تھے۔ان کی ادارت میں نقوش نے لمبا سفر طے کیا۔نقوش کے ایک اداریے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''جب نقوش ہمکنے اور ٹوں ٹاں کرنے لگا تو اس کی پرورش میرے سپرد ہوئی۔۔۔بیماری سمیت اس وقت اس کی عمر اڑھائی برس ہوگی۔یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی،میری راتوں کی نیند اچٹ گئی۔میں سوچتا تھا اتنا خوبصورت اور ہونہار بچہ اگر میری نگرانی میں پنپ نہ سکا تو کتنی جگ ہنسائی ہوگی،میں تو لاجوں مرتا رہا مالی حالات زیادہ اچھے نہ تھے مگر میں چاہتا تھا اسے ولایت تک بھیجوں،حوصلے اتنے وسائل محدود۔''69

محمد طفیل کے انتقال کے بعد 1986 سے نقوش ان کے بیٹے جاوید طفیل کی ادارت میں نکلنے لگا۔

نقوش نے مضامین کے علاوہ ایسے ایسے نادر و نایاب نمبر ترتیب دیے جو مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے

ہیں۔اپنے آپ میں یہ خصوصی نمبرایک مثال بن گئے۔جشن آزادی نمبر1948،عالم گیرامن نمبر1949،شخصیات نمبر1955،افسانہ نمبر1955،طنزومزاح نمبر1959،پطرس نمبر1959،آپ بیتی نمبر1964،غالب نمبر 1969،اقبال نمبر1977،میرتقی میرنمبر1980،ادبی معرکے نمبر1981،اس کے علاوہ خدانمبراوررسول نمبر نے رسالہ کوغیرمعمولی مقبولیت عطا کی۔خصوصی نمبراس وجہ سے بھی یادگار ہوگئے کہ چند برسوں کے دوران انہیں باقاعدہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔اس کا اندازہ ڈاکٹرعبدالسلام خورشیدنقوش کی اس تحریر سے کیا جاسکتا ہے:

> ''یہ نمبراپنے اپنے موضوع پرانسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان میں ضخامت کومحدود کرنے کی کوئی شعوری کوشش کی جاتی توان کی جامعیت میں فرق آجاتا۔ضخامت اورمواد کے اعتبار سے یہ مستقل تصانیف اورتالیف کا مقام حسل کرچکے ہیں جوکام نقوش نے کردکھایا ہے وہ ایک معجزے سے کم نہیں کتاب انسائیکلوپیڈیا اور مجلّے کوایک جگہ سمو کر اوراسے حسن بخش کر نقوش نے مجلّاتی صحافت کوچار چاند لگادیا ہے۔'' 70

نقوش گرچہ اب شائع نہیں ہوتا مگراس کے اثرات اس قدر ہمہ گیر تھے کہ آج بھی اس کی بازگشت ادبی دنیا میں سنی جاتی ہے۔رسالہ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس کے مدیرمحمدطفیل کومحمدنقوش کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

ماہ نو:

ماہ نوکراچی سے1948 میں جاری ہوا۔یہ ایک سرکاری رسالہ تھا جوادارہ مطبوعات پاکستان کے ماتحت تھا۔ جس کی ادارت کے فرائض پروفیسرسیدوقارعظیم انجام دیتے تھے۔انہوں نے صرف دوسال اس کی ادارت کی۔ 1950 میں پروفیسرحسن عسکری اس کے مدیر بنائے گئے۔اور پھرایک مختصرمدت کے بعد جولائی 1950 سے رفیق خاوراورظفرقریشی کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔اسلام آباد دارالحکومت بننے کے بعداسلام آبادمنتقل کردیا گیا جہاں اس کی اشاعت کا سلسلہ ایک وقفے کے لئے منقطع ہوگیا اوراس کا وجودخطرے میں پڑگیا۔چندشماروں کی اشاعت کے بعد پھرلاہورسے جاری ہوا۔کشورناہیداس کی مدیرمقررہوئیں۔

ماہ نوکی خوش قسمتی ہے کہ اسے ہمیشہ سے بیدارمغزمدیرملے۔قلمی معاونین میں بھی ہرصنف کے نمائندہ قلم کار نصیب ہوئے جن کی تخلیقات سے عوام کواستفادے کا موقع ملا۔افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو،عزیزاحمد،غلام عباس،اشفاق احمد،مسعودمفتی،غلام الثقلین نقوی،فرخندہ لودھی،جیسے عظیم افسانہ نگاروں کی تخلیقات شائع ہوئیں۔اس کے علاوہ نئے افسانہ نگاروں کو ماہ نو نے اعتبارفن عطا کیا۔شعرا وادبا کی تخلیقات اور تحقیقی وتنقیدی مضامین نے اس رسالے کواعتبار بخشا۔

ماہ نو کا معمول تھا کہ ہر سال فروری کے مہینے میں غالب پر اور اپریل کے مہینے میں اقبال پر مضامین شائع کئے جاتے تھے۔ان دو شعرا کی صد سالہ تقریبات پر غالب نمبر اور اقبال نمبر بھی شائع کیا گیا۔ ماہ نو کے خاص نمبروں میں قائد اعظم نمبر 1948،تحریک آزادی نمبر 1957، سیرت رسول نمبر 1963، غالب نمبر 1969، انیس نمبر 1972، دبیر نمبر 1975، اقبال نمبر 1977، بچوں کا ادب نمبر 1979، مسلم فن وثقافت نمبر 1980، ادب اور قومی تخشص نمبر 1982 فن وثقافت نمبر 1987، گولڈن جبلی نمبر 1997 وغیرہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ سرکاری رسالہ ہونے باوجود ادبی پہلو کا خاص اہتمام کیا گیا۔

شاہراہ:

شاہراہ کا پہلا شمارہ جنوری 1949 میں منظر عام پر آیا۔ یہ دو ماہی رسالہ تھا اور ترقی پسند مصنفین کے ترجمان کے طور پر دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ پہلے شمارے کے مدیر ساحر لدھیانوی اور معاون مدیر رام پرکاش اشک تھے۔ جبکہ شمارہ نمبر دو میں رام پرکاش شامل نہیں تھے۔اس کے بعد سرلا دیوی اور پرکاش پنڈت مدیر ہوئے اور طویل عرصہ تک 'شاہراہ' پرکاش پنڈت کی ادارت میں نکلتا رہا۔ پھر یوسف جامعی مدیر مقرر ہوئے جن کی سرپرستی میں کئی اہم نمبر شائع ہوئے۔

شاہراہ ہمیشہ سے ترقی پسند تحریک کی نمائندگی کرتا رہا۔اس کے ابتدائی شماروں کو دیکھنے پر یہ بات بھی سامنے آئی کہ رسالہ کے سرورق پر ہی ترقی پسند اردو مصنفین کا دو ماہی ترجمان لکھا ہوتا تھا۔ترقی پسند نظریات کے حاملین کو اس رسالے میں خاص جگہ دی جاتی تھی۔ رسالہ شاہراہ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس میں مضامین اور تخلیقی نگارشات کے علاوہ ناولیں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ کچھ ناولوں کو قسط وار تو کچھ ناولوں کو مکمل شائع کیا گیا ہے۔ ہندستان کسے باہر کی زبانوں کے ناولوں کو ترجمہ کے ذریعہ پیش کیا و ہندستان کی بعض علاقائی زبانوں کے ناولوں کو بھی بھی اردو قالب عطا کیا گیا۔ چیخوف، میکم گورکی اور نکھ لوئی گوگل وغیرہ کے ناولوں کا اردو ترجمہ رسالہ کے توسط سے پیش کیا گیا۔اس کی تفصیل فروری 1958 کے ناول نمبر میں دیکھی جاسکتی ہے۔اردو زبان کے علاوہ دیگر زبانوں کی ناولوں کا ترجمہ بھی شائع کیا جاتا تھا۔اس کے علاوہ کئی اہم خاص نمبر بھی شائع کئے ہیں۔جن میں کانفرنس نمبر 1950، افسانہ نمبر 1953، طنزومزاح نمبر 1955، کہانی نمبر 1960، ناولٹ نمبر 1958 وغیرہ شامل ہیں۔اس کے علاوہ سالناموں کی اشاعت کا بھی خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔شاہراہ کے ناولٹ نمبر کی بہت پذیرائی ہوئی اس میں اردو کے علاوہ دیگر زبانوں سے ترجمہ کی ہوئی ناولیں بھی شامل تھیں۔اس نمبر کو دو حصہ میں شائع کیا گیا تھا۔ ناولٹ نمبر کے پہلے شمارے کے اداریے میں محمد یوسف لکھتے ہیں:

''اردو ادب میں آج نظم و افسانہ کو وہ فروغ حاصل نہیں ہوا جو ناول کو ہے۔ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے

کہ ہمارے یہاں ناول پر ابھی مستی کا عالم ہے۔ناول نگاری ابھی گھٹنوں چل رہی ہے۔یوں تو اردو میں سماجی،سیاسی،اور تاریخی ناول کثرت سے لکھے جارہے ہیں لیکن ابھی تک ایسا ناول تخلیق نہیں کیا گیا جسے ہم دوسری زبانوں کے مقابلے میں اپنی فخریہ پیش کش کہہ سکتے ہیں۔‘‘71؎

عابد سہیل کا خیال ہے کہ یہ محض ایک رسالہ نہیں تھا بلکہ اس نے اپنے زمانے کے ادب کی صورت گری کی تھی۔یہ بات اس لیے بھی اہم ہے کہ عابد سہیل کا تعلق ادب،ادبی صحافت اور ترقی پسند فکر و نظر سے بہت گہرا تھا۔بارہ سال کی مدت میں اس رسالے کی خدمات نہایت اہم ہیں۔عابد سہیل لکھتے ہیں:

’’غرض اشاعت کے بارہ سال مکمل کرنے کے بعد شاہراہ 1960 میں ادبی تاریخ کا حصہ بن گیا۔شاہراہ ادبی رسائل وجرائد کی تعداد میں مزید ایک ماہنامہ کا اضافہ نہ تھا بلکہ اس نے اپنے دور کے ادب کی صورت گری میں ایک نہایت اہم کردار نبھایا تھا اور ترقی پسند فکر کو انتہا پسندی سے بڑی حد تک محفوظ بھی رکھا تھا۔‘‘72؎

شاہراہ نے ممتاز قلم کاروں کے ساتھ نئے لکھنے والوں کی بھی تربیت کی۔رسائل وجرائد کی دنیا میں اس کے اثرات وسیع اور ہمہ گیر اہمیت کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔

رسالہ نوائے ادب:

جنوری 1950 میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے ترجمان کے طور پر جاری کیا گیا۔انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی 1857 میں قائم کیا گیا تھا۔یہ ایک سہ ماہی رسالہ تھا جس کے مدیر ظہیر الدین مدنی تھے۔رسالہ نوائے ادب کا اداریہ ’عرض حال‘ کے عنوان سے شائع ہوتا تھا۔مدیر ظہر الدین مدنی پہلے شمارے میں اس رسالے کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’انسٹی ٹیوٹ کی ایک اور قابل قدر کار گزاری رسالے کا اجرا ہے۔انسٹی ٹیوٹ میں جو کچھ کام ہوتا ہے اس بر سر عام لانے کے لئے رسالے کی اشاعت بہت ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسٹی ٹیوٹ نے حالات ناساز گار ہونے کے باوجود رسالے کا اجرا کر دیا۔اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ علمی دنیا سے انسٹی ٹیوٹ کا رشتہ اور زیادہ مستحکم ہو جائے گا اور زبان و ادب کے ماہر ناقد اور محقق رسالہ نوائے ادب کے اجرا کا خیر مقدم کریں گے اور قلمی اعانت میں دریغ نہ کریں گے۔نوائے ادب کا یہ پہلا شمارہ آپ کے سامنے پیش ہو رہا ہے۔اس میں کئی خامیاں ہونگی لیکن آئندہ امید ہے کہ ہم تمام خامیوں کو دور کرنے کی حتی الوسیع کوشش کریں گے اور اس کے معیار کو بلند کیا جائے گا۔‘‘73؎

مذکورہ اداریے سے رسالے کے مقاصد کا بخوبی اندازا ہوتا ہے۔نوائے ادب میں ایک کالم ’مقالہ نما‘ کے عنوان سے تھا جس کے مرتب باقر علی تھے اور ان کے معاونین میں علی جعفر اور عصمت جاوید کا نام شامل تھا۔اس کالم

کے تحت مختلف نوعیت کے علمی وادبی مضامین شائع کئے جاتے تھے۔قارئین میں اس کی بہت پذیرائی ہوئی۔رسالہ نوائے ادب ایک مدت کے بعد ششماہی کردیا گیا تھا۔رسالہ نوئے ادب کے ہر سال کے پہلے شمارے میں گذشتہ سال کے تمام مقالات کی تفصیل درج کی جاتی تھی۔اس کے علاوہ سالناموں کے اشاعت کا بھی خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔

تحریک:

مارچ 1953 میں آنجہانی گوپال متل نے دہلی سے جاری کیا۔اپنے ابتدائی دور میں ہی اس نے اپنی شناخت بنالی۔29 برس اردو زبان وادب کی خدمت کر کے یہ رسالہ ہمیشہ سے لئے 1981 میں بند ہوگیا۔اس دوران تحریک کومخمور سعید، تکمین کاظمی، اور پریم گوپال متل جیسے مدیر ملے جنہوں نے تحریک کو بلند پایہ رسالہ بنانے میں موثر کردار ادا کیا۔یہ رسالہ ہمشہ ترقی پسند تحریک کا مخالف رہا۔اس رسالے پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد نوشاد عالم لکھتے ہیں:

> ''یہ اس وقت کا واحد رسالہ تھا جو ترقی پسند تحریک کے عہد شباب میں تصویر کے دوسرے روخ کو پیش کرر ہا تھا۔اس رسالے میں اردو کے نامور ادبا وشعرا کی تخلیقات شائع ہوتی تھی۔تحریک کی آبیاری میں مخمور سعید نے بھی اہم کردار ادا کیا۔جو اس رسالے کے معاون مدیر رہے ہیں۔اس رسالے نے خاصی شہرت ومقبولیت حاصل کی۔افسوس کہ گوپال متل نے اپنی صحت کی ناسازگاری کی وجہ سے اسے 1981 میں ہمیشہ کے لئے بند کردیا۔''74؎

رسالہ تحریک کی مقبولیت میں اس کے خاص نمبروں کا بھی اہم کردار رہا ہے جن میں جگر نمبر 1960، غالب نمبر 1961، چین کے ادبی وثقافتی رجحانات پر ایک نظر 1962، اقبال نمبر 1967، انقلاب روس نمبر 1967، آزادی نمبر 1975، سلور جوبلی نمبر 1978 وغیرہ اہمیت حامل ہیں۔ماہنامہ تحریک کے سلور جوبلی نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیم نکہت لکھتی ہیں:

> ''تحریک کا سب سے اہم نمبر اس کا سلور جوبلی نمبر تھا۔جس میں تقریبا آٹھ سو صفحات تھے۔جس میں پندرہ تنقیدی مضامین، پچی 25 نظمیں پاکستانی ادب پر، وزیر آغا، انور سدید اور جاوید انور کے مضامین، 35 افسانے، 84 شعرا کی غزلیں، ساجدہ زیدی کا ڈرامہ 'ممتا کی آگ' کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں اور غیر ملکی زبانوں کے بڑی تعداد میں تراجم شامل ہیں۔تحریک کا یہ نمبر 1978 میں شائع ہوا تھا۔1979 میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔اسے مخمور سعید اور گوپال متل نے ترتیب دیا تھا۔''75؎

نیادور:

حکومت اتر پردیش کے محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ کے ترجمان کے طور پر اپریل 1955 میں جاری کیا گیا۔

نیادور کے پہلے ایڈیٹر علی جواد زیدی تھے جنہوں نے اپنے ادبی ذوق سے اس رسالے کا ادبی مزاج متعین کیا۔سرکاری رسالے ہونے کے باوجود اس کا مزاج خالص ادبی اور اس کا واحد مقصد ادب کی خدمت کرنا تھا۔نیادور سے قبل اس کا نام ُاطلاعات' تھا جسے 1946 میں جاری کیا گیا تھا۔ڈاکٹر اطہر مسعود خاں لکھتے ہیں:

''حصول آزادی کے بعد ابتدائی دور میں اتر پردیش کا محکمہ اطلاعات سرکاری پریس نوٹوں پر مشتمل ایک پندرہ روزہ رسالہ ُاطلاعات' کے نام سے شائع کرتا تھا۔اس پرچہ میں ان پریس نوٹوں کو بغیر کسی ترمیم کے من وعن شائع کردیا جاتا تھا یعنی اس رسالے کی حیثیت اس وقت محض سرکاری اطلاعات فراہم کرنے کی تھی۔مزید یہ کہ اس کی ساری کاپیاں مفت تقسیم کی جاتی تھیں۔علی جود زیدی نے ان پریس نوٹوں کی تدوین یا ان کو ایڈٹ کرنے کی ابتدا کی اور معمولی تبدیلیوں کے بعد اس میں ادبی عنصر کا ضافی کرنے کی کوشش کی اور اس دور کے کچھ قلم کاروں کی تخلیقات شائع کرنے کی شروعات کی۔اس طرح اطلاعات میں ادبی حصے کا باقاعدہ اضافی ہوگیا۔یہ انہیں کی کوششیں کی تھی کہ ُاطلاعات' جو صرف سرکاری اعلانات اور رپورٹوں پر مشتمل ہوتا تھا اب ادبی سفر کی سمت بھی پیش قدمی کرنے لگا۔کچھ عرصہ بعد علی جواد زیدی نے وزیر اعلی اتر پردیش ڈاکٹر سمپورنا نندی جی کو ایک تجویز پیش کی کہ اطلاعات کا نام تبدیل کرکے اگر نیادور رکھ دیا جائے تو اس کیا ہمیت وفادیت میں اضافہ ہوجائے گا۔بہرحال یہ تجویز منظور ہوئی اور اطلاعات اپنے نئے نام یعنی نیادور کے نام سے شائع ہونے لگا۔اس طرح نیادور کا پہلا شمارہ اپریل 1955 میں علی جواد زیدی کی ادارت میں شائع ہوا۔''76

نیادور سرکاری رسالہ ہونے کے باوجود خود کو سرکاری قیدوبند سے آزاد رکھنے کی پوری کوشش کی۔اس نے ابتدا ہی سے اپنے معیار کو قائم رکھا۔ابتدائی دور سے ہی علمی،ادبی،تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے علاوہ تخلیقی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔اور اس کے لکھنے والے بھی ہمیشہ سے ممتاز قلمکار رہے ہیں،جن میں فراق گورکھپوری،پروفیسر محمد مجیب،حیات اللہ انصاری،جگن ناتھ آزاد،کلیم الدین احمد،آل احمد سرور،نیاز فتح پوری،صالحہ عبدحسین،اثر لکھنوی،جگن ناتھ آزاد،وامق جونپور،وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔نیادور کی ادارتی ٹیم میں اہم ادیب اور دانشور شامل رہے ہیں۔جن میں سرلا ساہنی،صباح الدین عمر،سید خورشید احمد،امیر احمد صدیقی،شاہنواز قریشی،سید امجد حسین،نجیب انصاری،ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نمایاں ہیں۔رسالہ نیادور اپنے خصوصی نمبروں کی وجہ سے ادبی دنیا میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔اس کے ذریعے شائع شدہ نمبروں کی دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔کچھ اہم خصوصی شماروں کی تفصیل یوں ہے۔جمہوریت نمبر 1956،تعمیری ادب نمبر 1857،نہرو نمبر 1964،جعفر علی خاں اثر نمبر 1967،غالب نمبر 1969،گوشہ ڈاکٹر ذاکر حسین 1969،گوشہ اقبال 1973،امیر خسرو نمبر 1974،عبدالماجد دریابادی

نمبر 1978،منشی نول کشور نمبر 1980، بہادر شاہ ظفر نمبر 1981،فراق نمبر 1983،یادرفتگاں نمبر1988،اودھ نمبر1984،کیفی اعظمی نمبر2002،اس کے علاوہ خصوصی شماروں کی ایک بڑی تعداد ہے جس میں اودھ نمبر بہت ضخیم اور اپنے آپ میں اودھ کی تاریخی ،ثقافتی اور تہذیبی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ان نمبروں کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس میں ادبی اور علمی شخصیات کے علاوہ سیاسی رہنماوں پر بھی نمبر شائع کئے گئے ہیں۔اطہر مسعود جنہوں نے اس رسالہ کا اشاریہ بھی تیار کیا ہے۔وہ رسالے کے خاص نمبروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی ادبی وصحافتی تاریخ میں وہ چند رسالے جو نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے سے نہایت باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں ان میں ایک نیادور بھی ہے۔نیادور کی بے مثل علمی اورادبی حیثیت کو مشاہیر علم وادب ہر دور میں تسلیم کرتے رہے ہیں یوں نیادور کا ہر شماری گونا گوں صفات کا حامل اور متعدد خوبیوں سے آراستہ ہوتا لیکن خاص نمبروں کی اشاعت کے معاملے میں نیادور کو یقیناً خصوصی اہمیت حاصل ہے۔نیادور نے اکتوبر 1955 سے دسمبر 1999 تک کل 73 خاص نمبر شائع کئے ہیں۔'77؂

نیادور آج بھی اسی آب وتاب سے جاری ہے ۔آج بھی اردو کے قارئین اس رسالے کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔نیادور نے دوزبان وادب خدمت کے ساتھ ادبی صحافت کی روایت کو بھی مستحکم کیا ہے۔جب بھی اردو رسائل کی تاریخ مرتب کیا جائے گی نیادور کا نام جلی حروف میں لکھا جائے گا۔

سوغات:

سوغات اردو کے معتبر صحافی،شاعر اور نقاد محمود ایاز کی ادارت میں جنوری1959 میں بنگلور سے جاری ہوا۔یہ دوماہی رسالہ تھا۔اردو ادب میں جدیدیت کو فروغ دینے میں سوغات کا اہم حصہ رہا ہے۔سوغات کی اشاعت میں کبھی تسلسل نہیں رہا۔متعدد بار اسے بند کرنا پڑا اور بالآخر 1997 میں ہمیشہ کے لیے بند کردیا گیا۔اس کا ہر شمارہ اپنے آپ میں اہم اور خاص ہوتا تھا اور عام رسالوں کے بالمقابل کافی ضخیم بھی تھا۔ڈاکٹر انیس صدیقی لکھتے ہیں:

''سوغات نے اصول ومعیار کے معاملے میں مفاہمت کیے بغیر،ہر تحریک ور جحان اور ادبی گروہ بندی سے سوغات کو آزاد رکھا،سوغات نے اردو دنیا کو نہ صرف جدید ادبی رجحانات سے واقف کروانے میں غیر معمولی خدمت انجام دیں بلکہ اس کام کا سنگ بنیاد سوغات ہی نے رکھا،سوغات کا شمار اردو دنیا کے ان چند رسالوں میں ہوتا ہے جن کے بغیر اردو ادب کی ترقی اور اس کی افہام وتفہیم کا تصور محال ہے۔''78؂

سوغات کی مقبولیت صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ دیگر ممالک میں بھی اس کے سیکڑوں قارئین تھے جو اس کی اشاعت کے بڑی بے صبری سے منتظر رہتے تھے۔اس رسالے نے بھی عام چلن کے مطابق علمی،ادبی اور تخلیقی مضامین

شائع کیے اور بڑے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی اپنے صفحات میں جگہ دی۔ ان مضامین اور مقالات کے علاوہ خاص نمبرات بھی شائع کیے جس میں جدید نظم نمبر 1961 کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ یہ نمبر دو جلدوں میں شائع کیا گیا تھا اس کی اہمیت کا اندازا اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ نمبر متعدد یونی ورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ محمود ایاز کی وفات تک یہ رسالہ بڑی آب تاب کے ساتھ نکلتا رہا اور ادبی حلقوں میں خوب مقبول بھی رہا۔ الغرض نومبر 1997 میں سوغات کا آخری شمارہ مریم ایاز کی ادارت میں نکلا اور یہیں پر اس کے سفر کا اختتام ہو گیا۔

سہ ماہی فکر و نظر:

فکر و نظر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے 1960 میں جاری ہوا۔ یہ خالص علمی اور تحقیقی نوعیت کا رسالہ ہے۔ گذشتہ ساٹھ برس سے مسلسل جاری ہے۔ اس کے مدیروں میں مسعود حسین خاں، آل احمد سرور، خورشید الاسلام، شہر یار، ڈاکٹر راحت ابرار اور پروفیسر سید محمد ہاشم جیسے مشاہیر علم و ادب شامل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وقت کے تقاضے کے مطابق متنوع موضوعات پر مشہور صاحبان قلم کے مضامین رسالے کی زینت بنتے رہے ہیں۔ علم و ادب کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ایسا ہو جس پر اس رسالہ نے پر مغز مقالات نہ شائع کیے ہوں۔ موضوع کی اہمیت اور وقت کے تقاضے کے مطابق مختلف موضوعات پر اس رسالے نے خصوصی شمارے بھی شائع کیے ہیں۔ مثلاً تین بار سرسید نمبر اور دو مرتبہ غالب نمبر اس کے علاوہ حالی، شبلی، نذیر احمد، ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، گاندھی جی، آل احمد سرور، نامورانِ علی گڑھ نمبر ۳ کارواں اور مشتاق احمد یوسفی نمبر اہمیت کے حامل ہیں۔ فکر و نظر کے بیشتر شماروں کی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی ہے۔ ان میں مشتاق احمد یوسفی نمبر 2019 بھی شامل ہے۔ اس شمارے میں مشتاق احمد یوسفی کے زندگی کے تمام پہلوؤں کے علاوہ ان کی کتابوں پر بھی مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہیکہ جہاں پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی اور دیگر نمایاں قلم کاروں کے مضامین شامل کیے ہیں وہیں نوجوان قلم کاروں کو بھی فکر و نظر نے اپنے صفحات میں جگہ دی ہے۔ مدیر پروفیسر سید محمد ہاشم یوسفی نمبر کے اداریے میں لکھتے ہیں:

> ''مشتاق احمد یوسفی نے اپنے مضامین، انشائیوں، فکاہیوں، خاکوں، سفرناموں اور تقاریر و خطبات کے پانچ مجموعے چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت، آب گم اور شام شعر یاراں یادگار چھوڑے ہیں جن کے ذریعے انہوں نے بالواسطہ طور پر ہندوستان و پاکستان کے درمیان اتحاد و یگانگت کے نقیب بن کر اردو ادب کے دامن کو وسعت قلبی، تعمیری فکر اور باہمی محبت کے بیش قیمت جواہر پاروں سے مالا مال کیا اور عہد حاضر کے مقبول ترین ادیب و مزاح نگار کی شکل میں اپنی شناخت

تسلیم کرائی ،جس کی تفصیلات شمارہ ہٰذا کے صفحات میں جلوہ گر ہیں ۔اس لئے امید ہے کہ ہماری دانشگاہ عظیم کے ایسے نامور فرزند کی شخصیت اور ادبی کارناموں کی تعین قدر کے سلسلے میں فکر ونظر کا یہ خصوصی شمارہ ایک اہم کردار ادا کرے گا اور قارئین ،طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لئے دلچسپی ،تحقیقی وتنقیدی مواد کی فراہمی اور مجموعی طور پر پورے اردو ادب کے سرمایہ میں اضافے کا سبب ہوگا۔''79

فکر ونظر کی ادبی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس کا اشاریہ بھی تیار کر دیا گیا۔اشاریہ کے مطالعہ سے اندازا ہوتا ہے کہ فکر ونظر نے پچھلے ساٹھ سالوں جو مضامین شائع کئے ہیں وہ اپنے آپ میں اردو ادب کا بیش بہا خزانہ ہیں ۔اس سے مختلف عہدوں میں ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات کا بھی بخوبی اندازا ہوتا ہے۔فکر ونظر نے صرف اردو زبان وادب ہی کی ترویج واشاعت نہیں کہ بلکہ اس نے اردو رسائل کی روایت کو بھی مستحکم کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی یہ رسالہ اسی آب وتاب کے ساتھ جاری ہے۔

ماہنامہ کتاب نما:

ماہنامہ کتاب نما کا آغاز جون 1960 میں مکتبہ جامعہ سے ہوا۔مکتبہ جامعہ لمٹیڈ ایک اشاعتی کا ادارہ ہے جس کا قیام 1922 میں ہوا۔ابتدا میں یہ محض ایک شعبہ تھا لیکن بعد میں اسے لمیٹڈ کا درجہ دے دیا گیا۔یہ ایک اشاعتی ادارہ ہے جس کی اشاعتی خدمات کا سلسلہ ایک صدی پر مشتمل ہے۔اب تک اس ادارے کی جانب سے ہزاروں کی تعداد میں کتابیں شائع ہوچکی ہیں ۔جن میں شعر وادب ،تنقید وتحقیق اور تخلیق وترجمہ وغیرہ شامل ہیں ۔اور اب بھی اس ادارے کی خدمات کا سلسلہ جاری ہے۔ماہنامہ کتاب نما کی آزادی سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا لیکن کچھ وجوہات کے سبب اسے بند کرنا پڑا تھا اور دوبارہ 1960 میں جاری ہوا۔جس کے پہلے مدیر ریحان احمد عباسی تھے اور نگراں مشہور شاعر غلام ربانی تاباں تھے۔مارچ 1965 کے اداریے میں لکھتے ہیں:

''ہمیں خوشی ہے کہ کتاب نما جون 1960 کے شمارے سے جب سے یہ آزادی کے بعد سے دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا ہے۔اب تک نہایت باقاعدگی اور پابندی سے شائع ہو رہا ہے اور اس کی اشاعت بھی بڑھ کر پہلے سے پانچ گنا کر دی گئی ہے۔ہماری برابر یہ کوشش ہے کہ یہ نہ صرف اسی طرح زیادہ سے زیادہ شائع ہوتا رہے بلکہ اس میں کچھ صفحات کا بھی اضافہ کر کے اسے زیادہ مفید اور موثر بنایا جائے ۔ہمیں امید ہے کہ اگر آپ کی ہمدردی اور پرخلوص تعاون اسی طرح ہمارے شامل حال رہا تو ہم جلد ہی اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں گے۔''80

کتاب نما کے ابتدائی دور میں صرف کتابوں پر تبصرے اور ادارے کی جانب سے نووارد مطبوعات کی تفصیل شائع کی جاتی تھی لیکن بعد میں اس رسالے نے ادبی رسالے کی صورت اختیار کر لی۔اور ہر طرح کے علمی

ادبی مضامین شائع کیے جانے لگے۔حامد علی خاں، ریحان احمد عباسی، غلام ربانی تاباں، شاہد علی خاں، ہمایوں ظفراور پروفیسر محمد میاں نے مختلف وقتوں میں اس کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔شاہد علی خاں کم وبیش تیس سال تک کتاب نما کے مدیر رہے۔شاہد علی خاں نے کتاب نما میں ایک جدت یہ پیدا کی کہ ابتدا میں اداریہ بلاعنوان کے شائع ہوتا تھا، ماہنامہ افکار کراچی کی طرز پر دسمبر 1978 'مہمان مدیر' کا سلسلہ شروع کیا۔مہمان مدیر کا پہلا اداریہ پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا۔کتاب نما کے مہمان مدیر کے لیے اردو ادب کی مختلف ممتاز شخصیات کی قلمی تحریریں شامل کی گئیں جو متنوع موضوعات پر مشتمل ہوتی تھیں۔مہمان مدیروں میں شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، منور رانا، مظہر مہدی، صدیق الرحمٰن قدوائی، سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، آل احمد سرور، سراج اجملی، احمد محفوظ، عطا عابدی، سہیل انجم، منور حسین کمال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔پروفیسر خالد محمود بھی کتاب نما کے ایک مدت تک مدیر رہے ہیں۔خالد محمود نے ادارت کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد مکتبہ اور رسالہ دونوں کو ترقی دی۔کتاب نما میں انہوں نے اعزازی مدیر کا بھی سلسلہ شروع کیا، پہلے ڈاکٹر عمیر منظر اور پھر پروفیسر سہپر رسول کا بنایا۔کتاب نما میں خاص نمبروں کی اشاعت کا خاص اہتمام کیا جاتا رہا ہے جن کی ایک بڑی تعداد ہے۔کتاب نما کے خاص نمبروں میں گوپی چند نارنگ نمبر، مولانا عبدالوحید نمبر، خلیق انجم نمبر، ہندوستان کی یونی ورسٹیوں میں اردو تحقیق نمبر، ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر، غالب نمبر اور رشید حسن خاں نمر وغیرا اہمیت کے حامل ہیں اس کے علاوہ مختلف موضوعات اور شخصیات پر گوشے بھی شائع کئے گئے ہیں۔

ادبی تہذیبی خبریں کتاب نما میں بہت اہتمام سے شائع کی جاتی تھیں۔کبھی کبھی رپورتاژ بھی شامل ہوتے تھے۔کتاب نما جامعہ ملیہ اسلامیہ کا باقاعدہ ترجمان تو نہیں مگر جامعہ کی شہرت اور نام وری میں کتاب نما کو بڑا دخل رہا ہے۔

کتاب:

اردو ادب کی دنیا میں عابد سہیل کا نام بیسویں صدی کے نصف آخر کے ایک رجحان ساز افسانہ نگار، خودنوشت نگار، تنقید نگار، اور معتبر صحافی کے طور پر ہوتا ہے۔ان کے خدمات کی مختلف جہتیں ہیں جن میں ماہنامہ کتاب کا اجرا بھی ہے۔ماہنامہ کتاب کی دسمبر 1962 میں لکھنؤ سے جاری ہوا۔آزادی کے بعد شائع ہونے والے رسالوں میں کتاب لکھنؤ کا ایک بے مقبول رسالہ ہے۔اس کی مجلس مشاورت میں احتشام حسین، حیات اللہ انصاری سہیل عظیم آبادی اور عابد سہیل جیسے ادیبوں اور صحافیوں کا نام شامل تھا۔یہ خالص ادبی رسالہ تھا جس میں علمی، ادبی اور تخلیقی مضامین شائع کئے جاتے تھے۔اس کے علاوہ دیگر زبانوں سے تراجم بھی شائع کئے جاتے تھے۔یہ رسالہ مختلف کالموں میں بٹا ہوا تھا جس ایک بہت اہم کالم تلخ، تند، شیریں کے عنوان سے تھا جو ادبی حلقوں کافی مقبول تھا۔ماہنامہ کتاب

اپنے خاص نمبروں کی وجہ سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔اس نے متعدد خصوصی شمارے شائع کئے ہیں۔جن میں افسانہ نمبر،علی عباس حسینی نمبر،کہانی نمبر،منتخب افسانہ نمبر،اس کے علاوہ مراٹھی کہانی نمبراہمیت کے حامل ہیں۔اس رسالے نے اردو زبان وادب کی ترویج اور قارئین کی ذہن سازی کا کام کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ماہنامہ کتاب ہمیشہ ادبی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔عابد سہیل اوران کی خدمات کا جب بھی تذکرہ ہوگا ماہنامہ کتاب کی خدمات کوضرور یاد کیا جائے گا۔

شب خون:

شمس الرحمٰن فاروقی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ان کا شمار اردو کے بلند پایہ محققوں اورنقادوں میں ہوتا ہے۔ان کی خدمات کی مختلف جہتیں ہیں جس میں ان کا رجحان ساز اور تاریخ ساز رسالہ شب خون بھی شامل ہے۔ رسالہ شب خون کا شمار جدیدیت کے ترجمان کے طور پر ہوتا ہے۔یہ جون 1966 میں الہ آباد سے جاری ہوا۔اس رسالے نے لکھنے والوں کو نئے خیالات،نئی فکر،نئے رجحانات سے نہ صرف روشناس کرایا بلکہ ان کی فکری اور تخلیقی تربیت بھی فرمائی۔شمس الرحمٰن فاروقی اس کی تدوین وترتیب خود کرتے تھے۔رسالہ مختلف کالموں میں بٹا ہوا تھا۔فروغ فکر کے تحت تنقیدی مضامین شائع کئے جاتے تھے۔صہبائے آب گینہ گداز اس کالم میں شعری نگارشات شائع کی جاتی تھیں۔زمانہ بڑے شوق کے سن رہا ہے یہ کالم افسانوں کے لئے مخصوص تھا۔قصہ جدید قدیم کے عنوان سے بھی ایک کالم تھا جس میں کتابوں پر تبصرے اورادبی خبریں شائع کی جاتی تھیں۔کہتی ہے خلق خدا کالم میں قارئین کے تاثرات شائع ہوتے تھے۔بعد میں اس کے کالموں میں وقت کی ضرورت کے حساب سے تبدیلیاں بھی کی جاتی رہیں۔

شب خون کے لئے ایک مجلس کی تشکیل دی گئی تھی۔جس میں مجلس عاملہ میں شمس الرحمٰن فاروقی،جمیلہ فاروقی ترتیب وتزئین،ڈاکٹر سید اعجاز حسین مدیر،جعفر رضا نائب مدیر،وغیرہ شامل تھے۔رسالے کے پہلے شمارے میں مدیر سید اعجاز حسین نے لکھا ہے کہ شب خون کا نام پہلے تیشہ تجویز ہوا تھا مگر بعد میں شب خون رکھا گیا۔مزید شب خون کے اغراض ومقاصد کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں علمی وادبی رسالوں کی تعداد بہت کم ہوتی جارہی ہے۔گنتی کے چند ایسے جریدے رہ گئے ہیں جو چراغ راہ بن کرراہ ادب کوروشن کرنے کی کوشش کررہے ہیں مگر تعداد کی کمی اورروشنی کا فقدان ان دونوں وجوہ سے بھی ناکافی ہے۔اس کی ذمہ داری صرف ان ہی لوگوں پر نہیں جواردو زبان سے بیگانگی برتنے میں فخر محسوس کرتے ہیں بلکہ ان لوگوں پر بھی ہے جواپنے کواردو دوست سمجھتے اور کہتے ہیں اس لئے کہ کوئی ادبی تنظیم ایسی نہیں جوتمام بکھرے ہوئے دانوں کوایک رشتہ میں پرودے،مختلف ومتعدد اہل فکر کے افکار ومحسوسات کو ایک اچھی صورت میں منظر عام پر

لا سکے، پرانے لکھنے والوں کی اچھی تخلیقات چھاپے اور نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرے، یہ کمی اردو دوستوں کے ہر دیار میں محسوس کی جارہی ہے۔اس احساس کا نتیجہ ہے کہ الہ آباد کے کچھ باہمت ادیبوں اورادب دوستوں نے یہ ماہنامہ نکالنے کی فکر کی۔'' 81

شب خون اپنے عہد کے رسالوں سے مختلف تھا۔اردو ادب میں جدید ادب ، نئے رجحان واحساس کو فروغ دینے میں نمایا کردار رہا۔یہی وجہ ہے کہ شب خون کو بہت جلد ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوگئی۔اس کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی اسے فاروقی جیسے نامور نقاد کی سرپرستی اور فراق گورکھپوری، احتشام حسین، آل احمد سرور، عمیق حنفی ،محمد حسن ،محمد احمد فاروقی ،شہریار ،جمیل مظہری ،راجندر سنگھ بیدی، خلیل الرحمٰن اعظمی ،رام لعل ،مسیح الزماں ،اوپیندر ناتھ اشک، وغیرہ جیسے مشاہیر قلم کا تعاون حاصل تھا۔شب خون کا بنیادی مقصد جدید ادب کو فروغ دینا تھا لیکن ترقی پسند تحریک اور دیگر مکتبہ فکر ادیبوں کی تحریریں مستقل شب خون میں شائع ہوتی تھیں۔شب خون کا اشاریہ بھی تیار ہو چکا ہے جس کے مطالعہ سے اندزا ہوتا ہے کہ اردو زبان وادب کا وہ کون سا موضوع ہے جو شب خون میں شائع نہ ہوا ہو۔غرض 2005 میں اپنی صحت اور بعض اہم ادبی کاموں کے پیش نظر شب خون کو بند کر دیا گیا۔غالبا یہ ان رسالوں میں ہے جس نے بند ہونے سے پہلے اپنے خریداروں کو یہ بتایا کہ اگر ان کا ادارہ پر کوئی حساب ہے تو اسے لے سکتے ہیں، اس سلسلے میں شب خون کے متعدد شماروں میں باقاعدہ اس کا اعلان شائع کیا گیا۔آخری شمارہ دو ضخیم جلدوں پر مشتمل تھا۔ایک جلد آخری شب خون کے طور پر تھی جبکہ دوسری جلد میں گذشتہ چالیس برسوں کا انتخاب شائع کیا گیا تھا۔شب خون کی تحریروں کی ایک ہی شناخت تھی اس میں بڑی تعداد میں مغرب کی اہم تحریروں کے ترجمے شائع کیے جاتے تھے۔شمس الرحمٰن فاروقی کے ترجمے بھی کثرت سے چھپے۔فاروقی صاحب کے تبصرے بھی چھپتے تھے جو بعد میں فاروقی کے تبصرے کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ان چالیس سالوں میں ایک بھی خاص شمارہ نہیں شائع کیا گیا۔مگر اس کا ہر شمارہ خاص ہوتا تھا۔رسائل کی کامیابی کا انحصار اداریے پر ہوتا ہے لیکن شب خون نے روایت سے انحرافکرتے ہوئے اداریے کی جگہ مغربی ادیبوں کے اقتباسات شائع کئے۔یہ اقتباسات ناولوں کے مسائل، نئی شاعری کی صورت حال، فنون لطیفہ، آرٹ اور فنکاری وغیرہ موضوعات پر مشتمل ہوتے تھے۔غرض یہ کہ شب خون واحد رسالہ ہے جس نے اردو ادب کو نئے رجحانات وتصورات سے آشنا کیا۔اور ساتھ ہی ادبی صحافت کی روایت کو بھی مستحکم کیا۔

عصری ادب:

سہ ماہی رسالہ عصری ادب دہلی سے 1970 میں نکلا۔جس کی ترتیب وتزئین کا کام معروف نقاد ڈاکٹر محمد حسن کرتے تھے۔یہ ایک ترقی پسند رسالہ تھا۔جس کا بنیادی مقصد ترقی پسند ادب کو فروغ دینا تھا۔عصری ادب میں مدیر کی جگہ سید بہاء الدین کا نام شائع ہوتا تھا۔پہلے شمارے کے اداریے میں رسالے کے متعلق لکھتے ہیں:

''ادب اور زندگی کے یہی عصری رشتے 'عصری ادب' کی اشاعتوں کا موضوع ہیں 'عصری ادب' سال میں چال مرتبہ سائع ہوگا۔ ہر اشاعت کے چار عنوانات ہونگے۔تذکرہ کے تحت عصری زندگی زیر بحث آئے گی۔تبصرہ کے تحت ہر سہ ماہی میں شائع ہونے والے اہم مضامین اور تخلیقی فن پاروں اور ہندوستانی اور غیر ملکی ادب کے اہم ادبی اور فکری میلانات کا جائزہ لیا جائے گا۔عوام کو متاثر کرنے والے دوسرے وسائل اظہار مثلاً ریڈیو،فلم،ٹیلیویژن،اسٹیج وغیرہ کے ذریعے جو کچھ پیش کیا جارہا ہے اس کا تجزیہ کیا جائے گا۔اسی کے ساتھ ساتھ اہم اردو کتابوں پر تبصرے بھی اسی حصے میں شائع ہوں گے۔تیسرا حصہ تخلیقی ہوگا جس میں معیاری افسانے،نظمیں،غزلیں ،ڈرامے،مضامین علمی وتنقیدی مقالے شائع ہوں گے۔اور آخری حصہ نوادر کے لئے وقف ہوگا جس میں مشاہیر کے غیر مطبوعہ اہم خط بھی شامل ہوں گے۔''82

مذکورہ اقتباس سے رسالے کی نوعیت اور خدوخال کا بخوبی اندازا ہوتا ہے کہ عصری ادب کتنے عنوان پر مشتمل ہوگا اور کس عنوان کے ساتھ کیا شائع کیا جائے گا۔اس کے علاوہ اردو ادب کے فروغ اور قارئین کے دلچسپی کے لئے کن کن عوامل کو مدنظر رکھا جائے گا۔اور جیسا کہ اس قبل ذکر کیا چکا ہے کہ اس رسالے کے مقاصد میں سے یہ بھی تھا کہ ترقی پسند ادب کو فروغ دیا جائے گا۔جو لوگ ترقی پسندی سے منحرف ہوکر جدید ادب کی طرف رخ کرنے لگے ہیں عصری ادب ان کے اندر ترقی پسندی کو نئے سرے سے جلا بخشنے کا کام کرے گا۔الغرض سماجی مسائل،معاشی صورت حال،ظلم واستحصال اور جبر واستبداد جیسے ترقی پسند موضوعات پر مضامین شائع کر کے ترقی پسند تحریک کے زندا جاوید ہونے کا ثبوت دیا۔شعیب رضا وارثی عصری ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عصری ادب نے ترقی پسند تحریک کو فروغ دینے کے لئے ان تمام نظریات اور اصول وضوابط کا اعادہ کیا جن پر تحریک کی بنیاد تھی۔ادب کو کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہئے،اس پر مذاکروں اور مضامین کے ذریعے عصری ادب قارئین تک معلومات بہم پہنچاتا رہا۔تحریک کا ایک مقصد ملک میں فرقہ واریت کے خلاف محاذ قائم کرنا بھی تھا۔اس رسالے نے اس طرف توجہ دی اور فرقہ واریت پر متعدد اچھے مضامین اور افسانے و نظمیں چھاپیں۔فرقہ پرستی کے انسداد کے لیے ادیبوں کو متحرک کیا اور اس بات پر زور دیا کہ وہ مختلف قسم کے تعصّبات جو ہمارے ملک کی فضا کو مسموم کررہے ہیں کو اپنا موضوع بنائیں۔''83

ڈاکٹر محمد حسن نے ترقی پسند تحریک کے اصول ومقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے عصری ادب کا اجرا کیا اور ترقی پسند ادب کو دوبارہ زندہ کرنے میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔عصرے ادب کے قلمی معاونین میں ترقی پسند مکتبہ فکر اور دیگر خیالات کے قلم کار شامل رہے جن میں ڈاکٹر قمر رئیس،محمد حسن،شہاب ظفر،صدیق الرحمٰن قدوائی،قاضی عبدالستار،جگن ناتھ آزاد،علی سردار جعفری،حیات اللہ انصاری قابل ذکر ہیں۔عصری ادب نے صرف ترقی پسند ادب کو ہی فروغ

نہیں بخشا بلکہ اردو کی ادبی صحافت کی روایت کو بھی مستحکم کیا۔

عصری آگہی:

ڈاکٹر محمد حسن کے رسالہ عصری ادب کے طرز پر عصری آگہی کا اجرا عمل میں آیا۔اس کا مقصد بھی ترقی پسند تحریک کو دوبارہ جلا بخشنا تھا۔سہ ماہی عصری آگہی کی شروعات 1978 میں دہلی سے ممتاز ادیب قمر رئیس نے کی۔ادبی رسالوں میں یہ رسالہ کافی اہم مانا جاتا ہے۔عصری آگہی کی ابتدا اس وقت ہوئی جب جدیدیت پوری طرح سے اپنے قدم جما چکی تھی اور ترقی پسند تحریک زوال پر تھی۔ ہر طرف جدید ادب کا چرچہ تھا۔اس کے ابتدائی مدیر قمر رئیس اور معاون مدیر سید عاشور کاظمی تھے۔یہ رسالہ ہمیشہ تعطل کا شکار رہا اور ایک مدت تک نکلنے کر بعد وسائل کی قلت کے سبب بند ہو گیا۔مگر اپنے ادبی مضامین اور تخلیقی نگارشات کی وجہ سے یہ رسالہ اپنی انفرادی شناخت بنانے میں کامیاب رہا۔ رسالہ مختلف عناوین پر منقسم تھا۔مضامین جس کے تحت اردو ادب کے مختلف موضوعات پر تنقیدی نوعیت مضامین شائع کیے جاتے تھے ان مضامین کے لکھنے والے بھی ممتاز ادیب وقلمکار ہوتے تھے جن میں قمر رئیس، پروفیسر محمد عقیل رضوی، پروفیسر وہاب اشرفی، بشیر احمد، شاہد احمد دہلوی، قابل ذکر ہیں۔اس علاوہ نظموں، غزلوں اور نثری تخلقات کے لئے الگ الگ کالم مختص تھے۔دیگر زبانوں سے تراجم بھی شائع کئے جاتے تھے۔اس کے علاوہ خصوصی شمارے اور ادبی گوشے بھی شائع کئے گئے جن میں راجندر سنگھ بیدی نمبر، پریم چندر نمبر اور عصمت چغتائی نمبر اہمیت کے حامل ہیں۔

ایوان اردو:

دہلی میں اردو کے فروغ کے لئے مارچ 1981 میں اندرا گاندھی کے ہاتھوں اردو اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔جس کے ترجمان کے طور پر مئی 1987 میں ماہ نامہ ایوان اردو جاری کیا گیا۔ایوان اردو کا بھی بنیادی مقصد اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت تھا۔اس کے علاوہ ملک میں گنگا جمنی تہذیب کو فروغ بخشنا اور اردو کے متعلق بدگمانیوں کو دور کرنا تھا۔ایوان اردو کے پہلے مدیر ممتاز صحافی اور مدیر مخمور سعیدی تھے۔جس کے بعد شریف الحسن نقوی، عنوان چشتی، فضل الحق، زبیر رضوی، ڈاکٹر صادق، پروفیسر قمر رئیس، انیس اعظمی، اور راغب الدین جیسے نامور ادیب بھی اس سے وابستہ رہے۔اس لئے رسالے کا معیار اور وقار روز افزوں ترقی کے مدارج طے کرتا رہا۔اور آج تیس سال طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی بغیر کسی تعطل کے جاری ہے۔ماہنامہ ایوان اردو میں علمی، ادبی، تحقیق اور تنقیدی مضامین کے علاوہ تخلیقی مضامین بھی شائع کئے جاتے ہیں۔جدید مطبوعات پر عمدہ تبصرے اور ادبی خبروں کے اشاعت کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔واضح رہے کہ ادبی خبروں کے تحت عام طور پر اردو اکیڈمی کی سرگرمیاں شامل اشاعت ہوتی ہیں۔سرکاری رسالہ ہونے کے باوجود اردو شعر و دب کے فروغ میں غیر معمولی خدمات انجام دی۔اردو زبان وادب کا بمشکل ہی کوئی موضوع ہوگا جس پر ایوان اردو نے مضامین نہ شائع کئے ہوں۔دہلی کی آثار قدیمہ کے متعلق ڈاکٹر خلیق

انجم کا ایک طویل مضمون جو گیارہ قسطوں میں شائع ہوا، جس کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ مختلف شخصیات پر خصوصی شمارے اور گوشے بھی شائع کیے گئے جن میں قرۃ العین حیدر نمبر، فیض احمد فیض نمبر، پریم چند نمبر، علامہ اقبال نمبر، کیفی اعظمی نمبر، حکیم عبدالحمید نمبر، شبلی نمبر، معاصرین غالب نمبر، فراق نمبر، غلام ربانی تاباں نمبر، خواجہ احمد عباس نمبر، مولانا آزاد نمبر اہمیت کے حامل ہیں۔ ایوان اردو کبھی کسی تحریک یا رجحان کا ترجمان نہیں رہا اور ابتدا ہی سے اپنے متوازن معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہے یہی وجہ ہے کہ سبھی مکتبہ فکر میں اس پزیرائی برابر ہے۔ آج بھی یہ رسالہ بڑی آب وتاب کے ساتھ جاری ہے۔

ذہن جدید:

یہ ایک سہ ماہی رسالہ تھا جو 1990 میں جاری ہوا۔ جمشید جہاں مدیر اور مرتب زبیر رضوی تھے۔ اس کا ہر شمارہ کافی ضخیم اور دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلا شمارہ 203 صفحات پر مشتمل تھا۔ ذہن جدید کی سب سے خاص بات اور انفرادیت یہ کہ اس میں ملکی اور غیر ملکی تمام فنون لطیفہ کو شائع کیا جاتا ہے۔ رسالے کے سرورق پر یہ جملہ لکھا ہوتا ہے 'ادب آرٹ اور کلچر کا ترجمان، اور یقیناً ذہن جدید نے ادب اور فنون لطیفہ کی ترجمانی میں کامیابی بھی حاصل کی۔ ذہن جدید کے ہر شمارے میں علمی، ادبی، تخلیقی اور فنون لطیفہ کے علاہ کسی خاص موضوع کو موضوع بحث بنایا جاتا ہے جس پر مختلف ناقدین اور محققین کی آرا کو شامل کیا جاتا ہے۔ ذہن جدید کا ہر شمارہ اتنا جاذب نظر اور مواد سے پر ہوتا ہے کہ قاری اگلے شمارے کا بے صبری سے منتظر رہتا ہے۔ مخمور سعیدی ذہن جدید کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اردو میں ایسے رسالوں کی کمی ہے جو ادبی تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ دوسرے معاملات اور مسائل کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ سکتے ہوں جن کا ہماری ذہنی اور جذباتی زندگی سے قریبی رشتہ ہے۔ مصوری، موسیقی، رقص، فلم اور بہت سارے سماجی اور سائنسی علوم جن سے واقفیت یا بے تعلقی ہماری شخصیت کے ادھورے پن پر دلالت کرے گی۔۔۔ ذہن جدی ادب کے ساتھ دیگر فنون لطیفہ کا بھی احاطہ کرتا ہے۔'' 84

مذکورہ اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ذہن جدید اردو کا واحد رسالہ ہے جو اردو زبان و ادب کے ساتھ فنون لطیفہ مصوری، موسیقی، فلم سازی، تہذیب و کلچر جیسے موضوعات کو شائع کرنے کا خاص اہتمام کرتا ہے۔ یقیناً آپ کوئی بھی شمارہ اٹھائیں نظر ڈالیں تو اندازا ہوگا کہ علم وادب کا وہ کون سا موضوع ہے جس پر مضامین نہ ہوں۔ اس کے علاوہ نظموں، غزلوں، افسانوں، اور دیگر اصناف کے لیے الگ الگ کالم مختص ہیں۔ چونکہ زبیر رضوی خود ایک عمدہ اور مقبول عام شاعر تھے اس لیے انہوں نے رسالہ میں تخلیقی جہت کو نمایاں رکھا۔ ذہن جدید میں خصوصی گوشوں کی اشاعت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور ایک بڑی تعداد میں گوشے شائع ہوئے جوں جو ادبی دنیا میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے

جاتے ہیں۔ مدیر ذہن جدید کی ہمیشہ سے یہی کوشش رہی ہے ایسے قلم کاروں کی تخلیقات کو شائع کیا جائے جسے قارئین پڑھنا چاہتے ہیں۔ ذہن جدید کے اہم قلم کاروں میں شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر قمر رئیس، وزیر آغا، علی احمد فاطمی، شمیم حنفی، ڈاکٹر وحید اختر، بلراج کومل، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، بانو قدسیہ، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تیس سال سے زائد کا عرصہ تک جاری رہنے کے بعد زبیر رضوی کے انتقال کے ساتھ ہی رسالہ بھی بند ہوگیا۔ یقیناً جب بھی رسائل کا تذکرہ ہوگا ذہن جدید کی خدمات کو ضرور یاد کیا جائے گا۔

اردو دنیا:

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک سرکاری ادارہ ہے جہاں سے متعدد رسالے شائع ہوتے ہیں جن میں سے ایک اردو دنیا بھی ہے۔ اردو دنیا کا پہلا شمارہ ستمبر 1997 میں منظر عام پر آیا وہ اس وقت سہ ماہی رسالہ تھا۔ 1969 میں اردو زبان کے فروغ کے لیے ترقی اردو بورڈ کی تشکیل ہوئی۔ پھر جون 1973 کو بیورو فار پرموشن آف اردو وجود میں آیا۔ جس کے تحت دو رسالے اردو میں خبر نامہ اور انگری میں نیوز لیٹر کے نام سے شائع ہونے لگے۔ لیکن جب حیات اللہ انصاری اردو بورڈ کے چیئر مین ہوئے تو انہوں نے خبر نامے کو تصنیف و تالیف سے موسوم کیا اور 1980 سے اردو دنیا کے نام سے خبر نامے کا آغاز کیا۔ 1994 میں ترقی اردو بورڈ کا اختتام ہوا اور 20 جون 1994 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نام سے ایک خود مختار ادارہ قائم کیا گیا۔ یکم اپریل 1996 کو بیورو فار پرموشن آف اردو جو مرکزی حکومت کا ایک خود مختار ادارہ تھا قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ساتھ ضم کر دیا گیا۔ اس ادارے نے اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں اہم کردار ادا کیا اور زبان و لسانیات، سائنس، صحافت، سماجیات، فنون لطیفہ، فلسفہ، انسائیکلوپیڈیا اور لغات جیسے موضوعات پر سیکڑوں کتابیں شائع کیں۔ اس کے علاوہ بچوں کے ادب پر بھی بڑی تعداد میں کتابیں تیار کرائی، ای سی آر ٹی کی کتابوں کا بھی اردو میں ترجمہ کرایا۔ صحافت کے میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ اردو دنیا جس کی ابتدا ایک خبر نامے کے طور پر ہوئی تھی ترقی کر کے ایک علمی و ادبی رسالہ بن گیا۔ ابتدا میں سہ ماہی تھا مگر اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اسے ماہنامہ کر دیا گیا۔ بلکہ 2011 سے بڑی سائز اور رنگین صفحات پر شائع کیا جانے لگا۔ موجودہ وقت میں ہندوستان کا سب زیادہ شائع ہونے والا رسالہ بن چکا ہے۔ اس رسالے میں اردو زبان و ادب کے متعلق تنقیدی و تحقیقی مضامین کے علاوہ تخلیقی نگارشات بھی شائع کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات اور متعدد شخصیات پر بڑی تعداد میں خصوصی شمارے اور گوشے بھی شائع کئے جا چکے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے شائع ہونے والا ایک اور ادبی و تحقیقی رسالہ 'فکر و تحقیق' ہے۔ جو دسمبر 1992 تک ششماہی کے طور پر شائع ہوتا رہا۔ ایک مدت تک اس اشاعت موقوف رہی پھر جنوری 1997 میں اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ فکر و تحقیق کو جولائی 1998 میں سہ ماہی کر دیا گیا۔ اس میں بیشتر مضامین ادبی اور تحقیقی شائع

ہوتے ہیں ۔اپنے علمی ،ادبی اور تحقیقی خدمات کی وجہ سے یہ رسالہ ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔فکر و تحقیق کے علاوہ اس ادارے سے خواتین کی دنیا، بچوں کی دنیا جیسے معیاری رسالے شائع ہوتے ہیں۔

اردو بک ریویو:

اردو بک ریویو کی شروعات 1995 میں عارف اقبال نے کی تھی۔ یہ رسالہ اپنے منفرد مشمولات اور تبصروں کے لیے جانا جاتا ہے۔اردو بک ریویو اردو میں حوالوں،تبصروں اور ادبی خبروں کے لیے وقف اپنی طرز کا واحد رسالہ ہے۔ یہ رسالہ کسی تحریک ور جحان نمائندہ یا ترجمان نہیں بلکہ خالصتا اردو کی خدمت کے لیے وقف ہے۔اردو بک ریویو کے مدیر عارف اقبال اور معاون مدیر ارشد سراج الدین مکی ہیں۔

اردو بک ریویو میں مضامین ومقالات کو ثانوی اور کتابوں پر تبصرے،جدید مطبوعات کی اطلاع،ادبی خبروں کو اولیت حاصل ہے۔یہ رسالہ مختلف کالموں میں بٹا ہوا ہے۔رسالہ اردو بک ریویو کا ایک دلچسپ کالم 'کتاب زندگی' ہے اس کالم کے تحت بزرگ ونوجوان ادیبوں اور وقلم کاروں کی مختصر سوانح نیز سوال وجواب کی شکل میں بعض دیگر معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔'نقد وتبصرہ' اردو بک ریویو کے اہم کالموں میں سے ایک ہے۔اس عنوان کے تحت جدید مطبوعات پر پر مغز نقد وتبصرہ کیا جاتا ہے۔'وفیات' کے عنوان کے تحت شعرا و ادبا کے انتقال پر ان کی تعزیت کے ساتھ ساتھ ان کے کوائف بھی پیش کیے جاتے ہیں۔غرض یہ کہ یہ رسالہ اردو ادب پر گہری نظر رکھتا ہے اور اردو میں شائع ہونے والی کتابوں کے حوالے سے جامعیت کے ساتھ جدید لٹریچر پر تجزیہ اور نقد کرتا ہے۔اردو بک ریویو کی ابتدا ماہنامے کے طور ہوئی لیکن مسلسل تعطل کا شکار رہا۔غرض وسائل کی قلت کے سبب اسے سہ ماہی کر دیا گیا۔اردو دنیا کا یہ منفرد رسالہ گذشتہ پچیس سالوں سے جاری ہے۔ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

مذکورہ رسالوں کے علاوہ بیسویں صدی میں جاری ہونے والے رسالوں کی ایک بڑی تعداد ہے مگر یہاں صرف ان رسالوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کا اردو زبان وادب کے فروغ میں اہم کردار رہا ہے۔لیکن مقالے کے آخر میں ابتدا سے تا حال کے رسائل وجرائد کا ایک اشاریہ پیش کیا گیا ہے تا کہ اس بات کا بخوبی اندازا لگایا جا سکے کہ اردو میں اب تک کون کون سے رسائل کب اور کہاں سے جاری ہوئے اور اس کا اجرا کرنے والا کون تھا۔اکیسویں صدی میں بھی رسائل کے اجرا کا سلسلہ جاری ہے۔اور اب بھی ایک بڑی تعداد میں مختلف نوعیت کے رسائل جاری ہیں۔ان رسائل میں بڑی تعداد ان رسالوں کی ہے جو بیسویں صدی کے آواخر میں جاری ہوئے۔اکیسویں صدی میں جاری ہونے والے رسائل میں مژگاں (کلکتہ)،ماہنامہ نقوش عالم (بنگلور)،کل اور آج کے فنکار(گوالیار)،رنگ وبو (حیدرآباد)،ادب ساز،گل بوٹے (ممبئی) یوجنا اردو، جہان کتب، جہان غالب (دہلی) سہ ماہی نئی کتاب، جہان اردو، ماہنامہ شگوفہ (حیدرآباد)، ماہنامہ امکان (لکھنؤ)،وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

1۔ عبدالسلام خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، ص 1

2۔ ڈاکٹر انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، ص 10

3۔ ڈاکٹر طاہر مسعود، اردو صحافت انیسویں صدی میں، ص 22

4۔ ایضاً ص 22

5۔ ضیاالدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، ترجمہ سید معین الحق، ص 100

6۔ ایضاً ص 94

7۔ عبدالسلام خورشید، داستان صحافت، ص 10

8۔ اے کے پرولکر، مترجم علی ابن الحسین زیدی، ہندستان میں چھاپہ خانہ آغاز وابتدائی تاریخ، ص 2

9۔ ایضاً، ص 39

10۔ عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندستان کے تمدن کی تاریخ، ص 73

11۔ امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد چہارم، ص 395

12۔ انٹرویو، شمس الرحمٰن فاروقی، شمس الرحمٰن فاروقی ڈاٹ کام

13۔ ڈاکٹر انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، ص 14

14۔ ایضاً، ص 3

15۔ عابد سہیل، اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل، ص 106

16۔ ڈاکٹر محمد انوار الدین، ذرائع ابلاغ میں رسائل کی اہمیت، ص 100

17۔ امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد اول ص 222

18۔ امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد اول ص 266

19۔ نادر علی خان، اردو صحافت کی تاریخ, ص 190

20۔ ڈاکٹر انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، ص 28

21۔ امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد اول ص 331

22۔ محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، ص 287

23۔ اودھ اخبار جنوری، 1874

24۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر، تاریخ ادب اردو، ص743

25۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، ص402

26۔ خلیق احمد نظامی، سید احمد خاں، آج کل، جون ص97

27۔ امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد دوم ص256

28۔ امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد دوم ص257

29۔ رئیس الدین فریدی، اردو صحافت عہد بہ عہد، ص50،

30۔ ڈاکٹر امتیاز ندیم، مخزن اشاریہ اور ادبی خدمات، ص411

31۔ روشن آرا، مجلّاتی صحافت کے اداراتی مسائل، ص27

32۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، ص490

33۔ روشن آرا، مجلّاتی صحافت کے اداراتی مسائل، ص30

34۔ جبین انجم، ماہنامہ جامعہ، ستمبر 1992، ص34

35۔ نور الہدیٰ، قدیم رسائل اور اداریہ نگاری، ص277

36۔ ایضاً، ص277

37۔ دیا نرائن نگم، اداریہ رسالہ زمانہ، اکتوبر 1923

38۔ سید سلیمان ندوی، معارف شذرات جولائی 1916

39۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ حصہ اول، ص80

40۔ مشاہیر کے خطوط بنام سید سلیمان ندوی ص79

41۔ آل احمد سرور، سہ ماہی اردو ادب، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، جولائی 1950 ص5

42۔ ڈاکٹر محمد یونس، انجمن ترقی اردو کی تاریخی خدمات 1947 تک، ص279

43۔ آل احمد سرور، سہ ماہی اردو ادب، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، جولائی 1950، ص5

44۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، ص394

45۔ بشیر احمد، ہمایوں لاہور، جنوری 1922

46۔ نیاز فتح پوری، نگار، نومبر 1988 ص5

47۔ ڈاکٹر شریف الدین، اردو صحافت اور حسرت موہانی، ص90

48۔ نور الرحمٰن، رسالہ جامعہ، جنوری تا جون 1923

49۔ حکیم محمد یوسف حسن، رسالہ نیرنگ خیال، جولائی 1925

50۔ نورالہدی، قدیم رسائل اوراداریہ نگاری، ص 377

51۔ ایضا، ص 378

52۔ دستاویز، اردو کے اہم ادبی رسائل وجرائد کی تاریخ، دوحہ ص 228

53۔ مولانا صلاح الدین، ادبی دنیا، بزم ادب، سالنامہ 1939

54۔ دستاویز، اردو کے اہم ادبی رسائل وجرائد کی تاریخ، دوحہ ص 250

55۔ امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد پنجم، ص 1176

56۔ حامد اقبال صدیقی، سیماب اکبرآبادی، ص 42

57۔ فیروز احمد، شاعر ہمعصر اردو نمبر، 1977، ص 106

58۔ ڈاکٹر شمیم نکہت، روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی، 1982 ص 115

59۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ماہنامہ سب رس، حیدرآباد جنوری 1938 ص 4

60۔ عاصم شہنواز شبلی، ماہنامہ امکان لکھنؤ، جنوری 2009 ص 38

61۔ عبدالحیٔ، ادبی صحافت، ص 71

62۔ جمیل اختر، اشاریہ ماہنامہ آج کل، نئی دہلی ص 81

63۔ فراق گورکھپوری، رسالہ آج کل، مارچ 1957

64۔ فراق گورکھپوری، رسالہ آج کل، مارچ 1957

65۔ دستاویز، اردو کے اہم ادبی رسائل وجرائد کی تاریخ، دوحہ ص 395

66۔ نذیر احمد چودھری، مجھے بھی کچھ کہنا ہے، سویرا شمارہ نمبر 1، جنوری 1947

67۔ ایضا، شمارہ نمبر 1

68۔ انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، ص 119

69۔ ایضا، ص 139

70۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، مجلّاتی صحافت میں نقوش کا مقام، ص 18

71۔ محمد یوسف، اداریہ شاہراہ ناولٹ نمبر، حصہ اول، فروری 1958

72۔ نوشاد منظر، رسالہ شاہراہ تجزیاتی مطالعہ اوراشاریہ، ص 9، 10

73۔ ظہیرالدین مدنی، رسالہ نوائے ادب، انجمن اسلام ممبئی، جنوری 1950، ص 6

74۔ محمد نوشاد عالم، ادبی شناخت، ص110

75۔ ڈاکٹر شمیم نکہت، روزنامہ قومی زبان، دہلی، 1982 ص111

76۔ اطہر مسعود خاں ۔ اشاریہ نیا دور، ص43

77۔ ایضا، ص78

78۔ ڈاکٹر انیس صدیقی، کرناٹک میں اردو صحافت، ص161

79۔ پروفیسر سید محمد ہاشم، فکر و نظر، مشتاق احمد یوسفی نمبر، 2019 ص، 6

80۔ ریحان احمد عباسی، ماہنامہ کتاب نما، مارچ 1965، ص1

81۔ رسالہ شب خون، جون 1966، ص3

82۔ عصری ادب، 1970 شمارہ نمبر1

83۔ شعیب رضا خاں وارثی، آزادی کے بعد دہلی میں اردو کے ادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ، ص41

84۔ مخمور سعیدی، ماہنامہ آج کل، نومبر 1990

باب سوم

ادبی تحقیق کی روایت

1۔ ادبی تحقیق معنی و مفہوم

2۔ ابتدائی نقوش

3۔ ادبی تحقیق کا ابتدائی دور

4۔ ادبی تحقیق کی روایت

ادبی تحقیق معنی ومفہوم

انسان فطرتاً متجسس مزاج ہے۔ وہ ہر وقت تجسس میں رہتا ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز کو وہ غور و فکر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہی تجسس دنیا سے آگہی بخشتا ہے۔ انسان کی یہی فطرت اسے تحقیق کی طرف مائل کرتی ہے۔ آج دنیا کے تمام علوم وفنون اور اس کے مختلف شعبوں میں جو نئی نئی دریافت ہورہی ہے وہ اسی جذبۂ تحقیق کی رہین منت ہے۔ علوم کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ تحقیق اس پر مہر نہ ثبت کردے۔ تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ جو سماج ومعاشرے اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی کے تاریک گوشوں کو روشن کرتی ہے۔ مشینوں کی ایجاد، ٹیکنالوجی کی ترقی اور ایٹم بم کی ایجاد، موسمیاتی تبدیلی کی اطلاع، دنیا میں آنے والی نت نئی مصیبت، طوفان اور زلزلوں کی وقت سے پہلے اطلاع اور اس سے بچنے کے لائحہ عمل سب کچھ تحقیق کی دین ہے۔ علمی درسگاہوں سے عملی تجربہ گاہوں تک ہر جگہ تحقیق کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ دیگر علوم کی طرح اردو میں بھی تحقیق کی روایت ابتدا سے رہی ہے البتہ باضابطہ طور سے اس کی ابتدا بیسویں صدی میں ہوئی۔ بہتر ہوگا کہ اردو میں ادبی تحقیق کی ابتدا اور اس کی روایت پر نظر ڈالنے سے قبل ادبی تحقیق کو سمجھ لیا جائے یہ ضروری بھی ہے اور معلومات کے اعتبار سے اہم بھی۔

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے۔ ح ق ق سے مشتق اور باب تفعیل کا مصدر ہے جس کا مطلب حق کو ثابت کرنا حق کی طرف پھیرنا ہے۔ 1

لغات میں تحقیق کے معنی کھوج، تفتیش، دریافت اور چھان بین کے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف لغات میں الگ الگ معنی دیے گئے ہیں۔

نور اللغات: تحقیق (ع۔ دریافت کرنا، کھوج لگانا) حقیقت دریافت کرنا۔ پوچھ کچھ، تصدیق۔

فرہنگ آصفیہ: تحقیق (ع۔ اسم مؤنث) راست، صحیح، درست، ٹھیک، سچ، تصدیق، ثبوت، مسلم، تسلیم کردہ شدہ، یقین، اعتبار، چھان بین، تلاش، تجسس، تفتیش، کھوج، سراغ، پتہ، دریافت، پوچھ گچھ، جانچ، شناخت، قابل اعتبار وغیرہ کے معنی درج ہیں۔

فرہنگ آمرہ میں تحقیق کے معنی تلاش، حقیقت جاننا، حق بات ڈھونڈھنا کے دیے گئے ہیں۔

تحقیق کا انگریزی مترادف Reseach ہے۔ رابرٹ راس کے مطابق Research فرنچ زبان کے لفظ Rechercher سے نکلا ہے، جس کے معنی پیچھے جا کر تلاکرنا (to search back)۔ انگریزی لفظ Search کا ماخذ فرنچ لفظ Chercher جو لاطینی زبان Circare سے ماخوذ ہے، جس کے معنی گھومنا پھرنا ہے۔ اس طرح ریسرچ کے معنی ہوئے گھوم پھر کر تلاش کرنا 2

شریڈن بیکر کے مطابق:

Reseach کے معنی دوبارہ تلاش کرنا ہے یعنی جہاں دوسروں نے تلاش کی ہے وہیں پھر تلاش کر کے ایسی

نئی بات کھوج نکالنا جو دوسرے نہیں ڈھونڈ پائے تھے۔3

ریسرچ یا تحقیق کے لغوی معنی سے اس کا صحیح مفہوم کا تعین نہیں ہوتا اس لیے تحقیق کے اصطلاحی معنی محققین نے اپنے زاویے سے الگ الگ معنی متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ہم یہاں چند محققین کی آرا کو درج کرتے ہیں تا کہ تحقیق کی صحیح تعریف کا تعین ہو سکے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ:

تحقیق کے لغوی معنی کسی شئے کی حقیقت کا اثبات ہے۔اصطلاحا یہ ایک ایسے طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔4

مالک رام:

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے۔اس کا مادہ ح ق ق۔جس کے معنی ہیں، کھرے کھوٹے کی چھان بین یا کسی بات کی تصدیق کرنا۔دوسرے لفظوں میں تحقیق کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے علم وادب میں، کھرے کو کھوٹے سے، مغز کو چھلکے سے، حق کو باطل سے الگ کریں۔انگیزی لفظ ریسرچ کے بھی یہی معنی اور مقصد ہیں۔5

قاضی عبدالودود:

تحقیق کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش کا نام ہے۔6

گیان چند جین:

تحقیق کے لغوی معنی حق کو ثابت کرنا، حق کی طرف پھیرنا، کسی چیز کی کھوج کرنا یا کسی شئے کی حقیقت کو ثابت کرنا ہے۔تحقیق کا انگریزی مترادف Research ہے۔7

جمیل جالبی:

تحقیق دراصل تلاش وجستجو کے ذریعہ حقائق معلوم کرنے اور ان کے تصدیق کرنے کا نام ہے، یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے آپ صحیح اور غلط میں امتیاز کرتے ہیں اور پھر صحیح کی مدد سے اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہیں۔8

پرفیسر عبدالستار ردولوی:

تحقیق کسی مسئلے قابل اعتبار حل اور صحیح نتائج تک پہنچنے کا وہ عمل ہے جس میں ایک منظّم طریقہ کار، حقائق کی تلاش، تجزیہ اور تفصیل کاری پوشیدہ ہوتی ہے۔9

مذکورہ بالا تعریفوں کے علاوہ بھی الگ الگ تعریفیں کی گئی ہیں۔مجموعی طور پر دیکھا جائے تو نا معلوم اشیاء کی دریافت اور موجودہ حقائق کی تصدیق اور اضافہ کا نام تحقیق ہے۔علوم وفنون کے متعدد شعبہ ہیں اور ہر شعبہ میں تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔علوم وفنون اور موضوعات کی تنوع کے سبب تحقیق کی بھی متعدد قسمیں ہیں۔مثلا موضوع کے اعتبار

سے،مقاصد کے اعتبار سے،مدت کے اعتبار،اخراجات کے اعتبار،منہج کے اعتبار سے،معیار کے اعتبار سے،محقق کی تعداد کے اعتبار سے،البتہ بنیادی طور پر دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1۔خالص نظریاتی تحقیقی(Pure Research)

2۔اطلاقی تحقیق(Applid Resesrch)

خالص یا نظریاتی تحقیق کا مقصد معلومات میں اضافہ کرنا ہوتا ہے جب کہ اطلاقی تحقیق میں معلومات کے اضافہ کے ساتھ اپنے نتائج کو عملی شکل میں بھی پیش کرتی ہے۔یعنی کہ نظریاتی تحقیق کا تعلق ادبی تحقیق کے اصول ومبادیات سے ہے جبکہ اطلاقی تحقیق کا مقصد عملی طور پر پیش کرنا ہے۔ادبی تحقیق کا مقصد بھی یہی ہے کہ مختلف نظریوں،تحریکوں،کتابوں،مصنفوں اور متفرق تخلیقات کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور موجودہ معلومات کی جانچ پڑتال کرنا اور غلط بیانیوں کو رفع کرنا ہے تا کہ درست رائے سامنے آسکے۔ادبی تحقیق میں تاریخی اور تجزیاتی طریقہ کار سے مدد لی جاتی ہے البتہ تاریخی تحقیق سے زیادہ مدد لی جاتی ہے۔

ابتدائی نقوش

ادبی تحقیق کے ابتدائی نقوش اٹھارہویں صدی سے ہی ملنے شروع ہو گئے تھے۔ یونیورسٹیوں میں اردو ادب میں تحقیق 1940 کے بعد شروع ہوئی۔ پہلی سندی تحقیق کے سلسلے میں گیان چند جین نے 1942 کا سال مقرر کیا ہے[10] البتہ اس کے اولین نقوش تذکروں کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ تذکرہ یہ ایک ایسی فنی ہیئت ہے جس میں اشخاص کے احوال و اثار کا ذکر ہوتا ہے۔ ادب میں اس سے مراد ایسی کتاب ہے جس میں شعرا کے حالات، منتخب کلام اور ان کے کارناموں پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہو۔ یہ ذکر مدلل نہیں ہوتا تھا بلکہ کچھ دیکھی اور کچھ سنی ہوئی باتوں پر تذکرہ نویس لکھتا تھا۔ ابتدائی تذکروں سے لے کر آب حیات تک اس نوع کی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ ادب کی تاریخ کے بہت سے ماخذ یہی تذکرے ہیں اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ڈاکٹر حنیف نقوی تذکرے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مروجہ اصطلاحی معنی کی روشنی میں صرف وہی کتابیں تذکرے کی تعریف میں آتی ہیں جن میں شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے پیش کیے گئے ہوں۔ دوسرے الفاظ میں یہ دو عناصر مختصر حالات اور منتخب کلام اس صنف ادب کے لیے ناگزیر ہیں، جس کی مربوط اور متوازن آمیزش کے بغیر کسی تصنیف کو تذکروں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ حالات کے تحت تذکرہ نگار شعرا کے نام اور تخلص، وطن اور جائے قیام، علمی وفنی استعداد، شاگردی کے روابط، مزاج وطبیعت کی افتاد، تصنیفی وتالیفی کارناموں کی نوعیت اور کلام کے معیار ومذاق کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرتا ہے۔''[11]

اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت فارسی سے آئی۔ اردو تذکرہ نگاروں نے نہ صرف فارسی تذکرہ نگاری کے عام اصولوں کی پیروی کی بلکہ اپنے تذکروں کی زبان بھی فارسی رکھی۔ انیسویں صدی سے قبل کا کوئی بھی تذکرہ اردو زبان میں نہیں ملتا۔ پہلا تذکرہ جو اردو زبان میں لکھا گیا وہ مرزا علی لطف کا تذکرہ 'گلشن ہند' (1801) ہے۔ جب کہ فارسی میں تذکرہ نگاری کی ابتدا تیرہویں صدی کے ابتدا میں ہو گئی تھی۔ چنانچہ سدید الدین محمد بن عوفی کا تذکرہ 'لباب الباب' (1220) کو فارسی کا پہلا دستیاب شدہ تذکرہ قرار دیا جاتا ہے۔[12] اردو میں لکھے جانے والے تذکروں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ اٹھارہویں صدی میں لکھے جانے والے تذکروں میں 'چمنستان شعرا' لچھمی نارائن شفیق، 'طبقات الشعراء' قدرت اللہ شوق، 'تذکرہ شعرا اردو' میر حسن دہلوی، 'تذکرہ شورش' سید غلام حسین شورش، 'گلشن سخن' مرزا کاظم علی متبلا لکھنوی، 'گلزار ابراہیم' محمد ابراہیم خاں خلیل، 'تذکرہ ہندی' غلام ہمدانی مصحفی، 'غبار الشعرا' خوب چند ذکا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جبکہ انیسویں صدی میں لکھے جانے والے تذکروں میں 'گلشن ہند' مرزا علی لطف، 'ریاض الفصحا' مصحفی، 'مجموعہ نغز' قدرت اللہ قاسم، گلستان بے خزاں' قطب الدین باطن، 'خوش معرکہ زیبا' سعادت خاں

ناصر، 'طبقات الشعرا ہند' کریم الدین، 'سخن الشعرا' عبد الغفار نساخ، 'انتخاب یادگار' امیر مینائی، اور 'آب حیات' محمد حسین آزاد اہم ہیں۔

واضح رہے کہ تذکرہ نگاروں کا عام مطمح نظر تحقیق نہیں تھا بلکہ ان کا بنیادی مقصد ادبی ذوق کی تسکین تھا۔ قدیم تذکروں کو زیادہ سے زیادہ تعارف نامہ کہا جاسکتا ہے۔ بیشتر تذکروں میں شعرا کے مختصر حالات، تاریخ پیدائش، مولد ومسکن، انتخاب اشعار اور ان کے کلام کی خصوصیات اور تنقید ملتی ہے۔ تذکرہ نگاری کا فن اختصار کا متقاضی ہوتا ہے اس لیے اس میں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ یہی وجہ رہی ہے کہ اکثر تذکروں پر بعد میں تنقید کی گئی۔

میر کا تذکرہ 'نکات الشعرا' (1165ھ۔1752) جو اردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے سے 'آب حیات' (1880) کے درمیان اور اس کے بعد بڑی تعداد میں تذکرے لکھے گئے۔ انیسویں صدی کے نصف تک بیشتر تذکرے فارسی میں لکھے گئے۔ 1857 کے بعد معدود چند تذکروں کے بقیہ اردو زبان میں تحریر کیے گئے اور ان میں سے بیشتر دکن، گجرات اور دہلی اور اس کے نواح میں لکھے گئے۔ ان میں سے اکثر تذکروں کی نوعیت یہ ہے کہ واقعات کی صحت اور عدم صحت کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ رائے زنی میں جانب داری اور مصلحت سے بھی کام لیا گیا ہے۔ شعرا کی تاریخ پیدائش اور وفات کے متعلق کوئی خاص تحقیق نہیں کی گئی۔ ماخذ کے نشادہی کی بھی کوئی خاص پابندی نہیں کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے تذکروں میں بڑی تعداد میں کمیاں ہیں۔ تذکروں کی ان کمزوریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے:

۱۔ تذکروں میں حالات زندگی عموماً بہت مختصر اور انتخاب کلام اکثر طویل ہیں۔
۲۔ سوانح اور شاعر کے انداز سخن گوئی کے سلسلے میں تقریباً سب نے ایک ہی روش اختیار کی ہے۔
۳۔ شاعروں کے حالات میں ان ان کے سال پیدائش و وفات اور عمر و عہد کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا گیا ہے۔
۴۔ ایک شاعر کے اشعار دوسرے شاعر سے یا بعض اشعار کئی شاعروں سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔
۵۔ اکثر تذکروں پر ایک دوسرے کی تقلید کا اثر نمایاں ہے اور تازگی وندرت بہت کم نظر آتی ہے۔
۶۔ شعر کے محاسن میں زیادہ تر صنایع لفظی و معنوی کو اہمیت دی گئی ہیا ور حسب ضرورت ان کو ظاہر کیا گیا ہے۔
۷۔ اکثر طرف داری سے کام لیا گیا ہے اور شعرا کی تعریف و تنقیص ذاتی تعلقات کی بنا پر کی گئی ہے۔
۸۔ تنقیدی لب ولہجہ پر اخلاقی جوش غالب ہے اور عموماً سب کو اچھے الفاظ میں یاد کیا گیا ہے۔ زندگی کو درازی عمر کی دعا دی گئی ہے اور متوفین کو مغفرت کی۔
۹۔ اکثر شعرا کے اسلوب وسلیقہ شعر کے لیے مبہم استعمال الفاظ کیے گئے ہیں جن سے شاعری کی حیثیت واضح نہیں ہوتی۔ [13]

مذکورہ نقائص اور کمزوریوں کے باوجود تذکرے ہی قدیم شعرا کے معلومات کا اہم ذریعہ ہیں۔ شعر و ادب کے مطالعہ میں تذکروں کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تذکروں کی مدد سے ہی ہمیں اس عہد کے ادبی

رجحان، معاصرانہ چشمک اور شعری روایت کا علم ہوتا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ اور شعری روایت متعین کرنے میں تذکرے بہت کارآمد ثابت ہوئے اگر یہ تذکرے دستیاب نہ ہوتے تو ہم اپنے قدیم ادبی سرمایے سے اس طرح واقف نہ ہو پاتے۔ متعدد شعرا کے حالات اور ان کا کلام تذکروں کے ہی رہین منت ہیں۔ مصطفیٰ خاں یک رنگ کا ذکر تذکروں ہی میں ملتا ہے البتہ ان کا دیوان نایاب ہے۔ قدیم تذکروں ہی میں ہمیں تنقید کے اولین نقوش ملتے ہیں۔ شعرا کے کلام پر تنقید کی روایت تذکرہ نگاروں نے ڈالی ہے۔ سوانح نگاری کی ابتدائی شکل بھی انہیں تذکروں میں ملتی ہے۔ دکنی شعرا سے شمالی ہند کے شعرا تک ولی، حاتم، سودا، میر، مصحفی، ذوق، غالب، مومن، میر حسن، قائم، مصحفی، انشاء، آتش، جرأت، ممنون، نسیم، تاباں وغیرہ کے حالات اور کلام کے بارے میں جو کچھ ملتا ہے ان میں ان تذکروں کا نمایاں کردار رہا ہے۔ ہماری ادبی تاریخیں بھی انہی تذکروں کی دین ہیں۔ ایسی صورت میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تذکرے اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود اہمیت کے حامل ہیں اگر یہ تذکرے نہ ہوتے تو عین ممکن ہے ادب کے بہت سے گوشوں اور حقائق کی دریافت نہ ہوتی۔ لہذا اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انہیں تذکروں کی بنیاد پر ہمارا تحقیقی کارواں آگے بڑھا۔ حنیف نقوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''تذکرے تاریخ ادب کا ایک جز بھی ہیں اور ان کی بنیاد بھی۔ انہوں نے بلا استثنا تمام مورخین کے لیے تحقیق و تلاش کی ظلمتوں میں چراغ راہ کا کام دیا ہے۔ ان کے متفق علی بیانات سے حقائق کے عرفان اور واقعات کی تعمیر میں مدد ملتی ہے اور اختلافی مباحث نے ارباب نظر کے ذوق تجسس کو بیدار کر کے تحقیقی شعور کی پرورش اور نشو و نما کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ چنانچہ آج بھی کوئی مورخ ان ماخذ کی جانب رجوع کیے بغیر اپنی تاریخ مکمل اور مستند ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ تذکروں کا یہی وہ بنیادی کردار ہے جو ہر صاحب الرائے شخص کو ان کی لازوال تاریخی اہمیت کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔'' 14

تذکروں کے بعد ادبی تحقیق کی روایت کو آگے بڑھانے میں تاریخ ادب کا بڑا کردار رہا ہے۔ اردو کی پہلی تاریخی کتب 'آب حیات' (1880) ہے۔ یہی وہ سنگ میل ہے جہاں سے تذکرہ شاعری کی تاریخ میں بدل جاتا ہے۔ آب حیات کے بعد اردو ادب کی ایک اور تاریخ جو آب حیات کی طرز پر لکھی گئی امداد امام اثر کی کاشف الحقائق ہے۔ جس کی اشاعت 1897 میں ہوئی۔ اس کے علاوہ بیسویں صدی میں مولوی عبدالحئی کی 'گل رعنا' اور عبدالسلام ندوی کی 'شعرالہند' 1938 قابل ذکر ہیں۔ ان سب سے کے برعکس اردو میں کچھ تاریخیں ایسی بھی لکھی گئیں جو صرف نثر نگاروں تک محدود رہیں جس میں احسن مارہروی کی تاریخ 'تاریخ نثر اردو' 1930، یحیٰ محمد تنہا کی 'سیر المصنفین' 1924، حامد حسن قادری کی 'داستان تاریخ اردو' (1941) قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ علاقائی تاریخیں بھی

لکھی گئیں مثلاً 'دکن میں اردو'، (1985) 'پنجاب میں اردو'، (1960) وغیرہ مگر باضابطہ اردو کی جو پہلی تاریخ لکھی گئی وہ رام بابو سکسینہ کی 'تاریخ ادب اردو' 1927 ہے۔

قدیم تحقیقی روایت کا ایک بڑا حصہ لغات اور قواعد پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے میں خان آرزو کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ 'نوادرالالفاظ' تصحیح غرائب الغات ہندی، خان آرزو کا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ میر ضامن علی جلال لکھنوی کی 'سرمایہ زبان اردو'، امیر مینائی کی امیر اللغات، میر علی اوسط رشک کی نفس اللغہ قابل ذکر ہیں۔ لغات نگاری اور قواعد نویسی میں مستشرقین کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اردو زبان وقواعد متعلق مشترقین کے بیشتر کام انگریزی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں میں ہیں لیکن ان کا تعلق اردو تحقیق کی روایت سے ہے۔ اس لیے ان کا ذکر ناگزیر ہے۔ لغت نگاری میں مستشرقین نے قابل قدر کارنامے انجام دیے اور کئی اردو انگریزی لغات تحریر کی ہیں۔ زبان کی تحقیق میں ان لغات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں ٹیلر، روبک، شیکسپیئر ، فاربس، اور فیلن کے نام خاص طور پر لیے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر گلکرسٹ اور گارساں دتاسی کا نام بہت نمایاں ہے۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ (1749-1841) کو ہندستانی زبان وادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ 1800 میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد وہ شعبہ ہندستانی کے پروفیسر اور ہیڈ مقرر ہوئے۔ لندن میں اورینٹل انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا تو اردو کے معلم کے طور پر ان کا تقرر رہا۔ انہوں نے نہ صرف اردو کی متعدد کتابیں لکھوائیں بلکہ خود کئی کتابیں تحریر کیں۔ ہندوستانی قاعدہ (1890) قواعد کی اہم کتابوں میں سے ایک ہے جس میں تحقیق کے ساتھ ساتھ لسانی تحقیق کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ 'انگریزی ہندستانی ڈکشنری' (1798) اس عہد کی اہم لغات میں سے ایک ہے جس میں تلاش وتحقیق کے عنصر بھی نظر آتے ہیں۔

فرانسیس مستشرق گارساں دتاسی (1797-1878) کا شمار اردو کے قدردانوں میں ہوتا ہے۔ پیرس میں اردو کے پروفیسر کے علاوہ ایک مدت تک ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ کے ناظم بھی رہے۔ ہندستان وہ کبھی تو نہیں آئے البتہ ہندستانی زبان سے محبت اور ہندستانی خبروں سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے۔ قدیم مخطوطوں کی تلاش اور اس کی تدوین ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ سال بھر کی سرگرمیوں اختتام پر ایک لیکچر بھی دیتے تھے جس کا ترجمہ کر کے مولوی عبدالحق نے 1943 میں شائع کر دیا ہے۔ دتاسی کی بڑی تعداد میں کتابیں ہیں البتہ 'تاریخ ادبیات ہندوی وہندوستانی' اور رسالہ تذکرات کے علاوہ ان کے خطبات تحقیقی نظر سے اہمیت کی حامل ہیں۔ ادبیات ہندوی وہندوستانی تذکرے کی طرز میں لکھی ہوئی اردو ادب کی تاریخ ہے۔ تاریخ ادبیات ہندی وہندوستانی تین جلدوں میں فرانسیسی زبان میں ہے۔ جس کا پہلے انگریزی میں اور پھر ذکاء اللہ دہلوی نے اردو میں منتقل کیا۔ اس تذکرے سے نہ صرف یہ کہ اردو تحقیق کو فروغ ملا بلکہ دتاسی کا تذکروں سے دلچسپی اور معلومات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس تذکرے

میں بہت سی کمزوریاں اور غلطیاں ہیں لیکن ایک مستشرق کی حیثیت سے انہوں نے جن معلومات کا ذکر کیا ہے وہ کافی اہم ہیں۔اس سے نہ صرف یہ کہ ان کے ذوق تحقیق کا پتہ چلتا ہے بلکہ قدیم تحقیق عناصر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

قدیم طرز کی تحقیق کرنے والوں میں غالب اور سودا کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔غالب نے اپنے خطوط ،تقریظوں، دیباچوں اور قاطع برہان میں زبان وفن کے جونکات بیان کیے ہیں اس سے ان کے تحقیقی شغف کا اندازہ ہوتا ہے نیز تحقیق نگاری کے ابتدائی شواہد بھی فراہم ہوتے ہیں۔

فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج نے اردو تحقیق پر زیادہ کام نہیں کیا البتہ قواعد اور لغات پر جو کام کیے ہیں انہیں اردو تحقیق کے ابتدائی نقوش میں شمار کیا جاسکتا ہے۔اردو تحقیق کی روایت کو فروغ بخشنے میں قدیم رسائل کا بھی بڑا اہم کردار رہا ہے۔ابتدا میں رسائل نے بڑی تعداد میں تحقیقی مضامین شائع کیے مختلف لائبریریوں پڑے مخطوطات کی اطلاع فراہم کی ۔انجمن ترقی اردو کا ترجمان 'سہ ماہی اردو' بنیادی طور پر تحقیقی رسالہ تھا مولوی عبدالحق کی ابتدائی دریافتیں اسی رسالے میں شائع ہوتی تھیں۔اردو تحقیق کا ایک بڑا خزانہ دارالمصنفین کے ترجمان ماہنامہ 'معارف' میں موجود ہے۔معارف نے نہ صرف تحقیقی مضامین شائع کیے بلکہ اردو کی پہلی مثنوی 'کدم راو پدم راؤ' اردو کی سب سے ضخیم مثنوی خاور نامہ، کئی اہم شعرا کی کلیات کی بازیافت بھی کی۔ ہندستانی اکیڈمی الہ آباد کا رسالہ 'ہندوستانی' حسرت موہانی کا 'اردو معلیٰ' اور عبدالقادر کا 'مخزن' نے بھی اردو تحقیق کے فروغ میں نمایا کردار ادا کیا۔اس کے علاوہ دکن ریویو، نگار، ساقی ،علی گڑھ منتھلی، نیرنگ خیال، ادبی دنیا، اودھ پنچ اور نقاد قابل ذکر ہیں۔درج بالا سطور سے تحقیق کے ابتدائی نقوش اور اس کے خط وخال کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

اردو تحقیق کا ابتدائی دور

1۔ سرسید احمد خان

2۔ محمد حسین آزاد

3۔ مولانا الطاف حسین حالی

4۔ علامہ شبلی نعمانی

اردو تحقیق کے ابتدائی نقوش انیسویں صدی میں ہی تذکروں ،تاریخوں اور لغات کی شکل میں ملنے شروع ہو گئے تھے۔البتہ اس وقت تک ادبی تحقیق کا کوئی باضابطہ اصول نہیں تھا پھر بھی تذکروں ،سوانحی کتابوں میں ادبی تحقیق کے عنصر نظر آتے ہیں۔اس سلسلے میں سرسید،آزاد،حالی اور شبلی کا نام قابل ذکر ہے۔تحقیق کی روایت پر بات کرتے ہوئے انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔سرسید نے اردو میں کوئی تحقیق کتاب یا متن نہیں تیار کیا مگر آثارالصنادید،آئین اکبری،خطبات احمدیہ،تزک جہاں گیری،اسباب بغاوت ہنداور تاریخ بجنور کے مطالعہ سے سرسید کے تحقیقی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔اسی طرح محمد حسین آزاد کی آب حیات،سخندان فارس،حالی کی سوانحی خدمات اور شبلی نعمانی کی سوانح نگاری،موازنہ انیس ودبیر اور شعرالعجم کو اردو تحقیق کے ابتدائی نمونے قرار دیے جاسکتے ہیں۔

سرسید احمد خاں (1817-1898)

سرسید احمد خاں (1817-1898) بیک وقت مفکر، مصلح ،ماہر تعلیم ،صحافی ،مورخ اور محقق کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ان کے فکر و ادب کی بنیاد مادیت،عقلیت،اجتماعیت اور حقائق نگاری پر قائم ہے۔سرسید نے جو تاریخی کتابیں تحریر کی ہیں اس سے ان کی مورخانہ بصیرت تحقیقی ذوق دونوں کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔سرسید کے زمانے میں اللہ کے رسولؐ کی سیرت اور قرآن وحدیث پر مستشرقین اور اسلام مخالفین کی طرف سے جو اعتراض کیے جارہے تھے سرسید اور ان کے رفقا نے ان کا جو جواب لکھا اس سے اصل ماخذ کی طرف رجوع کرنے اور تحقیق وتلاش کے رجحان کو فروغ ملا۔ان کی تحریروں سے اس خیال کو تقویت ملی کہ حق وصداقت تک پہنچنے کا واحد راستہ تحقیق ہے۔سرسید کی متعدد تحریروں میں تحقیق کے عناصر بخوبی نظر آتے ہیں۔ان کی کتابوں پر سرسری نظر ڈالی جارہی ہے تاکہ اندازا لگایا جاسکے کہ ان کے یہاں تحقیق کے کیا اصول تھے اور انہوں نے اردو تحقیق کے فروغ میں کیا کردار ادا کیا۔

’جام جم‘ سرسد احمد خاں کی پہلی تصنیف ہے جو 1840 میں شائع ہوئی۔اس میں امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک سترہ عناوین کے تحت ۴۳ بادشاہوں کی مختصر تاریخ رقم کی ہے۔کتاب میں مذکورا بادشاہوں کے حالات اور ماخذ کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کو ان بادشاہوں کے حالات جمع کرنے میں کتنی جانفشانی سے کام لینا پڑا ہوگا۔اس علمی وتحقیقی کارنامے سے نہ صرف سرسید کے تاریخی شعور بلکہ تحقیقی ذوق کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

’آثارالصنادید‘ تاریخ اور آثار قدیمہ کے موضوع پر سرسید کا شاہکار کارنامہ ہے۔یہ کتاب پہلی بار مطبع سید الاخبار سے 1847 میں شائع ہوئی۔اس میں دہلی کی عمارتوں اور نامور لوگوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔1847 کے اڈیشن میں چار ابواب قائم کیے گئے ہیں۔باب اول شہر کے باہر کی عمارتوں کے احوال پر مشتمل ہے جن کی تعداد 135 ہیں۔15باب دوم قلعہ معلی کی عمارتوں کے احوال میں لکھا گیا ہے۔جس میں 39 عمارتوں کا ذکر ہے۔باب سوم میں خاص شہر شاہ جہاں آباد کو موضوع بنایا گیا ہے۔چوتھا اور آخری باب دہلی اور دہلی کے لوگوں کے

بیان پر مشتمل ہے جن کی کل تعداد 128 ہے۔سرسید نے اس کتاب کو ڈیڑھ سال میں مکمل کیا۔ملازمت کی مصروفیت کے باوجود سرسید وقت نکال کر شہر اور شہر کے باہر کی عمارتوں کی تحقیق وتفتیش میں نکل جایا کرتے تھے۔اتنے بڑے کارنامے کا انجام دینا ایک مشکل کام تھا سرسید نے شب وروز کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے اس علمی کام کو انجام دیا۔ڈاکٹر مشتاق احمد لکھتے ہیں:

''آخری سانس لے رہی مغلوں کی دہلی کے آثار قدیمہ کی تاریخ لکھنے کے درپے ہوئے تو دہلی کے قدیم کھنڈروں میں بھٹکتے پھرے،عمارتوں کے کتبے کا چربہ اتارا اور ان کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کی۔۔۔کتب مینار کے بعض کتبے زیادہ بلند ہونے کے سبب نہیں پڑھے جاسکتے تھے۔اس مرد خدا نے اپنی عمر کی پرواہ کئے بغیر ان کتبوں کو قریب سے پڑھا اور ان کا چربہ اتارا۔سینکڑوں تاریخی کتابوں کا مطالعہ کیا اور اپنی نادر کتاب آثار الصنادید مکمل کر ڈالی۔''16؎

دہلی اور اس کے اطراف کی بیشتر عمارتیں قدیم ہونے کی وجہ سے بوسیدہ اور کھنڈر ہوگئیں تھیں۔ان عمارتوں کے کتبوں کو پڑھنا اور ان سے ضروری معلومات حاصل کرنا بڑا مشکل کام تھا۔بڑی تعداد میں عمارتوں کی حالت ایسی تھی کہ ان کے زیادہ تر حصے مسمار ہو چکے تھے اور جو باقی مادہ تھے ان سے استفادہ کرنا دشوار گزار تھا۔بوسیدہ اور خستہ حال عمارتوں کی تصویر لینا اور پھر ان پر لکھے مختلف زبانوں میں کتبوں کو پڑھنا،عمارتوں کے احوال اور ان کی تاریخ کا معلوم کرنا،عمارتوں کی قد وقامت کی پیائش کرنا،بعض عمارتوں کی بلندی کی وجہ سے ان کے کتبے بھی کافی بلندی پر تھے جن تک پہنچنا اور پڑھنا قدر دشوار تھا۔اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں:

''قطب صاحب کی لاٹھ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہیں جاسکتے تھے ،ان کے پڑھنے کو ایک جھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوالیا جاتا تھا۔اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اتارتا تھا،جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرط محبت میں بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہوجاتا تھا۔17؎

سرسید اپنی کمر میں رسی باندھ کر قطب مینار پر لٹک جایا کرتے تھے اور پھر اس پر لکھی عبارت کو نوٹ کرتے تھے جس سے ان کی کمر میں نشان پڑ گئے تھے۔۔کتنی ہی ایسی عمارتیں جو بوسیدہ حال تھیں اور جس کی تاریخ سے کم ہی لوگ واقف تھے سرسید نے انہیں زندہ جاوید کر دیا۔'آثار الصنادید' سرسید کی انتھک محنتوں کا نتیجہ اردو تحقیق کا منفرد اور قابل قدر کارنامہ ہے۔اس کے نہ صرف متعدد اڈیشن شائع ہوئے بلکہ کتاب کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر فرانسیسی اور انگریزی میں اس کے ترجمے بھی شائع کیے گئے۔اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن 1854 میں نئی ترتیب کے ساتھ شائع ہوا۔ان دونوں اشاعتوں میں بنیادی فرق یہ تھا کہ پہلے ایڈیشن کے مقابلے میں دوسرے ایڈیشن کی زبان وبیان میں

سادگی کا خاص خیال رکھا گیا۔ تحقیق کے طریقۂ کار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اشاریہ اور ماخذ کا بھی التزام کیا گیا۔ سرسید نے 'آثارالصنادید' لکھ کر خستہ حال عمارتوں کو ایک نئی زندگی بخش دی۔ اس سے قبل فارسی اور اردو میں اس طرح کی تحقیق کا کوئی تصور نہ تھا۔ سرسید چونکہ مغربی طرز تحقیق سے واقف تھے اس سبب سے اس کام میں آسانی ہوئی۔ آثار الصنادید اردو میں ایک نئے طرز تحقیق کا رواج پایا بلکہ دہلی اور اس کے اطراف کی عمارتوں کو ایک نئی زندگی ملی۔

'تاریخ ضلع بجنور' کو سرسید نے حکومت کے ایما پر لکھا۔ اسی طرح 'تاریخ سرکشی ضلع بجنور' 1858 مرادآباد میں لکھی جس میں 1857 کے حالات تحریر کیے گئے ہیں۔ سرسید احمد خاں کا تالیف کردہ تاریخی روزنامچہ ہے۔ اس میں انہوں نے ان حالات و واقعات کو درج کیا ہے جو 1857 کی جدوجہد آزادی کے دوران ضلع بجنور میں پیش آئے۔ اس کتاب کی تالیف میں انہوں نے مختلف لوگوں سے خط وکتابت اور دیگر دستاویز سے مدد لی ہے۔ اس سلسلے میں شہنشاہ دہلی اور ضلع کے انقلابی رہنما، رؤسا و حکام انگریز کے مابین جو خط و کتابت ہوئی وہ بھی درج کی گئی ہے۔ کتاب کے متن سے سرسید کے تحقیق نقطہ نظر اور ان کے سلیقہ مندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''اس تاریخ میں جو کچھ لکھا ہے نہایت تحقیق سے لکھا ہے۔ بہت سا اس میں میری آنکھوں کا دیکھا اور بہت سا اپنے ہاتھوں کا کیا ہوا ہے اور اس کے سوا جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت تحقیق سے اور بہت صحیح اور نہایت کی پچ لکھا ہے۔ 18''

تاریخ سرکشی بجنور ضلع بجنور کے متعلق ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔ مولف کتاب اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ اس کا لکھنے والا ان واقعات کا عینی شاہد ہے۔ مؤلف نے ضروری حواشی اور متعلقہ معلومات فراہم کر کے نہایت اہم تالیف بنا دیا ہے۔ خطبات احمدیہ سر ولیم کی کتاب لائف آف محمد کا جواب ہے جو سرسید نے 1869 میں لندن میں قیام کے دوران لکھی اور 1870 میں انگریزی میں لندن میں چھپی جبکہ اردو میں 1889 میں شائع ہوئی۔ خطبات احمدیہ بارہ خطبات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے حضرت محمدؐ پر کیے گئے بے جا اعتراضات کا نہ صرف جواب دیا ہے بلکہ دوسرے کئی موضوعات پر عالمانہ اور محققانہ انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ سرسید نے اس کتاب کی تالیف کے لیے انگلستان کا سفر کیا اور غیر معمولی تکالیف برداشت کر کے خطبات احمدیہ تصنیف کی۔ جس میں نہایت علمی اور تحقیقی انداز میں مستشرقین کی بددیانیتوں کا جواب دیا۔ ولیم میور کے ساتھ ساتھ کئی دیگر عیسائی مورخوں کے خیالات کا بھی ذکر کیا ہے۔ جہاد کے موضوع پر بھی لکھا گیا ہے۔ انہوں نے تحقیقی سے دلائل کے ساتھ لکھا ہے کہ اسلام اپنے عقائد کو کسی پر جبر نہیں عائد کرتا۔ سرسید نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے اپنے قیمتی سرمایے کو بیچ دیا تھا۔ یہ کتاب تحقیقی نوعیت نہ صرف اہم ہے بلکہ منفرد بھی۔ خطبات احمدیہ کو سرسید کی عمرانی اور مذہبی تحقیقات کا عمدہ نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

سرسید احمد خاں کے تحقیقی کارناموں میں ترتیب متن وتدوین بھی شامل ہے۔انہوں نے آئین اکبری،تاریخ فروز شاہی اور تزک جہانگیری کو مرتب ومدون کیا۔سرسید کے مدون کیے ہوئے تمام متون فارسی زبان میں ہیں تاہم ان کی اہمیت سے انکارنہیں کیا جاسکتا۔تدوین آئین اکبری ترتیب وتدوین کے میدان میں نہ صرف سرسید کا پہلا بلکہ اردو وفارسی کا بھی پہلا کارنامہ ہے۔ڈاکٹر الیاس اعظمی لکھتے ہیں:

''متنی تحقیق وتدوین کا اردو میں غالباً یہ (تصحیح آئین اکبری) پہلا کام تھا۔اس لحاظ سے سرسید کو ایک بڑے اور دیدہ ور محقق کی بھی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے۔''19

سرسید نے ابوالفضل کی کتاب 'آئین اکبری' کو متعدد مخطوطات سے تقابل کے بعد تین جلدوں پر مدون کیا جس میں دو جلدیں اول اور سوم 1855 میں مع تصاویر شائع ہوئیں جبکہ دوسری جلد کا نسخہ 1857 کے غدر کے دوران ضائع ہوگیا جواب تک ناپید ہے۔ابوالفضل کا طرز تحریر مشکل اور اکثر نسخے بوسیدہ ہو چکے تھے۔اس کتاب کی تدوین محنت طلب اور جانفشانی کا کام تھا جسے سرسید نے بحسن خوبی انجام دیا۔سرسید نے مختلف زبانوں کی لغات کی مدد سے اس کا صحیح مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ۔آئین اکبری سرسید کا نہ صرف اہم تدوینی کام ہے بلکہ تاریخ سے ان کی دلچسپی کا مظہر بھی ہے۔

محمد حسین آزاد (1910-1830)

شمس العلماء محمد حسین آزاد اردو کے ممتاز انشا پرداز اور جدید نظم نگار کے طور پر شہرت رکھتے ہیں ۔ان کی خدمات کے مختلف پہلو ہیں ۔ ایک اہم پہلو ان کی تحقیق خدمات کے حوالے سے ہے۔ آزاد کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد سو کے قریب بتائی جاتی ہے۔ جو مختلف موضوعات اور فنون سے تعلق رکھتی ہیں۔ان کی تصانیف میں ادب،تاریخ،لسانیات،فلسفہ،صحافت اور نظمیں شامل ہیں ۔ بڑی تعداد میں بچوں کے لیے درسی کتابیں بھی تحریر کیں جو ایک مدت تک ملک کے ایک بڑے حصہ میں ابتدائی اور ثانوی سطح پر کلاس کا حصہ رہیں۔محمد حسین آزاد بحیثیت ادیب،انشا پرداز اور مورخ تسلیم شدہ ہیں ۔ان کے پر تخیل رنگین اسلوب نگارش کا ہر کوئی قائل ہے البتہ کچھ لوگ انہیں محقق ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کا باقاعدہ کوئی تحقیقی کارنامہ نہیں ہے البتہ آب حیات، سخندان فارس،نگارستان فارس اور دیوان ذوق میں تحقیقی عناصر جا بجا نظر آتے ہیں۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

''محمد حسین آزاد کی کتاب 'آب حیات' جس طرح اردو کی تاریخ کا ایک انوکھا اور یکتا نمونہ ہے اسی طرح انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے ان کا لکچر کچھ نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات اردو کی ادبی اور شعری نظریہ سازی کی بوطیقا کہلانے کے مستحق ہے۔ پھر یہ کہ صحیح معنوں میں اردو تمثیل نگاری کا نقطہ عروج ان کی کتاب نیرنگ خیال ہے۔ اسی طرح سخن دان فارس آزاد کی بے مثال فارسی دانی اور لسانی تحقیق وتدقیق کی معراج ہے۔انہوں اپنی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا مگر ان کی مشق و ممارست نے انہیں اپنے دور کا سب سے بڑا صاحب اسلوب بنا دیا۔''20؎

آب حیات محمد حسین آزاد کا اہم علمی و ادبی کارناموں ہے۔اس کا پہلا ایڈیشن 1880 میں شائع ہوا۔ آب حیات کو پانچ ادوار پر تقسیم کیا گیا ہے اور ہر دور کے شعرا کی فنی و لسانی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ شعرا کی سوانح اور ان کی شعری خصوصیات پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کتاب میں اردو زبان کی تاریخ اور اردو نظم کے ارتقا پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ آب حیات جدید طرز کا تذکرہ اور اردو ادب کی پہلی تاریخی ہے جس میں اردو زبان کی تاریخ اور شعرا کے حالات کو بڑی تلاش و تحقیق کے بعد ترتیب دیا گیا ہے۔ البتہ آب حیات پر اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں سنین ،واقعات،اشعار پر تحقیق نہیں کی گئی ہے بلکہ سنی ہوئی باتوں اور واقعات کو ویسے کی نقل کر دیا گیا ہے۔ قاضی عبدالودود نے اپنے مضمون 'آزاد بحیثیت محقق'' میں تقریباً تین سو غلطیاں کی نشاندہی کی ہے ۔21؎ اسی طرح محمود شیرانی نے تنقید آب حیات میں بڑی تعداد میں غلطیوں کی وضاحت کی ہے۔ محمد حسین آزاد کی تسامحات اپنی جگہ مگر ان کی تحقیق خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ 'آب حیات' کا مطالعہ کرتے وقت کا اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ اس وقت ترتیب دی گئی جب تحقیق کا کوئی باضابطہ منظّم اصول نہیں تھا۔ حسین آزاد نے اس قسم کی

کتاب کی تجویز 1865 انجمن کے جلسے میں پیش کی تھی اور تقریبا پندرہ سال کی تلاش وتحقیق کے بعد یہ کتاب شائع ہوئی۔انہوں نے ولی سے انیس تک شعرا کے حالات اوران کے کلام کوجمع کرنے میں جس قدرمحنت کی تحقیقی نقطۂ نظر سے کافی اہم ہے۔

محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' لکھ کرتذکرے میں پائی جانے والی متعدد کمزوریوں کو پورا کرنے کی کوشش کی۔انہوں نے بڑی حدتک اردوشعرا کے حالات تفصیل سے درج کیے۔ان کے کلام پرتبصرہ اورتاریخ ادب میں ان کے مقام کے تعین کرنے کی بھی کوشش کی۔انہوں نے ایک خاص انداز سے شعرا کے کلام کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔بہت سے مقامات پران کی رائے مجموعی کلام کے پیش نظر کہی جاسکتی ہے بلکہ انہوں نے ایک عمومی رائے دے دی ہے۔آب حیات سے قبل جوتذکرے لکھے گئے ان میں شعرا کے حالات اورکلام پرخاطرخواہ روشنی نہیں ڈالی گئی۔جس کے متعلق وہ خودآب حیات کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''ان تذکروں سے نہ کسی شاعر کی زندگی کی سرگذشت کا حال معلوم ہوتا ہے نہ اس کی طبیعت اور عادات واطوار کا حال کھلتا ہے، نہ اس کے کلام کی خوبی اورصحت وسقم کی کیفیت کھلتی ہے نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معاصروں میں اوراس کے کلام میں کن کن باتوں میں کیا نسبت تھی۔انتہا یہ ہے کہ سال ولادت اورسال فوت تک نہیں کھلتا۔خیالات مذکورہ بالا نے مجھ پرواجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یامختلف تذکروں میں مذکور ہیں انہیں جمع کرکے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہواس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، پھرتی، چلتی تصویر سامنے آن کھڑی ہوں۔''22؎

آزاد نے آب حیات کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔پہلے دورمیں ولی اوران کے معاصرین کا تذکرہ ہے جبکہ دوسرے دورمیں شاہ حاتم، خان آرزو اورفغاں کا تذکرہ ہے۔تیسرے دورمیں مرزا مظہر جان جاناں، میرسوز، میرتقی میراورسودا کو شامل کیا گیا ہے۔چوتھا دور مصحفی، انشاء اور جرأت پر مشتمل ہے۔اسی طرح پانچویں دور میں درد، ناسخ، آتش، شاہ نصیر، مومن، ذوق اورمرزا غالب کوموضوع بنایا ہے۔ان ادوار کے علاوہ ایک دیباچہ، خاتمہ اور اردونظم کی تاریخ پربھی بھرپورروشنی ڈالی گئی ہے۔کتاب کے ابتدا میں اردوزبان کی تاریخ بھی لکھی ہے جس میں انہوں نے اردو کے برج بھاشا سے نکلنے کا نظریہ پیش کیا ہے جسے بعدمیں لسانی محققین نے نادرست قراردیا۔آب حیات ولی سے شروع ہوکرمیرانیس پرختم ہوتی ہے جس میں کل ۲۹ شعرا کے تذکرے ہیں۔اس میں اردوزبان اورشاعری کی عہد بہ عہد تاریخ پرروشنی ڈالی گئی ہے۔شعرا کے بیان میں دلچسپ پیرائے اسلوب کا استعمال کیا گیا ہے جس سے ان شعرا کی بولتی چالتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔غرض یہ کتاب مختلف حیثیتوں سے اردوادب میں بلند مقام رکھتی ہے۔اس میں وہ

تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک تحقیقی، تنقیدی اور تاریخی کتاب میں ہونا چاہیئے۔ڈاکٹر محمد حسین آب حیات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آزاد کا اوڑھنا بچھونا ہی ادب تھا اور اس میں ان کی اولیت کو تسلیم نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔جدید شاعری کی داغ بیل ڈالنے والوں میں ان کا نام سرفہرست ہے۔جدید تنقیدی رجحانات بھی پہلی مرتبہ محمد حسین آزاد کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ادبی تاریخ کو تذکرہ نگاری سے نگالنے والے بھی آزاد ہیں۔لسانی تحقیق کی طرف توجہ کرنے والے بھی وہی پہلے شخص تھے۔ان سب کے باوجود آزاد کو نکتہ چیں تو بہت ملے، ہمدرد کم۔''23ے

'آب حیات' اپنے تمام تر خصائص کے باوجود متعدد نقادوں نے آب حیات کی کمزروں پر گرفت کی ہے۔مثلاً یہ کہ آزاد نے تاریخی واقعات کے بیان میں غلطیاں کی ہیں۔بعض شعرا کو ناحق ایک دوسرے پر فوقیت دی ہے۔بعض مشہور شعرا کے نظر انداز کیا ہے۔بہت سارے واقعات اور حقائق کو بغیر تحقیق کے قدیم تذکروں سے بیان کردیا ہے۔تحقیق وتنقید سے زیادہ اپنی زبان دانی اور اسلوب نگارش کا ثبوت پیش کیا ہے۔کلیم الدین احمد 'آب حیات' کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ 'آب حیات' پر کافی محنت صرف ہوئی ہے لیکن یہ بھی روشن ہے کہ اس میں بہت سی غلط بیانیاں ہیں کچھ دانستہ اور کچھ نادانستہ۔آزاد میں تحقیق کا مادہ کم تھا۔کسی موضوع پر کم سے کم سامان جمع کرنے کے بعد وہ کوئی رائے قائم کر لیتے اور اپنی رائے قائم کرنے میں وہ عجلت سے کام لیتے تھے۔وہ یہ نہ کرتے اور نہ کر سکتے تھے کہ آہستہ آہستہ بڑے صبر، بڑی کاوش کے ساتھ تحقیق میں مصروف رہتے اور جب وافر سامان جمع ہوجاتا تو کوئی نتیجہ اخذ کرتے۔وہ سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے تھے۔ان کی چھان بین نہیں کرتے تھے۔ہر راوی اور اس کی ہر روایت پر غور فکر کے بغیر وہ یقین کر لیتے تھے۔بہت سی کتابوں کا اور ان کتابوں کے مضامین کا بظاہر ذاتی واقفیت کی بنا پر ذکر کرتے تھے،لیکن انہوں نے یہ کتابیں نہیں دیکھی تھیں۔ذاتی تحقیق کے بدلے وہ دوسروں کی رائیں اپنا لیتے تھے۔ان وجوہ کی روشنی میں 'آب حیات' کی دنیائے تحقیق میں زیادہ اہمیت نہیں۔'آب حیات' کا وہ حصہ جو اردو زبان کی پیدائش اور ترقی اور شاعری کے ظہور اور مختلف مدارج سے متعلق ہے مطلق تشفی بخش نہیں۔اس میں بہت سی غلطیاں ہیں۔آزاد کے ذہن میں اردو زبان کی پیدائش اور ترقی کے اسباب کی صاف تصویر نہ تھی۔وہ دکن کی اہمیت سے ناواقف تھے۔اس کے علاوہ بہت ساری باتیں جو انہوں نے لکھی ہیں وہ سست بنیاد ہیں اور تحقیق کی روشنی میں یہ سست بنیاد صاف نظر آنے لگتی ہے۔اصل یہ ہے کہ آزاد کی افتاد طبیعت اور تحقیق میں زیادہ مناسبت نہیں تھی۔ان کی طبیعت میں عجلت اور بے صبری تھی اس لیے کامیابی ممکن ہی نہ

تھی۔'' 24

مذکورہ تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کو تسلیم کرلیا جائے تب بھی 'آب حیات' محمد حسین آزاد کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ جس دور میں آب حیات لکھی گئی اس وقت تحقیق، تنقید اور نہ ہی تاریخ کا باقاعدہ آغاز ہوا تھا۔ آب حیات ہی میں ان اصناف کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ محمد حسین آزاد نے قدیم تذکرہ نگاری کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے ایک نئے طرز کا تذکرہ لکھا جو اردو کی ابتدائی تاریخ بھی ہے اور جابجا تنقید و تحقیق کے عناصر ملتے ہیں۔ بعد کے تمام مؤرخوں نے اس کتاب سے استفادہ کیا۔ محمد حسین آزاد نے شعرا کے حالات جمع کرنے میں جس تلاش و جستجو سے کام لیا آزاد کے تحقیقی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

محمد حسین آزاد کو تاریخ سے بہت لگاؤ تھا آب حیات کے علاوہ انہوں قصص ہند اور دربار اکبری لکھی تھی۔ دربار اکبری تقریباً آٹھ سو صفحے کی سب سے ضخیم کتاب ہے۔ جس میں آزاد کا تاریخی شعور بہت مربوط نظر آتا ہے۔ ان کو مغل حکمرانوں بالخصوص عظیم الشان شہنشاہ اکبر سے خاص لگاؤ تھا۔ کیوں کہ اکبر کے زمانے میں علوم وفنون کو خوب ترقی ملی۔ محمد حسین آزار نے اکبر کی سوانح، جنگی فتوحات، فن سپہ گری اور درباری شان وشوکت کا بیان بہت مؤثر انداز میں کیا ہے۔ اکبر کے اہم درباریوں پر بڑی لطافت سے روشنی ڈالی ہے۔ محمد حسین آزاد نے اس کتاب کی ترتیب میں منتخب التواریخ، اکبرنامہ، آئینہ اکبری، ماثر الامرا، سوانح اکبر، خزائن الاسرار سے استفادہ کیا ہے البتہ منتخب التواریخ سے سب سے زیادہ بائدہ اٹھایا گیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف تاریخ بلکہ تحقیق کا قابل قدر کارنامہ ہے۔

محمد حسین آزاد کے اہم کارناموں میں دیوان ذوق کی تدوین بھی ہے۔ ذوق سے ان کو بڑی عقیدت تھی وہ ان کے استاد تھے۔ دہلی کالج کے زمانے ہی سے ذوق کے کلام کو وہ محفوظ کرتے رہتے تھے۔ متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں کی کسی موقع پر استاد کو کوئی شعر یاد نہ آتا تو آزاد سے پوچھتے جو حسین آزاد بے تکلف سنا دیا کرتے تھے۔ استاد ذوق کے کلام کی تدوین آسان کام نہ تھا۔ ان کے بیشتر کلام بکھرے ہوئے اور بوسیدہ تھے۔ کلام ذوق کی تدوین میں انہوں نے دن رات ایک کردیے۔ ردیف کے اعتبار سے ان کے کلام کو ترتیب دیا اور ابتدا میں ذوق کے حالات اور کلام پر مفصل مقدمہ بھی لکھا۔ محمد حسین آزاد دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں، صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے تھے۔ دیوان مروجہ میں کچھ چھپے اور ان کی زبان سے کچھ سنے، پھٹے پرانے مسودے لڑکپن سے بڑھاپے تک کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت تحریریں ہیں۔ بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر وغائب لکھتا اور جمع کرتا تھا۔ کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا، مٹے حرفوں کا اجالنا، اس زمانے کے حالات کو سمیٹنا، حالتوں کا تصور باندھنا بھولے بسرے الفاظ ومطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا میرا

کام نہ تھا۔خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شامل حال تھی۔میں حاضر اور خدا ناظر تھا،راتیں صبح ہوگئیں اور دن اندھیرے ہوگئے،جب یہ مہم سرانجام ہوئی۔25؎

محمد حسین آزاد کے مرتبہ دیوان میں حافظ ویران اور انور سے زیادہ کلام شامل ہے۔محققین (حفظ محمود شیرانی،احمد حسین خاں،عابد پیشاوری) کا اعتراض ہے کہ محمد حسین آزاد نے ذوق کی نامکمل غزلوں اور قصائد کو خود مکمل کردیا اور کچھ کلام خود کہہ کر بھی شامل کردیا۔اس کے علاوہ دیوان ذوق کے مقدمہ میں لکھے گئے ذوق کے حالات وواقعات بھی آب حیات سے ملتے جلتے ہیں۔یہ تمام اعتراضات اپنی جگہ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے تدوین وتحشیہ کے کام کو ایک محقق کے طور پر انجام دیا ہے اور یہ حسین آزاد کا ایک اہم کارنامہ ہے،انہوں نے نہ صرف ذوق کے کلام کو محفوظ کیا بلکہ شیخ محمد ابراہیم ذوق کو ان کا صحیح مقام دلایا ہے۔

محمد حسین آزاد کو فارسی شعر وادب سے غیر معمولی شغف تھا۔انہوں نے ایران کا سفر بھی کیا تھا۔سخندان فارس،دربار اکبری اور نگارستان فارس فارسی شعر وادب سے ان کی دلچسپی کا مظہر ہے۔سخندان فارس دوحصوں پر مشتمل ان کے خطبات کا مجموعہ ہے۔پہلا حصہ لسانیات کے متعلق ہے۔جس میں انہوں نے زبان کی تعریف وتاریخ کے ساتھ ساتھ اس کی روایت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔سنسکرت اور فارسی زبان کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔جبکہ دوسرے حصہ میں ان کے لکچر ہیں۔حسین آزاد نے اس کام کے لیے ایران کا سفر کیا،وہاں کے علماء وفضلا سے ملاقات کی،ایرانی زبان ومحاورات کو سمجھا اور وہاں کی تہذیب ومعاشرت کو قریب سے دیکھا اس کے نتیجے کے طور پر سخندان فارس جیسا اہم کارنامہ وجود میں آیا۔سخندان فارس کے خطبات میں ان کا اسلوب بیان بہت نمایاں ہے اور اس میں معلومات کی فراوانی نظر آتی ہے۔جن خطبات میں فارسی لسانیات کو موضوع بنایا گیا ہے ان میں زبان کی تشکیل وارتقا پر بھی مفصل بحث کی گئی ہے۔لفظوں کے معنی میں تغیرات اور ان کی مختلف لطافتوں کا ذکر بڑے عالمانہ طور پر کیا گیا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالؔی (1914-1837)

مولانا الطاف حسین حالی کو نامور شاعر اور ممتاز نقاد کے طور پر جانا جاتا ہے۔انہیں پہلا باضابطہ سوانح نگار،اولین تنقید نگار اور جدید نظم کا معمار بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔انہوں نے اپنی شاعری سے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی اور نثر میں جو اسلوب اختیار کیا وہ اردو نثر کا معیار قرار پایا۔نظم ونثر میں ان کی کتابوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ان کی اہم تصانیف میں ’مقدمہ شعر وشاعری،حیات جاوید،یادگار غالب،حیات سعدی،مسدس مد وجزر اسلام کو بہت مقبولیت حاصل ہے۔حالی نے بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی جن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ہمیں یہاں ان کی تحقیقی خدمات سے غرض ہے۔مولانا حالی نے فن تحقیق ،اصول تحقیق اور تحقیق کے حوالے سے کوئی باضابطہ کتاب نہیں لکھی البتہ مختلف شخصیات کی لکھی گئی سوانحی کتابوں میں تحقیق کے عناصر جابجا نظر آتے ہیں۔مولانا حالی نے تین اہم شخصیات کی سوانح لکھی جن میں دو کا تعلق اردو ادب سے اور ایک فارسی ادب سے ہے۔

یادگار غالب (1897)

حیات سعدی (1882)

حیات جاوید (1901)

مولانا حالی کی سوانح عمریوں کی تحقیقی اہمیت پر نظر ڈالنے سے قبل یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ وہ سرسید کی شخصیت سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ ان کی اصلاحی تحریک کے اہم رکن بھی تھے۔سرسید کی ہی فرمائش پر مسدس (مد وجزر اسلام) لکھا جسے سرسید نے خود کے لیے توشہ آخرت سمجھتے تھے۔ان سوانح عمریوں کے لکھنے کا مقصد حالی کے نزدیک کوئی علمی وادبی تحقیق نہ تھا بلکہ قوم کو اسلاف کے کارناموں سے باخبر اور قوم کو بیدار کرنا تھا۔یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ سوانح عمریاں اس وقت لکھی گئیں جب سوانحی ادب کا کوئی اصول ضابطہ متعین نہ تھا۔مگر حالی نے سوانح کی ترتیب ،حقائق کی تلاش وجستجو پر پوری توجہ دی اور ماخذ کی بھی نشاندہی کی جو ان کے تحقیقی ذوق پر دلالت کرتی ہے۔حالی نے مواد کے حصول اور واقعات کی ترتیب میں عرق ریزی اور توجہ سے کام لیا۔وہ خود یادگار غالب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ’’جو یادداشتیں مرزا کی لائف سے متعلق ہیں بڑی کوشش سے جمع کی گئی ہیں۔میں دلی کے بعض بزرگوں اور دوستوں کو لکھا اور انہوں نے مہربانی فرما کر تمام مطلوبہ کتابیں اور جس قدر مرزا کے حالات ان کو معلوم ہو سکے لکھ کر میرے پاس بھیج دیے اور اس طرح مرزا کی لائف جہاں تک اس کی تکمیل ہو سکتی تھی مکمل ہوگئی[26]

مولانا الطاف حسین حالی کی سوانحی تحریروں میں مبالغے سے گریز ،واقعات کی چھان بین اور حقائق کے

دریافت کا پہلو نظر آتا ہے جو تحقیق کا اہم تقاضہ ہے۔ یہ درست ہے کہ عقیدت کی بنا پر ان کی تحقیق میں بعض کمزوریاں راہ پا گئیں تاہم ان کے تحقیقی ذوق کا اعتراف محققین و ناقدین نے کیا ہے۔ حقائق کی جستجو اور بازیافت میں تحقیقی نقطہ نظر کی کارفرمائی نمایاں نظر آتی ہے۔ حالی کی سوانح عمریوں میں حیات سعدی (اشاعت: 1886) پہلی سوانحی تصنیف ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ شیخ شرف الدین سعدی کے حالات زندگی پر مشتمل ہے جبکہ دوسرے حصہ میں ان کی تصنیفات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور کتاب کے آخر میں خاتمہ ہے جو کتاب کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے۔

حالی فارسی ادبیات کے خاص رمز شناس تھے۔ نہایت توجہ سے پڑھ رکھا تھا۔ حیات سعدی سے قبل اس نوع کی سوانحی کتابیں جو تحقیقی اعتبار سے مستند اور معتبر ہوں نہیں ملتی۔ معلومات کے جتنے بھی ذرائع ہو سکتے تھے حالی نے وہاں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ بیشتر تذکروں کا مطالعہ کیا اور پھر سعدی کے منتشر حالات کو یکجا کیا۔ مولوی عبد الحق لکھتے ہیں:

> ''مصنف کو شہد کی مکھی کی طرح چن چن کر واقعات کو یکجا کرنا پڑا۔ حالی نے صرف واقعات کا انتخاب ہی نہیں کیا بلکہ اسے ظرافت کی چاشنی سے دلچسپ بھی بنایا اور ایک فارسی شاعر کی سائنٹیفک سوانح و تنقید کی بنیاد ڈالی ہے۔ جس کا نمونہ فارسی شاعری میں بھی نہیں تھا۔'' 27

مذکورہ اقتباس سے حالی کی محنت اور ان کے تحقیقی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ حیات سعدی سے قبل شیخ سعدی سے متعلق یوں تو بہت سے واقعات اور ان سے متعلق باتیں سامنے آتی رہتی تھیں مگر ان میں سے بیشتر من گھڑت باتوں، کمزور روایتوں اور فرضی قصوں کی کثرت تھی مثلاً سعدی کا متعدد بار ہندستان آنا، امیر خسرو اور بادشاہ التمش سے ملاقات کرنا، سومناتھ مندر جانا، ریختہ میں شاعری کرنا ان تمام باتوں کی تردید حالی نے دلائل کی روشنی میں کی ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ''یہ (حیات سعدی) سعدی کی محققانہ سوانح عمری ہے اور قدیم تذکرہ نویسی کے مقابلے میں فن بیوگرافی میں ایک نیا راستہ دکھاتی ہے۔'' 28

کمزور روایات، فرضی داستانوں کی کثرت، مواد کی قلت کے باعث حیات سعدی لکھنا بہت مشکل کام تھا مگر حالی کے تحقیقی ذوق اور شب و روز کی محنت نے اس کام کو کر دکھایا۔ حالی کا یہ ایک اہم کارنامہ ہے۔ آج ایک صدی سے زائد کی مدت گزر جانے کے بعد بھی اس کی اہمیت و وقعت میں کچھ کمی نہیں آئی۔ حیات سعدی شیخ سعدی کی یہ صرف یہ کہ اہم سوانحی کتابوں میں سے ایک ہے بلکہ سوانحی ادب کا اہم کارنامہ بھی۔

یادگار غالب مولانا الطاف حسین حالی کی دوسری سوانحی کتاب ہے جو 1897 میں شائع ہوئی۔ یادگار غالب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ سوانح سے متعلق ہے جبکہ دوسرا حصہ غالب کے کلام پر تبصرہ اور انتخاب ہے۔ کتاب کی

وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''اصل مقصد اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب وغریب ملکے کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالی نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا اور جو کبھی نظم ونثر کے پرایہ میں، کبھی ظرافت وبزلہ سنجی کے روپ میں، کبھی عشق بازی اور رند مشربی کے لباس میں، اور کبھی تصوف اور حب اہلبیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکر ان چاروں باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا اس کو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے۔'' 29

مذکورہ اقتباس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ یادگار غالب لکھنے کا اصل مقصد غالب کی شاعرانہ عظمت کو عام کرنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک مبسوط سوانح عمری لکھی جس سے غالب فہمی کا سلسلہ اور غالب شناسی کا رجحان پیدا ہوا۔ واضح رہے کہ غالب کی شاعرانہ عظمت اور ان کے حالات زندگی لکھنے کا خیال حالی کے ذہن میں ایک مدت سے تھا۔ دلی میں قیام کے دوران انہوں نے مرزا کی تصانیف اور ان کے احوال غالب کے احباب سے حاصل کیے۔ خط وکتابت سے بھی مرزا کے متعلق معلومات جمع کی اور پھر اس کتاب کو ترتیب دیا جو مرزا کی پہلی سوانح عمری ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ تحقیقی نوعیت کا ہے البتہ انہوں نے غالب کی سوانح پر کم اور ان کی شاعرانہ عظمت اور انشا پردازی پر زیادہ توجہ دی ہے۔ غالب کی زندگی کے سے متعلق کو انہوں نے محققانہ انداز میں نہیں لکھا بلکہ اس کو غالب ہی کے الفاظ میں پیش کر دیا۔ جس کا اعتراف انہوں نے خود یادگار غالب کے دیباچہ میں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سوانح حیات کو زیادہ اہمیت نہ دی اور جن پہلوؤں پر توجہ دی اس میں کامیاب رہے جبکہ وہ چاہتے تو اس سے زیادہ مواد فراہم کر سکتے تھے۔ بہت سے واقعات کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ غالب کی زندگی کے صاف روشن پہلو صاف نظر آتے ہیں البتہ ان کے تاریک پہلوؤں پر کم توجہ نہیں دی گئی جس سے غالب کی زندگی کا ایک پہلو پر تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔ ان تمام کوتاہیوں کے باوجود یادگار غالب غالب کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے ایک مبسوط کتاب ہے۔ مطالعہ غالب میں اس کتاب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یادگار غالب کے بعد جو کتابیں لکھی گئیں بلکہ آج بھی جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کتاب سے ضرور استفادہ کیا جاتا ہے۔ یادگار غالب حالی کا نہ صرف یہ کہ غیر معمولی کارنامہ ہے بلکہ اردو ادب کا بیش بہا خزانہ بھی ہے۔ علامہ شبلی نے ایک خط میں لکھا ہے کہ یادگار غالب کے بعد غالب پر کسی اور کتاب کی کیا ضرورت تھی۔

حیات جاوید (1901) حالی کا تیسرا اہم سوانحی کارنامہ ہے جو سرسید کی لکھی گئی سوانح عمری ہے۔ کتاب دو حصے پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں سرسید کے حالات زندگی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں جبکہ دوسرے حصہ میں ان کی خدمات اور کارناموں پر تبصرہ ہے۔ حیات جاوید نہ صرف سرسید کی زندگی پر لکھا گیا اہم کارنامہ ہے بلکہ سیرت وسوانح

کی ایسی مثال اس سے پہلے اردو ادب میں نہیں ملتی۔

حالی نے سرسید کی زندگی میں ہی اس کام کو کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔1894 میں انہوں نے علی گڑھ کا سفر بھی کیا تھا جہاں منشی سراج الدین کا ترتیب کردہ مسودہ بھی انہیں دستیاب ہوگیا تھا اس کے علاوہ حالی نے سرسید کو ایک سوال نامہ بھی بھیجا تھا مگر اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔مولانا حالی کی دلی خواہش تھی کہ وہ خود علی گڑھ جا کر سرسید سے مل کر سوال نامہ تیار کریں مگر ملازمت کی وجہ سے نہیں جا سکے۔بعض دوستوں کے کہنے کی وجہ سے کہ ابھی سرسید بقید حیات ہیں اس لیے کام کو ایک مدت کے لیے موقوف کر دیا تھا۔

سرسید کی اپنی زندگی ہی میں مذہبی وسیاسی حلقوں میں موضوع بحث تھے۔ان کے معتقدین کی ایک جماعت تھی تو دوسری طرف ان کے مخالفین بھی تھے۔'حیات جاوید' کی اشاعت کے بعد اس پر طرح طرح کے اعتراض کیے گئے کذب وافتراق کا آئینہ اور مدلل مداحی جیسے القاب دیے گئے۔مولانا آزاد کو بھی بعض پہلوؤں سے اعتراض تھا۔وہ لکھتے ہیں:

''خواہ (حالی) مرحوم سوانح نگاری کو محض مدحت طرازی سمجھتے ہیں۔اس لیے پسند نہ کرتے تھے کہ ناگوار واقعات کو ابھرنے دیا جائے۔حیات جاوید میں انہوں نے ایسا ہی کیا ہے سرسید مرحوم کے آخری عہد کے حالات سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ حیات جاوید لکھنے کا خیال ترک کر دیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں ایسے کاموں پر خاک نہیں ڈال سکتا۔بالآخر انہیں واقعات کو پوری رنگ آمیزی سے لکھا اور جس قدر خاک ڈال سکتے تھے ڈال گئے۔''30

مولانا آزاد کا یہ کہنا کہ حالی سوانح نگاری کو مدحت طرازی سمجھتے ہیں اور سوانح لکھنے کی جو وجہ بتائی ہے اس کی ایک وجہ ہوسکتی ہے البتہ حالی نے لکھنا ترک نہیں کیا تھا بلکہ مواد کی قلت اور سرسید کے بقید حیات ہونے کی وجہ سے موقوف کیا تھا۔حالی سرسید سے متاثر ضرور تھے البتہ جن پہلوؤں پر اعتراض تھا اس پر وضاحت سے لکھا اور سرسید کے تسامحات کی گرفت بھی کی ہے۔تفسیر القرآن پر حالی لکھتے ہیں:

''سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں۔''31

حیات جاوید میں حالی ایک معتدل سوانح نگار کے طور پر دیکھے جاسکتے ہیں کونکہ انہوں نے بہت سے مقامات پر سرسید کا اس طرح دفاع نہیں کیا ہے جیسا کہ معترضین کا الزام ہے۔حالی نے سرسید کے کارناموں کی کھل کر تعریف کی ہے۔جہاں تک سوال خامیوں کی پردہ پوشی کا ہے تو حالی نے خود حیات جاوید کے دیباچہ میں یہ بات واضح طور پر لکھی ہے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی سوانح کو کریٹکل طریقہ سے لکھا جائے۔غرض یہ ہے کہ حیات جاوید تحقیقی نقطہ

نظر سے اہم ہے۔ مواد کافی محنت اور کاوش سے جمع کیا گیا ہے اور سوانح نگار نے دیانت داری سے نتائج بیان کیے ہیں۔ مولانا حالی نے نہ صرف یہ کہ سرسید کی سوانح لکھی بلکہ اردو میں سوانح نگاری کو عام کیا۔ مطالعہ سرسید میں حیات جاوید بہت اہم ہے۔

حکیم ناصر خسرو علوی کا فارسی نسخہ کی تحقیق و تدوین کی۔ یہ قلمی نسخہ دراصل نواب ضیاالدین احمد خاں کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ حالی نے اس وقت تمام تذکروں اور فرانسیسی فاضل چارلس شیفر کے مضمون کے مطالعہ سے حکیم خسرو کے حالات قلم بند کیے اور پھر 136 صفحات پر اصل متن کی تدوین کی اور اس طرح سے ایک نایاب مخطوطہ کو کتابی شکل میں شائع کیا۔

علامہ شبلی نعمانی (1857-1914)

اردو ادب میں علامہ شبلی نعمانی کئی حیثیتوں سے جانے جاتے ہیں۔ وہ صرف مصنف ہی نہیں بلکہ مفکر، مصلح اور مورخ بھی تھے۔ علمی وادبی موضوعات پر انہوں نے اہم کتابیں تحریر کیں۔ موازنہ انیس و دبیر لکھ کر اردو میں پہلی بار عملی تنقید کا نمونہ پیش کیا اور تقابلی تنقید کی بنیاد ڈالی۔ المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، سوانح مولانا روم، الغزالی اور سیرت النبی لکھ کر سوانحی ادب اور سیرت نگاری کو فروغ بخشا۔ اس کے علاوہ ان کے اہم کارناموں میں شعر العجم، الکلام، علم الکلام اور سفرنامہ روم ومصروشام کافی اہم ہیں۔

شبلی نعمانی ایک صاحب طرز نثر نگار تھے۔ ان کی تحریریں محققانہ شان اور ادبی حیثیت کی حامل ہیں۔ شبلی نعمانی نے علم وادب، تاریخ وتہذیب اور فکر وفلسفہ کے بیشتر موضوعات کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا بالخصوص تاریخی اور سوانحی خدمات میں وہ منفرد نظر آتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں انہوں نے تحقیق وتنقید کے جدید تر اصول وضوابط کو برتا اسی وجہ سے ان کی تحریروں میں معلومات کی کثرت اور تلاش وتحقیق کے عناصر بھی خوب نظر آتے ہیں۔ شبلی کے اندر تحقیق وجستجو کا اعلی ذوق تھا اس لیے علامہ سید سلیمان ندوی نے شبلی کو تحقیق کا معلم اول کہا ہے۔ ان کی تحقیقی خدمات کی عمدہ مثال ان کی سوانح عمریاں ہیں۔

المامون (1887) کو مولانا کی سوانحی کتابوں میں اولیت حاصل ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں خلیفہ مامون رشید کی ولادت، تعلیم وتربیت، جنگوں اور فتوحات کا تذکرہ ہے۔ جبکہ دوسرے حصہ میں مامون کے اخلاق وعادات، ملک کے امن وامان، ذوق علمی اور ان کے عہد کے اہل کمال کا تذکرہ ہے۔ شبلی کا ارادہ عباسی حکمرانوں کی تاریخ رقم کرنے تھا مگر بعد میں اپنے اس ارادے کو ترک کرکے انہوں نے ہیروز آف اسلام کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی المامون ہے۔ علامہ شبلی کو خلیفہ مامون رشید سے بڑی عقیدت تھی۔ مامون رشید کا عہد علم وکمالات کا دور تھا۔ دراصل مامون رشید کی سوانح لکھ کر اس زریں عہد کی تاریخ لکھنا تھا جو علم وفضل اور تہذیب وتمدن کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ المامون کے ابتدا میں سرسید کا لکھا ہوا دیباچہ بھی شامل ہے جس میں کتاب کی اہمیت اور خصوصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے:

> ''اس قدر جزئیات کو تلاش کرنا اور نظم اسلوب سے ایک جگہ جمع کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ مصنف نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس کا حوالہ معتبر ماخذ سے نہ دیا ہو۔ ہر ایک جزوی بات پر بھی اس کتاب کا جس سے وہ بات لی گئی ہے حوالہ دیا ہے۔ اس کے حاشیوں پر جس قدر کتابوں کے حوالے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے میں کس قدر جانکاہی ہوئی ہوگی اور مصنف کو کتنے ہزاروں ورق تاریخوں کے الٹنے پڑے ہوں گے اور اسی کے ساتھ جب یہ خیال

کیا جائے کہ مصنف نے جزئیات کو ایسی کتابوں سے تلاش کر کے نکالا ہے جن کی نسبت خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ ان میں مامون کے حالات ہوں گے تو اس محنت کی وقعت اور قدر اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے۔ یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے اور ایسی صاف شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔''[32]

دیباچہ میں مذکور عبارت سے ظاہر ہے کہ شبلی نعمانی نے واقعات کی تحقیق، تلاش و جستجو، دروبست اور اخذ و نتائج ہر ایک قابل تعریف ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف مصنف کی محنت، ذوق جستجو اور دیانت داری کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ شبلی کے تحقیقی ذوق کا بھی پتہ چلتا ہے۔ شبلی کو خلیفہ مامون رشید سے عقیدت تھی لیکن دیانت داری اور اصول پسندی سے کام لیا ہے۔ ان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ کمزوریوں کو بھی ظاہر کیا ہے۔ سوانحی حالات کی ترتیب میں بڑی تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ غرض اردو میں لکھی جانے والی سوانح میں المامون کو بڑی اہمیت حاصل ہے اب اس موضوع پر مزید کچھ لکھ پانا مشکل ہے۔

'سیرۃ النعمان' امام ابوحنیفہ کی مبسوط سوانح عمری ہے۔ علامہ شبلی کو امام ابوحنیفہ سے عقیدت تھی اسی عقیدت کی بنا پر ان کا لقب نعمان ہوا۔ سیرت النعمان کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں امام ابوحنیفہ کے حالات و سوانح ہیں جبکہ دوسرے حصہ میں تدوین فقہ، طریقہ اجتہاد کی وضاحت کی گئی ہے اور ان کی رائے اور قیاسات پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ امام ابوحنیفہ کی سوانح لکھنا اتنا آسان کام نہ تھا یقیناً شبلی نعمانی نے ابوحنیفہ جیسی عظیم شخصیت کی سوانح لکھ کر قابل قدر انجام دیا۔ پہلا حصہ جو امام ابوحنیفہؒ کی سوانح اور حالات پر مشتمل ہے اس میں موجودہ مواد سے بڑی حد تک مدد ملی ہوگی البتہ دوسرا حصہ جو اجتہاد و استنباد پر مشتمل ہے اس میں شبلی کو بڑی جدوجہد کرنی پڑی ہوگی۔ امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد و استنباد اور قیاسات کو سمجھنا بہت مشکل کام تھا شبلی نے اپنے تحقیقی ذوق سے اس کام کو کر دکھایا جو اپنے آپ میں ایک بڑا کارنامہ ہے۔ غرض مولانا نے ایک مستند سوانح حیات لکھی ہے مزید اس میں اضافہ کر پانا مشکل امر ہوگا۔

ہیروز آف اسلام کے تحت مولانا شبلی نے النعمان کے بعد الفاروق لکھی جو نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ تاریخ عالم کی ایک عظیم شخصیت حضرت عمر فاروقؓ کی سوانح ہے۔ 1894 میں شبلی نے الفاروق لکھنا شروع کیا اور چار سال بعد 1898 میں اس سوانحی کتب کی تکمیل ہوئی۔ الفاروق دو حصہ پر منقسم ہے۔ ابتدا میں تاریخ اسلام پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ حصہ اول میں حضرت عمر فاروقؓ کے نسب، ولادت، قبول اسلام اور خلافت و فتوحات کا ذکر ہے جبکہ دوسرے حصہ میں ملکی نظام، رعایا، تدبیر، بیت المال، مختلف محکمات، فتوحات اور دیگر کارناموں کا تفصیلی ذکر ہے۔ تحقیقی نوعیت سے یہ کتاب ایسی ہے کہ یورپ کے مستشرقین کی کتابیں بھی اس کتاب کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ کتاب کی فہرست مصادر اور مراجع پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے بنیادی مصادر، نامعلوم گوشوں اور نادر کتابوں

کے مطالعہ سے اہم نتائج اخذ کر کے اس کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ کتاب کے ماخذ کو دیکھ کر ان کے ذوق تحقیق کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف ہندستان ہی نہیں بلکہ بیرون ملک کی متعدد لائبریریوں کا بغور مطالعہ کیا۔ مختلف زبانوں میں موجود مواد سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس کی خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ شبلی نعمانی نے اس کتاب کی ترتیب میں تفسیر، حدیث، تاریخ، سیرت، اصول فقہ، جغرافیہ، اسماء الرجال اور لغت جیسے علوم وفنون سے مدد لی۔ مصادر و ماخذ کے تعلق سے مقدمہ میں جو وضاحت کی ہے محققوں کو اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ غرض الفاروق شبلی نعمانی کی ایک ایسی تصنیف ہے جو سوانح عمریوں میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔ الفاروق نہ صرف سوانحی ادب کی بہترین کتاب ہے بلکہ تحقیقی نقطہ نظر سے بھی کافی اہم ہے۔

الغزالی 1901 میں شائع ہوئی۔ جو امام غزالیؒ کی سوانح عمری ہے۔ الغزالی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں ولادت، تعلیم، سن رشد اور وفات وغیرہ کا تذکرہ ہے جبکہ دوسرے حصہ میں خدمات کا مفصل بیان ہے۔ الغزالی شبلی کی اہم سوانحی تصانیف میں سے ایک ہے۔ امام غزالیؒ کے حوالے سے عربی میں معدود چند جبکہ اردو میں کوئی مستند کتاب نہ تھی۔ شبلی نعمانی نے بڑی تلاش و تحقیق کے بعد اس کتاب کو ترتیب دیا۔ الغزالی کی خاص بات یہ رہی ہے کہ جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے اس کو وضاحت سے درج کیا گیا ہے اور مقدمہ میں ان کتابوں کی تفصیل بھی دی ہے جن سے استفادہ کیا ہے۔

سوانح مولانا روم مولانا جلال الدین رومی کی سوانح ہے۔ اس میں مولانا روم کی سیرت، اخلاق و عادات اور دیوان و مثنوی پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ رومی کے کلام پر جو تنقیدی و تحقیق روشنی ڈالی گئی ہے وہ قابل دید ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے صرف مولانا رومی کے حالات سے ہی آگہی نہیں ہوتی بلکہ بہت سے ضروری اسلامی امور سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ مواد کی تحصیل اور تسوید سے شبلی کے تحقیقی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں ماخذ کی تفصیل موجود ہے البتہ الفاروق اور النعمان کی طرح مفصل حوالوں کا التزام نہیں کیا گیا۔

سیرت النبی ﷺ شبلی کے سوانحی سلسلے کی آخری اور سب سے اہم کڑی ہے۔ اللہ کے رسولؐ کی سیرت پاک کو متعدد جلدوں میں بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ شبلی نعمانی نے اسے زندگی کے آخری ایام میں لکھنا شروع کیا جو ان کی زندگی میں مکمل نہ ہوسکی۔ ابتدائی دو جلدیں شبلی کے قلم سے ہیں بقیہ آپ کے جانشین سید سلیمان ندوی نے لکھی۔ شبلی نعمانی سیرت النبیؐ کو اپنی زندگی کا حاصل اور آخرت کے لیے توشہ سمجھتے تھے۔ علامہ شبلی کی دلی خواہش تھی کی آپؐ کی سیرت پر مستند کتاب لکھی جایے۔ سیرت النبیؐ سے قبل جو بھی کتابیں تھیں اس میں بعض ضعف روایات بھی ملتی ہیں۔ اردو کے علاوہ زبانوں میں جو کتابیں تھیں اس میں تعصب غالب تھا۔ مستشرقین نے آپؐ پر نازیبا الزامات لگا کر اسلام اور آپؐ کی شبیہ خراب کرنے کی کوشش کی تھی۔ مولانا شبلی نے ان اعتراضات اور الزامات کا جواب دینے کے

لیے سیرت النبیؐ لکھی جس میں مستشرقین کا منھ توڑ جواب دیا۔ اسلام اور آپؐ کے حوالے سے غلط فہمیوں کو رد کیا اور بڑی تلاش و تحقیق کے بعد سیرت النبی کو لکھنا شروع کیا۔ مولانا مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''خاص سیرت پر آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا۔۔۔اس بنا پر ضروری تھا کہ نہایت کثرت سے حدیث و رجال کی کتابیں بہم پہنچائی جائیں اور پھر نہایت تحقیق و تنقید سے ایک مستند تصنیف تیار کی جائے۔''33

سیرت النبیؐ حصہ اول دو جلدوں پر مشتمل ہے۔آپؐ نبی بنائے جانے کے بعد 23 سال تک بقید حیات رہے 13 سال مکہ میں اور پھر مدینہ میں۔پہلی جلد میں نبوت کے بعد 20 سال کا ذکر ہے جبکہ دوسری جلد میں ۹،۱۰،۱۱ ہجری کے واقعات اور کارناموں کا ذکر ہے۔حصہ اول کی دوسری جلد بھی نامکمل تھی سید سلیمان ندوی نے اسے مکمل کیا اور پھر بقیہ پانچ جلدوں میں اللہ کے رسولؐ کی سیرت پاک کو رقم کیا۔سیرت النبیؐ نہ صرف یہ کہ سیرت و سوانح کے اعتبار سے اہم ہے بلکہ تحقیقی نوعیت سے بھی اسے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔یہ نہ صرف اردو بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں لکھی جانے والی بہتریں سیرتوں میں سے ایک ہے۔پروفیسر ظفر احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی سیرت کی قدیم کتابوں سے مطمئن نہیں تھے۔وہ چاہتے تھے کہ سیرت کے موضوع پر صحیح روایات کے التزام کے ساتھ ایک مستند کتاب مرتب ہو جائے۔اس سلسلے میں انہوں نے یہ بلند معیار پیش نظر رکھنا چاہا تھا کہ سیرت کے واقعات اولا قرآن سے اخذ کیے جائیں۔بعدہ احادیث کی کتابوں سے مراجعت کی جائے۔سب سے آخر میں کتب سیرت کی روایات کام میں لائی جائیں۔مزید برآں روایات کی ترجیح کے باب میں محدثین کے دقیق اصولوں سے استفادہ کیا جائے۔''34

شبلی نعمانی کی سوانحی تصانیف کے علاوہ شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر تحقیقی نقطہ نظر سے کافی اہم ہے اس میں استقرائی تحقیق کی صورت جا بجا نظر آتی ہے۔شعر العجم گرچہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے البتہ اردو میں لکھا گیا ہے۔شعر العجم میں مختلف عربی، فارسی شعرا و ادبا کے تذکروں کے علاوہ انگریزی مورخین سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔شعر العجم پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اس میں فارسی شاعری کے تاریخ کے علاوہ شعرا کے حالات اور ان کے کلام کی خصوصیت کو بیان کیا گیا ہے۔مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شعر العجم تحقیقی و تنقیدی اعتبار سے اہم کارنامہ ہے۔فارسی شاعری اور اس کی روایت کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بہت مستند ہے۔

موازنہ انیس و دبیر بنیادی طور پر تنقیدی کتاب ہے جس میں انہوں نے دو ہم عصر شعرا انیس و دبیر کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔یہ کتاب اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ یہ اردو کی پہلی تقابلی تنقید کی کتاب ہے۔انیس و دبیر کے کلام کی تفہیم اور اس کی تحقیق میں شبلی نے جس تحقیقی شعور سے کام لیا ہے قابل دید ہے۔ان مستقل تصانیف کے علاوہ شبلی نے

کچھ خاص موضوعات پر داد تحقیق دی ہے ۔ بڑی تعداد میں مقالات اور مضامین لکھے۔اس ضمن میں ان کے بعض مقالات ادبی تحقیق کے عمدہ نمونہ ہیں ۔جن میں مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ،اسلامی کتب خانے ،اسلامی حکومتیں اور شفاخانے ،الجزیہ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں مقالات ومضامین ہیں جو مقالات شبلی کا حصہ ہیں کافی اہم ہیں جو بڑی تحقیق بعد لکھے گئے ہیں۔

ادبی تحقیق کی روایت

1۔ مولوی عبدالحق
2۔ حافظ محمود شیرانی
3۔ سید سلیمان ندوی
4۔ مسعود حسن رضوی ادیب
5۔ نصیر الدین ہاشمی
6۔ قاضی عبدالودود
7۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی
8۔ مالک رام
9۔ رشید حسن خاں
10۔ گیان چند جین
11۔ مختار الدین احمد آرزو

مولوی عبدالحق (1871-1961)

اردو زبان وادب کے خدمات گاروں میں مولوی عبدالحق کا نام نمایاں ہے۔ وہ بحیثیت ادیب، نقاد، ماہر لسانیات، لغت نویس، مترجم، خاکہ نگار، صحافی اور قواعد نویس کے ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ البتہ ان کی بنیادی حیثیت ایک محقق کی ہے۔ ان کا شمار صف اول کے محققوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے قدیم شعرا کے تذکروں کی نہ صرف بازیافت کی بلکہ اس پر تفصیلی مقدمہ لکھ کر شائع بھی کیا۔ خواب وخیال، گلشن عشق، سب رس، قطب مشتری جیسے کلاسکی متون کا پہلی بار مولوی عبدالحق نے تعارف کرایا۔ اس کے علاوہ مرحوم دلی کالج، اردو کی ابتدائی نشونما میں صوفیا کرام کا حصہ، اردو کا المیہ، جیسی اہم تحقیقی کتابیں یادگار چھوڑیں۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں قدیم متون اور مخطوطات کی تلاش اور اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ قدیم شعرا کے تذکرے جو مخطوطات کی شکل میں بکھرے پڑے تھے اس کو جمع کیا گیا اور تفصیلی مقدمہ کے ساتھ شائع کیا گیا۔ مولوی عبدالحق نے تذکروں کی بازیافت اور تدوین میں غیر معمولی دلچسپی لی انہوں بڑی تعداد میں تذکروں کو مرتب کر کے شائع کیا۔

مولوی عبدالحق نے متعدد علوم وفنون پر مشتمل تصانیف وتالیفات پیش کیں۔ تحقیقی کتابیں لکھیں اور ترتیب متن کا کام انجام دیا۔ ان کے تحقیقی کارناموں کی فہرست کافی طویل ہے البتہ ان کی مستقل تحقیقی تصانیف میں اردو کی نشونما میں صوفیا کرام کا حصہ، مرحوم دہلی کالج، نصرتی، مقدمہ قطب مشتری، سب رس، باغ و بہار، معراج العاشقین، قواعد اردو، گلشن ہند وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ سیکڑوں تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھے جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

'اردو کی ابتدائی نشونما میں صوفیا کرام کا حصہ' اردو زبان وادب کی ابتدائی تاریخ کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ اس میں صوفیا کرام کی سوانح اور ان کے ملفوظات کو بیان کیا گیا ہے۔ تحقیقی نوعیت سے بھی یہ کتاب غیر معمولی ہے کیوں کہ اس میں نہ صرف یہ کہ اردو زبان کی تاریخ کو بیان کیا گیا ہے بلکہ اردو کے آغاز کے متعلق کئی اہم نظریات کی تردید بھی کی گئی ہے۔ انہیں نہ صرف تاریخ کا مطالعہ کرنا پڑا بلکہ صوفیا کرام کے ملفوظات اور تصانیف کی بھی ورق گردانی کرنی پڑی۔ کتاب میں ان صوفیا کو موضوع بنایا گیا ہے جنہوں نے اردو کی ترویج واشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان میں ایک بڑی تعداد ایسے صوفیا کی ہے جن کے حالات اور کارناموں سے اردو دنیا ناواقف تھی مولوی صاحب نے ان کے حالات جمع کر کے اہم کام کیا ہے۔ اردو کی لسانی تحقیق کے اعتبار سے بھی یہ کتاب بہت اہم ہے۔

مرحوم دلی کالج (1989) دلی کے قدیم کالجوں میں سے ایک تھا۔اس ادارے نے اردو زبان وادب کے فروغ میں اہم کردارادا کیا۔ یہ پہلا علمی ادارہ تھا جہاں اردو زبان کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کا کامیاب تجربہ کیا گیا۔پہلی بار سائنس کی تعلیم دیسی زبان میں دی اور متعدد علوم وفنون کی سیکڑوں کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔دلی کالج کی خدمات کے اعتراف میں انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ اردو1933 میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔یہ سلسلہ ایک سال تک جاری ہے۔ان مضامین کو1945 میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔

مرحوم دلی کالج چار مضامین کا مجموعہ ہے۔پہلا مضمون مرحوم دلی کالج کے عنوان سے ہے جس میں کالج کی تاریخ سلسلہ وار بیان کی گئی ہے۔دلی کالج کی ابتدا1825 میں ہوئی جبکہ اس سے قبل 1800 میں انگریزوں کے ذریعہ فورٹ ولیم کالج کی بنیاد پڑ چکی تھی۔فورٹ ولیم کالج کا مقصد انگریزوں کو ہندستانی زبان کی تعلیم دینا تھا جبکہ دلی کالج کا مقصد ہندستانیوں کو مغربی علوم سے واقف کرانا تھا۔لہذا پہلی بار اردو میں مغربی علوم کی تعلیم دی گئی جو اپنے آپ میں بڑا کارنامہ تھا۔دوسرا مضمون نصاب تعلیم کے حوالے سے ہے جس میں مختلف ادوار میں کالج میں پڑھائی جانے والی نصابی کتب پر روشنی الی گئی ہے جس سے کالج کے معیار کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اس کے علاوہ طلبہ کی تعداد ان کو ملنے والے وظائف اوراساتذہ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔تیسرے مضمون میں کالج کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتابوں اور دہلی ورنکلر سوسائٹی کے اغراض ومقاصد اور ترجمہ وتالیف کی گئی کتابوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔کتاب کا آخری اور چوتھا مضمون کالج کے اساتذہ کے عنوان سے ہے۔جس میں کالج کے اساتذہ اور پرنسپل کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔کالج کے اساتذہ میں ٹیلر،مسٹر ایف بتروس،ڈاکٹر اسپرنگر، جے کارگل، پروفیسر ایلس،مولوی مملوک علی،مولوی امام بخش صہبائی، ماسٹر رام چندر،مولوی ذکاء اللہ،ماسٹر پیارے لال اور مولوی احمد علی کے نام قابل ذکر ہیں۔'مرحوم دلی کالج' دلی کالج کی پہلی اور مکمل تاریخ ہے جس میں کالج اوراساتذہ کی مکمل خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔مولوی عبدالحق کا یہ کارنامہ اپنے موضوع کی انفرادیت اوراولیت کے ساتھ ان کی محققانہ صلاحیتوں کا غماز ہے۔

مولوی عبدالحق کی تحقیق خدمات کا ایک بڑا حصہ دکنیات پر مشتمل ہے۔انہوں نے نہ صرف دکن کی اہم نثری ومنظوم کتابوں کی بازیافت کی بلکہ نصرتی پر ایک تحقیقی کتاب بھی لکھی نیز نصرتی کی مشہور مثنوی 'گلشن عشق'اور علی نامہ کی تدوین وترتیب بھی کی ۔مولوی عبد الحق دکنی ادب کا اردو سے متعارف کرانے والے ابتدائی محققوں میں سے ہیں۔مولوی صاحب سے قبل دکنی کو اردو سے الگ رکھا جاتا تھا انہوں نے نہ صرف یہ کہ قدیم کتابوں کی تلاش وتحقیق کی

بلکہ دلائل سے ثابت کیا کہ دکنی زبان اردو ہی کی قدیم شکل ہے۔

ملا وجہی کا شمار دکن کے باکمال شاعروں وادیبوں میں ہوتا ہے۔جنہوں نے مثنوی کی شکل میں قطب مشتری اور نثر میں سب رس جیسا عظیم کارنامہ پیش کیا۔سب رس کی تدوین مولوی عبدالحق کا اہم کارنامہ ہے جو 1932 میں انجمن ترقی اردو دہلی سے مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی۔انہوں نے کتاب کے ماخذ کو تلاش کیا اور دلائل سے ثابت کیا کہ سب رس وجہی کا طبع زاد کارنامہ نہیں بلکہ فتاحی نیسا پوری کے فارسی قصہ حسن ودل سے ماخوذ ہے۔مقدمہ میں وجہی کے حالات اور کارناموں پر تفصیل سے روشنی دالی گی ہے۔35

قطب مشتری گولکنڈہ کی پہلی طبع زاد مثنوی ہے۔جسے مولوی عبدالحق نے پہلی بار 1939 میں اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔مولوی صاحب کی تحقیق سے قبل ایک مدت تک ولی کو اردو شاعری کا بابا آدم خیال کیا جاتا تھا مگر تحقیق سے ثابت ہوا کہ ولی سے قبل بھی اردو کے شاعر گزرے ہیں۔نثری کتابوں میں فضلی کی کربل کتھا کو اردو نثر کی پہلی کتاب تصور کیا جاتا تھا مگر بعد کی تحقیق سے اس سے قدیم کتابوں کا پتہ چلتا ہے جن میں سے ایک سب رس بھی ہے۔قطب مشتری اور سب رس نہ صرف اردو ادب کی اہم کتابیں ہیں بلکہ مولوی عبدالحق کا بھی اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔36

مولوی عبدلحق کے اہم تحقیقی کارناموں میں معراج العاشقین کی دریافت واشاعت ہے۔معراج العاشقین 1924 میں شائع ہوئی۔اب تک یہ خیال عام تھا کہ معراج العاشقین خواجہ بندہ نواز کی طبع زاد تصنیف ہے۔مولوی عبد الحق نے تحقیق سے ثابت کیا کہ یہ بندہ نواز کی طبع زاد نہیں بلکہ مخدوم شاہ حسینی کی فارسی کتاب ’تلاوت الوجود‘ کا ترجمہ ہے۔37

مولوی عبدالحق نے شعرا کی مثنویوں اور دواوین کی تدوین کا کام بھی کیا ہے۔جس میں دیوان اثر،انتخاب میر،مقدمہ دیوان تاباں،انتخاب داغ،مسدس حالی اور مثنوی خواب وخیال اہم ہیں۔خواب وخیال میر اثر کی شاہکار تصنیف ہے جو ایک مدت تک نایاب تھی مولوی عبدالحق نے اس کی بازیافت کی اور اپنے تفصیلی مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔

اردو تذکروں کی تلاش وتدوین میں مولوی عبدالحق نے نمایا کردار ادا کیا۔اردو کے کسی محقق کو شاید ہی اتنے تذکرے مرتب کرنے کا شرف حاصل ہو۔انہوں نے نکات الشعرا،تذکرہ ریختہ گویاں،مخزن نکات،چمنستان شعرا،گلشن ہند،تذکرہ ہندی،ریاض الفصحا،گل عجائب اور عقد ثریا وغیرہ کی ترتیب وتدوین کا کام کیا۔گل عجائب کا واحد

نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود تھا جس کی مدد سے مولوی عبدالحق نے اسے مرتب کیا اور اس پر ایک مفصل مقدمہ بھی تحریر کیا۔ مصحفی نے اردو کے تین اہم تذکرے لکھے۔ مولوی عبدالحق نے ان مختلف نسخوں کو جمع کیا اور پھر اپنے تفصیلی مقدمہ کے ساتھ مدون کیا۔ میر کا تذکرہ جو اردو کا پہلا تذکرہ ہے جسے حبیب الرحمٰن خاں شروانی اس سے قبل مرتب کر چکے تھے مگر اس میں بعض غلطیاں تھیں مولوی عبدالحق نے متعدد نسخوں کی مدد سے اسے دوبارہ مرتب کیا۔ ان تذکروں کے علاوہ کئی اہم کلاسکی متون کی تدوین کا کام کیا ہے غرض یہ کہ مولوی عبدالحق کی تدوینی و تحقیقی کارناموں کی بڑی تعداد ہے جسے اردو تحقیق کی روایت میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ مولوی عبدالحق نے جن کلاسکی متون کو مرتب کیا ان کا مقدمہ بہت توجہ سے لکھا اس میں کلام اور صاحب کلام سے متعلق سوانحی معلومات کے علاوہ کلام پر ان کا تبصرہ ہی ان سخن فہمی کا غماز ہے۔

حافظ محمود شیرانی (1880-1946)

محمود شیرانی 1880 میں ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر سے ہی حاصل کی۔ پہلے قرآن حفظ کیا اور پھر فارسی سے با قاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ تکمیل تعلیم کے لیے لاہور گئے اور وہاں سے منشی فاضل کی سند حاصل کی۔ 1901 میں بیرسٹر کی تعلیم کے لیے انگلستان کا سفر کیا جہاں شیخ عبد القادر اور علامہ اقبال سے ملاقات ہوئی۔ ایک مدت تک سر ٹامس آرنلڈ کے علمی کاموں میں بھی مدد کی اور پھر لندن کی ایک مشہور کمپنی میں ملازمت کر لی۔ یہ ان کے لیے مشرقی علوم کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابیں جمع کرتے تھے۔ آگے چل کر شیرانی اس کمپنی کے حصہ دار بن گئے۔ 1913 میں ہندستان آئے اور مختلف وجوہات کی بنا پر واپس نہ جا سکے اور پھر لاہور کے اورینٹل کالج میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ 1940 میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن لوٹ آئے جہاں 1946 میں انتقال ہوا۔

محمود شیرانی کا شمار اپنے وقت کے جید عالموں میں ہوتا ہے۔ اردو میں باضابطہ تحقیق کی ابتدا حافظ محمود شیرانی سے ہوتی ہے۔ وہ پہلے محقق ہیں جنہوں نے نہ صرف تحقیق کے اصول متعین کیے بلکہ پائیدار اصولوں پر کام بھی کیا اور جدید مغربی اصول کو رواج دیا۔ محمود شیرانی کو مخطوطہ شناسی، سکہ شناسی، مہر شناسی، تصویر شناسی، قدیم کاغذ روشنائی اور علم خط پر مہارت حاصل تھی۔ وہ ہند و پاک میں اپنی تحقیقی کاوشوں کی وجہ سے تحقیق کے معلم اول اور بت شکن محقق کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر حافظ محمود شیرانی اردو میں ادبی تحقیق کے وہ معلم اول ہیں جنہوں نے حقائق کے تجسس اور استخراجی و استقرائی نتائج کے اخذ و استنباط کے ہر مرحلہ میں تاریخی تناظر سے روشنی و رہنمائی حاصل کی اور معروضی طریقہ فکر کی دست گیری و نظر فروزی نے ان کی تحقیقی عیار گیری کے پیمانے کو بلند رکھا اور زیادہ صحیح اور وقیع نتائج تک پہنچایا۔۔۔۔ پروفیسر شیرانی کی عہد آفریں علمی فتوحات اور تحقیقی استنباط نتائج میں ان کی تاریخی بصیرت ہی ایک کارفرما عنڈر کی حیثیت سے شریک نظر آتی ہے۔ انہیں قدرت کی طرف سے جو دراک ذہن اور قوت حافظہ ملی ہوئی تھی اس کی آبیاری میں ان کا وسیع تر مطالعہ اساسی ماخذ پر ان کی گہری نظر نے ان کی غیر معمولی قوت استقرا کو مہمیز کیا۔'' [38]

شیرانی نے تحقیق کے اصول پر کوئی باضابطہ کتاب نہیں لکھی البتہ ان کے تحقیقی کاموں سے تحقیق کے اصول مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے لسانیات، تحقیق و تدوین، تنقید اور تاریخ پر متعدد کتابیں یادگار چھوڑیں ہیں۔ جن میں پنجاب میں اردو، تنقید شعر العجم، تنقید آب حیات، خالق باری، فردوسی پر چار مقالے اور تحقیقی و تنقیدی مقالات پر مشتمل کئی جلدیں قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے بہت سے نظریات اور حقائق کو بھی درست کیا۔

شیرانی انگلستان میں تقریباً دس سال رہے جہاں ایک مدت تک آرنلڈ اور لوزک کمپنی کے ساتھ ان کا وقت گزرا یہی وہ زمانہ ہے جب ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ان کی ملازمت ہی یہی تھی کہ جو بھی کتابیں ان کو میسر ہوان کے متعلق پوری تفصیل لکھ کر کمپنی کو بھیج دیں اس طرح انہیں ہزاروں کتابیں اور پڑھنے کا موقع ملا جس نے ان کی مخطوطہ شناسی کی صلاحیت کو نکھار دیا۔ان کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کو مخطوطہ دیکھ کر یہ بتانے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوتی تھی کہ اس کتاب کا کاغذ کس زمانے کا ہے، کتاب کا عہد اور کاتب کون ہے۔

حافظ محمود شیرانی کے تحقیقی کارناموں میں ان کی مشہور تصنیف 'پنجاب میں اردو'(1928) اردو لسانیات پر پہلی معیاری تحقیقی کتاب ہے۔انہوں نے یہ کتاب لاہور کی ملازمت کے دوران پرنسپل عبداللہ یوسف علی کی فرمائش پر لکھی تھی۔کتاب کی اشاعت سے قبل اردو کی پیدائش کے سلسلہ میں مختلف نظریات عام تھے۔پہلی بار انہوں نے مختلف دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی۔وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی میں جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں،اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں گے۔''39

شیرانی نے پنجاب میں اردو کی پیدائش کے سلسلے میں بے شمار دلائل پیش کیے ہیں۔پنجابی اور اردو کے ایسے سیکڑوں الفاظ کا ذکر کیا ہے جو مشترکہ نظر آتے ہیں۔شیرانی کے اس نظریے کا بہت سے اہل علم نے استقبال کیا البتہ کچھ ماہرین لسانیات نے اس نظریہ کی تردید بھی کی جن میں مولوی عبدالحق،ڈاکٹر شوکت سبزواری،محی الدین قادری زور قابل ذکر ہیں۔مسعود حسین خان کے نظریہ کے آنے کے بعد شیرانی ہی نہیں بلکہ دیگر ماہرین لسانیات کے نظریات غلط ثابت ہوئے اور ثابت یہ ہوا کہ اردو کا مولد و مسکن دہلی اور نواح دہلی ہے۔محمود شیرانی کا جو بھی نظریہ رہا ہو تحقیقی نوعیت سے یہ کتاب کافی اہم ہے۔اس میں اردو کو پنجاب سے منسوب کرنے کے لیے جو دلائل پیش کیے گئے ہیں کافی اہم ہیں اور تحقیق کے جن اصولوں کو برتا گیا ہے وہ قابل ذکر ہے۔

شیرانی نے تدوین متن کے حوالے سے بھی کافی اہم کام کیے ہیں۔انہوں نے اردو میں رائج متعدد غلط روایات کو منسوخ کیا۔فردوسی کے متعلق یہ روایت عام تھی کہ فردوسی نے شاہنامہ سلطان محمد غزنوی کی فرمائش پر لکھی۔فردوسی نے سلطان کی ہجو بھی لکھی تھی۔شیرانی نے دلائل سے ثابت کیا کہ فردوسی سے منسوب ہجو سلطان ایک مجہول دستاویز ہے۔خالق باری جو ایک مدت سے امیر خسرو کی طرف منسوب تھی انہوں نے اپنی تحقیقی کوششوں سے ثابت کیا کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے بلکہ ضیاء الدین خسرو کی کتاب ہے۔40(دیباچہ خالق باری،انجمن ترقی اردو ہند1944)شیرانی نے اس کتاب کی تدوین ۱۶ قلمی اور ۳۹ مطبوعہ نسخوں کی مدد کی ہے۔محمود

شیرانی کو انجمن کے کتب خانہ میں ایک مخطوطہ دستیاب ہوا جس کے دیباچہ سے بہت سے سوالات کے جوابات مل جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس دیباچہ سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے۔ یعنی یہ کہ کتاب بچوں کو فارسی زبان سکھانے کے مقصد سے لکھی گئی۔ اس کا نام حفظ اللسان ہے۔۔۔ بابا اسحاق حلوائی کی فرمائش پر یہ تالیف وجود میں آئی۔ مصنف کا نام خسرو اور لقب ضیاء الدین۔۔۔ سال تصنیف ۱۰۳۲ھ جو مادہ تاریخ 'تصنیف آخر' سے برآمد ہوتا ہے۔ حضرت امیر خسرو ۷۲۵ھ میں وفات پاتے ہیں اور یہ خسرو ۱۰۳۱ھ میں بعد جہانگیر اپنی تالیف تیار کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ہمارے بزرگوں نے بنائے مشارکت اسمی اس خسرو کو زیادہ مشہور امیر خسرو تصور کر کے خالق باری کو غیر مستحقانہ قدامت دے دی ہے۔''[41]

مقالات شیرانی دس جلدوں پر ہے جس میں بڑی تعداد میں تحقیقی مقالات شامل ہیں۔ ابتدائی دو جلدوں میں اردو زبان اور اس کے آغاز وارتقا کے متعلق مقالات ہیں۔ تیسری جلد میں اردو کے کلاسکی ادب پر پانچ اہم مقالے ہیں۔ چوتھی جلد میں فردوسی اور شاہنامہ پر مشتمل ہے جبکہ میں پانچویں جلد تنقید شعر العجم پر لکھے گئے مقالات ہیں۔ چھٹی میں فارسی زبان وادب حوالے سے مضامین ہیں۔ ساتویں جلد میں چند بردائی کی مشہور کتاب 'راسا' پر مقالات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بقیہ جلدوں میں بھی اردو اور فارسی ادب کے حوالے سے اہم مقالات شامل ہیں۔ قابوس نامہ (چھ قسط)، شاہنامہ کی نظم کے اسباب اور زمانہ، ہجو سلطان محمود غزنوی، یوسف زلیخا، فردوسی، تنقید شعر العجم، دیوان خواجہ معین الدین، مثنوی لیلی مجنوں از احمد دکنی، بکٹ قصہ افضل جھنجھانوی، خالق باری، قصہ چہار درویش، میر قدرت اللہ قاسم اور اس کی تالیف مجموعہ نغز، اس کے علاوہ سیکڑوں مضامین جو تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ جس میں بہت سی غلط روایتوں کو رد کیا گیا ہے۔ 'راسا' ایک مشتبہ کتاب ہے جس کے بارے میں محققین کی الگ الگ رائے ہے۔ بعض اہل علم کا خیال تھا کہ راسا ہندی ادب کے پہلے شاعر پرتھوی راج راسا چند بردائی کی تصنیف ہے۔ شیرانی نے دلائل سے ثابت کیا کہ راسا ایک مشتبہ کتاب ہے۔ ایک خیال یہ بھی خاص وعام تھا کہ دیوان معینی حضرت معین حسن کا کلام ہے۔ شیرانی نے ایک مقالے میں داخلی اور خارجی شہادتوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ دیوان معین الدین اجمیری دراصل معین الدین واعظ مسکین فراہی کی تصنیف ہے۔ فردوسی نے شاہنامہ کے علاوہ یوسف زلیخا نام کی نظم لکھی تھی۔ شیرانی نے ان تمام خیالات کو اپنی تحقیق سے غیر مستند قرار دیا ہے۔ شیخ فرید الدین عطار سے منسوب کتابیں ان سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ قصہ چہار درویش کا امیر خسرو سے انتساب صحیح نہیں ہے وغیرہ۔

تحقیق مقالات کے علاوہ محمود شیرانی نے اردو ادب کی دو مشہور کتاب آب حیات اور شعر العجم پر تنقید کی جو

تنقید آب حیات' اور' تنقید شعر العجم' کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ کتابیں تحقیقی وتنقیدی نوعیت سے کافی اہم ہیں۔تنقید شعر العجم اکتوبر 1922 سے جنوری 1927 تک انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ میں قسط وار شائع ہوئی تھی۔جس میں انہوں نے شعر العجم میں پائی جانے والی تحقیقی خامیوں پر گرفت اور تنقید کی ہے۔آب حیات پر تنقید آب حیات کے نام سے مضمون لکھنے کا سلسلہ انہوں نے آخری عمر میں شروع کیا تھا۔طبیعت کی علالت کے سبب مکمل نہ کر سکے۔اتفاق سے دونوں کتابیں مکمل نہ ہوسکی البتہ تنقید شعر العجم کتابی شکل میں شائع ہوچکی ہے۔بنیادی طور پر دونوں کتابیں تنقیدی نوعیت کی ہیں البتہ حقائق کی دریافت میں انہوں نے جو جانکاہی دکھائی ہے قابل دید ہے۔

قدرت اللہ قاسم کے ضخیم تذکرہ' مجموعہ نغز' کی تدوین شیرانی کا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔انہوں نے اس تذکرہ کو بحسن خوبی ترتیب دیا ہے۔ابتدا میں ایک دیباچہ لکھا ہے جس میں مجموعہ نغز اور قدرت اللہ قاسم پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔دیباچہ کے شروع میں ایسے الفاظ کی فہرست بھی پیش کی ہے جو قدرت اللہ قاسم کے زمانے میں مختلف طریقہ سے لکھے جاتے تھے۔شیرانی متعدد کتابوں پر تبصرے بھی لکھے ہیں یہ تبصرے نہ صرف بہت ضخیم ہیں بلکہ اہم اور معلوماتی ہیں۔

سید سلیمان ندوی (1884-1953)

سید سلیمان ندوی ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ان کا شمار ممتاز علمی وادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔وہ ایک عظیم المرتبت عالم دین، محقق، مورخ، صحافی، ادیب وشاعر، ماہر تعلیم اور سیاست داں تھے۔سید سلیمان ندوی علامہ شبلی کے جانشینوں میں سے تھے۔انہوں نے نہ صرف علمی وتحقیقی موضوعات پر کتابیں تحریر کیں بلکہ شبلی کے ادھورے کاموں کی تکمیل اوران کے خوابوں کوشرمندۂ تعبیر بھی کیا۔سیرت النبی ﷺ، حیات شبلی، خیام، یادرفتگاں، سیرت عائشہ، ارض القرآن، خطبات مدراس، نقوش سلیمانی، مقالات سلیمان، عربوں کی جہاز رانی، اسلام اور مستشرقین، جیسی قابل ذکر کتابیں ان کی یادگار ہیں۔

سید سلیمان ندوی ۲۲ نومبر 1884 دسنہ ضلع پٹنہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔یہ علاقہ ہمیشہ سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔یہاں ہمیشہ سے عالم وفاضل کی ایک بڑی تعداد رہی ہے۔دسنہ میں ایک قدیم کتب خانہ بھی تھا جس سے سید صاحب نے خوب استفادہ کیا۔ابتدائی تعلیم مولوی مقصود اکھدوی اور خلیفہ انوار علی سے حاصل کی۔1901 میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا جہاں پانچ سال تک مفتی عبداللطیف سنبھلی، مولانا شبلی فقیہ جے راجپوری، مولانا حفیظ اللہ اعظمی، مولانا فاروق چڑیا کوٹی اور سید علی صاحب سے فیض یاب ہوئے۔1905 میں علامہ شبلی نعمانی ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم ہوکر لکھنؤ آئے تو سید صاحب کو اپنی تربیت خاص میں لے لیا۔علامہ نے انہیں تصنیف وتالیف کے لیے تیار کیا۔1906 میں ندوہ سے فراغت کے بعد الندوہ کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔1910 میں شبلی نے جب سیرت النبی ﷺ کی تدوین کے لیے ایک شعبہ قائم کیا تو سید صاحب کو لٹریری اسسٹینٹ مقرر کیا۔1912 تک 'الندوہ' کی سب ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔کچھ وقت تک 'الہلال' کی مجلس ادارت میں بھی رہے۔1913 کے آواخر میں علامہ شبلی کے ایما پر دکن کالج پونا میں عربی فارسی کی پروفیسری قبول کرلی۔علامہ شبلی کے انتقال کے چند روز قبل 1914 میں اعظم گڑھ آ گئے جہاں انہوں نے نہ صرف یہ کہ سیرت النبی ﷺ کی تکمیل کی بلکہ دارالمصنفین جس کا خاکہ خود شبلی نے تیار کیا تھا اس کو عملی جامہ پہنایا۔1916 میں جب ماہنامہ معارف جاری کیا۔دارالمصنفین اور شبلی کی وصیت کی تکمیل میں جدوجہد اور جانفشانی کرتے رہے۔عمر کے آخری حصہ میں پاکستان چلے گئے جہاں 1953 میں انتقال کیا۔

سید سلیمان ندوی کی اولین حیثیت ایک عالم دین کی ہے۔ان کے علمی ودینی کارناموں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔البتہ ان کے تحقیقی کارناموں کی بھی ایک بڑی تعداد ہے جس کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔سید صاحب کی تحقیقی

خدمات کا ایک بڑا حصہ سیرت وسوانح پر مشتمل ہے

خیام (1933) سید سلیمان ندوی کا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ دراصل سید صاحب نے 1930 میں پٹنہ میں ہونے والے آل انڈیا اورنٹیل کانفرس میں اپنا یہ مقالہ پیش کیا تھا جسے بعد میں عمر خیام کے چند غیر مطبوعہ فلسفیانہ رسائل اور رباعیات کے ایک غیر مطبوعہ نسخہ کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ عمر خیام شاعر، علم ہیت، علم نجوم، ریاضی اور فلسفہ کا ماہر تھا البتہ ان کی عالمی شہرت کا باعث ان کی رباعیاں ہیں۔ ان کی رباعیوں کا ترجمہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہوا ہے۔ اردو میں ان کی رباعیوں کا منظوم ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ 'خیام' فارسی شاعر عمر خیام کی سوانح حیات ہے۔ جس کو سید صاحب نے بڑی تلاش وتحقیق کے بعد لکھا ہے۔ مختلف عنوانات قائم کر کے عمر خیام کے حالات، تصانیف، تلامذہ، فارسی رباعی، خیام کا مذہب، خیام کا مشرب ومسلک، پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ خیام پر دنیا کی مختلف زبانوں میں بہت کام ہو چکے ہیں البتہ ان پر لکھی جانے والی زیادہ تر کتابیں مستشرقین کی ہیں۔ عربی فارسی میں بھی خیام پر خوب تحقیق ہوئی ہے۔ پھر بھی خیام کی زندگی کے بعض پہلوؤں اور تصانیف پر اختلافات پائے جاتے تھے۔ سید صاحب کی تحقیق سے قبل ایکس کتابوں کو خیام سے منسوب کیا جاتا رہا ہے جبکہ سید سلیمان ندوی نے صرف تیرہ کتابوں کو خیام کی تصنیف مانا ہے۔ خیام کی زندگی کے بعض نئے پہلوؤں کا بھی انکشاف کیا ہے۔ ان غلط روایتوں کا ازالہ بھی کیا ہے جو ایک مدت سے رائج تھیں۔ سید صاحب نے عربی، فارسی اور دیگر یورپی محققین کی ۶۳ کتابوں اور خود خیام کی ۱۳ کتابوں کو ماخذ کے طور استعمال کیا ہے۔ کتاب کے شروع میں 'سوانح خیام کے ماخذ ومصادر پر ناقدانہ تبصرہ' لکھ کر محققین کی کتابوں کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے اور ان کی کوتاہیوں کو بھی بیان کیا ہے۔

سید سلیمان ندوی نے ان کی رباعیوں پر سب سے زیادہ محنت کی ہے۔ قدیم سے قدیم ماخذ دریافت کیے ہیں۔ یورپ میں خیام ایک شرابی کی حیثیت سے مشہور تھا۔ سید سلیمان ندوی نے تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ خیام شراب نوشی تو دور وہ شراب کو پسند تک نہیں کرتا تھا۔ کسی معتبر ماخذ میں اس کا ذکر بھی نہیں ہے۔ بعض مستشرقین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ خیام الحادی تھا سید صاحب نے دلائل سے اس کو بھی غلط ثابت کیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ فردوسی کے ہزار سالہ جشن کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف دیے اس میں سید سلیمان ندوی کی یہ کتاب 'خیام' بھی تھی۔

سید سلیمان ندوی علامہ شبلی کے نہ صرف شاگرد بلکہ جانشین بھی تھے۔ ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے

اور قلم کو نکھارنے میں علامہ شبلی کا اہم رول رہا ہے۔ ہیروز آف اسلام کا جو سلسلہ شبلی نے شروع کیا تھا اس میں سید صاحب کو اسسٹنٹ مقرر کیا تھا۔ انتقال کے وقت سیرت کی تکمیل کی وصیت بھی سید صاحب کو کی۔ سیرت النبیؐ کی تکمیل سید سلیمان ندوی کا قابل قدر کارنامہ ہے۔ سیرت النبیؐ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دو جلدیں جس میں اللہ کے رسولؐ کی سیرت وسوانح پر روشنی ڈالی گئی ہے علامہ شبلی نے لکھی جبکہ بقیہ پانچ جلدیں جو شریعت محمدیہؐ پر مشتمل ہے علامہ شبلی کے ایما پر سید صاحب نے تالیف کی۔ پہلی جلد میں آپؐ کی ولادت سے لیکر سلسلہ غزوات تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ دوسری جلد میں وفود عرب، آپؐ کی وفات، ازراج مطہرات وغیرہ کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ تیسری جلد میں معجزہ کی حقیقت اس کے امکان ووقوع پر فلسفہ اور نبوت کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھی جلد منصب نبوت اور اس کے لوازم وخصائص وغیرہ پر مشتمل ہے۔ پانچویں جلد آپؐ کی عبادات، چھٹی جلد آپ کے اخلاق اور آپ کی تعلیمات جبکہ ساتویں اور آخری جلد اسلام کے سیاسی نظام کے اصول ومبادیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سید سلیمان ندوی نے سیرت کے دیباچہ کے طور پر ارض القرآن لکھا جس کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے اس کے کچھ حصہ کو سیرت میں شامل کیا گیا جبکہ بقیہ حصہ کو دو حصوں میں کتابی شکل میں شائع کیا۔ سیرت النبیؐ محسن انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب ہے۔ اردو زبان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کی زبانوں میں لکھی جانے والی بہترین سیرت کی کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

سیرت عائشہؓ، حیات مالک اور رحمت عالم سوانح اور سیرات کے اہم کارنامے کے طور پر دیکھی جاتی ہے۔ ان کتابوں میں سوانح کے جدید اصولوں اور سائنٹفک طریقہ کار کو اختیار گیا ہے۔ سید سلیمان ندوی جس موضوع پر قلم اٹھاتے پہلے تمام ذرائع سے مواد اکٹھا کرتے اور پھر تحقیق وتنقید کے بعد نہایت سلیقے سے مواد کی تسوید کرتے۔ کسی بھی موضوع پر بغیر تحقیق کے وہ کوئی رائے قائم نہیں کرتے۔ ان کی سوانحی کتابیں ادبی تحقیق کا عمدہ نمونہ ہیں۔

سید سلیمان ندوی کو علامہ شبلی نعمانی سے بڑی قربت تھی۔ 1905 ندوہ کے زمانہ سے لے کر 1914 تک کا ساتھ رہا۔ اس درمیان دونوں شخصیتوں کو ایک دوسرے کو جاننے سمجھنے کا خوب موقع ملا۔ شبلی نعمانی کے بیشتر حالات بالخصوص ابتدائی اور تعلیمی زندگی انہی کی زبانی سن رکھا تھا اور بقیہ ان کے رشتہ داروں اور شاگردوں سے معلوم کیے۔ علامہ شبلی کے احباب اور ان کے معاصرین سے بھی سید سلیمان ندوی کے روابط تھے البتہ حیات شبلی کی تالیف میں

زیادہ استفادہ شبلی کے مکاتیب سے کیا۔شبلی کے بیشتر حالات ان کے خطوط میں کسی نہ کسی صورت سے موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سید صاحب نے حیات شبلی کے دیباچہ میں اسے سوانح کے بجائے خودنوشت سوانح لکھا ہے۔سید سلیمان ندوی نے شبلی کے حالات بڑی تلاش وتحقیق کے بعد لکھا ہے۔ پیدائش سے لے کر آخر ایام تک کے حالات اوران کے علمی وادبی کارنوں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔مولانا کی حیات وخدمات پر یہ ایک مستند کتاب ہے اور سید صاحب کا بہترین تحقیقی کارنامہ ہے۔

ارض القرآن سیرت النبیؐ کے دیباچہ کے طور پر لکھا گیا تھا البتہ ضخامت کی وجہ سے کچھ حصہ کو دیباچہ میں شامل کیا گیا اور بقیہ کتابی شکل میں ارض القرآن کے نام سے شائع ہوا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ دارالمصنفین کے قیام کے بعد سب سے پہلے یہی کتاب شائع ہوئی۔ارض القرآن سید سلیمان ندوی کا منفرد اوراہم کارنامہ ہونے کے ساتھ علمی تحقیق کا گراں قدر سرمایہ بھی۔ یہ کتاب قرآن مجید کی تاریخی اور جغرافیائی تفسیر ہے۔قرآن مجید میں جن تاریخی مقامات اور قبائل کا ذکر ہے ارض قرآن میں اس کی جغرفیائی تحقیق کی گئی ہے۔ مستشرقین کی غلط بیانیوں ازالہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ کتاب دوحصہ پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں قوم عاد،قوم ثمود،اہل حصین، بنی عاد،قوم سبا،حمیر،اصحاب الاخدود، اصحاب فیل، جبکہ دوسرے حصہ میں حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت محمدؐ کے خاندان تک کی تاریخ اوراسلام سے قبل تجارت، یونان وروم کی تاریخ، زبان، مذہب اوراصحاب ایکہ اورالحمی کی بھی تفصیلی تاریخ بیان کی گئی ہے۔سید سلیمان ندوی نے اس کتاب کی تالیف کے لیے عربی، عبرانی، فرانسیسی اور جرمنی میں ترجمہ شدہ مواد سے استفادہ کیا۔تورات زبور اور قرآن کے علاوہ عرب کی قدیم ترین تواریخ کا بھی بطور خاص مطالعہ کیا۔ارض القرآن موضوعی حیثیت سے کافی منفرد اوراہم تحقیقی کارنامہ ہے۔

عربوں کی جہاز رانی سید سلیمان ندوی کے ان خطبات کا مجموعہ ہے جو مارچ 1930 میں اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کی فرمائش پر دیے گئے تھے۔عربوں کی جہاز رانی سید صاحب کی نہ صرف اہم تحقیقی کاوش ہے بلکہ جہاز رانی کے فن اوراس کی تاریخ پر اردو میں پہلی کتاب ہے۔ یہ دراصل چار اہم خطبات کا مجموعہ ہے۔اس کتاب میں جہاز رانی کے فن اور روایت، لغات میں مستعمل اس کے لیے الفاظ، اسلام سے قبل اور اسلام سے بعد عربوں کے بحری سفر، مختلف ممالک کی جہاز رانیاں اوراس کی اقسام، اس کے علاوہ جہاز رانی کے فن پر تحریر کردہ کتابوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔زمانہ جاہلیت، عہد نبوت، عہد خلفاء راشدین، اور بنوعباس کے بحری اسفار پر بطور خاص روشنی ڈالی ہے۔سید سلیمان ندوی نے بندرگاہوں کی تلاش وتحقیقات پر بڑی محنت کی، لغات، زمانہ جاہلیت کے اشعار اور قرآن

کی ۲۸ آیتوں کو بنیاد بنایا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک جن میں ہندستان، روم، اندلس، افریقہ، مصر، چین کی بندرگاہوں پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ عربوں میں جہاز رانی کی ابتدا کب ہوئی اس حوالے سے زیادہ کچھ نہیں ملتا البتہ با قاعدہ آغاز کو حضرت عثمان غنیؓ سے منسوب کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔:

''عربوں میں جہاز رانی کا اصل عہد حضرت عثمانؓ کی خلافت سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت امیر معاویہ شام اور مصر میں علاء بن الحضرمی بحرین میں گونر تھے۔ عربوں کے سب سے پہلے امیر البحر عبداللہ بن قیس حارثی ہیں۔ جنہوں نے رومیوں کے مقابلے میں پچاس بحری حملے کئے ہیں۔ ان کا آغاز ۲۸ھ سے ہوتا ہے۔'' 42

سید صاحب نے جہاز رانی کے فن، جہاز سازی کے کارخانوں، عربی کی جہازوں کے خصائص، جہاز رانوں کی تحقیقات، ایجادات و مشاہدات کو بڑی تفصیل سے تاریخی حوالوں سے بیان کیا ہے۔ مواد کی تلاش و تحقیق اور ترتیب میں جو ہنر مندی دکھائی ہے وہ ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے۔ ارض القرآن اردو تحقیق کا نہ صرف قابل قدر کارنامہ ہے بلکہ اردو میں اس فن پر پہلی کتاب ہے۔

نقوش سلیمان سید سلیمان ندوی کے مقالات، خطبات اور مقدمات کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں چھ خطبات ہیں جو ہندستان کی مختلف اردو کانفرسوں میں بحیثیت صدر کے پیش کیا گیا۔ دوسرے حصہ میں وہ مقالات شامل ہیں جو 'معارف' اور دیگر رسائل میں مختلف اوقات میں شائع ہوئے تھے جن کی تعداد چودہ ہے۔ جبکہ تیسرا حصہ مقدمات اور تقریظات پر مشتمل ہے جو وقتاً فوقتاً سید صاحب نے مختلف کتابوں پر لکھے تھے۔ ان مقالات کا موضوع اردو زبان و لسانیات اور اردو کے دیگر مسائل ہیں۔ مشمولات میں انڈیا آفس میں اردو کا خزانہ، اردو کیوں کر پیدا ہوئی۔ بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق، اردو زبان کی ترقی کا مسئلہ قابل ذکر ہیں۔ اردو کیوں کر پیدا ہوئی اور ہندستان میں ہندستانی سید صاحب کے دو اہم مقالات ہیں جس میں پہلی بار اردو زبان کا مولد سرزمین سندھ کو قرار دیا ہے۔ 'پرانے لفظوں کی نئی تحقیق' لفظوں کی تحقیق پر اہم مقالہ ہے جس میں کئی اہم الفاظ کی وجہ تسمیہ اور اس کے استعمال پر روشنی ڈالی ہے۔ اردو زبان کی تاریخ اور اس کے مسائل، مستقبل میں اس کی حفاظت اور ترقی کے لیے اقدامات اور سہ لسانی جھگڑے پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اردو مختلف عہدوں میں الگ الگ نام سے یاد کی جاتی رہی ہے۔ سید سلیمان ندوی کی دلی خواہش کی تھی کہ اردو کا نام ہندستانی رکھا جائے اور یہی نام مستقبل میں اس کی ترقی اور حفاظت میں معاون ہوگا۔ دنیا کی بیشتر زبانوں کا نام کسی قوم یا ملک سے منسوب ہے اور یہی اس کی ترقی کی

اصل وجہ ہے۔سید صاحب اس حوالے سے لکھتے ہیں۔:

''ہم اس زبان کا نام اردو جو صرف ڈیڑھ سو برس سے رفتہ رفتہ ہماری زبانوں پر چڑھ گیا ہے۔یک قلم چھوڑ دیں،اس کا نام ہندستانی رکھیں اوراس کوشہرت دے کرعام کریں۔دنیا کی اکثر زبانوں کا نام ملک یاقوم کے نام سے موسوم یا منسوب ہے۔اردو کا نام اس ملک یاقوم سے کئی تعلق نہیں رکھتا۔ایسا اجنبی نام جس سے قومی وملکی جذبے کوکوئی تحریک نہ پہنچے احتراز کے قابل ہےاور اس کے بجائے اس کا ہندستانی نام ہندوستان اوروہ بھی ہندواور مسلمانوں کےمشترکہ وطن کے نام کے تصور کے حامل ہونے کےسبب سے پوری طرح اپنے اندر ہمدردانہ جذبات کی روح رکھتا ہے اورمعلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی زبان کا نام ہے جس کو پورے ملک سے تعلق ہےاوروہ پورے ملک کی متحدہ زبان ہونے کا دعوہ رکھتی ہے۔عام خیال یہ ہے کہ ہندوستانی نام انگریزوں کا رکھا ہوا ہے مگر یہ واقعہ نہیں ہم اس نام کے ذریعے ملک کے سامنے وہ تخیل پیش کریں گے جو ہندو مسلم کے مشترکہ وطن کے تصور کی ترجمانی کرے گا۔اور مغلوں کے لشکری استیلا کی تاریخ سے جو لفظ اردو میں چھپی ہے ہم کو نجات دے گا۔''43

نقوش سلیمانی اردو زبان کی لسانی تاریخ وتحقیق کے حوالے سے قابل قدر کارنامہ ہے۔مشمولات کے مطالعہ سے نہ صرف یہ کہ اردو زبان وادب کے بعض اہم لسانی پہلوؤں سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ سید سلیمان ندوی کے تحقیقی ذوق کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

سید سلیمان ندوی نے بڑی تعداد میں تحقیقی مضامین اور مقالات بھی لکھے ۔جو تین جلدوں میں مقالات سلیمانی کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں ۔پہلی جلد میں تاریخی مقالات ہیں جو ہندستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے ہیں ۔ ہندستان کے مسلم حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیم اور علمی ترقی ،خلافت اور ہندستان ، ہندستان میں اسلام کی اشاعت کیوکر ہوئی ، ہندوکش عالمگیر کے عہد کی دو عجیب کتابیں ،تاج محل اور لال قلعہ کے معماراور ہندی الاصل اور ہندوی النسل مسلمان سلاطین وغیرہ اس جلد کے اہم مقالات ہیں ۔ان مقالات سے نہ صرف ہندستان کی تاریخ کے بعض اہم پہلوؤں سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ سید سلیمان ندوی کی تاریخی بصیرت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔دوسری جلد میں علمی وادبی مقالات ہیں جو کافی اہم اور تحقیقی نوعیت کے ہیں ۔کتب خانہ اسکندریہ،مرزا بیدل عظیم آبادی نہ تھے،حجاز کے کتب

خانے ،انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ، کتب خانہ حمیدیہ بھوپال، اس جلد میں شامل اہم تحقیقی مقالات ہیں۔ تیسری جلد میں مذہبی مقالات ہیں جن تعلق گرچہ ادب سے نہیں مگران میں بھی سید صاحب کا تحقیقی ذوق اور بالیدہ شعور کو دیکھا جاسکتا ہے۔

سید سلیمان ندوی کی تحقیق کا ایک بڑا حصہ ماہنامہ معارف میں موجود ہے۔معارف میں سید صاحب نے جو شذرات لکھے وہ مختلف موضوعات پر ہیں مگران میں تحقیقی نوعیت کے شذرات بھی بہت ہیں۔سید صاحب کے شذرات تین جلدوں میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔سید صاحب کا معمول رہا ہے کہ وہ جب کسی قدیم کتاب،مخطوطہ سے متعلق علم ہوتا تو قارئین معارف کوضرور مطلع کرتے تھے۔میر اثر کی شعری حیثیت مسلم ہے۔ان کی شاہکار مثنوی 'خواب وخیال'ایک مدت سے نایاب تھی شذرات 1917 میں پہلی بار اس کے بازیابی کی اطلاع دی جسے 1926 میں عبدالحق نے اپنی مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا۔سودا کے دیوان کے متعدد قلمی نسخے ہندستان اور دیگر ممالک میں موجود ہیں ایسے ہی ایک قیمتی نسخے کی اطلاع سید سلیمان ندوی نے معارف شذرات 1922 میں دی جسے بعد میں ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق نے 1985 میں مرتب کیا۔اردو نثر کی ایک اہم کتاب گربہ نامہ (بلی نامہ) جس کے مصنف فقیر غلام علی آزاد ہیں کی اطلاع سید صاحب نے معارف کے ذریعے سب سے پہلے دی۔اردو لغت ومحاورات کی دو کتابیں کی دریافت سید صاحب نے کی جو انشاء اللہ خاں انشاء کی کتاب دریائے لطافت سے بھی قدیم ہے۔اس کے علاوہ نسخہ حمیدیہ، مجموعہ گنج اور دیگر کئی کتابوں اور علمی وادبی گوشوں کی اطلاع سید صاحب نے معارف کے ذریعہ دی۔اس سے نہ صرف یہ کہ تحقیق کا معیار بلند ہوا ہے بلکہ اردو ادب میں گراں قدر اضافہ بھی ہوا ہے۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب (1893-1975)

سید مسعود حسن رضوی ادیب کی شخصیت بحیثیت نقاد اور محقق مسلم ہے۔ انہوں نے تنقید و تحقیق اور تدوین متن پر تیس سے زائد کتابیں سیکڑوں مضامین اور مقالات لکھے۔ مختلف کتابوں پر لکھے گئے ان کے دیباچے اور مقدمہ بھی کافی اہم ہیں۔ ان کی کتاب 'ہماری شاعری' اردو تنقید کا نمایاں کارنامہ ہے۔ البتہ ہمیں یہاں ان کی تحقیقی خدمات سے سروکار ہے۔

رضوی ادیب کا دائرۂ تحقیق خاصا وسیع ہے۔ انہوں نے ڈرامہ، مرثیہ، داستان اور تذکرہ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ان کی تحقیقی کتابوں میں روح انیس، لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، اردو ڈرامہ اور اسٹیج، ایرانیوں کا مقدس ڈرامہ، شاعر اعظم انیس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ رضوی ادیب نے نہ صرف اہم تحقیقی کتابیں تحریر کیں بلکہ تدوین متن کا معیار بھی قائم کیا اور ایک بڑی تعداد میں کتابوں کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دیا۔ جن میں فیض میر، مجالس رنگین، دیوان فائز، رادھا کنہیا کا قصہ، اندر سبھا، فسانہ عبرت، تذکرہ گلشن سخن اور بزم سلیمان کافی اہم ہیں۔

فائز دہلوی کا شمار شمالی ہند کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف مختلف اصناف سخن غزل، قصیدہ اور مثنوی میں طبع آزمائی کی بلکہ ایک اہم دیوان بھی یادگار چھوڑا ہے۔ فائز دہلوی کا دیوان ایک مدت سے گمنام تھا پہلی مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب نے اردو دنیا سے متعارف کرایا۔ اور اس پر ایک عالمانہ مقدمہ تحریر کر کے شائع کیا۔ ادیب کے لکھے گئے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فائز دہلوی کو عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انہوں نے اپنی تحقیق سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ فائز شمالی ہند کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ رضوی نے مقدمہ میں فائز دہلوی کے حالات، تصانیف، کلام اور خاندان کے حالات کو جس طرح تلاش و تحقیق کے بعد لکھا ہے یہ اردو تحقیق کا گراں قدر کارنامہ ہے۔ انہوں نے اس تحقیق سے نہ صرف فائز دہلو کے حالات سے واقفیت کرایا بلکہ ان کے کلام کو دوبارہ زندگی بخش دی۔

میر تقی میر کا مختصر رسالہ 'فیض میر' مدتوں گمنام رہا جس کے ذکر سے اکثر تذکرے بھی خالی ہیں۔ البتہ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اور محسن نے اپنے تذکرہ 'سراپا سخن' میں اس رسالے کا ذکر کیا ہے مگر وہاں بھی کوئی تفصیل موجود نہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظروں سے یہ رسالہ نہیں گزرا۔ رضوی ادیب نے پہلی بار مرتب کر کے اسے شائع کیا۔ یہ رسالہ میر نے اپنے لڑکے فیض علی کے لیے لکھا تھا اس وجہ سے اس کا نام فیض میر رکھا گیا۔ 'فیض میر' میں پانچ فارسی حکایتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ ان حکایتوں میں فلسفہ الٰہیات کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ تصوف سے میر کی دلچسپی کا علم ہوتا ہے بلکہ میر کی شخصیت کا ایک اور پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہ حکایتیں میر

کی فارسی دانی ،فارسی اسلوب بیان اور انشا پردازی کا نمونہ بھی ہیں۔فیض میر کی تدوین رضوی ادیب کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ادیب کے لکھے گئے مقدمہ سے فیض میر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔انہوں نے نسخے کی تصحیح اور متن کی ترتیب بڑے سلیقہ سے پیش کیا ہے۔

سعادت یار خاں رنگین ریختی کے ممتاز شعرا میں ہیں ۔مجالس رنگین ان کی اہم کتاب ہے ۔مجالس رنگین ہندستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کے دوران شعرا و ادبا سے کی گئی دلچسپ گفتگو اور بحثوں کا مجموعہ ہے۔رنگین کی یہ کتاب 62 مجلسوں پر مشتمل ہے۔جس کی ترتیب وتدین کا کام سید مسعود حسن رضوی ادیب نے کیا ہے۔مقدمہ میں رنگین اور ان کی تصانیف کے متعلق ضروری معلومات تحریر کرنے کے ساتھ ساتھ رنگین کی تمام کتابوں کی فہرست بھی درج کی ہے۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب نے زیادہ اہم کام ڈرامہ اور مرثیہ پر کیا۔اردو ڈرامہ کی تحقیق پر ادیب کا نام سرفہرست ہے۔انہوں نے نہ صرف ڈراموں کی ترتیب وتدوین کا کام کیا بلکہ ڈراموں کے حوالے سے بعض غلط روایتوں کا بھی ازالہ کیا۔انہوں نے ہی یہ ثابت کیا کہ اردو کے پہلے ڈرامہ نگار واجد علی شاہ ہیں۔اس سے پہلے عام طور پر امانت کو پہلا ڈرامہ نگار کہا جاتا ہے۔

ڈرامے کے موضوع پر 'اردو ڈرامہ اور اسٹیج' رضوی ادیب کی اہم تحقیقی کتاب ہے۔یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔لکھنؤ کا شاہی اسٹیج اور عوامی اسٹیج ۔کتاب میں ڈرامہ کے فن، روایت اور ہندستانی اسٹیج کی روایت پر نہایت کارآمد تحقیق پیش کی ہے۔کتاب کے ابتدا میں 'پس منظر' کے عنوان سے ڈرامہ کی ابتدا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مغربی محققین نے اردو ڈرامہ کی ابتدا کا سہرا یونانیوں کے سر باندھا ہے جبکہ رضوی ادیب نے ڈرامے کی ابتدا کو ہندستان سے منسوب کیا ہے، جس کے ثبوت میں انہوں نے قدیم زمانے میں پیش کیے جانے والے ناٹکوں کو ڈرامے کی اولین شکل قرار دی ہے۔اس کتاب کی اشاعت سے قبل یہ خیال عام تھا کہ اردو کا پہلا ڈرامہ اندر سبھا اور امانت پہلے ڈرامہ نگار ہیں مگر رضوی ادیب نے تحقیق سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو کا پہلا ڈرامہ لکھنے، کھیلنے اور اردو ڈرامے کے لیے پہلا تھیٹر تعمیر کرنے کا شرف اودھ کے بادشاہ واجد علی شاہ کو حاصل ہے۔اندر سبھا کے حذف واضافہ کے ساتھ کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔اندر سبھا کا پہلا ایڈیشن مصنف کی شرح کے ساتھ شائع ہوا البتہ بعد کے کسی ایڈیشن میں شرح کو شامل نہیں کیا گیا۔رضوی ادیب نے رسالہ اردو (اپریل 1927) میں پہلی بار اس کی طرف متوجہ کیا۔ڈرامے کی تاریخ وتحقیق میں انہوں نے خود دلچسپی لی اور پھر تحقیق سے ثابت کیا کہ پہلے ڈرامہ نگار امانت کے نہیں واجد علی شاہ ہیں۔

'ایرانیوں کا مقدس ڈرامہ' ڈرامائی ادب کی اہم تحقیقی اور ادیب کی انتھک محنت کا نتیجہ ہے۔رضوی ادیب سے قبل کسی بھی ایرانی یا مغربی محقق نے اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی ۔انہوں اس موضوع پر لکھنے کے لیے

ہندستان، جرمنی، فرانسیسی، امریکہ، برطانیہ اور دیگر کئی ممالک کے مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کیا ان ماٰخذ کی فہرست بھی کتاب میں دی ہے جس سے انہوں نے استفادہ کیا ہے۔ اردو ڈرامہ کی تحقیق میں یہ کتاب منفرد اور اہم ہیں۔ اس کے علاوہ رضوی ادیب نے امانت کی اندر سبھا اور واجد علی شاہ کا ڈرامہ رادھا کنہیا کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دیا۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب کو مرثیہ سے خاص دلچسپی تھی۔ مرثیہ نگاروں میں انیس سے بے حد لگاؤ تھا۔ انہوں میر انیس کے حوالے سے کئی اہم کام کیے ہیں۔ روح انیس، رزم نامہ انیس، شاہکار انیس، شاعر اعظم انیس، اسلاف میر انیس ان کی اہم کتابیں ہیں۔ مرثیہ اور مراثی انیس کی تفہیم میں یہ کتابیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ مرثیہ پر لکھے گئے ان کے مضامین مراثی ریختہ، تاریخ مرثیہ کا ایک باب، دہلی میں مرثیہ گویوں کا آخری دور اردو مرثیہ کی تحقیق و تدوین کے سلسلے میں اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔

ان کی مستقل تحقیق و تنقیدی کتابوں کی تعداد کم و بیش تیس ہیں۔ جبکہ تنقیدی و تحقیقی مقالوں کی تعداد اسیکڑوں میں ہے۔ ان میں ایک بڑی تعداد شخصی مضامین کی بھی ہے۔ لسانیات زبان و قواعد پر بھی ان کے مقالات ہیں۔ میر انیس، مرزا غالب اور واجد علی شاہ پر سب سے زیادہ مقالات تحریر کیے ہیں۔ ڈارامہ، ناٹک، لکھنویات، ان کے مقالات کا اہم موضوع رہا ہے۔ ڈیڑھ سو سے رائد کتابوں پر تبصرے اور مقدمے بھی تحریر کیے۔ ان کے تحقیق مقالات میں 'حضرت میر کی اولاد، بکاولی اور گل بکاولی، آتش کا مذہب، مول چند کا شاہنامہ اردو، فارسی اور اردو کا ایک فرانسیسی ادیب و شاعر، شہید شاگرد ناسخ اور ان کا غیر مطبوعہ دیوان اور میر حسن کے بیٹے ان کے اہم تحقیق مقالات ہیں۔

نصیرالدین ہاشمی (1895-1964)

نصیرلدین ہاشمی کی شناخت بنیادی طور پر ایک دکنی محقق کی ہے۔ان کا شمار بلند پایہ ادیبوں اور نامور محققوں میں ہوتا ہے۔مخطوطہ شناسی اور قدیم قلمی کتابوں کی پرکھ پر انہیں خاص دسترس حاصل تھی۔مختلف موضوعات پر دو درجن سے زائد کتابیں ان سے منسوب ہیں۔البتہ ان کا خاص موضوع دکنی ادب کی تاریخ اور تحقیق رہا ہے۔دکن ادب کی بہت سی کتابوں کی انہوں نے بازیابی کی۔اردو کی سب سے پہلی مثنوی کدم راو پدم راو اور سب سے ضخیم مثنوی خاور نامہ کی بازیافت کا سہرا نصیر الدین ہاشمی کو حاصل ہے۔عورتوں کی اصلاح اور تعلیم نسواں کے بھی بڑے علمبردار تھے ۔خواتین کی خدمات کے حوالے سے بھی کئی کتابیں تحریر کیں۔اردو کی علاقائی تاریخ (دکن میں اردو) میں بھی انہیں اولیت حاصل ہے۔

نصیر الدین ہاشمی کا نام محمد عبدالباری تھا۔1895 میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔آپ کا تعلق علم پرور اور علم دوست گھرانے سے تھا۔ان کے اجداد نوائط خاندان سے تھے۔تبلیغ اسلام اور اشاعت علم کی غرض سے ہندستان تشریف لائے۔مختار الملک سالار جنگ اول کی خواہش پر ان کا خاندان 1869 میں حیدرآباد آباد ہوا۔ان کے والد مولوی عبدالقادر سررشتہ عدالت میں مجسٹریٹ اور پھر رجسٹرار بلدہ رہے۔نانا بھی نائب فینانس اور دیگر عہدوں پر فائز رہے۔دکن کی تاریخوں اور تذکروں میں آپ کے اجداد کا ذکر ملتا ہے۔

نصیرالدین ہاشمی نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔دارالعلوم حیدرآباد سے منشی اور مولوی کی سند لی۔معروف رباعی گو شاعر امجد حیدرآبادی کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔مدراس یونیورسٹی سے فاضل کا امتحان پاس کیا۔عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک تک کی تعلیم حاصل کی مزید تعلیم کے لیے انگلستان ،فرانس اور یورپ کے کئی دیگر ممالک کا سفر کیا۔ہنگامی انسپکٹر ،دفر دیوانی ومال، رجسٹرار بلدہ جیسے عہدوں پر ملازمت کر کے 1950 میں وظیفہ یاب ہوئے۔ملازم سے سبکدوشی کے بعد حیدرآبادی کی لائبریریوں میں بھی خدمات انجام دی۔1964 میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔

نصیرالدین ہاشمی نے مختلف موضوعات پر اہم علمی وادبی کتابیں تحریر کی۔جن میں دکن میں اردو، سلاطین دکن کی ہندستانی شاعری، حضرت امجد کی شاعری، مدارس میں اردو، مقالات ہاشمی، دکنی ہندو اور اردو، دکھنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین، یورپ میں دکھنی مخطوطات، قابل ذکر ہیں۔البتہ یہاں ان کی تحقیقی کاوشوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

دکن میں اردو نصیر الدین ہاشمی کی شاہکار تصنیف ہے۔جس میں دکن میں اردو زبان وادب کی ترویج وترقی کی تاریخ کو مفصل بیان کیا گیا ہے۔بہمنی عہد سے عہد آصفی تک شعرا وادبا کا تذکرہ موجود ہے۔پوری کتاب سات ادوار پر مشتمل ہے۔پہلے دور میں بہمنی عہد کے شعرا وادبا کا تذکرہ ہے۔دوسرے دور میں قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنت کی شعری وادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔یہ باب نہ صرف اس کتاب کے حوالے سے بلکہ اردو زبان کی

تاریخ کے حوالے سے بھی کافی اہم ہے اس عہد میں وجہی، نصرتی، غواصی، ابن نشاطی، قطب شاہی، عادل شاہی عالم اور علم دوست حکمرانوں کا تذکرہ ہے۔عہد بہمنی کے زوال کے بعد قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، اور برید شاہی سلطنتوں نے اردو زبان وادب کو جس طرح فروغ بخشا اور جن حکمرانوں نے عملی طور حصہ لیا ان کا مفصل اور مدلل انداز میں احاطہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اس دور میں جن اصناف کا وجود عمل میں آیا ان کا بھرپور بیان ہے۔

تیسرا عہد مغلیہ کے عنوان سے ہے جس میں عہد مغلیہ میں اردو زبان کے فروغ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ولی کے دیوان کا دہلی آنا اور پھر اردو زبان کا فروغ پانا کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اس عہد کے شعرا و ادبا کے حالات اور خدمات کا بھی تعارف پیش کیا ہے۔چوتھا دور عہد آصفیہ کے بیان میں ہے۔سلطنت آصفیہ میں گرچہ فارسی زبان کی زیادہ اہمیت تھی مگر اردو زبان کی خدمت کرنے والے بھی کم نہ تھے۔اردو زبان وادب کی تاریخ میں یہ عہد بھی کافی اہم ہے اس میں نہ صرف اردو کو فروغ ملا بلکہ اردو کی پہلی یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا قیام بھی عمل میں آیا۔نصیر الدین ہاشمی نے اس عہد میں مختلف حوالوں سے اردو زبان کی صورت حال کا بھرپور احاطہ کیا ہے۔پانچواں اور چھٹا باب بھی عہد آصفیہ کے بیان میں ہے اس باب میں اردو نظم ونثر میں ہونے والی تبدیلی اور اردو کے سرکاری زبان ہونے کا ذکر ہے۔آخری باب میں اردو زبان کے عروج وزوال کی داستان رقم کی گئی ہے۔جامعہ عثمانیہ بالخصوص شعبہ تالیف وترجمہ کی خدمات اور خواتین دکن کی خدمات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔کتاب کی ابتدا میں مختلف عنوانات کے تحت اردو زبان کی ابتدا اور نثر ونظم کی ابتدا کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے۔دکن میں اردو کے پیدا ہونے کا لسانی نظریہ نصیر الدین ہاشمی نے اسی کتاب میں پہلی بار پیش کیا۔کتاب کے مباحث کو سامنے رکھ کر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے نیز اردو کی پہلی علاقائی تاریخ بھی ہے جس کے بعد پنجاب میں اردو، بہار میں اردو اور دیگر علاقائی تاریخیں لکھی گئیں۔نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اردو میں ہندو شعرا و ادبا کی خدمات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔یہ بات اسی کتاب سے ثابت ہوتی ہے کہ حیدرآباد میں اردو کا سب سے پہلا اخبار (آصف الاخبار) نارائن راو نے جاری کیا تھا۔نصیر الدین ہاشمی کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے جو کچھ لکھا ہے مستند کتابوں سے لکھا ہے۔اگر چہ ابتدا میں میرا ارادہ ایک مختصر مضمون لکھنے کا تھا لیکن جب میں نے لکھنا شروع کیا تو مضمون طویل ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ ایک کتاب کی سی صورت ہوگئی۔'' 44

یورپ میں دکھنی مخطوطات نصیر الدین ہاشمی کا اہم تحقیقی اور حوالہ جاتی کارنامہ ہے۔اس میں یورپ کی مختلف لائبریریوں میں موجود دکنی مخطوطات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔نصیر الدین ہاشمی کو یورپ میں موجود دکنی مخطوطات کی اطلاع سب سے پہلے 'ماہنامہ معارف' سے ملی۔46 جس کے بعد 1928 میں جامعہ عثمانیہ کے وظیفہ پر وہ اس کام کی

تالیف کے لیے ایک سال کے لیے یورپ گئے۔ جہاں انہوں نے اسکاٹ لینڈ، پیرس اور انگلستان کی لائبریریوں سے مواد جمع کیا۔جن لائبریریوں سے انہوں نے استفادہ کیا ان میں کتب خانہ انڈیا آفس، کتب خانہ برٹش میوزیم، کتب خانہ آکفورڈ، کتب خانہ ایڈنبرا، کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی قابل ذکر ہیں۔ان مخطوطات میں درجنوں ایسے مخطوطات ہیں جن کا کوئی نسخہ ہندستان میں موجود نہیں ہے۔مثلا خاور نامہ، قطب مشتری، مثنوی اہل بیت اور مثنوی پدماوت۔انہیں بعض ایسے مخطوطات بھی ملے جن کے متعدد نسخے موجود ہیں، جن سے اختلافات معلوم کیے جاسکتے ہیں۔دیوان ولی کے پندرہ نسخے، گلشن عشق کے متعدد نسخے، پھول بن کے تین نسخے۔ایسے مخطوطات بھی موجود ہیں جن کا فارسی سے ترجمہ کیا گیا ہے جن کا اصل نسخہ یورپ کی لائبریریوں میں موجود ہے۔جن سے تصحیح کا کام لیا جاسکتا ہے۔بظاہر یہ کتاب یورپ میں موجود مخطوطات کی فہرست ہے لیکن اس میں بڑی تفصیل سے مخطوطات پر روشنی بھی ڈالی گئی ہے۔ ہندستان اور یورپ میں موجود مخطوطات کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ان مخطوطات کی دریافت سے صرف نئے پہلووں انکشاف نہیں ہوا بلکہ کئی غلط راویتوں کا ازالہ بھی ہوا۔کتاب کے شروع میں ایک پیش نامہ ہے جس میں دکن میں اردو کی ترویج واشاعت کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کی خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔کتاب کی تالیف اور وجہ تالیف کے حوالے سے بھی گفتگو کی گئی ہے۔مواد کی دستیابی اور ماخذ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔یورپ کے کتب خانوں کی فہرست کے تسامحات کی بھی نشاندہی کی ہے۔تحقیقی نقطہ نظر سے یہ کتاب بہت اہم ہے۔

کتب خانوں میں موجود مخطوطات کی وضاحتی فہرست کے حوالے سے نصرالدین ہاشمی نے کئی اہم کام کیے ہیں۔یورپ میں دکھنی مخطوطات کے علاوہ کتب خانہ سالار جنگ میوزیم کی بھی وضاحتی فہرست تیار کی ہے۔میوزیم میں موجود کتابوں کی تعداد بے شمار ہے جن میں ایک بڑا حصہ قدیم کتابوں اور مخطوطوں کا ہے۔جن تک پہنچنا، پڑھنا اور اس کے متعلق لکھنا بڑا مشکل کام تھا۔نصیرالدین ہاشمی جنھیں مخطوطہ شناسی میں دسترس حاصل ہے وہ نہ صرف قدیم سے قدیم کتابوں، درست متن بآسانی پڑھ لیتے ہیں بلکہ کاتب کی تحریر، روشنائی اور بادشاہوں کی مہروں پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست بھی دو جلدوں میں مرتب کی ہے۔کتب خانہ آصفیہ میں اس وقت تقریبا ڈیڑھ لاکھ کتابیں تھیں۔تحقیقی امور میں وضاحتی فہرست بہت اہم ہوتے ہیں بالخصوص ریسرچ اسکالر کے لیے کافی معاون ہوتی ہیں۔نصیرالدین ہاشمی نے کتب خانہ آصفیہ، عجائب خانہ حیدرآباد کی چودہ اور سینٹرل ریکارڈ آفس کی ۴۳ قلمی کتابوں وضاحتی فرست علاحدہ مرتب کی ہے۔نصیرالدین ہاشمی کی تحقیقی خدمات کے حوالے سے سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

> ''ادب کے گمشدہ کڑیوں کی بازیافت اور ادب کے ان جواہر پاروں کو منظر عام پر لانے جو مرور زمانہ کی گرد وغبار میں نظر سے اوجھل ہوگئے تھے،نصیرالدین ہاشمی نے جس محنت لگن، تحقیقی ذوق

وشوق اور شیفتگی سے کام کیا ہے اس کی مثال مشکل سے ہی ملتی ہے۔''46

خواتین ادب سے بھی انہیں غیر معمولی دلچسپی رہی ہے۔انہوں نے اس حوالے سے کئی اہم کام کیے۔وہ نہ صرف خواتین کی تعلیم ،معاشرے کی اصلاح کے فکر مند تھے بلکہ تحریک نسواں کے اہم رکن بھی تھے۔خواتین دکن کی خدمات پر انہوں نے کئی اہم کتابیں تحریر کیں۔'خواتین عہد عثمانی' میں خواتین کے پچیس سالہ ہمہ جہت ترقی کا تذکرہ ہے۔'خیابان نسواں' اس میں تعلیمی اصلاحی مضامین شامل ہیں ۔خواتین دکن کی اردو خدمات،اس میں خواتین کی شاعری،نثر نگاری اور صحافتی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔خواتین کے حالات کے ساتھ ساتھ ان کے نمونہ کلام کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ان خواتین میں ایک بڑی تعداد ہندو خواتین کی بھی ہے جنہوں نے مختلف حوالوں سے اردو ادب کی خدمات کی ہے جس پر نصیر الدین ہاشمی نے تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔'ملکہ حیات بخشی بیگم' نسائی ادب کے حوالے سے یہ کتاب بھی بہت اہم ہے۔

نصیر الدین ہاشمی کے تحقیقی مقالے ملک کے موقر رسائل میں شائع ہوئے ۔یہی مقالات 'مقالات ہاشمی' اور 'دکھنی کے چند تحقیقی مضامین' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے ۔مقالات ہاشمی دو جلدوں پر مشتمل ہے۔پہلی جلد میں ۲۴ تحقیقی وتنقیدی مضامین ہیں ۔ان مقالات میں 'بہمنی عہد کا ایک دکنی شاعر' جو معارف 1932 میں شائع ہوا۔جس میں پہلی بار مثنوی کدم راو پدم راو کی بازیافت ہوئی ۔اس سے قبل اردو دنیا اس مثنوی سے ناواقف تھی۔یہ مثنوی ناقص الطرفین ہے اس لیے مثنوی کا نام نہیں معلوم ہو سکا چونکہ اس میں مثنوی کدم راو پدم راو کا قصہ منظوم ہوا ہے اس مناسبت سے نصیر الدین ہاشمی نے اس کا نام مثنوی کدم راو پدم راو رکھا۔مثنوی نگار کا تخلص نظامی ہے انہوں نے تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ بہمنی عہد کا شاعر فخر دین نظامی ہے۔جمیل جالبی نے 1973 میں اپنے مبسوط مقدمہ کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا۔خاور ناہ دکنی معارف 1930 میں تین قسطوں میں شائع ہوا۔جس میں اردو کے باکمال شاعر کمال خاں رستمی کی مثنوی خاور نامہ جو اردو کی سب سے ضخیم مثنوی اور پہلی رزمیہ مثنوی بھی انڈیا آفس میں موجود اس کے واحد نسخے کی اطلاع دی گئی ہے۔نصیر الدین ہاشمی نے پہلی بار خاور نامہ سے متعارف کرایا۔شیخ چاند نے 1968 میں اپنے مقدمہ کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا۔مقالات ہاشمی کا ایک اور اہم مضمون 'سلطان علی عادل شاہ ثانی کا ہندستانی کلیات' معارف مئی 1933 میں شائع ہوا جس میں عادل شاہ کے اردو کلیات کے ایک نادر مخطوطے کی برہان پور میں موجودگی کی اطلاع دی گئی ہے۔جسے زینت ساجدہ نے 1962 میں مرتب کیا۔

'کتاب نورس' بھی ایک زمانے تک نایاب تھی اس زمانے کے لکھے گئے تذکرہ میں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کو موسیقی اور راگ راگنیوں سے بڑی دلچسپی تھی اور اس نے راگ راگنیوں پر مشتمل ایک کتاب ''کتاب نورس' مرتب کی تھی جو اب نایاب ہے۔کتاب نورس کا دیباچہ ملا ظہوری نے 'سہ نثر ظہوری' کے نام

سے لکھا تھا۔ جون 1932 میں نصیرالدین ہاشمی کا ایک مضمون ’عجائب خانہ حیدرآباد کا ایک نایاب دکھنی مخطوطہ‘ کے عنوان سے شائع ہوا جس میں ’کتاب نورس‘ کے تین مخطوطوں کی دریافت کی خبر دی گئی تھی اور ان مخطوطوں پر تفصیلی بحث بھی۔ اور پھر معارف ہی میں جولائی 1953 میں ڈاکٹر نذیر احمد کا ایک مضمون کتاب نورس کے متعلق شائع ہوا جس میں ’کتاب نورس‘ کے دس مخطوطوں کی بازیافت اور ان کا تقابل پیش کیا گیا تھا۔ جسے 1955 میں ڈاکٹر نذیر احمد نے کتابی شکل میں مرتب کر کے شائع کیا۔

جنوبی ہند کا علاقہ ارکاٹ جہاں ایک مدت تک والی جاہی سلطنت کا قیام رہا۔ والی جاہی خاندان کے بانی نواب انوارالدین خان اور ان کے چار فرزندوں نے 1163ھ سے 1258ھ تک اس علاقے پر حکمرانی کی۔ نواب والی جاہ اور ان کے فرزند بڑے علم دوست تھے۔ ان کے زمانے میں بڑے بڑے علماء، اطباء، شعرا و ادبا جمع تھے۔ جنہوں نے عربی، فارسی اور اردو میں بڑی تعداد میں کتابیں لکھیں۔ اس زمانے کی بیشتر کتابیں اب بھی دستیاب ہیں۔ ارکاٹ میں لکھی گئی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہے۔ معارف جولائی 1931 کے شمارے میں نصیرالدین ہاشمی کا مضمون ’یورپ میں ارکاٹ کے دکھنی مخطوطات‘ شائع ہوا جس میں پہلی بار یورپ کے کتب خانوں میں موجود ارکاٹ کے دکھنی مخطوطوں کی اطلاع دی گئی۔ مذکورہ مضمون کے مطالعہ سے ارکاٹ کے صاحب دیوان شاعر و ادیب مولانا محمد باقر آگاہ (1158ھ۔ 1220ھ) کی سوانح اور ان کی خدمات سے آگہی ہوتی ہے۔ باقر آگاہ تین سو تین کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے چودہ کتابیں اردو کی بھی ہیں۔ دس کتابیں یورپ کے کتب خانوں میں اب بھی موجود ہیں۔ جن میں سے ’ہشت بہشت، ریاض الجنان، محبوب القلوب اور تحفۂ احباب‘ برٹش میوزیم لندن میں اور تحفۃ النساء، رسالہ فرقہ ہائے اسلام، ہدایت نامہ، معراج نامہ اور رسالہ عقائد کے مخطوطات پیرس میوزیم کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ’مثنوی گلزار عشق عرف قصہ رضوان شاہ و روح افزا‘ آکسفورڈ یونی ورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ یورپ کے کتب خانوں کے علاوہ باقر آگاہ کی بقیہ چھ کتابیں ’دیوان اردو، روضۃ السلام، ریاض السیر، خمسہ متحیرہ، مثنوی روپ سنگار اور فرائد در عقائد‘ ہیں۔ سلطنت والی جاہی کا ایک اور مصنف مولانا غوث شرف الملک جو 31 کتابوں کے مصنف ہیں۔ اردو میں صرف ایک کتاب ’ترجمہ کیدانی یا فقہ حنفی‘ ہے۔ اس کے علاوہ اردو کی ایک طویل مثنوی ’چہار گلشن‘ جس کے مصنف سرشار ہیں کا بھی مخطوطہ یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہے۔[47]

اس کے علاوہ کئی اہم مقالات مشمولات کا حصہ ہیں۔ جن میں ولی کا غیر مطبوعہ کلام، نورس ابراہیم عادل شاہ ثانی، انڈیا آفس کے کیٹلاگ میں دکنی مخطوطات کی فروگزاشتیں، کیمبرج میں ہندستانی مخطوطات کی فہرست، پیرس کے ہندستان مخطوطات کی فہرست قابل ذکر ہیں۔

'دکھنی ہندواوراردو'اس کتاب میں ان ہندو شعرا وادبا کو موضوع بنایا گیا ہے جنہوں دکنی ادب کی خدمت کی۔
ایسے ادبا کی ایک بڑی تعداد ہے اس میں ایک بڑی تعداد ہندو خواتین کی بھی ہے۔دکھنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین 1963 میں شائع ہوئی۔دکنی ادب کی تحقیق وتنقید کے حوالے سے ۱۹ اہم مقالات شامل ہیں۔یہ مقالات کئی اہم پہلوؤں اور نئے گوشوں سے متعارف کرواتے ہیں۔کئی غلط روایتوں کا الزالہ بھی کرتے ہیں۔دکنی ادب کے حوالے نصیرالدین ہاشمی کے یہ مقالات اہمیت کے حامل ہیں اور دکنی تحقیق میں اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قاضی عبدالودود(1896۔1984)

قاضی عبدالودود اردو تحقیق کے ان بنیاد گزاروں میں سے ہیں جنہوں نے ادبی تحقیق کے اصول وضع کیے۔ اس کی صحیح تعریف کا تعین نیز غلط روایات کا ازالہ بھی کیا۔ادبی تسامحات پر گرفت کر کے اردو تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کی سعی کی۔قاضی صاحب نے ادبی تحقیق پر باضابطہ کوئی کتاب نہیں لکھی البتہ شعرا و ادبا کی سوانح،قدما کے کارناموں کا احتساب اور معاصرین کی خامیوں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ کتابوں پر تحقیقی تبصرے اور تحقیقی مقالے لکھے جس کی حیثیت کسی کتاب سے کم نہیں ہے۔غالب پر بھی انہوں نے اہم تحقیقی خدمات انجام دی'غالب بحثیت محقق' تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''قاضی عبدالودود صاحب کو اردو میں تحقیق کا معلم ثانی کہنا چاہیے۔میرا خیال ہے کہ نئی نسل تحقیق کے آداب اور انداز سے قاضی صاحب کے توسط سے آشنا ہوئی ہے،پچھلے پچیس تیس برسوں میں احتیاط پسندی کا جو رجحان بڑھا ہے،شک کرنے یا یوں کہیے کہ مضبوط دلیلوں کے بغیر دعووں کو قبول نہ کرنے کا انداز جس طرح فروغ پذیر ہوا ہے اور منفی استدلال نے جس طرح اہمیت حاصل کی ہے۔دوسرے لفظوں میں زودیقینی اور خوش اعتقادی نے جس طرح کم اختیاری کی سند پائی ہے،اس میں قاضی صاحب کی تحریروں کا بڑا حصہ ہے۔ان کی بے لچک شخصیت،ان کے بے جھجھک انداز گفتگو اور ان کے سخت گیر احتساب نے،اس زمانے میں تحقیق کے طالب علموں کی ذہنی تربیت کی ہے۔اور ان کی تحریروں نے یہ بتایا کہ تحقیق کی زبان اور پیرائے اظہار میں انشاء پردازی،مرصع کاری اور الفاظ کے بے محابا استعمال کی مطلق گنجائش نہیں۔''48

قاضی عبدالودود کا مطالعہ کافی وسیع اور نظر بہت گہری تھی۔انہوں نے خواجہ احمد فاروقی کی کتاب میر تقی میر حیات اور شاعری،نورالحسن ہاشمی کی دلی کا دبستان شاعری،ابواللیث صدیقی کی 'لکھنؤ کا دبستان شاعری،اختر اور ینوی کی 'بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا' اور شاد کی خودنوشت 'شاد کی کہانی شاد کی زبانی' پر اعتراضات کے علاوہ بہت سی تسامحات کی گرفت کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہیں اردو تحقیق کا معلم ثانی اور بت شکن محقق تسلیم کیا جاتا ہے۔تحقیقی نقطہ نظر سے ان کے مضامین،مقالات،تبصرے اور مدونہ کارنامے کافی اہم ہیں۔انہوں نے اپنی تحقیق سے جو اضافہ کیے ہیں ان کی حیثیت اثاثہ کی ہے۔یوں تو ان کے تحقیقی کارناموں کا دائرہ کافی وسیع ہے البتہ یہاں ان کے اہم کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

'عیارستان' قاضی عبدالودود کے تبصروں کا مجموعہ ہے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے تھے۔اس میں تین اہم کتابوں پر تفصیلی تبصرہ ہے۔جس میں مسعود حسن رضوی ادیب کی مرتبہ کتاب دیوان فائز،رام بابو سکسینہ کی ترتیب کردہ مرقع شعرا اور خواجہ احمد فاروقی کی کتاب میر تقی میر حیات اور شاعری شامل ہیں۔ان تبصروں کی حیثیت تحقیقی

ہے۔دیوان فائز میں انہوں نے نہ صرف یہ کہ مسعود حسن رضوی ادیب کی تسامحات کی نشاندہی کی ہے بلکہ قابل قدر اضافہ بھی کیے ہیں۔مثلاً مقدمہ میں فائز کی پیدائش اور سال وفات کا ذکر نہیں تھا انہوں نے متعدد حوالوں سے اس کا تعین کیا۔تاریخ محمدی کی مدد سے ان کے والد کا نام محمد خلیل اور سال وفات کا ضافہ کیا۔تذکرہ السلاطین کی مدد سے ان کے دو بھائیوں کا نام بھی تلاش کیا۔غرض قاضی عبدالودود نے فائز کے بہت سے گمنام پہلوؤں کی نہ صرف دریافت کر قابل قدر اضافہ کیے بلکہ کتاب میں موجود بہت سی خامیوں اور کوتاہیوں کی بھی نشاندہی کی۔

دوسرا تبصرہ مرقع شعرا ہے۔جو ایک طرح کا تذکرہ ہے،جس میں رام بابو سکسینہ نے دس شعرا کے حالات اور کلام کو جمع کیا ہے اور ساتھ ہی ان شعرا کی تصاویر بھی شامل کی گئی ہے۔قاضی عبدالودود نے شعرا کے حالات اور ان کے متعلق تاریخ کو مشکوک قرار دیا ہے۔تحقیقی اعتبار سے یہ تبصرہ بھی منفرد اور اہم ہے۔عیارستان کا تیسرا تبصرہ خواجہ احمد فاروقی کی کتاب میر تقی میر حیات اور شاعری پر ہے۔جو کافی اہم اور طویل ہے تقریباً ایک سو پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔انہوں نے اس کتاب کا سخت محاسبہ کیا ہے اور کئی اہم پہلوؤں پر اعتراض کیا ہے۔کتاب کی ترتیب،طریقہ کار اور ماخذ پر بھی سوال قائم کیے ہیں۔مزید ان کے بہت سے دعووں کو مسترد کر دیا ہے۔

'اشتر و سوزن' قاضی عبدالودود کا دوسرا اہم تبصروں کا مجموعہ ہے جو 1994 میں شائع ہوا۔اس میں عمدہ منتخبہ تذکرہ سرور اور شاد کی خود نوشت شاد کی کہانی شاد کی زبانی پر مفصل تحقیقی تبصرہ شامل ہے۔عمدہ منتخبہ تذکرہ سرور کو خواجہ احمد فاروقی نے لندن کے واحد نسخہ کو بنیاد بنا کر اسے مرتب کیا۔قاضی عبدالودود نے چار اہم نسخوں کی مدد سے اس کا موازنہ کیا ہے اور بہت ساری غلطیوں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ شعرا کے اشعار کی تعداد اور ان سے منسوب اشعار کی طرف توجہ دلائی ہے۔اشاریہ،حواشی اور دیگر ضروری امور میں بھی جدید اصول کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔دوسرا تبصرہ شاد عظیم آبادی کی خود نوشت پر ہے۔یہ تبصرہ قاضی صاحب کے اہم تبصروں میں سے ایک ہے۔قاضی عبدالودود شاد کو بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں البتہ ان کی خود نوشت کے بعض پہلوؤں سے انہیں اعتراض ہے۔ان کے نزدیک خود نوشت میں جا بجا خود ستائی سے کام لیا گیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''کہانی میں ایسی باتیں جن سے شاد اور ان کے بزرگوں کی بڑائی اور مخالفین کی برائی ظاہر ہوں بہت ہیں۔ایسے واقعات جن میں اپنی تعریف نکلتی ہو سچے بھی ہوں انہیں بیان کرنے میں احتمال رہتا ہے کہ لوگ انہیں باور نہ کریں...مرتب سے بہتر راوی شاد کو کون مل سکتا تھا۔''49

ان کے علاوہ قاضی عبدالودود نے سیکڑوں تبصرے لکھے جو تبصرے کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔اختر اورینوی کی کتاب' بہار میں اردو زبان کا ارتقا 1857 تک'،ڈاکٹر سید حسنین کی کتاب مرزا محمد علی فدوی،ڈاکٹر مختار احمد کی مدونہ کتاب مثنویات راسخ اور سید احمد دہلوی کی چار جلدوں پر مشتمل لغت فرہنگ آصفیہ پر

قاضی صاحب نے تفصیلی تبصرہ لکھا ہے۔ان تبصروں میں انہوں نے متعدد غلطیوں کی نشاندہی کی ہے ۔تحقیقی نقطہ نظر سے یہ تبصرے کافی اہم ہیں۔قاضی صاحب نے تاریخ ادبیات اردو، چھان بین، دیوان یقین، لغات گجری، دیوان عزلت، دہلی کا دبستان شاعری، لکھنؤ کا دبستان شاعری، دیوان تاباں پر تبصرے کیے ہیں۔ان تمام کتابوں پر تبصرے میں قاضی صاحب نے بڑی عرق ریزی اور تحقیق درک کا ثبوت دیا ہے۔قاضی عبدالودود کی تبصرہ نگاری کا اندازہ رشید حسن خاں کے ان خیالات سے بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

''اگر کوئی اچھا طالب علم قاضی صاحب کے لکھے ہوئے تبصروں کو اچھی طرح پڑھ لے تو اس کی ادبی تحقیق کے اصولوں کا اور اس کے طریقہ کار کا عملی طور پر علم وعرفان حاصل ہوگا۔ہم جب یہ کہتے ہیں کہ نئی نسل قاضی صاحب کے واسطے سے تحقیق کے آداب واصول سے آسانی ہوئی ہے تو ہمارا مطلب یہی ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے مختلف اہم کتابوں پر اس طرح نظر ڈالی ہے کہ عملی تحقیق کے سارے گوشے روشن ہوگئے ہیں۔یہ تبصرے جہاں ایک طرف تحقیق کے اصولوں کا اور طریقہ کار کا عرفان بخشتے ہیں وہاں ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کے لیے شرائط کیا ہیں اور کس طرح کے لوگ تحقیق نہیں کرسکتے۔یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ احتیاط، معیار اور راست گوئی جیسے الفاظ کے صحیح معنی کیا ہیں ۔شیرانی صاحب سے جس روایت کا آغاز ہوا تھا قاضی صاحب نے متعدد اضافوں کے ساتھ اس کی توسیع کی۔اس فرق کے ساتھ کی شیرانی صاحب کی توجہ کا بڑا حصہ فارسی ادب کا پر صرف ہوا تھا۔اس کے مقابلے میں قاضی صاحب کی بیشتر نگارشات کا تعلق اردو زبان اور ادب سے ہے۔''50

علاوہ قاضی عبدالودود کی تحقیقی خدمات کا ایک بڑا حصہ تدوین متن پر مشتمل ہے۔انہوں نے کئی اہم کتابوں کی تدوین کی ان پر تفصیلی مقدمہ لکھے حاشیہ اور حوالوں سے ان کتابوں کو دوبارہ زندہ کیا۔جن میں دیوان جوشش 1941، دیوان رضا عظیم آبادی 1959، تذکرہ شعرا مصنفہ ابن امین اللہ طوفان 1945، تذکرہ مسرت افزا از امراللہ الہ آبادی 1954، قطعات دلدار 1959، آشوب قلق 1960 کافی اہم ہیں۔اس کے علاوہ کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جن کی ترتیب وتصحیح کا کام قاضی صاحب نے کیا البتہ اس پر کوئی مقدمہ نہیں تحریر کیا مثلا کلام شاد 1923، شاہ کمال علی کمال کا کلام 1942، مثنوی مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق، گلزار نسیم اور مثنویات شاد 1958، ارمغان بہار 1962 وغیرہ۔

قاضی عبدالودود نے بعض ممتاز ادیبوں اور محققوں کے علمی کارناموں پر بھی قلم اٹھایا ہے۔جس میں محمد حسین آزاد اور مولوی عبدالحق کی تحقیقی وتدوینی خدمات کا محاسبہ کیا گیا ہے۔محمد حسین آزاد کی آب حیات سے متعلق دو مضامین 'آب حیات کے دو ماخذ' اور 'آب حیات اور طبقات الشعرا' کے عنوان سے لکھے جو معاصر میں مئی 1951 اور دسمبر 1953 میں شائع ہوئے۔ان دونوں مضامین میں قاضی صاحب نے شیرانی کے مضمون 'تنقید آب حیات' کے

حوالے سے آب حیات کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔متعدد جگہوں پر آزاد کی تسامحات کی نشاندہی کی ہے ۔مثلاً آب حیات میں مذکور حکاتوں کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں محمد حسین آزاد کا اختر ع ہے۔شعرا سے منسوب اشعار بھی درست نہیں ہیں ۔قاضی صاحب نے منسوب اشعار کے اصل شعرا کی نشاندہی کی ہے۔آب حیات کے متعدد ایڈیشنوں کے تضادات کی بھی نشاندہی کی ہے۔

قاضی صاحب کا ایک مضمون 'آزاد بحیثیت محقق' نوائے ادب ممبئی تین قسطوں میں شائع ہوا۔ جسے بعد میں کتابی شکل میں ادارہ تحقیقات پٹنہ نے 1984 میں شائع کیا۔ان مضامین میں محمد حسین آزاد کے تحقیقی تسامحات پر گرفت کی گئی ہے۔محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ فارسی میں وحشی یا فغاں اور اردو میں میر واسوخت کے موجد ہیں ۔ قاضی صاحب کا کہنا ہے کہ فارسی میں واسوخت کوئی مستقل صنف ہی نہیں ہے ۔اسی طرح آزاد کے مرتبہ دیوان ذوق میں حافظ شیرانی نے چودہ غزلوں کو خود آزاد کی قرار دی ہے ۔قاضی صاحب کا اس سلسلے میں کہنا ہے کہ ان غزلوں کے علاوہ اور بھی کلام ان کا ہو تو عجب نہیں ۔اس کے علاوہ سخندان فارس، نگارستان فارس، کی غلطیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔

'عبدالحق بحیثیت محقق' قاضی عبدالودود کا اہم تحقیقی مقالہ ہے۔ جو 1958 تا 1959 معاصر میں تین قسطوں میں شائع ہوا۔ بعد میں یہی مقالہ خدا بخش لائبریری پٹنہ سے 1995 میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔اس مقالہ کا بڑا حصہ میر کی زندگی، شخصیت اور کلام سے متعلق ہے۔پہلی قسط میں مولوی عبدالحق کی جن مرتبہ کتابوں کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے ان میں ذکر میر، انتخاب کلام میر، نکات الشعرا، گلشن ہند، خطبات گارساں دتاسی، اور عقد ثریا شامل ہیں ۔جبکہ دوسری جلد میں تتمہ تبصرہ ذکر میر، انتخاب کلام میر، دیوان تاباں، وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔تیسری قسط میں بھی انہیں کتابوں پر بحث کی گئی ہے۔قاضی صاحب نے ذکر میر مرتبہ عبدالحق میں 33 غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔انتخاب کلام میر کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولوی عبدالحق نے کلیات میر کے کس نسخے سے اشعار کا انتخاب کیا ہے اس کی وضاحت نہیں کی ہے اور معیاری اشعار کے بجائے کمتر درجہ کے اشعار کا بھی انتخاب کیا گیا ہے۔قاضی صاحب نے نکات الشعرا کے زمانہ تصنیف، سال آغاز اور اختتام کی نشاندہی کی ہے اس کے علاوہ اردو فارسی مفردات اور مرکبات کی سولہ صفحات پر ایک فہرست تیار کی ہے جو مولوی عبدالحق کے مرتب نسخہ میں نہیں ہے ۔اس کے علاوہ عبدالحق کی مرتبہ گلشن ہند، عقد ثریا، خطبات گارساں دتاسی، اور دیگر کتابوں کی تسامحات کی نشاندہی کی ہے۔

قاضی عبدالودود کی ایک حیثیت ماہر غالبیات کی ہے۔غالب تحقیق کے حوالے سے ان کی خدمات اہم ہیں۔عمر کا ایک بڑا حصہ غالب تحقیق میں گزارا۔غالب کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کے باوجود ان کی کوتاہیوں اور کمزیوں کی گرفت بھی سختی سے کی ہے۔غالب کے حوالے سے قاضی صاحب کی جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں 'کچھ

غالب کے بارے میں، جہان غالب، غالب بحیثیت محقق،اور ماثر غالب غالب شناسی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔غالب کے استاد عبدالصمد کے سلسلے میں محققین غالب میں کافی اختلافی بحث رہی۔قاضی صاحب نے تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ عبدالصمد مرزا غالب کے تخیل کی پیداوار ہے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔قاضی صاحب کتابوں کے علاوہ غالب پر تین درجن سے زائد مضامین لکھے۔جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ان مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے غالب کی زندگی کے بعض گمنام پہلوؤں کو ہی نہیں اجاگر کیا ہے بلکہ انہوں نے مطالعہ غالب کا معروضی انداز میں محاسبہ بھی کیا ہے۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی (1905-1981)

اردو تحقیق کے چند اہم ستونوں میں سے ایک امتیاز علی خاں عرشی ہیں۔انہوں نے پوری زندگی تحقیق وتدوین میں گزاری اور اس میدان میں گراں قدر کارنامے انجام دیے۔تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ مضامین اور مقالے بھی لکھے۔شاعر کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔عرشی کا شمار ماہرین غالبیات میں کیا جاتا ہے۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی ولادت 1905 میں رامپور میں ہوئی۔مدرسہ مطلع العلوم میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1922 میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی کی سند حاصل کی جبکہ اورینٹل کالج سے فاضل کا امتحان پاس کیا۔ملازمت بھی کی تو علم وادب سے وابستہ رہے۔انہیں انگریزی،عربی،فارسی اور اردو زبان پر عبور حاصل تھا۔ان کی علمی لیاقت کو دیکھتے ہوئے 1932 میں کتب خانہ رامپور کا ناظم مقرر کیا گیا۔اور آخری عمر تک اسی کتب خانہ سے وابسطہ رہے 1981 میں انتقال کیا۔

امتیاز علی عرشی نے عربی،فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ان کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو تحقیق وتدوین کے آداب رموز سے آشنا کیا،تحشیہ وتدوین کا معیار قائم کیا اور اپنی تحقیق صلاحیتوں سے اردو ادب کو بیش بہا تصانیف سے روشناس کرایا۔ان کی تحقیق وتدوین نو واردین تحقیق کے لیے رہنما ہے نیز تحقیق کے فن واصول سے آگاہی بخشتی ہے۔بہت سی اہم کتابیں جو طاق نسیاں اور کتب خانوں کے ردی میں پڑی بوسیدہ ہورہی تھیں عرشی نے انہیں دوبارہ زندگی عطا کی اور اردو تحقیق وتدوین کو اعتبار بخشا۔

تحقیق میں امتیاز علی خاں عرشی کا خاص کارنامہ ان کی قابل قدر تدوین وترتیب ہے۔تصحیح متن،اختلاف نسخ، حوالوں کی جانچ پڑتال،جعلی نسخوں کی پرکھ اور تحقیق کے مواد کی فراہمی کا ان کے یہاں ایک خاص سلیقہ موجود ہے۔ان کے اندر کام کرنے کی ایک لگن تھی۔نادر ونایاب چیزوں کی تلاش اور اسے از سرے نو ترتیب دینا ان کے اندر ایک خاص ملکہ تھا۔ان کے تحقیقی وتدوینی کاموں کے لمبی فہرست ہے البتہ یہاں ان کے اہم کارناموں کا جائزہ لیا جاتا ہے تا کہ ان کے تحقیقی ذوق کا اندازہ ہو سکے۔

امتیاز علی عرشی کے اہم کارناموں میں مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کے اردو،فارسی اور ہندی کلام کی تدوین ہے۔انہوں نے ان کے کلام کو جمع کیا اور اس پر مبسوط اور عالمانہ مقدمہ لکھ کر 'نادرات شاہی' کے نام سے شائع کیا۔ امتیاز علی خاں عرشی نے متعدد کتابوں کی مدد سے شاہ عالم ثانی کے حالات جمع کیے اور اس طرح انہوں نے نہ صرف شاہ

عالم ثانی کے کلام کو لوگوں تک پہنچایا بلکہ تلاش وتحقیق سے ان کے حالات اوران کی شعری لیاقت سے بھی لوگوں کو روشناس کرایا۔

انشاء اللہ خاں انشا کی بے نقط کہانی ' سلک گہر ' کی ترتیب وتدوین کا کام بھی عرشی نے کیا۔جس کا ایک نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں ملا تھا جس پر انہوں نے ایک عالمانہ مقدمہ تحریر کر کے شائع کر دیا۔سید احمد علی یکتا کی ' دستور الفصاحت ' عارف کندھاری کی ' تاریخ اکبری '، تاریخ محمدی، محاورات بیگمات، وقائع عالم شاہی اور امام سفیان ثوری کی تفسیر کو مرتب کر کے شائع کیا۔

امتیاز علی خاں عرشی کو ماہر غالبیات کے طور بھی یاد کیا جاتا ہے۔انہوں نے غالب کے حوالے سے کئی بڑے اہم کام انجام دیے اور غالب شناسی کی راوایت میں نت نئے اضافے کیے ہیں۔غالب کے وہ خطوط جو نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کے نام لکھے گئے تھے کتب خانہ رامپور میں پڑے ہوئے تھے۔عرشی نے انہیں تلاش کیا اور اس پر طویل مقدمہ لکھ کر مکاتیب غالب کے نام سے 1937 میں شائع کیا۔غالب کا منتخب کلام جو کم یاب تھا رضا لائبریری رامپور میں ایک مدت سے پڑا ہوا تھا انہوں نے انتخاب کلام غالب کے نام سے شائع کیا۔اس کا مقدمہ بھی علم وادب کے شائقین کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

غالبیات کے حوالے سے ان کا سب سے اہم کام دیوان غالب کی تدوین وترتیب ہے۔جس میں غالب کے تمام کلام کو جمع کیا گیا ہے۔اس دیوان کی خاص بات یہ ہے کہ اسے تاریخی ترتیب سے جمع کیا گیا ہے۔عرشی کا لکھا ہوا 72 صفحات کا مقدمہ کافی اہم ہے۔اس میں ایسی نادر ونایاب معلومات کو یکجا کیا گیا ہے جس سے ہم ناواقف تھے۔اس کے علاوہ بھی انہوں نے غالبیات کے حوالے سے کئی اہم کام کیے ہیں۔

امتیاز علی خاں عرشی نے کثیر تعداد میں علمی وتحقیقی مقالات ومضامین لکھے۔ان کے مقالات کا ایک مجموعہ مقالات عرشی کے نام سے 1970 میں شائع ہوا۔ان مقالات کے مطالعہ سے علمی لیاقت اور تحقیقی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔مختصر یوں کہ امتیاز علی خاں عرشی ایک اچھے محقق، نقاد اور مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی تھے انہوں نے علم وادب کے حوالے سے جو بھی کام کیے ہیں انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ امتیاز علی خاں عرشی کی علمی کارناموں کی وقعت کا اندازہ رشید حسن خاں کے اس اقتباس سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اردو میں جس طرح ادبی تحقیق کی روایت ساز شیرانی صاحب ہیں،اسی طرح تدوین کی

روایت اپنی معیاری اور مثالی شکل امتیاز علی خاں عرشی کی مرہون ہے۔عرشی صاحب نے جو کام کیے ان کاموں نے تدوین کے اصول کو اور طریقہ کار کو روشناس کرایا۔ان کی مرتبہ کتابوں میں مکاتیب غالب، دستور الفصاحت ،تاریخ محمدی اور دیوان غالب یہ کتابیں معیاری اور مثالی حیثیت رکھتی ہیں۔'' 51ؔ

امتیاز علی خاں عرشی نے تحقیق کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی۔انہوں نے نہ صرف یہ اپنی ادبی تحقیق کے معیار کو بلند کیا بلکہ کئی اہم کتابوں کی تدوین کر کے انہیں ضائع ہونے سے بچالیا۔غالب کے حوالے سے ان کی تحقیق وتدوین اہم کارنامہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی انہیں اردو تحقیق کے اہم ستون کے طور پر جانا جاتا ہے۔

مالک رام(1906-1993)

مالک رام کا شمار اردو کے معتبر محققوں اور ماہر غالبیات میں ہوتا ہے۔بحیثیت خاکہ نگار،انشا پرداز، صحافی،تبصرہ نگاراور مترجم کے بھی انہوں نے غیر معمولی خدمات انجام دی۔اسلامیات سے بھی انہیں گہری دلچسپی رہی ہے۔انہوں نے اپنی تصانیف وتالیفات سے اردو ادب میں غیر معمولی اضافہ کیے۔ان کی بعض کتابیں متنی کاوشوں کا بہترین نمونہ ہیں۔ان سے کم وبیش پچاسوں کتابیں منسوب ہیں البتہ یہاں ان کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن تعلق تحقیق وتدوین سے ہے۔

'تذکرہ معاصرین' مالک رام کے اہم تحقیقی کارناموں میں سے ایک ہے جو چار جلدوں پر مشتمل 219ادیبوں کا تذکرہ ہے۔اس تذکرے کی خاص بات یہ ہے کہ مروجہ تذکرہ نگاری کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے اس میں صرف شعرا کو شامل نہیں کیا گیا ہے بلکہ تمام اصناف سے تعلق رکھنے والوں کو جگہ دی گئی ہے۔اس میں معروف شعرا وادبا کے ساتھ ساتھ غیر معروف شعرا وادبا کا بھی تذکرہ ہے۔بعض ایسے ادیبوں کے حالات بھی رقم کیے ہیں جس کے بارے میں بمشکل ہی کہیں اور ملتا ہے۔غرض یہ ہے کہ تذکرہ معاصرین آنے والی نسل کے لیے ایک اہم ماخذ ثابت ہوگا۔اس کے ذریعہ انہوں بڑی تعداد میں شعرا وادبا کے سوانحی حالات اور ان کے کلام کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔

مالک رام کو مولانا آزاد اور غالب سے بڑی عقیدت ومحبت تھی۔یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ کام انہوں نے ان شخصیات پر کیا ہے البتہ ان کی بنیادی شناخت ماہر غالبیات کی ہے۔غالب کا مطالعہ کرنے میں انہوں عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کیا ہے۔اور کئی یادگار تصانیف چھوڑی ہیں۔مالک رام کا غالبیات کے حوالے سے پہلی اور اہم تصنیف 'ذکر غالب' ہے۔جس میں انہوں غالب کے مستند حالات بڑی تفصیل سے رقم کیے ہیں۔یہ غالب کی اہم سوانحی کتابوں میں سے ایک ہے۔اسے بڑی تلاش وتحقیق کے بعد لکھا گیا ہے۔نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''جناب مالک رام جو نصف صدی سے اردو ادب کی خدمت کررہے ہیں۔ممتاز ماہر غالبیات ہیں۔اگر انہوں نے اور کچھ نہ کیا ہوتا اور صرف ذکر غالب ان کے پاس ہوتی تب بھی وہ ہماری ادبی تاریخ میں ہمیشہ یادر کھے جاتے۔اس لیے کہ ذکر غالب سے زیادہ جامع محیط اور مستند سوانح عمری دوسری نہیں لکھی گئی۔''52

'فسانہ غالب'(1977)غالب پر لکھے گئے ملک رام کے پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے۔اس کا پہلا مضمون 'توقیت غالب ہے' جس میں 1750 سے 1880 تک کے احوال واشخاص اور واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔جو غالب سے متعلق ہے۔تحقیقی نقطہ نظر سے یہ مضمون بہت اہم ہے۔اسی طرح دوسرے مضمون غالب کی تاریخ ولادت پر

مدلل گفتگو کی گئی ہے۔مشمولات میں ایک مضمون غالب کے استاد کے حوالے سے ہے جو کافی تحقیقی نوعیت ہے۔غرض یہ ہے کہ فسانہ غالب میں شامل مضامین نہ صرف غالب تحقیق کے حوالے سے اہم ہیں بلکہ ادبی تحقیق کا بھی عمدہ نمونہ ہیں۔

تلامذہ غالب مالک رام کی اہم کتابوں میں سے ایک ہے جسے بڑی تحقیق وتلاش کے بعد لکھا گیا ہے۔اس میں غالب کے ایک سو اکیاسی شاگردوں کا تذکرہ ہے۔جس میں ان کے احوال کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کو بھی شامل کیا گیا ہے۔مالک رام نے تلاش جستجو اور ایک مدت کی محنت شاقہ کے بعد اس کو ترتیب دیا ہے۔اور بہت سے شاگرد جو گمنامی کی زندگی میں تھے ان کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔غالب کے حوالے سے مالک رام کی ایک اور اہم کتاب گل رعنا کی ترتیب و تدوین ہے۔یہ غالب کے اردو، فارسی کلام کا انتخاب ہے جسے غالب نے کلکتہ کے قیام کے دوران مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر ترتیب دیا تھا۔مالک رام نے ایک جامع اور عالمانہ مقدمہ لکھ کر 1970 میں شائع کیا۔مالک رام کے ترتیب وتدوین متن کا عمدہ نمونہ ہے۔

دیوان غالب مدونہ مالک رام جو غالب کی صد سالہ تقریب کے موقع پر پیش کیا گیا تھا، دیوان غالب کا پہلا تحقیقی اڈیشن ہے۔قاضی عبدالودود نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کئی تسامحات کی نشاندہی کی ہے۔مالک رام نے دیوان غالب کی ترتیب میں صحت متن پر خاص توجہ دی ہے۔غالب اور کلام غالب کے حوالے سے کافی عالمانہ مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔اس کے علاوہ مالک رام نے غالب کے حوالے سے کئی اہم تحقیقی کام کیے ہیں گفتار غالب، دیوان غالب، خطوط غالب اور مجموعہ سبد چیں کافی اہم ہیں۔

مالک رام نے مولانا آزاد کی بھی کئی اہم تصانیف کی تدوین وتحقیق کا کام کیا ہے جس میں غبار خاطر، تذکرہ اور خطبات آزاد شامل ہے۔غبار خاطر مالک رام کے اہم تدوینی کتابوں میں سے ایک ہے۔انہوں نے صحت متن اور حوالوں وحواشی کا خاص خیال رکھا ہے۔

مالک رام نے تحقیقی وتدوینی کتابوں کے علاوہ بڑی تعداد میں تحقیقی وتنقیدی مضامین ومقالات بھی تحریر کیے ہیں جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ان کے مقالات میں 'اردو میں تحقیق' کافی اہم ہے۔جو آل انڈیا اورینٹل کانفرس اجلاس علی گڑھ کی صدارت کے موقع پر پیش کیا گیا تھا۔کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔یہ مقالہ 29 صفحات پر مشتمل ہے۔اور کافی اہم ہے۔اس میں ادبی تحقیق اور اس کی روایت پر دلچسپ گفتگو کی گئی ہے۔اس کے علاوہ کئی اہم محققین کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مالک رام نے اپنی تحقیقی خدمات سے نہ صرف یہ کہ اردو تحقیق کی روایت کو فروغ بخشا ہے بلکہ اردو ادب کے وقار میں بھی اضافہ کیا ہے۔پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

''مالک رام صاحب نے اردو تحقیق کی روایت کو آگے بڑھانے میں کافی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔متنی تحقیق میں تخریج

اور تعلیق نویسی کا جو مقام ہے اس سے ہر محقق وادیب واقف ہے۔ لیکن یہ زمین بڑی سنگلاخ ہے اسی لیے عام طور پر محققین اس سے گریز کرتے ہیں۔ مالک رام صاحب نے تحقیق کی اس ضرورت کو بڑی حد تک پورہ کیا ہے۔ کربل کتھا ہو یا غبار خاطر یا ان کی دوسری اور تحقیق ان میں یہ عنصر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔''53

مالک رام کی تحقیق خدمات کا ایک بڑا حصہ تدوین متن پر مشتمل ہے۔ انہوں نے کم وبیش تیس کتابیں ترتیب وتدوین کی۔ جو متنی ادب کا بہترین کارنامہ ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ کتابوں کی ترتیب وتدوین کا کام کیا بلکہ اردو تدین کے معیار کو بھی بلند کیا۔ انہوں نے جن جدید اصولوں کو اپنایا اور حوالوں اور حواشی کا جس طرح خاص اہتمام کیا ادبی تحقیق کے نقطہ نظر سے بہت اہم ہے۔ محققین کو نہ صرف یہ کہ ان کی مدونہ کتابوں کو پڑھنا چاہیے بلکہ ان کے اصولوں سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔ ان کی مدونہ کتابوں میں سبد چیں، کلیات غالب، دیوان غالب، خطوط غالب، گل رعنا، غبار خاطر، تذکرہ، خطبات آزاد، نذر ذاکر، نذر عرشی، نذر حمید اور نذر عابد قابل ذکر ہیں۔ مالک رام نے کم وبیش دوسو مقالات ومضامین تحریر کیے، جن سے بعض اتنے ضخیم ہیں کہ انہیں کتاب کی جگہ رکھا جاسکتا ہے۔

رشید حسن خاں (2006-1930)

اردو تحقیق وتدوین کو فروغ واستحکام اور اس کے معیار کو بلند کرنے والوں میں ممتاز نام رشید حسن خاں کا بھی ہے۔ انہوں نے ایک معتبر محقق کی حیثیت سے اپنا تخصص قائم کیا۔ آپ کی دو درجن سے زائد کتابیں ہیں جن میں زبان وبیان، اردو املا کے مسائل، تنقیدی وتحقیقی مقالات ومضامین کا مجموعہ، کئی اہم کتابوں کی تدوین وترتیب کے علاوہ تحقیق وتدوین کے اصول وضوابط پر بھی دو اہم کتابیں ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، تدوین تحقیق اور روایت کافی اہم ہے۔ انہوں نے کئی اہم شعرا کے کلام کا عمدہ انتخاب بھی پیش کیا ہے۔

رشید حسن خاں تحقیق میں مستند حوالوں اور مناسب دلائل اور صحیح نتائج تک رسائی حاصل کرنے کی اہمیت سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ انہوں نے خود تحقیق وتدوین کے اصول وضوابط بھی مقرر کیے ہیں۔ وہ تحقیق میں بے اعتدالی، بے اصولی اور قیاس آرائی کو بالکل نہیں پسند کرتے اور خود بھی تحقیق کے بنائے گئے اصولوں کی پابندی کرتے ہیں۔ رشید حسن خاں کا سب سے اہم کام تدوین متن ہے۔ انہیں تدوین متن پر عبور حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ انہیں خدائے تدوین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ شارب ردولوی رشید حسن خان کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''بڑی محنت، لگن اور ذمہ داری کے ساتھ اردو زبان وادب کے کلاسکی سرمائے کے صحت متن اور تحقیق کا کام انجام دیا ہے۔ حالات وحقائق کی چھان بین، صحت متن اور ماخذات کی تلاش وجستجو میں وہ اس عہد کے تمام نئے محققین سے زیادہ محتاط اور ذمہ دار ہیں۔ وہ اس وقت تک ایک لفظ بھی نہیں لکھتے جب تک کہ اس کے بارے میں پوری تحقیق نہ کرلیں۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تحقیق کے معاملے میں ان کا سلسلہ براہ راست قاضی عبدالودود سے ملتا ہے لیکن رشید حسن خاں کی تحقیق کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے تحقیق سے تنقیدی بصیرت اور اس نتیجے میں کسی فیصلے پر پہنچنے کی وقت کو الگ نہیں کیا ہے۔ وہ ایک وکیل کی طرح شواہد جمع کرتے ہیں اور اس کی روشنی میں ایک جج کی طرح فیصلہ کرتے ہیں۔''54

ادبی تحقیق مسائل وتجزیہ نہ صرف رشید حسن خاں کی بلکہ اردو تحقیق کی اہم کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس میں تحقیق کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی ہے۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں نظریاتی بحثیں ہیں اور یہ پانچ اہم مضامین پر مشتمل ہے۔ جبکہ دوسرا حصہ عملی تحقیق کے اصول وطریقہ کار پر مشتمل ہے۔ اس کے تحت دیوان غالب صدی ایڈیشن، اردو شاعری کا انتخاب، علی گڑھ تاریخ ادب اردو اور تاریخ ادب اردو پر تحقیقی تبصرہ شامل ہے۔ یہ تبصرے کافی اہم اور معلوماتی ہیں۔ ان میں نہ صرف تحقیق کے اصول نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ بہت سے دعووں کو رد اور غلط بیانیوں کو درست کیا گیا ہے۔ یہ تبصرے اردو تحقیق میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

تحقیق وتدوین دونوں پر آپ کو یکساں قدرت حاصل ہے۔ ان کے مدونہ کارناموں کی بڑی تعداد ہے جن

میں فسانہ عجائب، باغ و بہار، سحر البیان، گلزار نسیم، مثنویات شوق، مصطلاحات ٹھگی اور زٹل نامہ کافی اہم ہیں۔ رشید حسن خاں نے نہ صرف ان کلاسکی متون کی تدوین ترتیب کا کام کیا بلکہ بہت سی غلطیوں اور تسامحات کی اصلاح کا کام بھی کیا۔ میر کا ایک مشہور شعر جو ایک مدت سے غلط رائج تھا۔ اردو ادب کا عام قاری ہی نہیں بلکہ محمد حسین آزاد اور مولوی عبد الحق جیسے باکمال محقق نے بھی اسے غلط لکھا ہے۔ وہ شعر تھا:

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

رشید حسن خاں نے لکھا کہ شعر کا صحیح متن یوں ہے:

سرہانے میر کے کوئی نہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

انہوں نے ان متون کو جدید اصولوں کی روشنی میں صحت جامعیت کے ساتھ مرتب کیا ہے اور ان مفصل اور علمی مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ ان میں مثنویات شوق کا مقدمہ خاصا طویل ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شوق نے صرف تین مثنویاں زہر عشق، فریب عشق اور بہار عشق لکھی تھی۔ گیان چند جین رشید حسن خاں کے مدونہ کاموں کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اب تک اردو نثر میں بہترین تدوینات مولانا عرشی اور مالک رام ومختار الدین احمد کی رتھیں۔ رشید حسن خاں نے فسانہ عجائب اور باغ و بہار کو اس انداز سے مدون کیا ہے کہ یہ ایسے مکمل اور مثالی کام ہیں جن کی نظیر نہ ماضی میں ملتی ہے نہ عرصے تک مستقبل میں ملنے کی امید ہے۔ یہ کتابیں تدوین کا ایسا بیش بہا خزانہ ہیں جن میں متناہی دولت چھپی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک ایسی کتاب تیار کرنے کے لیے پندرہ بیس سال کا عرصہ درکار ہے۔''55

رشید حسن خاں نے کئی اہم شعرا کے کلام کا بھی انتخاب پیش کیا ہے جن میں نظیر اکبرآبادی، انیس و دبیر، میر درد، سودا، شبلی اور ناسخ قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے نہ صرف ان شعرا کا انتخاب کیا بلکہ ان پر علمی مقدمہ بھی تحریر کیا اور کئی اہم غلط بیانیوں کو اپنی تحقیق سے رد کیا ہے۔ ناسخ جو دبستان لکھنو کے اہم شعرا میں سے ایک ہیں رشید حسن خاں نے نہ صرف ان کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے بلکہ اصلاح زبان کے حوالے سے کئی اہم غلط بیانیوں کا ازالہ بھی کیا ہے۔ تحقیقی نقطہ نظر سے یہ مقدمہ کافی اہم ہے۔

اردو زبان کے مسائل اور املا و تلفظ کے حوالے سے بھی آپ نے تحقیقی کام کیے ہیں۔ زبان اور اس کے قواعد، املا، تلفظ اور الفاظ کی تصحیح پر ان کی متعدد کتابیں ہیں جن میں اردو املا، اردو کیسے لکھیں، زبان اور قواعد، انشا اور تلفظ

،عبارت کیسے لکھیں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ کتابیں نہ صرف ابتدائی درجہ کے طلبہ کے لیے انتہائی مفید وکارآمد ہے بلکہ ان اردو زبان اور قواعد کے جن مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے وہ لسانی تحقیق کے حوالے سے کافی اہم ہیں۔ تحقیق وتدوین کے علاوہ انہوں نے بڑی تعداد میں تنقیدی وتحقیق مضامین اور متعدد کتابوں پر تبصرے بھی لکھے ہیں۔ان مضامین کے مجموعہ تفہیم اور تلاش وتعبیر کے علاوہ تبصروں کا بھی ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔رشید حسن خاں نے تحقیق وتدوین کے جو اصول بنائے اور اپنی تلاش وتحقیق سے جن غلط فہمیوں اور تاریکیوں کو روشن کیا وہ ادبی تحقیق کے باب میں قبل قدر اضافہ ہے۔ان کے تحقیقی کارناموں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

گیان چند جین(1932-2007)

گیان چند جین اردو کے ان معروف محققوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے مختلف حیثیتوں سے اردو ادب کی خدمت کی ہے۔انہیں نقاد، محقق، ماہرلسانیات اور مؤرخ کے طور پر جانا جاتا ہے۔شعروشاعری سے بھی انہیں گہرا شغف رہا ہے البتہ ان کی بنیادی شخصیت نقاد اور محقق کی ہے۔علمی و ادبی موضوعات پر انہوں نے کم وبیش تیس سے زائد کتابیں تحریر کیں۔گیان چند جین نے نہ صرف یہ کہ مختلف موضوعات اور اہم شخصیات پر کتابیں اور مضامین لکھے بلکہ اردو ادب کے بہت سے گمشدہ و گمنام پہلوؤں کی دریافت اور من گھڑت روایتوں کا ازالہ کیا۔بڑی تعداد میں مخطوطات اور کتابوں کی دریافت کی ۔کتابوں کی تحقیق وتدوین کے ساتھ ساتھ تحقیق کے اصول ضوابط بھی مرتب کیے۔اصول تحقیق پر ان کی کتاب 'تحقیق کا فن' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔فن تحقیق پر بنیادی کتابوں میں سے ایک ہے۔

ڈاکر گیان چند جین 19 ستمبر 1923 کو سیوہارہ ضلع بجنور کے ایک جین گھرانے میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے الہ آباد یونی ورسٹی سے بی۔اے اور ایم۔اے کیا۔شمالی ہند میں اردو کے نثری قصے ابتدا سے 1970 تک کے عنوان سے ڈی فل کیا جو کہ بعد کو اردو کی نثری داستانیں کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔اردو مثنوی شمالی ہند میں کے موضوع پر 1960 میں آگرہ یونی ورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔تعلیم سے فراغت کے بعد ایک مدت تک Poineer کی ادارت بھی انجام دی۔1950 میں حمیدیہ گرلس ڈگری کالج بھوپال میں لکچر منتخب ہوئے۔یہیں سے درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہوا جو کشمیر، الہ آباد اور حیدرآباد یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دی۔2007 میں امریکہ میں انتقال ہوا۔

گیان چند جین نے علمی و ادبی موضوعات پر دو درجن سے زائد کتابیں تحریر کیں جن ایک بڑی تعداد ان کی تلاش تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ان کی تحقیقی کتابوں میں عام لسانیات،لسانی مطالعے،تحقیق کا فن ،اردو کی نثری داستانیں،اردو مثنوی شمالی ہند میں ،تاریخ ادب اردو ،قاضی عبد الودود بحیثیت مرتب متن،غالب شناس مالک رام،ایک بھاشا: دولکھاوٹ دو ادب قابل ذکر ہیں۔تحقیق کا فن اصول تحقیق پر منفرد اور بنیادی کتاب ہے۔محققین بالخصوص تحقیق کے نو واردین کے لیے نہایت کارآمد ہے۔اس میں تحقیق کے اصول اور طریقہ کار کو جدید طریقہ تحقیق اور سائنٹفک اصولوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔کتاب کو 22 ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔جس میں تحقیق کی تعریف اور اقسام،موضوع کا انتخاب،مواد کی فراہمی، خاکہ اور مواد کی تسوید، مطالعہ اور نوٹ لیا اس کے علاوہ آخر میں

تحقیق کی جدید اصطلاحوں کا تعارف بھی کیا گیا ہے۔ ریسرچ اسکالر کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے تا کہ وہ اپنی تحقیق کو سائنٹفک طریقے سے انجام دے پائیں۔

اردو کی نثری داستانیں دراصل گیان چند جین کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جسے انہوں نے بعد میں ترمیم واضافہ کے بعد شائع کیا۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے پہلی بار داستانوں پر محققانہ نظر ڈالی ہے۔ داستانوں کے ماخذ کے اوران کے مصنفین کے متعلق ایک مستند معلومات فراہم کی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کی یہ کتاب داستانی ادب کے ارتقا اور ترویج کے موضوع پر ایک عمدہ کتاب ہے۔ نثری داستان نویسی کی روایت اور اس کے ترقی کے اسباب پر خاص توجہ دی ہے۔ پوری کتاب کو 13 ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔ عہد بہ عہد داستانوی ادب کی تاریخ، روایت، سماجی وسیاسی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مجموعی طور پر داستان نویسی اور قصہ گوئی کے فن و روایت پر بہتر کتاب ہی نہیں بلکہ اردو تحقیق کا بہترین نمونہ بھی ہے۔

اردو مثنوی شمالی ہند میں' شمالی ہند کی مثنویوں پر لکھی گئی تحقیقی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کتاب میں شمالی ہند میں ساڑھے ساتھ سو سال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب دراصل گیان چند جین کے ڈی لٹ کا مقالہ ہے جو 1960 میں آگرہ یونی ورسٹی کے لیے لکھا تھا۔ مکمل کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کے تحت ذیلی ابواب قائم کر کے تمام موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے تحت ایک فہرست درج ہے جس میں شمالی ہند کی تمام مثنویوں کی فہرست درج ہے۔ گیان چند جین نے نہ صرف شمالی ہند میں مثنوی کی تاریخ رقم کی ہے بلکہ اپنے تحقیقی ذوق سے مثنویوں میں منظوم قصوں کے ماخذ پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب میں تحقیقی مواد محنت، علمی ذوق اور بڑی تلاش و تحقیق کے بعد جمع کیا گیا ہے۔ جین صاحب کی اس کتاب سے جہاں اردو مثنوی کی تاریخ رقم ہوئی ہے وہیں مثنوی کے بہت سے تاریخ گوشوں کا بھی انکشاف ہوا ہے۔ میر تقی میر کی تین اہم غیر مطبوعہ مثنوی کی دریافت اسی کتاب سے ہوئی۔ غرض یہ مثنوی پر یہ ایک محققانہ کتاب کا درجہ رکھتی ہے اور اس کا شمار حوالہ جاتی کی کتابوں میں کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے اس تحقیقی روایت کو آگے بڑھایا جو شیرانی، امتیاز علی خاں عرشی، عبدالودود، مالک رام اور رشید حسن خاں وغیرہ سے وابستہ تھیں۔ ان کی تصانیف اور تحقیق اردو ادب کا گراں قدر کارنامہ ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ ابتدا تا 1700 ان کے علمی و تاریخی کارناموں میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب پروفیسر سیدہ جعفر کے اشتراک سے لکھی گئی۔ اردو ادب کی تاریخوں میں یہ کتاب کئی حیثیتوں سے مختلف ہے۔ کتاب میں جزئیات کا خاص خیال رکھا گیا

ہے۔ پوری کتاب پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اس میں اردو ادب کی تاریخ کو بڑی تفصیل اور تحقیق کے بعد لکھا گیا ہے۔ گیان چند جین نے اردو زبان کے مولد کے حوالے سے اپنا لسانی نظریہ بھی اسی کتاب میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اردو زبان کے آغاز کے سلسلے میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اردو کی اصل کھڑی بولی اور صرف کھڑی بولی ہے۔ گیان چند جین کا ماننا ہے کہ کھڑی بولی گیارہویں اور بارہویں صدی میں اس اپ بھرنش سے ابھری جو دلی، میرٹھ اور مراد آباد وغیرہ کے علاقے میں بولی جاتی تھی، لیکن انھوں نے اسے اپ بھرنش کا نام نہیں دیا، البتہ اس کا اظہار ضرور کیا کہ وہ شورسینی اپ بھرنش سے مختلف ضرور تھی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کھڑی بولی کا آغاز گیان چند جین کے نزدیک دلی، میرٹھ اور مراد آباد کے علاقہ سے ہوئی۔ ابتدا سے 1700 تک کے اردو ادب کے کم و بیش تمام شعرا و ادبا اور مصنفین کے حالات اور خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ استفادہ کردہ مواد کی نہ صرف تفصیل دی ہے بلکہ اس کا تنقیدی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین کی ایک حیثیت ماہر لسانیات کی بھی ہیں۔ انھیں لسانیات سے خاص لگاؤ تھا۔ جین صاحب نے نہ صرف یہ کہ اپنے لسانی نظریے کو دلائل سے پیش کیا بلکہ بڑی تعداد میں لسانی مقالات اور مضامین بھی لکھے۔ لسانیات کے حوالے سے ان کی دو کتابیں لسانی مطالعے، عام لسانیات بہت اہم ہے۔ لسانی مطالعے ان تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جو لسانیات کے موضوع پر لکھے گئے۔ کتاب میں صوتیات، فن تحریر، زبان و بولی، اردو کے مصوتے، غنائی اصوات، اردو رسم الخط کی اصلاح جیسے کئی اہم لسانی موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اردو زبان کی تاریخ و ترویج اور اس کی ساخت کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب کافی معاون ہے۔ 'عام لسانیات' لسانی مباحث پر ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں عام لسانیات اور اس کی شاخوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ پوری کتاب 24 ابواب پر مشتمل ہے۔ علم زبان اور اس کی شاخیں، زبان کی ماہیئت اور اس کے مختلف روپ، صوتیات، فونیمات، مارفیمات، علم اللغات اور لفظ اصلیات، لسانی جغرافیہ، زبانوں کی نوعیاتی گروہ بندی، زبانوں کی خاندانی گروہ بندی وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں علم زبان کے مطالعہ کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ جس میں ہندستان میں لسانیاتی مطالعہ، یورپ میں لسانیاتی مطالعہ وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ لسانیات اور زبان کی تفہیم کے لیے یہ کتاب نہ صرف اہم ہے بلکہ لسانیات کی تدریس میں بھی کافی اہم ہے۔ لسانی کتابوں پر لکھی جانے والی کتابوں میں اسے دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔

گیان چند جین کی ایک حیثیت غالب شناس کی ہے۔ انہوں نے غالب سے متعلق سے متعدد مضامین اور

مقالات تحریر کیے۔اس موضوع پر ان کی دو کتابیں تفسیر غالب اور رموز غالب ہے۔تفسیر غالب چھ تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ان کی ضخامت اور اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں مقالات کہا جاسکتا ہے۔رموز غالب میں غالب پر ۱۲ مضامین ہیں۔جن میں ۹ تحقیقی اور ۳ تنقیدی مضامین ہیں۔یہ دونوں کتابیں غالبیات سے ان کی دلچسپی کا مظہر ہیں اور غالبیات کے باب میں اضافہ بھی۔

علامہ اقبال کے حوالے سے بھی انہوں نے اہم تحقیقی وتدوینی کام کیے ہیں۔اقبال کے ابتدائی 1908 تک کے کلام کو' کلام اقبال ترتیب مہ وسال' 1980 میں حیدرآباد سے شائع کیا۔گیان چند جین کے اہم تدوینی کاموں میں ایک ہے۔اس کے علاوہ ان کے کئی تحقیقی مضامین کے مجموعے شائع ہوئے جن میں ذکر وفکر،حقائق،کھوج،قابل ذکر ہیں۔ادبی اصناف پر بھی ان کی ایک اہم کتاب ہے جس نثری اور منظوم اصناف ادب کی تعریف،تاریخ اور لوازمات کو بیان کیا گیا ہے۔اس کتاب سے نہ صرف یہ کہ اصناف کو سمجھنے میں مدد ملی ہے بلکہ ادبی اصناف کی تدریس کے لیے بھی کافی اہم ہے۔

مختارالدین احمد آرزو (1924-2010)

پروفیسر مختار الدین احمد آرزو(1924-2010)اردو ادب میں بطور ادیب اور محقق کے جانے جاتے ہیں۔ان کا شمار نامور محققوں اور مخطوطہ شناسوں میں ہوتا ہے۔انہوں نے اپنی تالیفات وتصنیفات سے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیے ہیں۔کربل کتھا،تذکرہ گلشن ہند،تذکرہ آزردہ اور تذکرہ حیدری وغیرہ آپ کی اہم ترین دریافتیں ہیں۔ان کی ایک حیثیت ماہر غالبیات کی ہے۔غالب پرانہوں نے تحقیقی مقالات لکھ کر بعض گمنام پہلوؤں کو روشن کیا نیز احوال غالب،نقد غالب اور گنجینہ غالب کی ترتیب وتدوین کا کام بھی انجام دیا۔غالب انسٹی ٹیوٹ نے 1983 میں غالب انعام برائے تحقیق دیا۔

مختارالدین احمد 1924 کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔والد نے غلام معین الدین نام رکھا،بعد میں مختارالدین احمد نام تجویز ہوا اوراسی نام سے وہ مشہور ہوئے۔آپ کے مورث اعلی سید ابراہیم سلطان فیروز شاہ کے عہد میں غزنی سے ہندستان آئے اور شاہی فوج میں ملازم ہوئے۔عمر بھر جنگی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے بالآخر قلعہ رہتاس کی جنگ میں شہید ہوئے۔مختارالدین احمد کے والد مولانا ظفرالدین کوتعلیم وتعلم سے کافی لگاؤ تھا انہوں نے مختلف جگہوں پر نہ صرف تدریسی خدمات انجام دی بلکہ کئی درسگاہیں بھی قائم کی۔اس کے علاوہ اردواور عربی میں پچاس سے زائد کتابیں آپ سے منسوب ہیں۔

مختارالدین احمد آرزو نے ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کی۔مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ سے مولوی،عالم اور فاضل ے امتحانات پاس کیے۔اعلی تعلم کے لیے 1943 میں علی گڑھ گئے جہاں سے بی۔اےاورایم۔اے(عربی) کی تعلیم حاصل کی۔1952 میں شعبہ عربی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔1953 میں عربی کے لیکچرر منتخب کے گئے۔1984 میں ملازمت سے سبکدوش ہوکر وظیفہ یاب ہوئے اور 2010 میں علی گڑھ میں انتقال کیا۔

پروفیسر مختارالدین احمد آرزو عربی،فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔بنیادی طور پر وہ عربی کے عالم تھے۔ان کی تعلیم بھی عربی میں ہوئی تھی۔البتہ اردو میں سب زیادہ اور قابل قدر کارنامہ انجام دیے۔ان کا سب سے غیر معمولی کارنامہ کربل کتھا کی دریافت ہے۔کربل کتھا کے مصنف فضل علی فضلی ہیں۔کربل کتھا ملاحسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف 'روضۃ الشہدا' 908ھ کا ترجمہ ہے۔کربل کتھا کوشمالی ہند کی اولین نثری کتاب ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فضلی نے اسے 34-1733 میں لکھی۔تقریبا سو سال تک یہ کتاب پردہ خفا میں تھی۔سب سے پہلے مولوی کریم الدین نے اپنے تذکرہ 'طبقات الشعراہند' (1848) میں اس سے متعارف کرایا جس کا واحد نسخہ ان کے پاس تھا۔56ء پرنسپل اسپرنگر کے ذاتی کتب خانہ کی فہرست جب شائع ہوئی تو کربل کتھا کے موجودگی کی اطلاع ملی۔غالب گمان ہے کہ یہ وہی نسخہ تھا جو مولوی کریم الدین کے پاس موجود تھا۔جس

کے بعد سو سال تک اس کی موجودگی کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

1953 میں پروفیسر مختارالدین احمد آرزو تحقیقی کام کے لیے یورپ جا رہے تھے تو قاضی عبدالودود نے کربل کتھا کے اس نسخہ کی تلاش کے بارے میں درخواست کی تھی۔ آپ نے جرمنی، ہالینڈ، فرانس، اسکاٹ لینڈ اور انگلستان کے مختلف کتب خانوں کا جائزہ لیا، ماربرگ یونی ورسٹی کے تقریباً 900 مخطوطات کو دیکھا پھر بھی مایوسی ہوئی۔ بالآخر ہائیڈل برگ میں ڈاکٹر البرٹ کے پاس موجود انگل کا خط دیکھنے سے مختارالدین احمد کو یہ معلوم ہوا کہ نسخہ اسپرنگر ٹوبگن میں موجود ہے۔ مختارالدین وہاں گئے بڑی تلاس و بسیار کے بعد وہاں وہ نسخہ انہیں مل گیا 1956 میں اس نسخہ کو لے کر ہندستان لوٹے۔ 57 1965 میں پروفیسر مختارالدین اور مالک رام نے اپنے مبسوط مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ کربل کتھا کی اطلاع مختارالدین نے احباب کو دی تو خواجہ احمد فاروقی نے کسی طرح مخطوطہ کا عکس حاصل کر لیا اور 1961 میں مرتب کر کے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا۔ پروفیسر حنیف نقوی انتخاب کربل کتھا کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''اکتوبر 1965 میں ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ نے ڈاکٹر آرزو اور مالک رام صاحب کا مرتب کیا ہوا نسخہ شائع کر دیا اور اسی اشاعت کے ذریعہ عوام اور اہل علم کو پہلی بار 'کربل کتھا' سے روشناسی حاصل ہوئی۔ اس اعتبار سے مرتبین کا یہ دعویٰ کہ یہ کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی اور پہلی بار منظر عام پر آ رہی ہے بالکل درست قرار پاتا ہے۔'' 58

پروفیسر مختارالدین احمد متن کی ترتیب اور جامع علمی مقدمہ کے مطالعہ کے بعد مرتب کی عرق ریزی اور علم و فضل کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ مختار الدین احمد کو محققین کی صف میں جگہ دلانے کے لیے یہی ایک کارنامہ کافی ہے۔ مقدمہ میں نہ صرف کربل کتھا بلکہ اس کی دریافت کی داستان، مصنف کے حالات، کربل کتھا کی تاریخی و لسانی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

'گلشن ہند' سید حیدر بخش حیدری کا تذکرہ ہے۔ اس نام سے مرزا علی لطف کا بھی ایک تذکرہ ہے۔ مشابہت سے بچنے کے لیے حیدر بخش حیدری کے تذکرہ کو تذکرۂ حیدری کا نام دیا گیا۔ حیدری کا یہ تذکرہ ایک مدت سے نایاب تھا۔ یورپ میں باڈلین لائبریری میں مشرقی مخطوطات و مطبوعات کے نگراں Dr A.P.L.Beeston کی کوششوں سے دستیاب ہوا۔ 1967 میں مختارالدین احمد آرزو نے اپنے مقدمہ کے ساتھ پروفیسر آل احمد سرور کے مشورہ پر شائع کیا گیا۔ 59 گلشن ہند میں 289 شعرا کا تذکرہ ہے۔ واضح رہے کہ گلشن ہند (تذکرہ شعرا اردو) گلدستہ حیدری (1802) میں شامل ہے جوان کی متفرق تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اب تک الگ سے اس تذکرے کا کوئی مخطوطہ دستیاب نہ ہو سکا۔ گلدستہ حیدی کے بارے میں اب تک یہ گمان تھا کہ اس میں 'تذکرہ گلشن ہند' شامل نہیں ہے۔ مختارالدین احمد

نے مقدمہ میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ انگلستان میں اس کے دو نسخے انہوں نے دیکھے دونوں میں گلشن ہند موجود تھا۔60؎ تذکرہ کے ابتدا میں حیدری کا لکھا ہوا ایک دیباچہ بھی شامل ہے جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے سفر کلکتہ کے دوران مرزا محمد فاضل کے بیٹے مرزا محمد علی کے کہنے پر ایک تذکرہ تیار کیا تھا جس کا نام گلشن ہند رکھا۔

شعرا کا یہ تذکرہ تقریباً 80 صفحات پر مشتمل ہے، جسے حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے اور ہر حروف کے لیے الگ سے باب قائم کیا گیا ہے۔ حوالوں اور حواشی کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ مختارالدین نے مصنف کی پیش کردہ معلومات میں باضافہ بھی کیا ہے۔ متعدد نسخوں اور مختلف تذکروں کی مدد سے اختلاف متن کو بھی واضح کیا۔ بعض جگہوں پر متن میں اضافہ اور تصحیح سے کام لیا گیا ہے۔ اس تذکرے کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تدوین کے جملہ تقاضے پورے کیے گئے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تذکرہ گلشن ہند کی تدوین نہ صرف مختارالدین احمد کا گراں قدر کارنامہ ہے بلکہ اردو ادب میں اہم ترین اضافہ بھی۔

'تذکرہ آزردہ' مفتی صدرالدین آرزدہ کا شمار اپنے عہد نامور شخصیات میں ہوتا ہے۔ غالب کے ہمعصروں میں تھے۔ آرزدہ نے کئی قلمی آثار کے علاوہ ایک تذکرہ بھی تصنیف کیا تھا، جو عرصہ دراز سے ناپید تھا۔ پروفیسر مختار الدین احمد نے 1974 میں اپنے مقدمہ کے ساتھ کراچی سے شائع کیا۔ مقدمہ مختصر البتہ علمی نوعیت کا ہے جس میں مفتی صدرالدین آرزدہ کے سوانحی حالات، قلمی آثار پر روشنی دالی گئی ہے ساتھ ہی ساتھ کتابوں کا تعارف اور کلام کے نمونہ بھی پیش کیے گئے ہیں۔ آرزدہ کے اعزہ اور شاگردوں پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ مقدمہ سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ تذکرہ آرزدہ کا ذکر سوائے شیفتہ اور لالہ رام کے کہیں نہیں ملتا۔ یہ تذکرہ کب ترتیب دیا گیا محققین نے اس بارے میں مختلف الرائے ہیں البتہ مختارالدین احمد نے داخلی شواہد کی روشنی میں اس کا سال ترتیب 1233-1229 کے درمیان قرار دیا ہے۔61؎

تذکرے کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمیوں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ مثلاً اس تذکرہ کی تالیف میں تذکرہ ہندی اور مجموعہ نغز پر انحصار کیا گیا۔ اشعار کا انتخاب اور بڑی حد تک الفاظ کا استعمال بھی انہیں تذکرہ کی مدد سے کیا گیا۔ پورے تذکرہ میں مجموعی طور 106 شعرا کا تذکرہ ہے۔ حوالوں اور حواشی سے بھی معلومات میں اضافہ کیا گیا ہے۔ حواشی سے شعرا کے سنین، شعرا سے متعلق معلومات میں اضافہ اور اختلاف متن کی وضاحت کی گئی ہے۔

'دیوان حضور' شیخ غلام یحیٰ حضور عظیم آبادی کا دیوان ہے جو ایک مدت سے کم یاب تھا۔ اس دیوان سے متعلق اردو کے اکثر تذکرے بھی خالی ہیں البتہ نساخ اور علی ابراہیم کے تذکرہ میں حضور کے دیوان کی موجودگی کا ذکر ملتا ہے۔ پہلی بار مختارالدین احمد نے 1977 میں 43 صفحات کا مبسوط مقدمہ لکھ کر شائع کیا۔ مرتب نے مقدمہ میں مختلف عناوین قائم کیے ہیں۔ جس میں حضور کے حالات، کلام اور دیگر ضروری تفصیلات دی گئی ہے۔

مقدمہ کا پہلا عنوان 'حضور تذکروں میں' ان تذکروں پر روشنی ڈالی گئی ہے جن میں حضور کے متعلق معلومات دی گئی ہے۔ان تذکروں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے حضور کے حالات مرتب کرنے میں مدد لی گئی ہے ان میں تذکرہ شورش، گلشن سخن، گلزار ابراہیم، تذکرہ عشقی، طبقات الشعرا ہند، سخن شعرا اور تذکرۃ الصالحین قابل ذکر ہیں۔ان تذکروں میں حضور کے حالات فارسی زبان میں ملتے ہیں جبکہ طبقات الشعرا ہند اور تذکرۃ الصالحین میں اردو میں حالات ملتے ہیں۔ 'حضور کے حالات' کے عنوان کے تحت ان کے حالات مختلف تذکرہ نگاروں کے اقوال کی روشنی میں نقل کیے گئے ہیں۔اس کے علاوہ حضور کے اشعار کی مدد سے ان کی عمر، عہد، معاشرت اور سیاسی حالات مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'دیوان' کے عنوان سے بھی ایک باب قائم کیا گیا ہے۔جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ دیوان حضور کا ذکر بیشتر تذکروں میں ملتا ہے۔اور اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ حضور نے اپنے معاصرین میں علی ابراہیم کو اپنا منتخب کلام 'تذکرہ گلزار ابراہیم' درج کرنے کے لیے دیا تھا۔حضور کا منتخب دیوان کتاب خانہ خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ میں محفوظ ہے۔62 مختار الدین احمد نے اسی منتخبہ دیوان سے حضور کے دیوان کو مرتب کیا ہے۔مقدمہ میں شاعری کے نام سے ایک عنوان قائم کیا گیا ہے جس میں ان شاعری کی خصوصیات اور زبان و بیان کے ساتھ ساتھ بعض الفاظ پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔الفاظ کی تصحیح اور متروک الفاظ کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔مقدمہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مختار الدین کے موجودہ دیوان حضور کا نسخہ کہاں سے دستیاب ہوا۔انہوں نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

مختار الدین احمد نے اس دیوان کو جدید طریقہ کار پر مرتب کیا ہے۔حواشی اور حوالوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔انہوں نے نہ صرف دیوان کی تریب و تدوین کا کام کیا ہے بلکہ مشکل اور متروک الفاظ کے معنی بھی تحریر کیے ہیں۔ غیر واضح اور کرم خوردہ الفاظ کی قیاسی تصحیح بھی کی گئی ہے ان الفاظ کو بھی مکمل کیا گیا ہے جو جلد بندی میں کٹ گئے تھے۔

ان کتابوں کے علاوہ مفتی سید محمد ولی اللہ فرخ آبادی کی فارسی تصنیف جو ایک مدت سے غیر مطبوعہ تھی مختار الدین احمد نے مرتب کر کے رسالہ اردو ادب جولائی 1956 میں شائع کیا، جسے بعد میں مالک رام نے کتابی شکل میں 1956 میں شائع کیا۔شیخ محمد ریاض امجد کا سفر نامہ 'سیر دہلی' (1860) کی ترتیب و تدوین کا مختار الدین احمد نے کیا تھا۔واضح رہے کہ ریاض امجد نے دہلی کا سفر 1860 میں کیا تھا اور اسی سال 64 صفحات میں اس سفر کی روداد رقم کی تھی۔سفر نامہ کے مطالعہ سے غالب سے ان کی ملاقاتوں کا پتہ چلتا ہے۔مختار الدین احمد آرزو نے یہ سفر نامہ 1962 میں مرتب کر کے شائع کیا۔

غالب پر اعلی تحقیق کرنے والوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔جن محققین نے غالب پر تحقیق کی ان میں غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، عبدالستار صدیقی، مہیش پرشاد، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مسعود حسن رضوی ادیب، مالک رام، پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر مختار الدین احمد کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔غالب پر پہلی کتاب (یادگار غالب 1893) مولانا الطاف حسین حالی نے لکھی، اس وقت سے سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔اب بھی غالب تحقیق کا سلسلہ جاری ہے اور اب بھی بہت سے نئے پہلو سامنے آ رہے ہیں۔پروفیسر مختار الدین احمد کی ایک حیثیت ماہر

غالبیات کی ہے۔انہوں نے نہ صرف غالب پر کتابیں مرتب کیں بلکہ بڑی تعداد میں پر مغز مقالات بھی تحریر کیے۔اسی وجہ سے غالبیات پر تحقیق کے لیےادارہ گالب انسٹی ٹیوٹ نے 1983 میں انہیں انعام برائے غالب تحقیق سے سرفراز کیا تھا۔

مختارالدین احمد نے 1949 میں علی گڑھ میگزین کا غالب نمبر ترتیب دیا،جس میں غالب پر کام کرنے والوں بطور خاص ماہر غالبیات سے مضامین اور مقالات تحریر کرائے۔غالب نمبر کی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ مقالات کی اہمیت کے پیش نظرا سے کتابی شکل دینے کا فیصلہ کیا گیا۔اس کے لیے دوبارہ مضامین لکھوائے گئے اور موجودہ مضامین میں ترمیم واضافہ کی درخواست کی گئی۔ جسے تین جلدوں میں شائع کیا گیا۔

'احوال غالب'(1953)غالب کی شخصیت اور سوانحی حالات پر مشتمل 18 مضامین شامل ہیں،جن میں سے چھے علی گڑھ میگزین سے ماخوذ ہیں۔مجموعہ میں دیباچہ کے علاوہ مختار الدین کے دو اہم مقالات 'سر غالب درحدیث دیگراں'اور'مرزا غالب کی تصویریں' شامل ہیں ۔'نقد غالب'(1956) غالب کی نثر ونظم پر 16 تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں سے چار میگزین سے ماخوذ ہیں۔'گنجینہ غالب'اس مجموعہ میں غالب کے غیر مطبوعہ اشعار، غالب کی بعض نادرتحریریں اور غالب پرلکھی گئی کتابوں پر تبصرے شامل کیے گئے۔

غالب پر بڑی تعداد میں تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی لکھے۔غالب تحقیق پر لکھے گئے چند مضامین کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔'مرزا غالب کی تصویریں'رسالہ آج کل فروری 1952 میں شائع ہوا۔اس میں مختار الدین احمد ان تصاویر کا تعارف پیش کیا ہے جومستند ہیں۔کچھ ایسی تصویروں پر بھی بحث کی ہے جو بعد کی ہے دلائل سے انہیں مشکوک ٹھرایا ہے۔آخر میں غالب کی ان تحریروں کو بھی نقل کیا ہے جس میں انہوں نے دوسروں سے تصویر بھیجنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس ضمن میں سیاح،شیونارائن اور یوسف مرزا کے نام قابل ذکر ہیں۔

'مرزا غالب درحدیث دیگراں' علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں شائع ہوا تھا۔اس میں ان لوگوں کے ملفوظات اور بیانات کونقل کیا ہے جنہیں غالب کو دیکھنے اوران سے ملنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔حضرت غوث علی قلندر،شیخ محمد ریاض الدین امجد،خواجہ عزیز الدین عزیزلکھنوی،صغیر بلگرام اور میر حسینی سہلا کے نام قابل ذکر ہیں۔ 'مرزا غالب سے ایک ملاقات'فروری آج کل 1953 میں شائع ہوا تھا۔جس میں انہوں نے شیخ ریاض الدین امجد کے سفر نامہ 'سیر دہلی' کے حوالے سے شیخ کے دہلی جانے اور غالب سے ملاقات کا ذکر ہے۔شیخ صاحب نے نہ صرف ملاقات کی تھی بلکہ انہیں اپنی غزلیں دکھائی تھیں،غالب نے بھی مرثیہ کے تین بندان کوسنائے تھے۔

'درمدح غالب می گوید'ہماری زبان جون 1957 میں شائع ہوا تھا۔اس میں مختارالدین احمد نے منشی بال مکندی کی مثنوی 'لخت جگر' سے گالب کی مدح میں کہے گئے اشعار نقل کیے ہیں۔مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مثنوی

غالب کی اصلاح کے بعد 1288 میں شائع ہوئی تھی۔اس کے علاوہ مختار الدین نے بڑی تعداد میں تحقیقی مقالات لکھے ہیں، چند عناوین کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے تاکہ مضمون کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکے۔کچھ غالب کے بارے میں، غالب کے ایک شعر پر بحث، غالب کی کم یاب تصنیف تیغ تیز، غالب اور قاضی عبدالودود، غالب کا ایک معاصر، کچھ سیاح شاگرد غالب کے بارے میں، غالب کے تین غیر مطبوعہ خط، غالب کی ایک غیر مطبوعہ تحریر، غالب کی ایک اردو تقریظ، غالب اور مفتی میر محمد عباس قابل ذکر ہیں۔

مختار الدین احمد کے تدوینی کاموں کا ایک بڑا حصہ مکاتیب پر مشتمل ہے۔انہوں نے نہ صرف یہ اہل علم کو مکاتیب لکھے بلکہ کئی مشاہر کے خطوط کی ترتیب وتدوین کا کام بھی کیا ہے۔مکاتیب لکھنے اور جمع کرنے کا انہیں بہت شوق تھا۔ان کے پاس مشاہیر کے خطوط کا ایک بڑا حصہ موجود تھا۔پروفیسر مختار الدین احمد نے جن مشاہیر کے خطوط مرتب کیے ان میں اکبرالہ آبادی، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی اور قاضی عبدالودود کے نام قابل ذکر ہیں۔

'خطوط اکبر' اکبرالہ آبادی کے غیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے۔ان خطوط کو مختار الدین احمد نے مختلف مصادر سے حاصل کیے، کچھ پرانے اخبارات ورسائل میں تھے اور کچھ اہل علم کے پاس محفوظ تھے۔اولاً علی گڑھ میگزین کے اکبرالہ آبادی نمبر (1950) میں شائع کیا اور پھر 1951 میں کتابی شکل میں شائع کیا۔مجموعہ میں 35 خطوط اور مکتوب الیہ کی تعداد 19 ہے۔البتہ دو خط کے مکتوب الیہ کا نام معلوم نہ ہوسکا۔تقریب کے عنوان سے مختار الدین کا مقدمہ بھی شامل ہے۔جس میں اکبر اس قبل شائع ہو چکے پانچ مجموعوں کا تعارف پیش کیا ہے۔اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ اس کے علاوہ اکبر کے خطوط کا ایک بڑا ذخیرہ ابھی غیر مطبوعہ ہے جسے تلاش کر کے مرتب کیے جانے کی ضرورت ہے۔اکبر کی مکتوب نگاری پر بھی مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔مثلاً اکبر خط لکھنے میں کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے تھے۔عموماً مختصر خطوط لکھتے تھے البتہ علمی خطوط طویل ہوتے تھے۔القاب وآداب کا بھی کوئی خاص اہتمام نہیں تھا۔مرتب نے حواشی بھی لکھے ہیں۔حواشی میں مکتوب الیہ کا تعارف اور اس کی شخصیت پر معلومات فراہم کی گئی ہے۔بعض حواشی میں اشعار بھی نقل کیے گئے ہیں۔اس کے علاوہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے خطوط چار جلدوں میں، رشید احمد صدیقی، مولوی عبد الحق کے خطوط بھی بڑی تلاش وبسیار کے بعد ترتیب دیا ہے۔علمی خطوط کے نام سے بھی انہوں نے ایک مجموعہ شائع کیا تھا۔ان خطوط کا ایک بڑا حصہ غالبیات سے متعلق ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

1۔ پروفیسر کلب عابد، عماد التحقیق، ص14

2۔ گیان چند جین، تحقیق کا فن، ص19

3۔ ایضا، ص19

4۔ پروفیسر عبدالستار ردولوی، ادبی اور لسانی تحقیق اصول اور طریقہ کار، ص111

5۔ مالک رام، اردو میں تحقیق، ص3

6۔ قاضی عبدالودود، اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں، ص5

7۔ گیان چند جین، تحقیق کا فن، ص10

8۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، نئی تنقید، ص66

9۔ پروفیسر عبدالستار ردولوی، ادبی اور لسانی تحقیق اصول اور طریقہ کار، ص13

10۔ گیان چند جین، پاکستان میں اردو تحقیق و تدوین، ص120

11۔ حنیف نقوی، شعرا اردو کے تذکرے، ص22،

12۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ص17

13۔ ایضا، ص77

14۔ ایضا، ص26

15۔ سرسید احمد خاں، آثار الصنادید, ص12

16۔ ڈاکٹر مشتاق احمد، سرسید کی نثری خدمات، ص56

17۔ الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ص57

18۔ اختر وقار عظیم، شبلی بحیثیت مؤرخ، ص132

19۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنفین کی تاریخی خدمات، ص43

20۔ ابوالکلام قاسمی، مونوگراف محمد حسین آزاد، ص8

21۔ قاضی عبدالودود، محمد حسین آزاد بحیثیت محقق، ص5

22۔ محمد حسین آزاد، دیباچہ آب حیات، ص4

23۔ ڈاکٹر محمد حسین، اردو تحقیق کا ارتقا، ص83

24۔ نازیہ امام، آب حیات کی ادبی معنویت، ص 175

25۔ محمد حسین آزاد، دیوان ذوق، ص 1

26۔ الطاف حسین حالی، یادگار غالب دیباچہ، ص 12

27۔ مولوی عبدالحق، حالی کی اردو نثر نگاری،، ہماری زبان، جون 1949

28۔ ڈاکٹر عبدالقیوم, حالی کی اردو کی نثر نگاری، ص 128

29۔ مولانا الطاف حسین حالی، دیباچہ یادگار غالب، 13

30۔ ڈاکٹر عبدالقیوم، تنقیدی نقوش، ص 31

31۔ الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ص 204

32۔ دیباچہ المامون، شبلی نعمانی، ص 2

33۔ شبلی نعمانی، سیرت البنیؐ، ص 8

34۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی، مولانا شبلی بحثیت سیرت نگار، ص 53

35۔ مولوی عبدالحق، مقدمہ سب رس، ص 3

36۔ ایضا، ص 6

37۔ مولوی عبدالحق، معراج العاشقین، ص 5

38۔ پروفیسر نزیر احمد، حافظ محمود شیرانی تحقیق مطالعے، ص 278

39۔ حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، ص 19

40۔ مولوی عبدالحق، دیباچہ خالق باری، ص 7

41۔ حافظ محمود شیرانی، دیباچہ دوم خالق باری، ص 53

42۔ سید سلیمان ندوی، عربوں کی جہاز رانی، ص 48

43۔ سید سلیمان ندوی، نقوش سلیمانی، طبع اول، ص 75

44۔ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، ص 7

45۔ نصیر الدین ہاشمی، یورپ میں دکھنی مخطوطات، ص 8

46۔ سیدہ جعفر، تاریخ ادب اردو جلد سوم، ص 231

47۔ ماہنامہ معارف فروری 1931 ص 357

48۔ کلیم الدین احمد، تحقیق کا معلم ثانی، قاضی عبدالودود نمبر 1974، ص 120

49۔ قاضی عبدالودود، اشتر وسوزن،ص45

50۔ رشید حسین خاں، غالب نامہ قاضی عبدالودود نمبر، 1978 ص131

51۔ رشید حسن خاں, تدوین تحقیق روایت،ص179

52۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی, ایک ممتاز ماہر غالبیات، مشمولہ مالک رام محقق اور دانشور،ص31

53۔ پروفیسر نذیر احمد، مالک رام ایک تاثر، مشمولہ مالک رام محقق اور دانشور،ص14

54۔ پروفیسر شارب ردولوی، جدید اردو تنقید اصول ونظریات،ص456،

55۔ ڈاکٹر گیان چند جین، خدائے تدوین، مشمولہ رشید حسن خاں شخصیت اور ادبی خدمات،ص73

56۔ مولوی کریم الدین، تذکرہ طبقات الشعراء ہند،ص،61

57۔ مالک رام ومختار الدین، کربل کتھا،ص29

58۔ پروفیسر حنیف نقوی، انتخاب کربل کتھا،ص9

59۔ مختار الدین احمد، تذکرہ گلشن ہند،ص19

60۔ ایضاً،ص17

61۔ مختار الدین احمد آرزو، تذکرہ آرزدہ،ص14،

62۔ مختار الدین احمد، دیوان حضور،ص15،

باب چہارم

ماہنامہ معارف کی تحقیقی خدمات

1۔ قلمی نسخوں اور مخطوطات کی بازیافت

2۔ دکنیات

3۔ غالبیات

4۔ اقبالیات

5۔ لسانیات

6۔ متفرقات

قلمی نسخوں اور نادر مطبوعات
کی بازیافت

معارف ایک علمی و تحقیقی رسالہ ہے۔1916 سے تا حال جاری ہے۔تحقیقی مزاج ہونے کی وجہ سے علم و تحقیق کے مختلف النوع مباحث کو اولیت دی گئی۔اردو زبان میں ہونے کی وجہ سے ابتدا سے ہی اردو زبان وادب کے بے شمار مسائل زیر بحث آئے ۔تین دہائیوں پر مشتمل اس مقالہ میں بے شمار تحقیقی مباحث معارف کی زینت بنے۔ابتدائی تحقیق سے آج تک کی روایت پر اگر نظر ڈالی جائے تو معارف کی یہ تحریریں اس روایت کا خوشگور پرتو ہیں۔علم و تحقیق کی دنیا کے بے شمار مباحث یہاں پیش ہوئے جو آئندہ کی تحقیقی سرگرمیوں کے لیے ایک رہنما کی مثال بنے۔تین دہائیوں کے اس تحقیقی مطالعہ کو مختلف ذیلی عناوین میں تقسیم کر کے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔امید ہے کہ اس سے سمجھنے اور تحقیق کی مختلف النوع شکلوں کو پہچاننے میں آسانی ہوگی۔

میر اثر صوفی شاعر کے طور پر مشہور خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی اور صاحب دیوان شاعر تھے۔انہوں نے اردو کی مختلف شعری اصناف میں طبع آزمائی کی ۔ان کے دیوان میں غزلیں ،رباعیات اور دو مثنویاں شامل ہیں۔ میر اثر کی مثنوی 'خواب وخیال' کو اردوادب میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ایک مدت تک یہ مثنوی کم یاب تھی۔ پہلی بار سید سلیمان ندوی نے 1917 میں معارف کے شذرات میں اس کی اطلاع دی۔وہ لکھتے ہیں:

> ''حضرت خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر دہلوی اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے۔تصوف کو بے تکلف سہل ورواں اردو غزلوں میں ادا کرنا انہیں دونوں بھائیوں پر ختم تھا۔ان کی مثنوی 'خواب وخیال' اردو زبان کا ایک انمول سرمایہ ہے۔سال تصنیف ۱۱۲۵ھ ہے۔یہ مثنوی کم یاب ہے۔شمس العلماء محمد حسین آزاد 'آب حیات' میں ایک دو فقرے سے زیادہ اس پر نہ لکھ سکے۔شاید یہ مثنوی انہیں ہاتھ نہ آئی۔مولانا حالی بھی مقدمہ دیوان میں اپنا نہ دیکھا ظاہر کرتے ہیں۔ہم اپنے دوست مولوی بشیر الحق صاحب سب انسپکٹر سون برسا کے ممنون ہیں کہ ان کی وساطت سے یہ مثنوی مستعار ہمیں ہاتھ آسکی۔''1

یہ مثنوی انجمن ترقی اردو سے 1926 میں شائع ہوئی جسے مولوی عبدالحق نے مرتب کیا تھا۔انہوں نے اس پر ایک تفصیلی مقدمہ بھی لکھا مگر اس میں معارف کا ذکر نہیں کیا گیا۔مقدمہ میں خواب وخیال کے مخطوطوں کے بارے میں مولوی صاحب لکھتے ہیں:

> ''ان کے دیوان کی طرح ان کی مثنوی بھی بہت کم یاب ہے۔مجھے ایک مدت سے اس کی تلاش تھی اتفاق سے ایک نسخہ میرے برادر معظم شیخ ضیاء الدین نے مجھے بھیجا جو انہیں کہیں سے مل گیا تھا۔میں اس کی اصلاح وترتیب میں مصروف تھا کہ مولوی نجیب اشرف ندوی نے اطلاع دی کہ انہیں ایک نسخہ انجمن اصلاح دسنہ بہار کے کتب خانے میں دستیاب ہوا ہے۔جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں انجمن کی طرف سے اسے شائع کرنے والا ہوں تو کمال عنایت سے وہ نسخہ میرے پاس

بھیج دیا جس سے مجھے اپنے نسخے کی تصحیح میں بہت مدد ملی۔'' 2

ڈھاکہ سے حکیم مولوی حبیب الرحمٰن خاں سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں اردو لغت ومحاورات کی دونادر کتب کی اطلاع دیتے ہیں جو کہ دریائے لطافت سے پہلے لکھی گئی۔اس خط سے نہ صرف یہ کہ اردو کی دوقدیم کتابوں کے متعلق واقفیت ہوتی ہے بلکہ محمد حسین آزاد کے نظریہ کا بھی باطل قرار پاتا ہے کہ انشاء اللہ خاں انشاء کی دریائے لطافت (1802) اردو قواعد کی پہلی کتاب ہے۔معارف جولائی 1917 کے شذرات میں اردو کی دونادر کتب کی بازیافت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امپیریل لائبریری کلکتہ میں شمس البیان، اردو لغت ومحاورات میں ایک کتاب ہے جو دریائے لطافت سے پندرہ برس پہلے لکھی گئی ہے۔مجھ کو یاد آتا ہے کہ اس موضوع پر ندوہ کے کتب خانہ میں بھی ایک کتاب موجود ہے۔ابھی حال میں ایک ناقص الطرفین رسالہ ہمارے دوست کے ہاتھ لگا ہے جس کا نام 'صرف اردو' ہے، رسالہ منظوم ہے اور پرانی زبان میں ہے، شیدا کوئی بزرگ ہیں، وہ اس کے مصنف ہیں۔لارڈ منٹو اور ڈاکٹر ہنٹر کی اس میں بڑی تعریف کی ہے۔سال تصنیف ۱۲۲۱ھ ہے۔دریائے لطافت سے ایک سال پہلے تصنیف پایا ہے، از راہ عنایت یہ رسالہ ہمارے مطالعے کے لیے بھیجا ہے۔'' 3

'شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان' جس کے مصنف مرزا محمد اسماعیل جان طپش ہیں۔مرزا طپش دہلی کے رہنے والے تھے۔عروض و بلاغت اور فن شعر کے ماہر تھے۔فن شاعری خواجہ میر درد سے سیکھی تھی۔خاندانی سپاہی تھے اس لیے فنون سپہ گری سے بھی واقفیت تھی۔مرزا ایک اچھے شاعر بھی تھے بیاض طپش میں موجود ہندی کلام سے آپ کا تخلص 'سدا خیر' ثابت ہوتا ہے۔'شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان' مرزا طپش نے ۱۲۰۷ھ میں قیام مرشدآباد /ڈھاکہ کے زمانہ میں لکھی تھی۔یہ کتاب چھوٹے سائز کے ۹۶ صفحات پر مشتمل پتھر کے چھاپے پر مرشدآباد سے ۱۲۶۵ھ میں شائع ہوئی تھی۔4 اس کے علاوہ قصہ یوسف زلیخا، بہار دانش، کلیات طپش، بیاض طپش وغیرہ مرزا طپش کی اہم کتابیں ہیں۔'شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان' کو عابد رضا بیدار نے خدا بخش لائبریری پٹنہ سے 1977 میں شائع کیا۔عابد رضا بیدار کتاب کی تدوین کے متعلق لکھتے ہیں:

''اب اس کتاب کے مطبوعہ نسخے بھی نایاب ہیں۔ڈھاکہ کے حکیم حبیب الرحمٰن مرحوم کو اس کا ایک نسخہ ملا تھا۔ایک نسخہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے پاس بھی تھا۔جنھوں نے قاضی عبدالودود کی فرمائش پر ایک قلمی نسخہ کی مدد سے اس کا ایک ایڈیشن بھی تیار کیا تھا پھر خدا جانے اس کا کیا ہوا۔رضا لائبریری رامپور میں بھی ایک نسخہ موجود ہے۔ایک مخطوطہ بھی رضا میں محفوظ ہے لیکن یہ مطبوعہ نسخہ کے بعد کا ہے۔ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہے۔ایشیاٹک سوسائٹی کے قلمی

نسخہ اور رامپور کے مطبوعہ نسخہ کی نقل خدا بخش کے لیے حاصل کی گئی ہیں اور ان کی بنیاد پر ایک نسبۃ بہتر نسخہ پیش کیا جا رہا ہے۔''5

شذرات کے مطالعہ سے سیکڑوں مخطوطات اور قدیم وجدید مطبوعات کے بارے میں معلومات ہوتی ہے۔فروغ کتب معارف کا ایک مستقل موضوع رہا ہے۔ مدیران معارف کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ کسی قدیم وجدید مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتاب کے اطلاع پہنچے تو بلا تاخیر اسے قارئین معارف تک پہنچا دیں۔ پٹنہ کے کتب خانہ میں موجود ایک منظوم قلمی نسخے کا تعارف دسمبر کے شذرات میں سید سلیمان ندوی کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پٹنہ کے کتب خانہ مشرقی میں اردو نظم کی ایک قدیم کتاب ہے، محمد امان قادری گورکھپور مصنف کا نام ہے۔سال تصنیف ۱۱۷۰ھ ہے یعنی اس کی تصنیف پر ۱۶۷ برس گذر چکے ہیں ۔حنفی فقہ کے مسائل اس میں منظوم ہوئے ہیں ،سات ابواب پر عبادات ومعاملات وغیرہ کے عنوانات سے اشعار ہیں ۔اس نظم کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ بحر ایسی اختیار کی گئی ہے جو ہندی رامائین سے ماخوذ ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری پر ہندی نے کس حد تک اثر کیا تھا۔''6

اردو ادب کے مختلف گوشوں کی تفتیش وتلاش ، نادر و نایاب کتب کی بازیافت اور ان ذخیروں کی حفاظت کے حوالے سے معارف کی فکرمندی دیدنی ہے۔ علم دوستی کا یہ رویہ اول تا آخر نمایاں ہے۔ نادر کتب سے دلچسپی دیکھ بہت سے قارئین بھی اپنے خطوط میں معارف کو معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اردو نثر کی ایک اہم کتاب 'گربہ نامہ' (بلی نامہ) جس کے مصنف فقیر غلام علی آزاد ہیں۔ سید صاحب شذرات میں لکھتے ہیں:

''ڈھاکہ سے ایک مخدوم نے جن کے کتب خانے کے بعض نوادر درحقیقت جواہرات میں تلنے کے لائق ہیں، ان میں سے ہمارے پاس 'گربہ نامہ' (بلی نامہ) ایک قصہ کی چند ورقہ کتاب اس تمہیدی خط کے ساتھ بھیجی ہے، کہ مجھے یقین ہے کہ دارالمصنفین کے قبضے میں اگرچہ ایک بڑا کتب خانہ ہے لیکن شاید گربہ نامہ اس میں موجود نہ ہو اس لیے بازار سے دو پیسے کی خرید کر بھیجتا ہوں۔ یہ اردو نثر میں گربہ مسکین کی مختصر سوانح عمری ہے۔ زبان پرانی ہے مگر رواں ۔قدیم اردو کے دستور کے مطابق حرف اضافت کی تقدیم وتاخیر ہے۔ جابجا آیات قرآنی ، احادیث، فارسی اساتذہ کے اشعار اور ہندی دوہے ہیں۔ خیالات ومضامین سے مولویت جھلکتی ہے۔ آخر میں مصنف نے اپنا نام فقیر غلام علی آزاد بتایا ہے۔ اس سے مراد اگر میر غلام علی آزاد بلگرامی ہیں جیسا کہ قرأن کی شہادت ہے تو اس نظریے میں اب غور کرنا پڑے گا کہ اردو نثر کی سب سے پہلی کتاب فضلی کی 'دہ مجلس' ہے، جیسا کہ مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کا دعوی ہے یا میر غلام علی آزاد کا چند ورقہ رسالہ ہے۔ یہ دونوں بزرگ ایک ہی زمانے میں تھے۔''7

اشرف علی فغان شمالی ہند کے باکمال شعرا میں سے تھے ۔اردو اور فارسی دونوں میں شاعری کرتے

تھے۔انھوں نے اردو کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی ۔میر تقی میر ،سودا ،قدرت اللہ قاسم ،درد،آرزو، مصحفی اور جانجاناں کے نہ صرف معاصرین میں سے تھے بلکہ سودا جیسے اہم شاعر نے فغاں کی تقلید میں قطعات اورغزلیں کہیں 8 (معارف اپریل1922)،البتہ اشرف علی فغاں کو وہ شہرت نہ مل سکی جو ان کے معاصرین شعرا کو ملی ۔فغاں کے مختصر حالات،کلام کا انتخاب اور شعری خصوصیات کا ذکر بیشتر تذکروں میں ملتا ہے ۔فغاں کے میر تقی میر کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔میر نکات الشعرا میں لکھتے ہیں:

''بندہ بخدمت او بسیار مربوطم'' 9

اسی طرح ان کی شاعرانہ خصوصیات کے اعتراف میں لکھا ہے:

''بسیار جوان قابل و ہنگامہ آرا،شعر ریختہ را بخوبی می گوید،گاہے فکر غزل فارسی ہم می کند'' 10

محمد حسین آزاد نے بھی 'آب حیات' میں ان کی شاعرانہ خصوصیات کی خوب داد دی ہے ، بلکہ اکثر تذکرہ نویسوں نے ان کے شعری محاسن کی تعریف کی ہے ۔البتہ جو شہرت میر ،درد،اور سودا کو نصیب ہوئی وہ فغاں کو میسر نہ ہوئی بلکہ وہ ایک مدت تک گمنامی میں رہے،اس کی ایک وجہ ان کے کلام کی غیر دستیابی ہے ۔فغاں کے دیوان سے نہ صرف عوام بلکہ خواص بھی نا آشنا تھی ۔آب حیات کی تالیف کے وقت محمد حسین آزاد کو بھی فغاں کا دیوان نہ مل سکا البتہ شیخ ابراہیم ذوق کے لڑکپن کا لکھا ہوا دیوان انہوں نے دیکھا تھا۔حسین آزا آب حیات میں لکھتے ہیں:

''ان کے جس دیوان سے میری آنکھیں روشن ہوئیں وہ میرے استاد ظاہر و باطن شیخ ابراہیم ذوق کے لڑکپن کا لکھا ہوا تھا۔اگرچہ فغاں کی زبان اسی زمانہ کی زبان ہے مگر فن شاعری کے اعتبار سے نہایت با اصول اور برجستہ ہے اور الفاظ کی بندش ان کے مشق سخن پر گواہی دیتی ہے ۔مقدار میں دیوان درد سے کچھ بڑا تھا۔مگر فقط غزلوں کا دیوان تھا۔'' 11

ماہنامہ معارف اپریل1922 کو عبدالسلام ندوی کا ایک مضمون 'اشرف علی فغاں' کے عنوان سے شائع ہوا۔جس میں پہلی مرتبہ فغاں کے قلمی دیوان کی دسنہ میں بازیابی کی خبر دی گئی تھی ۔مولانا عبدالسلام ندوی فغاں کے قلمی دیوان کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خوش قسمتی سے اس دیوان کا ایک قلمی نسخہ ہمارے ہاتھ آ گیا ہے جو دیوان درد سے بہت بڑا ہے۔ یہ نسخہ ایک انگریز کرامت جنگ جیمس ولیم کلکٹر گورکھپور نے اپنے کسی اہلکار کو تحفہ دیا تھا،اور اب یہ دسنہ لائبریری (بہار) کی ملکیت ہے ۔اس میں غزلوں کے علاوہ شروع میں دو قصیدے ہیں جو جناب امیر اور حضرت امام علی موسی رضا کی منقبت میں لکھے گئے ہیں،اخیر میں چند رباعیاں اور متفرق اشعار ہیں،دو مخمس، چند ہجویں اور بعض قطعات ہیں۔نسخہ نہایت خوش خط ہے اور اخیر میں لکھا ہے۔'انتخاب دیوان مرزا اشرف علی خاں المتخلص بہ فغاں'۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی

صاحب ذوق نے ان کے کلام کا انتخاب کر کے یہ نسخہ لکھوایا ہے ورنہ اصل دیوان اس سے بڑا ہوگا ۔اس کے ساتھ فارسی دیوان بھی ہے ۔جس کی زبان نہایت سادہ ،صاف اور سلیس ہے ۔فارسی غزلیں اکثر چھوٹی چھوٹی بحروں میں لکھی ہیں ۔اس لیے خیالات نہایت سادگی کے ساتھ ادا ہوئے ہیں۔"12؎

فاضل مضمون نگار نے نہ صرف قلمی دیوان کا تعارف کرایا ہے بلکہ اردو اور فارسی کلام کا انتخاب بھی پیش کیا ہے۔ اشرف علی خاں فغان کی شاعرانہ خصائص کو بھی اردو اشعار کی مدد سے مفصل لکھا ہے ۔عبدالسلام صاحب کا یہ مضمون اس حوالے سے کافی اہم ہے کہ اس سے نہ صرف فغاں کے دیوان کی پہلی بار بازیابی ہوئی بلکہ فغاں کے حوالے سے مباحث کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ۔معارف کی اس اطلاع کے تقریبا 26 سال بعد سید صباح الدین عبد الرحمٰن کا مضمون تین قسطوں میں معارف جنوری تا مارچ 1948 میں شائع ہوا ۔مضمون کی ابتدا میں مدیر معارف کا ایک نوٹ تحریر ہے جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ فغاں کا دیوان اب تک شائع نہیں ہوا ہے ۔البتہ ان کے حالات اور کلام کا انتخاب نئے پرانے تذکروں میں ملتا ہے ۔دیوان کے قلمی نسخے بھی نایاب ہیں ۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے ان کے دیوان کے تین اہم قلمی نسخوں کو فراہم کر کے ان کی مدد سے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا تھا ،فغاں کے حالات اور کلام پر مفصل تبصرہ بھی تحریر کیا تھا ، یہ دیوان انجمن ترقی اردو ہند نے طبع کرایا تھا مگر شائع نہ ہوسکا تھا کہ دلی کے گزشتہ فساد میں انجمن کی بیش قیمت کتابوں کے ساتھ یہ دیوان بھی تلف ہوگیا ۔مرتب نے مقدمہ میں حالات اور کلام پر تبصرہ کے ساتھ قلمی نسخون کے متعلق کئی ضروری معلومات تحریر کی تھی ۔مقدمہ کا بیشتر حصہ دیوان کے ساتھ ضائع ہوگیا البتہ فغاں کے حالات اور کلام پر تبصرہ کی ایک نقل ان کے پاس محفوظ تھی جسے ناظرین معارف کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔13؎

مدیر معارف کے مذکورہ نوٹ کے بعد سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا اصل مضمون شروع ہوتا ہے ۔جس میں مختلف عنوانات کے تحت فغاں کے نام ونسب ،حالات ،شاگرد ،مذہب ،انداز طبیعت ،ہجویں ،الفاظ کی بندش ،قطعات ،رباعیات ،معاصرین اور فغاں کی گمنامی کے سبب پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے ۔معارف کے اس مضمون کے دو سال بعد انجمن ترقی اردو سے 1950 میں فغاں کا دیوان شائع ہوا ۔مرتب کے مقدمہ سے دیوان کے تلف ہونے کی کوئی اطلاع نہیں ملتی ۔البتہ مقدمہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ 1938 میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے کتب خانہ اصلاح دسنہ (بہار) سے دیوان کا نسخہ حاصل کر کے ایک تفصیلی مقدمہ لکھا تھا ، جسے مولوی عبد الحق سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند کی خدمت میں بھیجا تھا ۔مولوی عبدالحق نے مقدمہ کو پسند کیا تھا اور انجمن کی طرف سے شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا ۔دیوان کے مزید نسخوں کی فراہمی کی امید بھی دلائی تھی ۔مگر 1942 تک مولوی عبدالحق کو

دیوان کا کوئی نسخہ نہیں مل سکا اور پھر 27 فروری 1942 کو مولوی عبدالحق نے ایک خط میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن کو لکھا کہ دیوان کا کوئی مزید نسخہ نہیں مل سکا اس لیے اسے ایسے ہی چھاپ دینا چاہیے۔14؎ اس مراسلہ کے بعد پنجاب یونی ورسٹی میں دیوان فغاں کے دو قلمی نسخوں کی موجودگی کی اطلاع ملی۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے ان قلمی نسخوں کو باضابطہ حاصل کیے اور پھر ان تینوں نسخوں کی مدد سے دیوان کی تدوین کی۔مذکورہ نسخوں کے حوالے سے سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے:

''پنجاب یونیورسٹی کا ایک نسخہ تو کتب خانہ اصلاح دسنہ (پٹنہ) سے بالکل مشابہ ہے۔دونوں میں کہیں کہیں جو اختلاف ہے اس کا ذکر دیوان کے مطبوعہ اڈیشن کے حواشی میں کر دیا گیا ہے۔ ۔دونوں میں ایک ہی کاتب کا خط معلوم ہوتا ہے۔کتب خانہ اصلاح دسنہ کے نسخہ میں کاتب کا نام نہیں مگر پنجاب یونیورسٹی کے مذکورہ نسخہ میں کاتب کا نام آخر میں سلطان علی مرقوم ہے...اس نسخہ میں فارسی کلام کے آخر میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے'ہذا اختمت انتخاب دیوان مرزا اشرف علی المتخلص بہ فغاں مخاطب بخطاب ظریف الملک کوکہ خاں بہادر سلمہ اللہ الرحمٰن مالکہ'اردو کلام کے آخر میں بھی یہی عبارت صرف چند الفاظ کے اضافہ کے ساتھ لکھی ہوئی ہے...پنجاب یونیورسٹی کے مذکورہ نسخہ میں بھی دونوں جگہ یہ عبارت درج ہے۔دونوں نسخوں میں دیوان کا خاتمہ کاتب کی ہجو پر ہوتا ہے جو حسب ذیل ہے:

یہ جو میرا ہے راقم دیوان
تحفہ ننھے کا بھولا بھالا ہے
کچھ نہ سیکھا غلط نویسی بن
ہوش جس روز سے سنبھالا ہے
ہائے مبوزسے وہ لکھے ہے خسا
آپ کا رسم الخط نرالا ہے
قاتل طبع زاد ہے ظالم
میں نے دشمن بغل میں پالا ہے
زندگی ہے میری سخن جس کو
سہو کاتب نے مارڈالا ہے 15؎

سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے مذکورہ قطعہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ فغاں نے دیوان کی کتابت اپنی زندگی میں کرالی تھی۔اور یہ دونوں قلمی نسخے شاید اسی کی ہو بہو نقل ہیں۔(دیوان فغاں،مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن،

ص50) مذکورہ نسخوں میں ابتدائی 52 صفحات میں فارسی غزلیں اور ایک ہجو اور اس کے بعد اردو کلام ہے۔ اردو کلام کی ابتدا میں تین قصائد ہیں جو امیر المومنین حضرت علیؓ اور امام موسی رضا کی مدح و منقبت میں لکھے گئے ہیں۔ اردو کلام میں غزلوں کے ساتھ ساتھ رباعیاں، قطعات، مخمس اور ہجویں ہیں۔ اردو کلام مجموعی طور پر 146 صفحات پر مشتمل ہے۔ 16

پنجاب یونیورسٹی کا دوسرا قلمی نسخہ پہلے نسخہ کے بالمقابل کم اہم ہے۔ اس میں جا بجا غلطیاں ہیں۔ کاتب کا نام مذکور نہیں ہے البتہ کتابت سے ظاہر ہے کہ اس کا کاتب جدا ہے۔ البتہ آخر میں مالک کتاب کا نام خدا بخش خواجہ لاہور درج ہے۔ اس نسخہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی کچھ غزلیں اور اشعار مذکورہ بالا دونوں نسخوں میں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ تذکرہ نگاروں نے فغاں کے کلام کا جو انتخاب شامل کیا ہے اس کے بیشتر اشعار اس نسخہ میں موجود ہیں۔ 17

سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے فغاں کے قلمی دیوان اور کلام کی خصوصیات کے ساتھ ان کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ فغاں کا نام مرزا اشرف علی اور فغاں تخلص تھا۔ وہ شاہ جہاں آباد میں پیدا ہوئے۔ مگر ان کی پیدائش کا سن اب بھی تحقیق طلب ہے۔ کسی بھی تذکرے میں فغاں کی پیدائش کا سن نہیں ملتا اور نہ ہی فغاں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ احمد شاہ فغاں کے رضاعی بھائی تھے۔ احمد شاہ کا سن پیدائش 1141ھ ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے احمد شاہ کی سال پیدائش پر قیاس کرتے ہوئے ان کی پیدائش کا سن تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مرزا اشرف علی خاں نام اور فغاں تخلص تھا۔ شاہ جہاں آباد میں پیدا ہوئے۔ سن ولادت معلوم نہ ہو سکا، مگر احمد شاہ کے رضاعی بھائی تھے، اس لیے اس کے سن ولادت سے ان کی پیدائش کی تاریخ بھی متعین کی جا سکتی ہے۔ احمد شاہ کا سن پیدائش 1141ھ ہے۔ رضاعی بھائی ہونے کی حیثیت سے اشرف علی خاں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو سال بڑے ہوں گے، اس لیے 1139ھ سے 1141ھ تک کسی میں ان کی پیدائش ہوئی ہوگی۔'' 18

والد کا نام مرزا علی خاں نکتہ تھا۔ ان کا خاندان دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے ممتاز اور تیموری دربار سے گہرا تعلق تھا۔ ماں نے احمد شاہ کو دودھ پلایا اس لیے خود کوکہ خاں، کوکلتاش خاں بہادر کہلائے۔ چچا ایرج خاں مرشد آباد میں شاہی ملازم شاید وہاں کے حاکم تھے۔ 19 فغاں بچپن سے جوانی تک احمد شاہ کے ساتھ رہے۔ احمد شاہ کے تخت نشینی کے بعد اس کے ندیم خاص مقرر ہوئے۔ احمد شاہ ان کی لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی سے بہت متاثر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ظریف الملک کو کا خاں بہادر کا خطاب عطا کیا۔ احمد شاہ کی معزولی کے بعد انھوں نے دہلی چھوڑ دی تھی۔ دہلی سے نکلنے کے بعد انھوں نے کس طرف کا رخ کیا اس حوالے سے متعدد روایات ملتی ہے۔ دہلی سے نکل کر مرشد آباد پہنچے۔ مرشد آباد میں بھی زمانے نے ان کا ساتھ نہ دیا اور وہ وہاں سے واپس دہلی پہنچے۔ دوبارہ دہلی سے کب

نکلے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا البتہ وہاں سے نکل کر شجاع الدولہ کے دربار میں حاضر ہوئے۔ وہاں سے نکل کر عظیم آباد پہنچے۔20

میر تقی میر نے لکھا ہے کہ وہ قزلباش خاں امید کے شاگرد تھے۔ مصحفی اور لطف نے انہیں ندیم کا شاگرد بتایا ہے 21 ممکن ہے پہلے امید سے اصلاح لیتے رہے ہوں پھر ندیم کے شاگرد ہوئے ہوں۔ فغاں مذہبا شیعہ تھے دیوان کا آغاز حضرت علیؓ کی مدح سے کیا ہے۔22 گلشن ہند اور سخن شعرا میں فغاں کا سال وفات 1186 لکھا ہے البتہ مدفن کا پتہ نہ چل سکا۔23

سرورالہدی نے تقریبا پچاس سال بعد مزید دو نسخوں کی بازیابی کی اور پھر پانچ نسخوں کی مدد سے فغاں کے دیوان کو مرتب کر کے 2003 میں شائع کیا۔ ان کے مرتبہ دیوان کی خاص بات یہ ہے کہ بعض غزلیں اور اشعار جو بوسیدہ ہونے کی وجہ سے نامکمل تھے انہیں مکمل کیا اور بعض نئی غزلوں سے دیوان میں اضافہ بھی کیا۔ مرتب نے نہ صرف ان کے دیوان کی تدوین کی بلکہ متعدد تذکروں، تاریخوں کی مدد سے ان کے حالات، معاصرین، استاذ و شاگرد اور کلام کے فنی محاسن اور معائب پر بھی مفصل روشنی ڈالی ہے۔ البتہ فغاں کی زندگی کے وہ پہلو جو کمیاب اور تاریک تھے اس پر کوئی خاص تحقیق نہیں ملتی۔

فغاں کے حالات کا ذکر کسی تذکرہ یا تاریخ میں مفصل نہیں ملتا۔ ان کی زندگی متعلق اکثر پہلوؤں پر اختلافی آرا ملتی ہیں۔ معارف اس حوالے سے خوش نصیب ہے کہ اس نے فغاں کا نہ صرف دیوان ادبی دنیا تک پہنچایا بلکہ ان کے ذکر کو دوبارہ چھیڑا۔ ان کا دیوان تو مرتب ہو گیا البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے حالات سے متعلق دوبارہ تحقیق کی جائے اور ان کی زندگی کے گمشدہ اور تاریک پہلوؤں کو روشن کیا جائے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کو ان کا مدفن نہ مل سکا تھا۔ سرورالہدی نے ان کے مدفن کو تلاش کیا اور ان کے مدفن کی کچھ تصاویر بھی اپنے مرتبہ دیوان میں شامل کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''آخر کار یہ غریب الوطن شاعر عظیم آباد کو وطن ثانی بنا کر جیتے جی کہیں اور کا رخ نہیں کرتا ہے۔ 1186ھ میں زندگی کی آخری سانس لے کر عظیم آباد میں ابدی نیند سو جاتا ہے۔ فغان کی قبر محلّہ دھول پورہ، پٹنہ سٹی کی شیر شاہی مسجد سے شمال کی جانب باون برج کے امام باڑے کے احاطہ میں ہے۔ مگر اب یہ زمین دوز ہو گئی ہے صرف کتبے کا اوپری حصہ نظر آتا ہے... کتبے پر حکیم ابوالحسن مفتوں کا یہ قطعہ تاریخ وفات کندہ ہے۔
>
> کوکہ خاں آن بہار باغ سخن
>
> سوئے خلد بریں زدنیا رفعت

کرد مفتوں چو فکر تاریخش
گفت ہاتف سرور دلہا رفت 24؎

مرزا محمد رفیع سودا (1712ـ1781) ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ انہوں نے غزل، رباعی، قصیدہ شہر آشوب، مرثیہ، ہجویات اور مدحیات غرض یہ کہ انہوں مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر ان کی وجہ شہرت ان کے قصائد ہیں۔ سودا کے قلمی و مطبوعہ دیوان کے سیکڑوں نسخے ہندوستان اور بیرون ملک میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق نے دیوان سودا کو 1985 میں چھبیس نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے اور ان تمام نسخوں کی اطلاع دی ہے جو ہندوستان اور ہندوستان باہر موجود ہیں۔ ایسے ہی ایک اہم نسخے کی اطلاع سید سلیمان ندوی نے اگست 1922 کے شذرات میں دی ہے۔ یہ نسخہ مختلف حیثیتوں سے اہم ہے۔ سید سلیمان ندوی کتب خانہ آصفیہ میں موجود سودا کے قلمی دیوان کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صدر الصدور دولت آصفیہ حیدآباد دکن کے کتب خانے میں سودا کے دیوان کا ایک نادر نسخہ بہم پہنچا ہے، علاوہ خوش خطی اور دیگر اوصاف ندرت کے ایک خاص بات اس میں یہ ہے کہ نسخہ عین اس وقت پایہ تکمیل کو پہنچ رہا تھا جب نادر شاہ اپنی قہار فوجیں لیے ہوئے دلی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ کاتب نے کتاب کے آخر میں لکھا ہے کہ یہ سطریں جس وقت لکھی جارہی ہیں نادر شاہ کی فوجیں شہر میں داخل ہو رہی ہیں۔ کیا یہ علمی یک سوئی کی عجیب وغریب مثال نہیں کہ جب شہر اضطراب اور بے چینی کی کروٹیں لے رہا تھا، ایک سودا زدۂ علم دیوان سودا کی کتابت میں مصروف تھا، یہ ذوق فن ہر بوالہواس کو کہاں نصیب۔'' 25؎

سودا کا ایک قدیم قلمی دیوان جو کم یاب تھا۔ اگست 1922 کے شذرات میں سید صاحب نے اس نسخے کے دریافت کی اطلاع دی اور اس کا مختصر تعارف بھی لکھا یہی نسخہ ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق نے 1985 میں اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔

سید سلیمان ندوی نے معارف اکتوبر 1922 کے شمارے میں 'اوراق پارینہ' کے عنوان کے تحت ایک قدیم نصابی کتاب 'مجمع گنج' کا تعارف کرایا ہے۔ سید صاحب کو یہ کتاب دسنہ بہار کے ایک کتب خانہ کی ردی کتابوں میں ملی۔ نادر مخطوطات اور مطبوعات کے حوالے سے معارف کے صفحات پر یہ اہم تحریر ہے۔ 1845 میں یہ کتاب کمپنی کے عہد میں کلکتہ اسکول بکس سوسائٹی میں چھپی۔ یہ کتاب کمپنی کے قائم کردہ ابتدائی اسکول میں پڑھائی جاتی تھی اور طلبہ کو بطور انعام بھی دی جاتی تھی۔

کتاب کا یہ نسخہ 1855 میں دسنہ بہار کے حاجی وزیرالدین کو گیا اسکول کے مشرقی صیغہ کی طرف انعام میں ملی تھی۔ یہ چھوٹی تقطیع کے 217 صفحات میں ہے اوراس میں 28 مضامین اورعنوانات ہیں۔اس میں ہندوستان میں پیدا ہونی والی نیل، روئی، افیون، ململ اور ریشم کے کپڑے، گنا، تباکو اور ہندوستان کی تجارت کے علاوہ اس وقت کے ہندوستان کے احوال کا تذکرہ ہے۔ مثلاً اس وقت کے ہندستان کے ملکوں کے نام حسب ذیل لکھے ہیں:

''ہندستان کی سرحدوں میں جتنے ملک اور شہر ہیں ان کے نام۔ ہند کے دکھن میں جتنی بستیاں ہیں اور شہر ہیں ان کا بیان۔اوڑیسہ، تلنگ، دروار، میسور، حیدرآباد، تراون کوٹ، مملکت پیشوا، یا رئیس مرہٹہ پونہ، ناگپور سے سب ملک 1819 مسیحا میں کمپنی کے دخل میں آئے۔ ہند کے اتر کو جو بستیاں اور آبادیاں ہیں ان کا بیان۔ بنگالہ، مہدیا، بہار، بنارس، بوندیل کھنڈ، بگھیل کھنڈ، متھیلا یا ترہت، خوشل، اودھ، متھرا، ہریانہ، میاں دو آب، جے پور، بیکانیر، ریاست سندھیا، ریاست ہلکر، پنجاب، ملتان، سندھ، گجرات، سوائے ان کے اور بھی ملک ہیں۔'' 26؎

اس کتاب میں ایک باب ہندستان کی پیداوار اور تجارت کے بیان میں ہے۔جس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کا قدیم ہندستان جو کہ برباد ہو چکا تھا پھر بھی کس قدر ثروت مند اور تجارت کا مرکز تھا۔ کتاب کی کچھ عبارتیں نقل کی جاتی ہیں تا کہ قدیم ہندستان کی تجارت اور شہرت کا اندازہ لگایا جا سکے:

''ہند میں جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں دوسرے ملک میں لے جا کر بیچنے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ ہند میں دولتمند ہونے کا بڑا وسیلہ سوداگری ہے۔ جو چیزیں آدمی کو ضروری ہیں ان کی بہتات سے پیدا ہونے کے سبب ہند کے رہنے والوں کو غیر ملک سے کوئی چیز لانے کی احتیاج کم ہوتی ہے۔ بلکہ ملک سے بہت چیزیں جو اور ملکوں کے رہنے والوں کو ضروری ہوتی ہیں خواہ کھانے کی چیز ہو جیسے دھان، چاول، گیہوں، خواہ کسی صنعت کے لیے ہو جیسے ریشم، روئی دوسرے ملکوں میں لے جاتے ہیں۔اور اسی سوداگری کے وسیلہ سے بہت دولت دوسرے ملکوں سے اس ملک میں آتی ہیں۔''
27؎

انگلستان کے گزشتہ عہد جہالت پر بھی ایک باب شامل ہے۔ کتاب کا اہم باب اسکندریہ کے مشہور کتب خانہ کے جلائے جانے کے متعلق ہے جس کا ملزم مسلمانوں کو ٹھہرایا گیا ہے۔ کتاب میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ یورپ کے علوم وفنون کو اپنی زبان میں منتقل کریں۔ کتاب کے عنوان کے نیچے درج عبارت سے کتاب کے لکھے جانے کے مقصد کا علم ہوتا ہے۔:

''عقل کو روشن کرنے والی تعلیمون کا اور دانائی سکھانے والی ۔۔۔۔کا اس میں اکثر ملکوں کی بستی، شہر اور ادیبوں کے احوال کا بیان ہے۔ ہندوستانی لڑکوں کے لیے انگریزی سے زبان اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔'' 28؎ سید

سلیمان ندوی کتاب کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی طلبہ کو جدید معلومات سے روشناس کیا جائے ،اس لیے جو باتیں اس وقت نئی معلوم ہوتی تھیں اس کا ذکر ہے۔۲۔ چونکہ ہندوستان میں اس وقت تک مسلمان طاقتور عنصر تھے ،اس لیے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں اور عیسائی بادشاہوں کے درمیان تعلقات، جنگ وصلح بہت پرانے ہیں۔ جنگ صلیبی کا ایک باب ہے ،فتح اندلس کا ذکر ہے، سلطان روم کا بیان ہے۔۳۔ اس وقت تک انگریز زیادہ عقلمند یا متکبر نہیں ہوئے تھے اس لیے پہلے اپنی واپنے ملک اور اپنے براعظم یورپ کی جہالت کا ذکر کر کے پھر اپنی عقلمندی اور دانشوری اور ترقی کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ انگلستان کے گذشتہ عہد جہالت پر بھی ایک باب ہے۔'' 29

مجمع گنج سے تاریخ ادب کا کوئی بڑا مسئلہ وابستہ نہیں مگر معارف کے ابتدائی تحقیقی رجحانات کے حوالے سے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ واضح رہے کہ انگریزوں کی آمد کے بعد تراجم کی روایت کو فروغ ملا۔ اس نوع کی بہت سی نصابی کتب مرتب کی گئیں۔ مرزا غالب کی انشائے غالب بھی نصابی ضرورت کے تحت مرتب کی گئی تھی نیز ایک کتاب 'جواہر منظوم' (اشاعت: 1867) بھی ہے۔ یہ انگریزی نظموں کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ گارساں دتاسی کے خطبے میں اس کتاب کا ذکر ہے۔ 30

ماہنامہ معارف فروری 1923 کو قاضی عبد الودود کا مضمون 'جامع الاخلاق' شائع ہوا۔ جس میں فارسی کی معروف علمی کتاب اخلاق جلالی (لوامع الاشراف فی مکارم الاخلاق) کے اردو ترجمہ جامع الاخلاق کا تعارف کرایا گیا ہے۔ تصوف، نفس اور اخلاق کے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ یہ کتاب اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ کسی قدیم کتاب کو اردو میں منتقل کرنے کی پہلی کوشش ہے۔ 31 اخلاق جلالی کا ترجمہ مولوی امانت اللہ نے 1805 میں فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے دوران کپتان جیمس ماونٹ کی فرمائش پر کیا تھا۔ اس کے مطبوعہ نسخے کمیاب تھے۔ قاضی عبد الودود نے 1923 میں ادبی دنیا سے متعارف کرایا۔

مولوی امانت اللہ مترجم جامع الاخلاق کے سوانحی حالات تاریک ہیں۔ بیشتر تذکرے بھی ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ البتہ دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ہدایت الاسلام کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ شاعری بھی کرتے تھے شیدا تخلص کرتے تھے۔ قاضی عبدالودود کے مطابق ان کے پاس موجود نسخہ مطبع احمدی کلکتہ اردو ٹائپ میں مولوی غلام حیدر ساکن ہوگلی کے اہتمام سے 1848 میں طبع ہوا تھا۔ صفحات کی تعداد 268 ہے اور ہر صفحہ میں 17 سطریں ہیں۔ 32 قاضی عبد الودود کا یہ مضمون بہت مختصر ہے البتہ مخطوطہ کے متعلق بڑی حد تک معلومات حاصل ہو جاتی ہے۔ قاضی صاحب کا یہ مضمون نہ صرف اس حوالے سے اہم ہے کہ اس کے ذریعہ پہلی بار جامع اخلاق سے

اردو دنیا متعارف ہوئی بلکہ اس تحریر سے دوبارہ تحقیق کا سلسلہ شروع ہوا۔

قاضی عبدالودود کے اس مضمون کے چند ماہ بعد 'جامع الاخلاق' کے عنوان سے مولوی سید مقبول احمد صاحب کا مضمون معارف جون 1923 کو شائع ہوا۔جس میں جامع الاخلاق کے دوسرے نسخہ کا تعارف پیش کیا گیا۔مقبول احمد نسخہ کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جامع الاخلاق یعنی اخلاق جلالی کے ترجمہ کا دوسرا اڈیشن ہے۔اصل کتاب لوامع الاخلاق فی مکارم الاخلاق سے موسوم تھی اسی مناسبت سے ترجمہ کا نام جامع الاخلاق رکھا گیا۔دوسرے اڈیشن کے سرورق پر جلی قلم سے یہ لکھا ہوا ہے۔نام اس کتاب سعادت انتساب کا جامع الاخلاق ہے اور یہ ترجمہ ہے لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق عرف اخلاق جلالی کا اردو زبان میں 1220ھ میں مطابق 1805 کے مولوی امانت اللہ مرحوم نے جو فورٹ ولیم کالج کے درمیان منشی تفریق ہندی تھے اس کو ترجمہ کیا تھا۔اب 1850 میں حسب ارشاد فیض بنیاد صاحب والامناقب علیا مناصب قدرداں علم وہنر ابر جود وسخا گستر جناب معلیٰ القاب مسٹرلٹن صاحب بہادر پرنسپل مدرسہ آگرہ کے سید اشرف علی واسطی مہتمم مطبع العلوم متعلقہ مدرسہ دہلی نے اس کو مطبع العلوم میں باہتمام اپنے چھپوایا۔اسی سرورق کو جو جدول وگل کاری سے تمام تر معرا ہے لوح کتاب بھی سمجھ لیجیے۔کیوں کہ ورق الٹنے پر پہلا صفحہ اور دیباچہ مترجم شروع ہوجاتا ہے۔یہ نسخہ لیتھو یعنی پتھر پر طبع ہوا ہے۔تقطیع بارہ انگشت لمبی اور سات انگشت چوڑی،تعداد صفحات 261 ہے۔ہر صفحہ پر بیس سطریں ہیں۔چاروں طرف اکہری جدول،کاغذ سفید گندہ جس کی سفیدی باوجود مرور ایام ودست گردانی ومزاولت کے اب تک قائم ہے۔قلم متوسط خط صاف نستعلیق جیسا آج کل علی گڑھ یونی ورسٹی کی مطبوعات کا ہوتا ہے۔اغلاط میں بھی کمی نہیں۔''33

پہلے اڈیشن کے بالمقابل دوسرے اڈیشن میں جگہ جگہ غلطیاں ہیں۔پہلے اڈیشن کے دیباچہ میں جس فرہنگ اصطلاحات کا وعدہ کیا گیا تھا دوسرے اڈیشن میں بھی مفقود ہے۔مترجم نے مصنف کے احوال پر باضابطہ ایک باب قائم کیا ہے مگر مترجم نے اپنے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔البتہ مقبول احمد نے ان کے اسلوب نگارش اور کلام کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''ترجمہ کی زبان بتاتی ہے کہ کہ بالائے ہند کے باشندہ تھے۔نعت شریف کے انداز نگارش سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب شیعہ امامیہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن کمال خوبی وقابلیت یہ ہے کہ ترجمہ میں معتقدات کا اظہار کسی پیرایے سے نہیں ہونے پایا۔اکابر دین وسلف کرام کے نام نامی اور ذکر گرامی اسی شان ادب اور پرداز عظمت سے لکھے ہیں جیسے محقق علامہ کے قلم سے نکلتے ہیں۔اس ترجمہ سے پہلے ہدایت الاسلام کی پہلی جلد سے فارغ ہو چکے تھے۔خدا معلوم دوسری جلد لکھنے کی

نوبت بھی پہنچی یا نہیں۔مثنوی کے خاتمہ میں اپنا تخلص شیدا درج کیا ہے... شیخ صاحب نظم ونثر ریختہ دونوں پر قدرت بلیغ رکھتے تھے۔ان کی شاعری محض سادہ علمی، اخلاقی اور پند آموز تھی اس لیے ان میں وہ شوخی اور مقبولیت نہیں پائی جاتی ہے جو ان کے معاصر شعرا کے حصے اور ان کی داستان ہائے عشق افزا کے صلے میں آئی۔ان کے کلام پر نگاہ ڈالتے وقت یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہئے کہ وہ ایک سرکاری کالج کے ذمہ دار استاد اور مترجم تھے۔پیشہ ور نغمہ گو، نکتہ سنج سخن طراز نہیں۔اسی کتاب میں مشہور اشعار فارسی یا مقولوں کے ترجمے میں انہوں نے بلا کدو کاوش اظہار کمال کیا اور جہاں گنجائش پائی ہے۔رنگینی وگل افشانی سے بھی کام لیا ہے۔''34

مولانا حکیم سید منظور احمد طاب ثراہ کا کتب خانہ واقع قصبہ صدان ضلع فرخ آباد جس میں بے شمار قلمی اور مطبوعہ کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے۔مقبول صاحب کے مطابق اس میں جامع الاخلاق کے متعدد قلمی اور مطبوعہ نسخے موجود ہیں البتہ سب سے بہتر نسخہ آہنی چھاپہ خانہ کلکتہ مطبوعہ 1810 کا ہے۔جس کو انہوں نے اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔اس نسخہ میں اصل فارسی نسخہ اور ترجمہ دونوں منسلک ہے۔ترجمہ کے صفحات 251 اور اصل عبارت 189 ہے۔خاتمہ میں موجود عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب فقیر نثار علی کے اہتمام سے جنوری 1852 کو مطبع العلوم مدرسہ دہلی میں چھاپی گئی۔35 مقبول احمد صاحب نے نہ صرف یہ مطبوعہ نسخہ کا تعارف کرایا ہے بلکہ نسخہ میں پائی جانے والی غلطیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔جامع الاخلاق کے نسخے کمیاب تھے البتہ اب کئی نسخہ دستیاب ہیں ان میں سے بعض نسخے ریختہ پر بھی دستیاب ہیں۔البتہ مولوی امانت اللہ کے سوانحی حالات اب بھی تحقیق طلب ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تحریروں کو دوبارہ پڑھا جائے اور نئے طریقہ سے نہ صرف اس کتاب کی تدوین کی جائے بلکہ ان کے سوانحی حالات بھی متعدد ذرائع سے دستیاب کیے جائیں۔

مولانا الطاف حسین کی شخصیت محتاج تعارف نہیں وہ نہ صرف اردو تنقید کے بنیاد گزاروں میں سے ہیں بلکہ انہوں نے یادگار غالب اور حیات جاوید جیسی غیر معمولی اہمیت کی حامل سوانح عمریاں بھی تحریر کیں۔اس کے علاوہ حالی نے کئی اہم کتابیں تحریر کیں۔ان کی لکھی ہوئی کتابوں سے ہر کوئی واقف ہے البتہ کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ مولانا حالی نے خود اپنی کہانی تحریر کی تھی، جو نایاب تھی معارف نے اس کی اطلاع اردو دنیا تک پہنچائی۔دراصل مولانا حالی نے اپنے سوانحی حالات قلم بند کر کے نواب عماد الملک بلگرامی کی خدمت میں بھیجا تھا۔نواب صاحب کے انتقال کے بعد ان کے کاغذات میں یہ مسودہ ملا۔جسے مدیر معارف کے ایک مختصر نوٹ کے ساتھ ماہنامہ معارف مئی 1927 کو شائع کیا گیا۔مدیر معارف کا نوٹ ملاحظہ ہو:

''ہمارے پچھلے نامور مصنفین میں مولانا حالی کا جو درجہ ہے وہ مخفی نہیں، وہ حیات جاوید مصنف ہو کر خود حیات جاوید پا چکے ہیں۔ان کی سخنوری، سخن فہمی، نکتہ رسی اور متانت تحریر اپنا جواب نہیں

رکھتی۔ایسی ہستی اگر کسی دوسری قوم کو حاصل ہوتی تو اس کی مستقل سوانح عمریوں اور اس کے کارناموں کے تبصروں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہوتا۔مگر ہماری غفلت کی انتہا ہے کہ چند صفحوں کے سوا ان کے سوانح حیات کا کوئی ورق بھی نہیں ملتا۔ایسی حالت میں معارف کس قدر خوش قسمت ہے کہ اس کو مولانا حالی کی خودنوشت سوانح عمری کا مسودہ ہاتھ آ گیا ہے۔یہ چند صفحوں کی تحریر ہے جس میں مولانا نے اپنے کل حالات قلم بند کیے ہیں اور اس کو نواب عماد الملک بلگرامی مرحوم کی خدمت میں بھیجا تھا۔بلکہ عجب نہیں کہ نواب صاحب مرحوم کی فرمائش ہی سے اس کو لکھا ہو۔نواب صاحب کی وفات کے بعد ان کے کاغذات میں یہ مسودہ ملا اور آج وہ معارف کے صفحات کی زینت بن رہا ہے۔ہم نے چاہا کہ اس کا چربہ اور عکس اتار کر چھاپیں،مگر گو اس پر مصنفانہ کاٹ چھانٹ اور حک واصلاح موجود ہے۔تاہم یہ یقین نہیں ہے کہ وہ خود مولانا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ہے اور خط بھی ہے اس لیے اس خیال کو چھوڑ دیا۔'' 36

مولانا شبلی نعمانی اور حالی کے گہرے مراسم تھے۔علی گڑھ کی ملازمت کے دوران ایک مدت کا ساتھ رہا۔حیات جاوید پر علامہ شبلی نے تبصرہ بھی کیا تھا جو معارف میں شائع ہوا تھا۔حالی کی بعض اہم تحریروں اور متعدد خطوط کو علمی دنیا تک پہنچانے کا شرف معارف کو حاصل ہے۔معارف میں حالی کے متعلق نہ صرف متعدد مضامین اور مقالات شائع ہوئے بلکہ حالی کے 9 غیر مطبوعہ خطوط پہلی بار معارف میں ہی شائع ہوئے۔ماہنامہ معارف کو یہ خوش نصیبی حاصل ہے کہ مولانا حالی کی خودنوشت سوانح عمری سب پہلے معارف میں شائع ہوئی۔

مولانا الطاف حسین حالی کی یہ خودنوشت بہت مختصر ہے البتہ ولادت،سلسلہ نسب،خاندان کا ذریعہ معاش،والد کا انتقال،تعلیم تعلیم کا شوق دہلی لے گیا،انگریزی نہ پڑھنے کے وجوہات،دلی سے جبری واپسی، ملازمت،1857 کا غدر اور ملازمت کا چھوڑنا،دوبارہ تعلیم کا آغاز،مرزا غالب کی خدمت میں باریابی،نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے تعلق،گورمنٹ بک ڈپو کی ملازمت،لاہور میں ایک نئے قسم کے مشاعرے کا آغاز،انگلوعربک اسکول کی مدرسی،تریاق مسموم کا لکھنا،مسدس اور بعض دیگر نظموں کی تصنیف،مجالس النسا کی تصنیف،حیات سعدی لکھنا،مقدمہ شعروشاعری اور دیوان کا شائع کرنا،یادگار غالب کی تصنیف اور حیات جاوید جیسے عنوانات کے تحت زندگی کے اہم پہلوؤں کو رقم کیا گیا ہے۔اپریل 2015 حالی صدی کے موقع پر مولانا حالی یاد میں ایک روزہ سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ سیمینار میں پیش کیے جانے والے مقالات کو کتابی شکل میں پیش کیا گیا جس میں حالی کی خودنوشت کو بھی شائع کیا گیا۔

عظیم آباد ایک عہد تک نہ صرف علم وادب کا گہوارہ رہا ہے بلکہ اسے ایک دبستان کی حیثیت بھی حاصل رہی ہے۔اردو کے کئی نامور ادبا وشعرا کا مسکن بھی رہا ہے۔دہلی کے اجڑنے کے بعد شعرا وادبا کی ایک بڑی تعداد نے عظیم آباد کا رخ کیا۔دلی سے عظیم ہجرت کرنے والوں میں ایک نام عشق عظیم آبادی کا ہے۔میر کے بعد اردو کا پہلا

تذکرہ ' تذکرہ عشق'اسی سرزمین پر لکھا گیا۔عشق عظیم آبادی کا شمار اردو کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔مرزا محمد علی فدوی، میر غلام حسین شورش،خواجہ محترم خاں محترم،خواجہ مکرم خاں حریف ،خواجہ عاصم خاں شور،اور خواجہ اعظم خاں عاشق جیسے شعرا عشق کی درسگاہ معرفت سے فیض یاب ہوئے۔ان کے حالات اور کلام کا انتخاب اکثر تذکروں میں ملتا ہے البتہ ان کا کلیات نایاب تھا۔اصحاب ذوق کی تلاش وجستجو کے بعد بھی کلیات عشق دستیاب نہ ہوسکا۔حسرت موہانی بھی اس کلیات کی تلاش میں عظیم آباد گئے مگر افسوس ان کی یہ حسرت پوری نہ ہوسکی۔37 معارف کو یہ خوش نصیبی حاصل ہے کہ کلیات عشق کے بازیابی کی اطلاع سب سے پہلے معارف کے ذریعہ اردو دنیا کو ملی۔مولوی سید حسن رضا کا مضمون 'شاہ رکن الدین عشق عظیم آبادی ان کا کلیات اور تذکرہ حیات' معارف مئی 1929 میں شائع ہوا۔جس میں پہلی بار کلیات عشق کی دستیابی کی خبر دی گئی۔مولوی سید حسن رضا عظیم آباد کی علمی وادبی ماضی پر تمہیدی کلمات ادا کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔:

> ''افسوس ہے کہ امتداد زمانہ کے ہاتھوں اسلاف کے یہ کارنامے آج گردفنا میں روپوش ہیں اور جو کچھ باقی بھی ہیں ان کا وجود ڈوبنے والے ستاروں سے زیادہ نہیں اس لیے ہمیں فخر وناز کا اس وقت تک کوئی حق نہیں پہنچتا جب تک انہیں اپنی سعی وتلاش ،کوشش وکاوش سے دوبارہ منظر عام پر نہ لاسکیں۔اسی جذبی کی کشش اور خیال کی نشونما نے مجھے کلیات عشق سے ملایا، یہ کلیات بھی مدتوں سے اور اساتذہ کے کلام کی طرح نایاب تھا۔اصحاب ذوق وجستجو وتلاش کی ناکامیوں سے پاشکستہ ہو چکے تھے۔مولانا حسرت موہانی بھی اسی جستجو وتلاش کی امیدیں لیکر عظیم آباد تک آئے ،مگر افسوس کہ ان کی بھی یہ حسرت پوری نہ ہوسکی، یہاں تک کہ ہمارے صوبہ کے مشہور شاعر ومورخ حضرت شاد بھی تاریخ نہاں میں لکھ گئے ہیں۔ان کے چند اشعار ہمارے بزرگوں کی زباں پر تھے اور خود ان کے ذخیرہ معلومات ایک مطلع سے زیادہ نہ تھا جسے انہوں نے حیات فریاد میں درج بھی کردیا ہے۔مجھے اپنی قسمتوں پر ناز ہے کہ اپنی گمنامی نادانی کے باوجود عشق کا کلیات حاصل کرلیا، اب اس کا انتخاب یادگار عشق کے نام سے شائع کررہا ہوں۔اس ناچیز تالیف کے تین باب ہیں حالات زندگی، خصوصیات شاعری اور انتخاب کلام۔''38

مضمون نگار نے نہ صرف یہ کہ عشق عظیم کے کلیات کی بازیابی کی بلکہ 35 حوالوں سے ان کے مختصر حالات بھی رقم کیے ہیں۔ان سے متعلق متعدد غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے۔اب تک یہ رائے عام تھی کہ عشق عظیم آبادی راسخ عظیم آبادی کے شاگرد تھے انہوں نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا کہ راسخ عظیم آبادی خود عشق کے ایک شاگرد مرزا فدوی کے شاگرد تھے۔39 معارف کے مذکورہ مضمون کے تقریبا چالیس سال بعد 1979 میں قریشہ حسین نے آٹھ نسخوں کی مدد سے عشق کی کلیات کو مرتب کرکے شائع کیا۔کلیات کی تدوین کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''ثاقب عظیم آبادی نے 'یادگار عشق' لکھ کر رکن الدین عشق کے نام کو محتاج تعارف نہ چھوڑا تھا۔لیکن ان کی تصنیف کو تحقیق سے دور کا بھی لگاو نہ تھا۔....میں نے ستمبر 1957 سے کام شروع کیا اور ناقص اور مکمل، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ آٹھ نسخوں کا کھوج لگایا۔ان نسخوں میں بتیاوالا نسخہ اساسی حیثیت رکھتا۔یہ مکمل بھی ہے اور قدیم ترین بھی۔کلیات کی ترتیب میں میں نے اسی نسخہ کو اساسی حیثیت دی ہے۔اور دوسرے نسخوں اور ماخذوں میں جو اختلافات نظر آئے ہیں ان کی تفصیل 'فٹ نوٹس' میں درج کردی گئی ہے۔اور مجھے یہ کہنے میں کچھ تامل نہیں کہ 'کلیات عشق' کو پہلی بار اس کی پوری آب وتاب کے ساتھ تحقیق کی روشنی میں پیش کیا جارہا ہے۔ثاقب عظیم آبادی نے کلام عشق کی ایک جھلک نامکمل سی جھلک دکھائی تھی۔کلیات عشق کے ایک دو نسخوں کا لوگوں کو علم تھا لیکن اس کی تفصیلات، اس کی ضخامت، اس کی خصوصیتوں کا صحیح علم نہ تھا۔اب کلیات آپ کے سامنے ہے اور اب یہ بات ممکن ہے جو پہلے محال تھی کہ عشق کی تاریخی اور ادبی اہمیت کا پوری طور سے صحیح جائزہ لیا جاسکے۔فدوی اور راسخ سلسلہ عشق کی دو کڑی ہیں جو منظر عام پر آچکی ہیں۔اور اب کلیات عشق کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا شاید غلط نہیں کہ اگر عشق نہ ہوتے تو فدوی اور راسخ بھی نہ ہوتے کم ازکم ایسے تو نہ ہوتے جیسے وہ ہیں۔''40

کلیات کی تدوین 'حضرت رکن الدین عشق اور ان حیات وشاعری' کے نام سے کیا ہے۔پوری کلیات کو چھ ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔عشق تذکروں اور دیگر کتابوں میں، حیات عشق، تلامذہ عشق، ماخذ کلام عشق، عشق کی شاعری اور عشق کی زبان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ڈاکٹر قریشہ حسین نے نہ صرف ان کی کلیات کی تدوین وترتیب کی بلکہ ان کے سوانحی احوال پر بھی تفصیل سے روشنی دالی ہے۔ان کی زندگی اور شاعری کے حوالے سے متعدد غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ماخذ کلام عشق کے نام سے ایک باب قائم کیا ہے جس میں ان چھ قلمی اور دو مطبوعہ نسخون کی تفصیل درج کی ہے جن کی مدد سے کلیات کی ترتیب کا کام کیا۔کلیات کے آخر میں ایک ضمیمہ بھی ہے۔جس میں وہ اشعار اکھٹا کیے گئے ہیں جو تذکروں میں بکھرے پڑے تھے۔ضمیمہ کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جو کلیات میں نہیں تھے۔اس کے علاوہ الگ الگ باب کے تحت ان کی شاعری کی خصوصیات اور زبان کا تخلیقی استعمال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

شاد عظیم آبادی کا ایک تبرک 'متروکات شاد' معارف جولائی 1929 میں شائع ہوا۔شاد عظیم آبادی نے مذکورہ مضمون میں اپنی شاعری کے متروکات کو درج کیا ہے۔شاد کی یہ ایک قدیم تحریر ہے جو ایک مدت سے نایاب تھی۔معارف نے سب سے پہلے اردو دنیا تک پہنچایا۔مضمون کے ابتدا میں مدیر معارف کا ایک نوٹ بھی ہے جو حسب ذیل ہے:

''حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم نے اپنی زندگی ہی میں غالباً معارف میں مولوی سید حسرت ماہانی

صاحب کے متر کات شاعری کا ذکر پڑھ کر ایک مختصر مضمون میں اپنے متر کات شاعری کی تفصیل لکھی تھی، کاغذات کے ذخیرہ میں یہ تحریر گم ہوگئی تھی، چند روز ہوئے کہ یہ 'یوسف گم گشتہ' پھر ہاتھ آیا، ان وہ معارف کے بازار میں ہے قدر دان اندازہ فرمائیں۔'' 41

واقعہ یہ ہے کہ دربار رامپور میں متر کات کی ایک بحث چھڑ گئی جس میں شعرا نے اپنے اپنے شاعری سے متر کات پیش کیے، شاد عظیم آبادی نے بھی اپنی شاعری سے متروکات چن کر قلم بند کیے تھے جو کاغذات کے ذخائر میں گم ہو گئے تھے۔معارف نے جولائی 1929 میں اسے اردو دنیا سے متعارف کرایا۔شاد نے کئی صفحات میں اپنے متروکات پیش کیے ہیں۔البتہ چند متر کات کو یہاں پیش کیا جاتا ہے تاکہ زبان وقواعد سے متعلق متر کات شاد سے واقفیت ہو سکے۔

پیار، پیاس، پیارا بہ حرکت حروف دوم بجائے ہائے مخلوط الالف۔

کبھو بجائے کبھی

بیچ بہ معنی میں، باستنائے بیچ میدان، بیچ محفل، بیچ گھر، بیچ دریا وغیرہ

پیر بجائے (پاؤں) مگر بعض جگہ تقریری زبان میں جائز الاستعمال ہے۔

زور بجائے (غضب کا) جیسے میر تقی میر نے فرمایا: زور عالم نظر آیا تیرے ودائی کا۔لیکن بمعنی طاقت صحیح الاستعمال ہے۔

سدا بجائے ہمیشہ۔

کیونکر سے بجائے کیونکر۔

موسم میت بالفتح سین یا بجائے بالکسر۔

نشا بحرکت دوم بجائے بالفتح۔

نے بجائے نہیں یا نہ۔

وصلت بجائے وصل۔

بغیر ایسے اشارے کے استعارہ سے کام لینا کہ عینیت پائی جائے، جیسے معشوق آیا کی جگہ، گل آیا بجائے (وہ گل آیا)۔

واو مجہول و یائے مجہول کا واو و یائے معروف کے ساتھ قافیہ کرنا۔جیسے گور و دور یا دلیر و پیر۔

الف ساکن واو ساکن یا یائے ساکن و نون ساکن جب کہ آخر لفظ میں واقع ہو، اوزان میں ساقط کر دینا، جس سے وہ لفظ یا مصرہ بھونڈا معلوم ہو۔

ہائے مختفی کا قافیہ الف کے ساتھ جب کہ وہ لفظ فارسی یا عربی ہو اور یہ ترکیب فارسی مرکب ہو یا نون کا اعلان بحالت ترکیب فارسی ہو بشرطیکہ پھر وہ لفظ دوسرے لفظ کے ساتھ مرکب بہ ترکیب فارسی نہ ہو جائے۔مثلاً وہ گران جان ہے میں اظہار نون، مگر جب یہ نون پھر مضاف یا معطوف ہو جائے، جیسے ظلم آسمان پیر میں اظہار نون صحیح ہوگا۔

ہندی لفظ کو فارسی لفظ کے ساتھ بہ ترکیب فارسی مرکب کرنا، مگر واضح رہے کہ بحالت علم یا عام شہرت کے ایسے مرکب مفرد

ومہند ہے جیسے پاندان وغیرہ،خواہ وہ مرکب اسم صفاتی ہوکرزبانوں پر جاری ہو،جیسے اٹھائی گیراوغیرہ صحیح ہوگا۔

جوں بہ معنی مثل ۔ہوئیں ہوئے بجائے ہوں یاہو۔

سو(بجائے وہ حرف صلہ)42

دیوان پنجم از قاضی عبدالودود معارف جولائی 1937 میں شائع ہوا۔مذکورہ مضمون میں مصحفی کے دیوان پنجم قلمی نسخہ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔مصحفی کے دیوان کے قلمی نسخے کم یاب تھے۔اس وقت تک صرف دونسخوں کا پتہ چل سکا تھا۔دونوں نسخے اتفاق سے پٹنہ میں موجود تھے۔ایک کتب خانہ شرقیہ بانکی پورجبکہ دوسرانسخہ انجمن ترقی اردوصوبہ بہار کی ملکیت ہے۔قاضی صاحب نے مذکورہ مضمون میں دوسرےنسخہ کا تعارف پیش کیا ہے۔وہ نسخہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ نسخہ انجمن ترقی اردو بہار کی ملکیت ہے فضل علی خاں صاحب کا عطیہ ہے،نواب سید جعفرحسن خاں مرحوم فیض تخلص ان کے اجداد مادری میں سے ہیں اور وہ مصحفی کے شاگرد تھے۔غالبا یہ نسخہ 1240ھ سے پیشتر وہ لکھنؤ سے اسے لائے تھے۔کاتب کا نام معلوم نہیں لیکن زمانہ کتابت کے متعلق اتنا قطعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ 1224 کے بعد کا لکھا ہوا ہے۔اس لیے کہ دیوان ششم کا دیباچہ جو اسی سال کا تحریر کیا ہوا ہے۔کسی سبب سے اس دیوان کے آخر میں درج ہوگیا ہے۔یہ دیباچہ آئندہ بجنسہ شائع کردیا جائے گا۔اوراق کی تعداد(بہ شمول دیوان ششم)147اوراشعار کی مجموعی تعداد 954 ہے۔عموما ہرصفحہ میں 14 سطریں ہیں لیکن پہلے صفحہ میں صرف 8 سطریں ہیں۔''43

فاضل مضمون نگار نے غزلیات،رباعیات،مثنویاں،سلام،نظم فارسی وغیرہ عناوین کے تحت مصحفی کے کلام پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔پورے دیوان میں غزلوں کی مجموعی تعداد 3446 ہے۔اس میں دوغزلہ،سہ غزلہ کے علاوہ آسان اورسنگلاخ زمینوں میں لکھی گئی غزلیں بھی شامل ہیں۔بعض غزلیں ناسخ،آتش اور ہوش کی زمینوں میں لکھی گئی بھی موجود ہیں۔دیوان کی ابتدااس مطلع سے ہوتی ہے:

کلی کو اس چمن میں جب نہ ہو وقفہ تبسم کا
اب ہر برگ گل پھر کیا کرے دعوی تکلم کا

آخری غزل کا مقطع یہ ہے:

اہل تلاش رہتے ہیں گھر بیٹھ مصحفی
ناداں کیا ہے تونے کبھی روزگار بھی

مصحفی کے دیوان کے حوالے سے مولوی عبدالسلام ندوی کا ایک مضمون 'مصحفی اوراس کے دیوان کا رامپوری

نسخہ‘ معارف اگست 1937 میں شائع ہوا۔ جس میں مصحفی کے حالات، شاعری اور ان کی تصانیف پر روشنی ڈالی ہے۔ مصحفی کے دواوین کی تعداد کے متعلق اختلافات کو بھی مختلف حوالوں سے بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی کون سا دیوان کس کتب خانہ اور کن حالات میں محفوظ ہے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ عبد السلام ندوی مصحفی کے دیوان کے نسخوں کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’مصحفی کے آٹھوں اردو دیوان اورینٹل پبلک لائبریری میں محفوظ ہیں پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا اور چھٹا دیوان اسٹیٹ لائبریری رامپور میں موجود ہے جن میں اول، دوم، سوم اور چہارم کے وہ نسخے ہیں جو خود مصحفی نے خوشخط نستعلیق میں لکھوا کر دربار اودھ میں پیش کئے تھے، ان نسخوں کی تاریخ کتابت 1796 ہے۔ میر صدر الدین حسین کاتب کا نام ہے۔ پہلے دیوان کا ایک نسخہ 1826 کا مخطوطہ ہے۔ دو نسخے دیوان دوم کے ہیں، جن میں ایک 1829 کا اور دوسرا 1831 کا لکھا ہوا ہے۔ باقی دواوین کے کچھ ایسے نسخے ہیں جن میں تاریخ کتابت تحریر نہیں۔ ان دواوین میں بعض غزلیں مشترک ہیں ۔ دو اردو دیوان آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں نمبر ۹۵ اور نمبر ۲۶۳ پر محفوظ ہیں۔ فارسی دواوین میں وہ دیوان جو جلال، اسیر اور ناصر علی کی تتبع میں تھا خود مصحفی کے پاس سے چوری ہوگیا تھا۔ باقی دو نسخوں کے متعلق معلوم نہیں کہ کہاں ہیں۔ اسٹیٹ لائبریری میں ایک فارسی دیوان کا نسخہ موجود ہے۔ اس نسخہ میں صرف چند ردیفیں ہیں اور وہ بھی غیر مرتب جا بجا نئی غزلوں کے لئے بیاضیں چھوڑ دی گئی ہیں، جو کہیں کہیں بخط غیر کہی جا چکی ہیں۔ متعدد مقامات پر الفاظ، مصرعے اور شعروں کو قلم زد کر کے ان کے بدل تحریر کیے گئے ہیں۔ حواشی پر مختلف اضافے ہیں بہت ممکن ہے کہ یہ خود مصنف کا اپنا نسخہ ہو۔ اس دیوان کی غزلیں عموماً سعدی، حافظ، کمال، ظہوری اور فاخر کی غزلوں کے قوافی اور ردیفوں میں لکھی گئی ہیں معلوم نہیں کہ یہ کون سا دیوان ہے۔‘‘[44]

عبد السلام صاحب ندوی کے مذکورہ اقتباس سے نہ صرف مصحفی کے دیوان کی تعداد اور مختلف کتب خانوں میں ان کی موجودگی کی اطلاع ملتی ہے بلکہ اس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ مصحفی نے اپنا فارسی دیوان جلال، اسیر اور ناصر علی کی تتبع میں لکھا تھا۔ اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ فارسی کی بعض غزلیں حافظ، سعدی، کمال، ظہوری اور فاخر کی زمینوں میں بھی لکھی ہیں ۔ دیوان کی موجدگی کے علاوہ مصحفی کے تذکروں کے موجدگی کی بھی اطلاع دی گئی ہے۔ فاضل مضمون نگار کا مقصد دراصل مصحفی کے دیوان کے رامپوری مطبوعہ نسخہ پر روشنی ڈالنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولوی عبد السلام ندوی ان دنوں اسٹیٹ لائبریری کے اردو منظومات کی فہرست ترتیب دے رہے تھے۔ اور اس سلسلے میں وہ مصحفی کا دیوان دوم دیکھ رہے تھے جس پر جدید قلم سے جگہ جگہ اصلاحیں تھیں، البتہ اکثر مقامات پر اسی طرح چھوڑ دیا گیا تھا۔ مولانا عبد السلام ندوی کو وہاں مصحفی کا ایک ایسا نسخہ دستیاب ہوگیا جو بمشکل ہی کہیں اور موجود ہو، وہ اس سلسلے

میں لکھتے ہیں۔:

''مصحفی کا کوئی مکمل دیوان اب تک طبع نہ ہوسکا،ایک مختصر انتخاب مولانا حسرت موہانی نے شائع کیا تھا جو میری نظر سے نہیں گذرا۔دوسرا مشہور انتخاب وہ ہے جو نواب خلد آشیاں کلب علی خاں صاحب (1965۔1887) کے عہد میں غالبا ان کے حسب الحکم منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی متوفی 1318ھ اوران کے استاد منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی متوفی 1881 شاگرد مصحفی کی تصحیح 1878 میں مطبع تاج المطابع رامپور سے شائع ہوا تھا،یہ مصحفی کے چار دیوان کا انتخاب ہے۔اس پر مرحوم منشی محمد احمد صاحب قمر وصریر مینائی خلف امیر مینائی متوفی 1934 کا مختصر رسمی سرنامہ ہے،جس میں مرحوم نے مصحفی کے دواوین کی کمیابی اور موجودہ نسخوں کی فاحش غلطیوں کواس انتخاب،تصحیح اور طبع کا باعث قرار دیا ہے۔'' 45

عبدالسلام ندوی نے مصحفی کے کلام کی تصحیح کے حوالے سے لکھا ہے کہ مصحفی کے کلام کی تصحیح اس طرح نہیں کی گئی ہے جیسی بالعموم قدیم کتابوں کے مصححین میں مروج ہے بلکہ کلام کی استادانہ اصلاح کر کے مصحفی کے طرز بیان اوراس کی زبان پرایک زمانے تک کامیاب پردہ ڈالے رکھا46 اس کے علاوہ مصحفی کے کلام کی اصلاحوں کی نوعیت، مصحفی اور اس دور کی زبان،الفاظ کی کمی بیشی،تغیر وتبدیلی،اسالیب کلام میں اصلاح،فقروں اور جملوں میں تغیر وتبدل،اشعار اور مصرعوں کی اصلاح،معنوی تبدیلیاں، مصححین کی غلط فہمیاں اوراعتذار پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔یہ مضمون نہ صرف یہ کہ دیوان کی بازیابی بلکہ مصحفی کے کلام کی تصحیح کے حوالے سے بھی کافی اہم ہے۔

معارف ستمبر 1937 قاضی عبدالودود کا مضمون' سید انشا کا غیر مطبوعہ قطعہ اور اس کی شان نزول' شائع ہوا۔مذکورہ مضمون میں انشاء اللہ خاں انشاایک ایسے قطعہ کی بازیابی کی گئی ہے۔جو انشاء کی مطبوعہ کلیات میں بھی نہیں ہے۔اس قطعہ کے لکھے جانے کا ایک شان نزول بھی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ سعادت خاں کے دفتر میں ایک مولوی صاحب تھے جن کی قلم سے اجناس کی جگہ اجنا نکل گیا۔سعادت علی خاں نے گرفت کی تو انہوں نے قواعد زبان واب سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی اجنا غلط نہیں ہے۔سید انشانے ان کی ہجو میں رباعیاں اور قطعہ لکھے جو نایاب تھا۔آب حیات میں محمد حسین آزاد نے اس واقعہ کواس طرح نقل کیا ہے۔

''سعادت علی خاں کہ ہر امر میں سلیقہ اور صفائی کا پابند تھا اس نے حکم دیا تھا کہ اہل دفتر خوش خط لکھیں،اور فی غلطی ایک روپیہ جرمانہ۔اتفاقا اعلی درجہ کے اہل انشا میں ایک مولوی صاحب تھے ،انہوں نے فرد حساب میں اجناس کو اجنا لکھ دیا۔سعادت علی خاں تو ہر شے پر خود نظر رکھتے تھے۔ان کی بھی نگاہ پڑ گئی۔مولویوں کو جواب دینے میں کمال ہوتا ہے انہوں نے کچھ قاموس، کچھ صراح سے اجنا کے معنی بتائے۔کچھ قواعد نحو سے ترخیم میں لے گئے۔نواب نے انہیں اشارہ کیا

،انہوں نے مارے رباعیوں اور قطعوں کے اتو کر دیا۔

اجناس کی فرد پر یہ اجنا کیسا　　　　یہاں ابر لغات کا گرجنا کیسا
گوہوں اجنا کے معنے جو چیز اگے　　　　لیکن یہ نئی اپچ اپجنا کیا

47

مذکورہ واقعہ پر لکھے گئے رباعی اور دیگر اشعار دستیاب ہیں اکثر تذکروں اور کتابوں میں شامل ہے البتہ انہوں نے اس موقع پر ایک قطعہ بھی لکھا تھا جو نایاب تھا۔ غیر مطبوعہ قطعہ تذکرہ ناصر کے قلمی نسخہ سے نقل کر کے زیر نظر مضمون میں شامل ہے۔ قطعہ حسب ذیل ہے۔:

یہاں ہے ایک جنا ایسا کہ جس نے　　　　لکھا ہے موقع اجناس اجنا
زہے وہ کاغذ ابری کہ جس پر　　　　لغت کے بادلوں کا ہوگر جنا
وہ اپنے معترض کو یوں کہے ہے　　　　زبان پوربی میں مورے سجنا
کہ اجنا از زمیں چیزے کہ روید　　　　وہ جہ کا بھوئیں سے ہووت اپجنا
صراح اندر لکھت ہیں اس کی تصریح　　　　رہا اب آگے باقی ڈھول بجا
مرخم اور مخفف ہوویں ہیں لفظ　　　　بجا ہے جنا کو کہنا جنا
ہوا یہ قاعدہ انشا تو پھر تو　　　　کہا کر کا جنا وولہ کو کجنا (کذا)

48

شذرات معارف سے سید سلیمان ندوی کے متعدد اسفار کا پتا چلتا ہے جن میں سفر لاہور، حیدرآباد، دہلی، لکھنؤ، بھوپال، ممبئی، میسور اور مدراس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مذکوہ اسفار سے صرف احوال سفر ہی نہیں بلکہ نہایت کارآمد معلومات اور فکر انگیز نکات زیر بحث آتے ہیں۔ ان میں تاریخی، جغرافیائی معلومات، سیاسی وسماجی حقائق، علمی وادبی اداروں کا تذکرہ، قدیم کتب خانوں، اشاعتی اداروں، معروف شخصیات سے ملاقات کی دلچسپ روداد ہے۔ سید سلیمان ندوی کا معمول تھا کہ جس شہر کا بھی سفر کرتے وہاں اداروں اور کتب خانوں کا ضرور معائنہ کرتے تھے اور وہاں موجود کتابوں اور شخصیات کا احوال قارئین معارف تک ضرور پہنچاتے تھے۔ اکتوبر 1937 کے سفر مدراس میں سید صاحب مدراس یونی ورسٹی کے شعبہ تحقیقات علمیہ بھی گئے۔ وہاں موجود دیوان بیدار کے دونسخوں کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا محوی عربی، فارسی کے خوش مذاق عالم اور اردو کے اچھے شاعر ہیں۔ انہوں نے چھ سات برس کے اندر کئی کتابوں کا ترجمہ اور تصحیح کی ہے۔۔۔۔ دلی کے ایک شاعر میر محمد بیدار کا دیوان

مقدمے اور تصحیح کے ساتھ شائع کیا ہے۔ بیدار کا یہ دیوان 1935 میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔اب کیا عجیب بات ہے کہ اس کے دو برس بعد 1937 میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اسی دیوان کے کسی دوسرے قلمی نسخے کو غیر مطبوعہ سمجھ کر جناب جلیل احمد صاحب قدوائی کے مقدمے اور تصحیح کے ساتھ شائع کیا ہے۔اگر ہمارے علمی اداروں میں آپس میں علمی روابط ہوں تو اس قسم کی محنت اور سامائے کی بربادی سے ہم محفوظ رہیں۔''49

سید محمد خاکی ایک صوفی شاعر گزرے ہیں۔ان کے حالات اور کلام سے تمام تذکرے خالی ہیں۔معارف مارچ 1942 کو جناب غلام مصطفیٰ خاں کا ایک مضمون 'خاکی' شائع ہوا۔جس میں پہلی بار حبیب گنج میں موجود قلمی دیوان خاکی کی اطلاع دی گئی۔قلمی نسخہ میں اوراق کی تعداد 91 اور اشعار کی تعداد 1800 بتائی گئی ہے۔قلمی دیوان میں ایک خاتمہ بھی ہے جو حسب ذیل ہے۔:

''تمت شدہ دیوان رنگین من کلام توحید انجام سید محمد قادری عرف مدن صاحب ابن سید جمال اللہ قادری مد ظلہم العالی، بخط نوشت سید حسین قادری عرف شاہ میاں ، بتاریخ دہم ربیع الاول 1182 قلم شدہ''50

مذکورہ خاتمہ کی عبارت اور دیوان کی داخلی شہادتوں سے فاضل مضمون نگار نے درج ذیل نتائج اخذ کیے ہیں۔:

''1۔ خاکی کا نام سید محمد تھا،اور عرف 'مدن صاحب'

2۔ ان کے والد کا نام سید جمال اللہ تھا،اور یہی غالباً ان کے پیر بھی تھے،جیسا کہ ان کے بعض اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:۔

جمال اللہ مرشد جب دیکھا کر پیوکون خاکی
کیا ہے تجکو ں او محرم بھی نا محرم سوں کیا مطلب

خاکی جمال ذات اپس پیر کوں سمجھ
تجلوں کیا ہے مست جو ان پیوسوں ملا

اپنے خاکی کیتن جمال اللہ
نت پیا سوں ایسے ملا دینا

3۔ لفظ قادری جو خاکی اور ان کے والد کے نام کے ساتھ پایا جاتا ہے،یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ لوگ پیری مریدی میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ (المتوفی 1166) کے سلسلے میں منسلک تھے،اسی لیے خاکی نے کئی قصیدے شیخ کی مدح میں بہت عقیدت کے ساتھ لکھے ہیں۔ایک کا مطلع یہ ہے:۔

تو بادشاہ دوجہاں یا غوث اعظم دستگیر
ہے لامکاں تیرا مکاں یا غوث الاعظم دستگیر

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔:

یوں تصدق ہے غوث الاعظم کا
فیض ان کا ہر آن ہے ہو حق

4۔ کاتب سید حسین قادری عرف شاہ میاں بھی غالباً خاکی کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔اس نے اس دیوان کی تکمیل ۱۰ ربیع الاول 1182 مطابق دوشنبہ ۲۵ جولائی 1768 میں کی تھی۔

5۔ فقرہ مدظلہم العالی خاکی کے نام کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے،جس سے صاف ظاہر ہے کہ خاکی کم ازکم 1768 تک ضرور زندہ تھے،جب کہ یہ دیوان مکمل ہوا۔'' 51

مذکورہ اقتباس میں فاضل مضمون نگار نے خاکی کے نام،ان کے والد جمال اللہ اور شیخ عبدالقادر جیلانی سے عقیدت کو بیان کیا ہے۔مزید اس بات کی بھی نشاندہی کی ہے کہ جس وقت یہ دیوان لکھا گیا خاکی باحیات تھے۔جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جاچکا ہے کہ سید محمد خاکی کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں البتہ میر حسن اور مولانا عبدالحئی نے اپنے تذکروں میں ایک خاکی کا ذکر کیا ہے اور ان کے کلام کے نمونوں کو بھی پیش کیا ہے۔لیکن میر حسن اور صاحب گل رعنا نے جس خاکی کا ذکر کیا ہے وہ کوئی اور خاکی ہیں۔یہاں ان کے بیانات کو نقل کیا جاتا ہے تاکہ دونوں خاکی کے درمیان فرق کو سمجھا جا سکے۔میر حسن دہلوی لکھتے ہیں۔:

''خاکی مرد درویش شاہجہاں آباد میں جہانگیر بادشاہ کے عہد کے۔احوال معلوم نہیں۔ایک بوڑھے آدمی سے ان کا یہ شعر:

ٹھانی ہے اپنے من میں اب تو یہی سریجن
تجھ پیم کی گلی میں خاکی کو خاک ہونا 52

مولانا عبدالحئی نے گل رعنا میں میر حسن کی بات نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میر حسن نے تذکرہ میں اسی عہد کے ایک اور شاعر کا ذکر کیا ہے جس کا تخلص خاکی تھا،وہ کہتے ہیں کہ یہ دلی میں درویشانی زندگی بسر کرتا تھا،اس سے زیادہ اس کا کچھ حال معلوم نہیں،مگر اس کا ایک شعر کسی پیر مرد سے سنا ہوا اب تک یاد ہے... اگر درحقیقت یہ اسی زمانہ کا شاعر تھا اور یہ شعر اسی کا ہے جس کی شہادت کا توڑ ایک مجہول الحال پیر مرد پر ہوتا ہے تو خاکی کو دکن کا باشندہ ماننا پڑے گا، جو خاک چھانتا ہوا دلی پہنچ گیا ہوگا۔جہانگیر ابراہیم عادل شاہ کا ہمعصر ہے،اس وقت دلی میں اردو شاعری کا سراغ نہیں ملتا،دکن میں اس کی بنیادیں قائم ہو رہی تھیں،مگر اس وقت زبان جس

عالم طفولت میں تھی اس کا نمونہ محمد قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ اور مولانا نصرتی کے اشعار پڑھنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔ خاکی کا جو شعر میرحسن نے اپنے تذکرے میں نقل کیا ہے، اس کی زبان شمس ولی اللہ اور ان کے ہمعصر شعرا کی زبان ہے۔ اس وجہ سے میری قطعی رائے یہ ہے کہ میرحسن کو دھوکہ ہوا ہے یا کاتب کا سہوالقلم ہے، بجائے جہانگیر کے عالم گیر ہونا چاہئے تھا۔''53

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے نہ صرف یہ کہ خاکی کے قلمی دیوان کے نسخہ کا تعارف پیش کیا ہے بلکہ میرحسن اور مولانا عبدالحئی کے تذکرے میں مذکور خاکی اور سید محمد خاکی میں فرق قائم کرنے کے لیے بڑے اہم نکات پیش کیے ہیں۔ فاضل مضمون نگار کا کہنا ہے کہ ہمارے خاکی بالکل مختلف ہیں ان کا تعلق جہان آباد دہلی سے نہیں بلکہ دکن سے تھا۔ اس حوالے سے انہوں نے اہم دلائل بھی پیش کیے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔:

1۔ ''میرحسن دہلوی نے جس خاکی کا شعر نقل کیا ہے وہ ہمارے خاکی کے دیوان میں نہیں ہیں۔

2۔ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے خاکی کم ازکم 1768 تک یعنی عالمگیر اورنگ زیب کے بھی تقریباً ساٹھ سال بعد زندہ تھے، اور یہ زمانہ قریب قریب وہی تھا جبکہ میرحسن دہلوی نے اپنا تذکرہ لکھا ہے۔ اب اگر ہمارے خاکی دہلی کے ہوتے تو میرحسن اپنے ہم وطن اور ہم عصر شاعر کے متعلق صرف اتنا لکھنے پر اکتفا نہ کرتے کہ 'احوالش معلوم نیست'۔

3۔ جس وقت ہمارے خاکی زندہ تھے اس وقت تک شاہ جہان آباد (دہلی) کی زبان بہت صاف ہوچکی تھی، اور اردو کے چند بہترین شعرا مثلاً میر، سودا اور درد وغیرہ مشہور ہوچکے تھے، ان لوگوں کی زبان ہرگز وہ نہ تھی جو ہمارے خاکی کی ہے۔ جن کے یہاں دکنی زبان و بیان کے علاوہ خیالات بھی ولی کی طرح دکھنی اثر سے متاثر ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ خاکی شاہ جہاں آباد دہلی کے نہ تھے۔

4۔ ایک اور بات غور طلب ہے اور میرے خیال میں وہ خاکی کو دکھنی ثابت کرنے میں مدد دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کا پورہ دیوان پڑھ جایئے بعض بزرگوں کی مدح میں قصیدے پایئے گا، لیکن ہندستان کے صرف ایک بزرگ دکن والے یعنی حضرت گیسودراز بندہ نواز (گلبرگہ) المتوفی 1422 کی مدح میں صرف ایک قصیدہ ہے مطلع اس کا یہ ہے:

نزول رحمت رب کریم بندہ نواز
توں فیض بخش ہے گنج رحیم بندہ نواز

ان باتوں سے یقین کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے خاکی دکنی تھے۔54

خاکی کے عہد کے دکنی تذکرے اور تاریخیں بھی ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ بعد میں لکھی جانے والی کتابوں میں بھی کوئی خاص تفصیل نہیں ملتی، البتہ نصیرالدین ہاشمی کی کتاب 'دکن میں اردو' میں ان کا ذکر تو ہے مگر نہ کے برابر۔ نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں۔:

''سید محمد قادری نام اور خاکی تخلص تھا۔ ولی کا زمانہ دیکھا ہے۔ دیوان ہنوز شائع نہیں ہوا۔ ریختی میں طبع آزمائی کی ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے پاس ان کا دیوان موجود ہے۔:

پیا بن اے سہیلی انجنوں سے مکہ دھوتی ہوں
کبھی میں متمنع گہرااندہارا دیکھ روتی ہوں

رہوں کیوں ابتدا میں میں دسے جب انتہا مجھ کو
فنا فی الشیخ ہو کر میں بقا بااللہ ہوتی ہوں

55

دکن کی تواریخ اور تذکروں میں سید محمد خاکی کا کوئی خاص تذکرہ نہیں ملتا البتہ ان کے متعلق متعدد زبانی رواتیں عام ہیں۔ فاضل مضمون نگار نے چند زبانی روایتیں نقل کی ہیں جو بے حد دلچسپ ہیں۔:

''1۔ برار (دکن) کے مشہور شہر امراوتی اور ایوت محل کے درمیان موٹر کی سڑک پر ایک مقام نیر ہے، وہاں سے ۵،٦ میل پر ایک گاؤں اجنتی ہے اور وہاں سے ۹ میل پر اڑگانوں ہے۔ مشہور ہے کہ تقریبا پونے دوسوسال ہوئے، کہ موخر الذکر مقام پر خاکی پہنچے، وہاں ایک بوڑھا مالی اور اس کی بیوی دونوں اپنے باغ کے کام میں مشغول تھے۔ انہوں نے خاکی کو اجنبی اور خستہ حال سمجھ کر کچھ کھانا پیش کیا۔ خاکی نے دعا کی ان کا خاندان ہمیشہ خوشحال رہے، چناچہ مشہور ہے کہ اس دعا کی برکت سے اس مالی کا خاندان اب تک بہت طمانیت کی زندگی بسر کرتا ہے۔

2۔ خاکی نے اڑگانوں میں کچھ عرصہ کے لیے قیام کرلیا اور ان کی کراماتوں کی شہرت جب اطراف میں ہوئی تو اجنتی سے بھی ایک ہندو ڈھیڑ (چھوٹی ذات والا) ملکو نامی ان کی خدمت میں روز پہنچتا تھا۔ خاکی نے اسے مستفیض کر کے صاحب کرامت بنادیا۔ اس بھلے آدمی نے خاکی کی روانگی کے بعد خاکی کی ایک مصنوعی قبر اجنتی میں بنالی، تو اڑگانوں والے کیوں پیچھے رہتے انہوں نے بھی ایک قبر اپنے لیے تیار کرلی، اب دونوں مقاموں پر خاخی صاحب کا عرس ہوتا ہے۔ اجنتی میں اتنا ہوا کہ ملکو کے مرنے کے بعد اسے خاکی کی مصنوعی قبر کے قریب دفن کردیا گیا۔ اور اس وقت سے اب تک وہاں مردوں کو جلاتے نہیں ہیں بلکہ دفن کرتے ہیں۔ خدا جانے خاکی کس خاک میں سو رہے ہیں لیکن وہاں یہ مشہور ہے کہ وہ پاک پٹن (پنجاب) میں چلے گئے تھے اور وہیں ان کی اصلی قبر ہے۔

3۔ ایک اور قصہ خاکی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے جو دوسرے بزرگوں کے ساتھ بھی منسوب ہے۔ وہ یہ کہ خاکی اڑگانوں میں بیٹھے ہوئے کچھ وظیفہ پڑھ رہے تھے یکا یک انہوں نے اپنے مصلے کے نیچے ہاتھ ڈالا، تھوڑی دیر میں ہاتھ باہر کھینچا تو وہ کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک جہاز کا مالک آیا جس سے معلوم ہوا کہ خاکی صاحب نے اس کے جہاز کو ڈوبنے سے بچایا تھا۔''56

خاکی کا دیوان حبیب گنج میں موجود ہے، جس میں متعدد اقسام کی نظمیں ہیں۔ بیشتر غزلیں عشق حقیقی کے

پیرائے میں ہیں۔آپؐ،حضرت علیؓ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح میں قصائد بھی شامل ہیں۔کئی مستزاد بھی ہیں۔ صوفیانہ رنگ میں لکھی گی ایک مثنوی بھی ہے جس میں 55 اشعار ہیں۔مثنوی کے ابتدائی اشعار حسب ذیل ہیں۔:

کہوں کیا زباں سوں خدا کی صفت — صفت ہو کہ موجود ہے سب جگت
خدا کوں صفت سب سزاوار ہے — وہی جز وکل کا سدا یار ہے
جنے حق کوں پایا جہاں میں نہیں — رہے ہو کے اعمی حشر تک وہیں
سمجھ کر اپس کے اول جیو کیوں — اپس جیومیں دیکھ لے پیو کیوں
فرائض تو باطن کے ہیں پانچ جان — بیان کھول کرتا ہوں اس کوں پچھان
محمدؐ کے جب نور میں رب کا نور — دسے پر سمج اوہی کلمہ ظہور
مثال اس کی کہتا ہوں کر گیان توں — اسے سن اتا دل کے توں کان سوں
کہ جوں ماہ کے نور میں تج دسے — کہ خورشید کا نور اس میں بسے
جو نور غلے نور حق نے کہا — سمج اس کتین بے خبر کیوں رہا
محمدؐ کے نت نور میں ذات کون — کہ پاتا ہے اوصلوہ بطور
وصل پا کے واصل چھپی بات کوں — سنے ہور کے بلکہ اوذات سوں
وصل پا خدا سوں جو باتاں سنے — صلوۃ بطوں سوں کرنا نماز بطوں

57

سید محمد خا کی کل کائنات شعرانہیں اقسام پر محدود ہے البتہ مولوی عبدالحئی نے گل رعنا میں لکھا ہے کہ دیوان کے علاوہ ایک مثنوی فیض عام بھی لکھی تھی جو مولوی عبدالرزاق قریشی کے کتب خانہ میں موجود تھی۔مولوی عبدالحئی اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔:

''سید محمد بن جمال الدین قادری ایک بزگ شمس ولی اللہ کے ہمعصر تھے۔ان کا مکمل دیوان مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔یہ دیوان ردیف دار ہے۔علاوہ غزلوں کے مثنوی اور مستزاد بھی ہے،ایک دو ریختیاں بھی ہیں جو ہندی شاعری کا نمونہ ہیں۔مناجات بھی ہے،نعت بھی۔اول سے آخر تک کلام عارفانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔مقطوں میں کثرت سے اپنے پیر کا نام لیتے ہیں۔زبان وہی ہے جو ولی کے دیگر ہمعصروں کی ہے۔اس دیوان کے علاوہ ایک مثنوی ان کی فیض عام ہے جو 1141 میں لکھی ہے۔جس زمانہ میں ولی نے دہ مجلس لکھی تھی یہ ساڑھے سولہ جز کی کتاب ہے اور سید عبدالرزاق چیف ٹرانسلیٹر ناگپور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔میرا گمان غالب یہ ہے کہ میر حسن نے خاکی کا جو شعر نقل کیا ہے وہ انہی کا ہے۔'' 58

غلام مصطفیٰ خاں نے برار میں مثنوی فیض عام دیکھی تھی۔انہوں نے صاحب گل رعنا کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مثنوی فیض عام خاکی کی نہیں بلکہ عبدالمحمد کی تصنیف ہے۔انہوں نے اس حوالے سے متعدد داخلی وخارجی ثبوت پیش کیے ہیں۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔:

''زمانہ طالب علمی ہی سے جب کہ میں علی گڑھ میں تھا مجھے یہ اشتیاق پیدا ہوا تھا کہ چونکہ میرے وطن جبل پور سے ناگپور قریب ہے اس لیے میں آسانی کے ساتھ اس مثنوی کا پتہ چلا سکوں گا۔مولوی صاحب مرحوم کی زیارت مجھے نصیب ضرور ہوئی لیکن افسوس ہے کہ میں انہیں اس سلسلہ میں نہ پہچان سکا تھا،اب ان کے بھائی عبدالستار صاحب سے برار میں وہ مثنوی دیکھنے کو ملی،اس کی تفصیل پھر کبھی انشاءاللہ پیش کروں گا۔ابھی مختصراً اتنا عرض کرتا ہوں کہ وہ مثنوی خاکی کی نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے شاعر عبدالمحمد کی ہے۔مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد صاحب مہدی جونپوری 1505 کے کوئی صحابی شیخ ویش تھے،ان کے پوتے مصطفے تھے،جنہوں نے مہدی عقائد کی بہت تبلیغ کی تھی۔اسی کی تفصیل اور مصطفے کے حالات زندگی پر یہ مثنوی مشتمل ہے۔تقریباً چار ہزار اشعار ہیں۔اس طرح حمد سے شروع ہوتی ہے:۔

خدا کی کروں صفت اول بیان — بنایا جنے سب زمین آسمان
بھی انسان کوں خاک سیتی کیا — انا سرہ شرف اس کوں دیا
جنے جان کوں آگ سو کر بدن — پری جن کا تسیتن پنجارتن

یہ قصہ دراصل کسی شیخ آدم نے فارسی میں لکھا تھا جس کا یہ دکھنی منظوم ترجمہ عبدالمحمد نے کیا ہے۔خود شاعر کرتا ہے:۔

اما سن بیان اس قصے کا امر یار — اگر تو اچھے دل منے ہوشیار
میاں مصطفے کا قصہ فارسی — بنایا تھا دل کھول جیون آرسی
میاں شیخ آدم نے کہ کر بیان — سو بولے تھے اس کوں مبارک زبان
ولے ان پڑھیا اس کوں کیا بوجھتا — کہ جیسے اندھے کوں نہیں سوجھتا
سہل کر کر دکھنی میں جوڑی کتاب — سمجھنے میں ہر ایک کے اوے شتاب
کیا ہے یودکھنی زباں سو کلام — رکھنا تو اس کا یقین فیض عام

اب ہم اس مثنوی کے آخری اشعار نقل کرتے ہیں جس سے شاعر کا نام اور تاریخ تالیف معلوم ہوسکے گی۔

نویں چاند شعبان کی رات کوں — خدا نے یوں آخر کیا بات کوں
اتھا سن ہجری جداں یک ہزار — بھی یک سو پو چالیس یک درشمار

سو عبد المحمد نبیؐ کا غلام	خدا کے فضل سے کیا یوں تمام
اتا چاہتا ہے یو عاجز غریب	کہ ہو عاقبت بیچ نیکی نصیب
کہ یعنی خدا آپ کر کر فضل	سو ایمان بخشے عطا بے خلل
شریعت نبیؐ کی اوپر مستقیم	رکھے آپ صاحب غفور الرحیم
پڑھے جو میاں مصطفے کا ذکر	بھی جو کر عقیدہ سنے کان دھر
تو اپنی زبان سون خدا کے بدل	دعا سوں کرے یاد صاحب عقل
وگرجو خطا چوک دیکھیں کبھی	تو کر عیب پوشی سنوارین سبھی
نبیؐ پر درودواں پڑھو بے شمار	بھی مہدی پہ بھیجو سلامان ہزار

59

مذکورہ اشعار کی مدد سے مثنوی نگار کا نام، سال تصنیف اور اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس مثنوی کی اصل فارسی نثر میں تھی جس کے مصنف شیخ آدم تھے۔عبدالمحمد نے اردو میں نظم کیا۔البتہ اب بھی خاکی کے حالات تحقیق طلب ہیں۔معارف اس حوالے سے خوش نصیب ہے کہ اس نے خاکی اور دیوان خاکی کو اپنے تحقیق کا موضوع بنایا ،ضرورت اس بات کی ہے کہ خاکی کے دیوان کو ازسرے نوترتیب دیا جائے اوران کے حالات تلاش کیے جائیں۔

خدائے سخن میر تقی میر کا شمار اردو کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے۔انہیں شہنشاہ تغزل بھی کہا گیا۔انہیں نے اردو اور فارسی دونوں میں شاعری کی ہے۔اردو میں انہیں غالب اور فارسی میں حافظ اور سعدی کے ہم پلہ شمار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اردو میں چھ اور فارسی میں ایک دیوان یادگار چھوڑا۔معارف جون 1943 کو ابواللیث صدیقی کا مضمون 'میر کا فارسی کلام' شائع ہوا۔جس میں میر تقی میر کے فارسی کلام کے ایک قلمی بیاض کی دستیابی اور اس کا تعارف پیش کیا گیا۔مضمون کے ابتدا میں ایک مختصر سی تمہید بھی ہے۔جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ مولانا کیفی صاحب چریا کوٹی مسلم یونی ورسٹی کے قلمی کتابوں کی ایک فہرست تیار کر رہے ہیں۔جس میں انہیں ایک قلمی بیاض ملی۔پہلے ورق کا نصف جلد سازی میں کٹ گیا ہے البتہ عبارت صاف پڑھنے میں آتی ہے،جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

'دیوان نظم فارسی کہ میر تقی میر گفتہ اند' 60

مذکورہ عبارت اور قلمی بیاض کے بغور دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ میر تقی میر کا فارسی کلام ہے۔بیاض پر تاریخ کتابت یا کاتب کا نام درج نہیں ہے البتہ اشعار ہر جگہ آسانی سے سمجھ آتے ہیں۔ہر غزل کے مقطع میں میر تخلص استعمال ہوا ہے۔کلام کے مطالعہ اور دیگر داخلی شہادتوں سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یہ میر تقی میر کے فارسی دیوان کا بیاض ہے۔فاضل مضمون نگار اس خیال کی تائید میں لکھتے ہیں:۔

''ہر غزل کے مقطع میں میر بطور تخلص استعمال ہوا ہے اور رباعیات سے بھی جن کی ایک کثیر تعداد دیوان غزلیات کے آخر میں شامل ہے اسی خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ بیاض پر تاریخ کتابت یا کاتب کا نام درج نہیں ہے، لیکن کاغذ نہایت پرانا اور بوسیدہ ہے، خط اگرچہ شکست ہے لیکن نہایت پختہ اور پاکیزہ ہے، اور سوائے دو چار مقامات کے اشعار ہر جگہ بخوبی سمجھ میں آجاتے ہیں ۔علاوہ تخلص کے جس کا ذکر اوپر ہوا داخلی شہادت یعنی کلام کے مطالعہ سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یہ کلام میر ہی کا ہے۔اس سلسلے میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ فارسی کلام میں بکثرت ایسے اشعار موجود ہیں جن کے خیالات بعینہ اردو اشعار میں بھی نظم ہوئے ہیں ۔اور یہ اردو اشعار عام پر مشہور ہیں، دوسرے میر کا مخصوص قنوطی رنگ، دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا ذکر، محبت اور اس کے مختلف مدارج ومنازل کا بیان، تصوف کے مسائل، ریاکاری اور سالوی کی مذمت جیسی اردو کلام میں موجود ہے۔ فارسی میں بھی اپنی برتری کا احساس ،اپنی استادی کا یقین، اپنے کلام پر بھروسہ جس طرح ان کے اردو اشعار سے ظاہر ہے، فارسی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔امور بالا کو پیش نظر رکھ کر یہ خیال یقین میں بدل جاتا ہے کہ پیش نظر فارسی کلام میر تقی میر کا ہے۔'' 61

محمد ابواللیث صدیقی نے مذکورہ بیاض اور اردو دیوان کے بہت سے اشعار سے یہ ثابت کیا ہے کہ دونوں میں یکساں خیالات اور مضامین نظم ہوئے ہیں۔ اکثر اشعار ایسے ہیں جو اردو اور فارسی کلام دونوں میں شامل ہیں۔انہوں نے کچھ اشعار ثبوت کے طور پر بھی پیش کیے ہیں۔ یہاں چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔:

اردو دیوان میں ایک شعر ہے:

نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن   غبار اک ناتواں سا کوبکو تھا

فارسی میں بھی بالکل اسی مضمون کو نظم کیا ہے:

ندیدم میر رادر کویا ولیک   غبار ناتوانے باصبا بود

اردو غزل میں ایک شعر معرفت کا ہے۔

گل وآئینہ کیا خورشید ومہ کیا   جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی روتھا

فارسی میں یہ شعر یوں ہے۔

گل وآئینہ و مہ وخورشید   ہر کسے رو بسوے تو دارد

اردو:

سر نشین راہ میخانہ ہوں میں کیا جانوں   رسم مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

فارسی:۔

من چہ دانم راہ ورسم خانقاہ عمر من درخدمت میخانہ رفت

اردو:۔

پھر نہ دیکھا کچھ بجز یک شعلہ پر پیچ وتاب شمع تک تو میں بھی دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

فارسی:۔

سحر گہ بر سر پروانہ رفتم کف خاکستر گرمے بجا بود

مذکورہ مثالیں اس امر کی وضاحت کے لیے کافی ہیں البتہ فاضل مضمون نگار نے متعدد اردو اور فارسی کے ایسے اشعار نقل کیے ہیں جس میں مضامین اور خیالات یکساں ہیں ۔بعض اشعار ایسے بھی ہیں جس میں خیالات تو یکساں نہیں ہیں البتہ میر کے کلام کی جو خصوصیات ہیں ان کے کلام کی موضوعی اور فنی انفرادیت ہے اس میں جا بجا نظر آتیں۔

سحر البیان کے خالق میر حسن کسی تعارف کے محتاج نہیں ،انہوں نے متعدد مثنویوں کے علاوہ اردو شعرا کا ایک تذکرہ ،اصناف سخن اور شعری ہیئتوں ،غزل ،قصیدہ ،مسدس ،مثلث ،رباعی اور ہجویں وغیرہ میں طبع آزمائی کی ۔البتہ ایک مدت تک کلیات کی عدم دستیابی کے سبب کئی اہم پہلو پردے میں رہے ۔تمام تذکرہ نگاروں نے ان کے کلام کے محاسن کی تعریف کی ہے مگر کلام کی دستیابی نہ ہوسکی ۔محمد حسین آزاد کو بھی آب حیات لکھتے وقت کلیات کی عدم دستیابی کا ملال تھا۔آب حیات میں لکھا ہے کہ’ آج یہ نوبت ہے کہ پانچ غزلیں بھی پوری نہ ملیں جو اس کتاب میں درج کرتا‘۔ البتہ میں بعد کلیات میر حسن کے کئی قلمی نسخے دستیاب ہوئے ۔ایک نسخہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے پاس بھی تھا۔دوسرا نسخہ پٹنہ میں قاضی عبدالودود کے پاس تھا جس پر انہوں نے ایک مضمون بھی اپنے رسالہ معیار میں لکھا تھا۔ میر حسن کی مثنوی قصر جواہرات بالاقساط اسی رسالہ میں شائع ہوئی تھی ۔62

معارف اکتوبر 1943 کو محمد ابو اللیث صدیقی بدایونی کا مضمون ’میر حسن کی ایک نادر مثنوی‘ شائع ہوا ۔جس میں انہوں نے پہلی بار اردو دنیا کو مثنوی رموز العارفین سے متعارف کرایا ۔فاضل مضمون نگار نے میر حسن کی کلیات کے کئی اہم نسخے دستیاب کر کے قلمی دیوان اور مثنویوں پر مفصل روشنی ڈالی ہے ۔جس میں موجود میر حسن کی گیارہ مثنویوں کی وضاحت کی ہے ۔البتہ اس میں سے چھ اہم ہیں ۔مثنوی رموز العارفین غیر مطبوعہ مثنویوں میں ضخامت کے حساب سے سب سے بڑی ہے ۔مطبوعات میں بھی صرف سحر البیان اس کے برابر ہے ۔میر حسن اپنی اس مثنوی کو سب سے بہتر سمجھتے تھے ۔

میر حسن کی سب سے پہلی اور کمیاب مثنوی رموز العارفین ہے جو 1188 میں لکھی گئی ۔یہ اخلاقی مثنوی ہے ۔ چھوٹے چھوٹے قصے نظم کر کے ان سے اخلاقی نتائج مرتب کیے ہیں ۔رموز العارفین مثنوی مولانا روم کی بحر اور طرز پر

لکھی گئی ہے۔ جا بجا مثنوی مولا نا روم کے اشعار موقع کے لحاظ سے تضمین کیے ہیں۔ اس کے علاوہ بزرگوں کے اقوال اور حکایتیں بطور تمثیل پیش کر کے نہایت لطف پیدا کیے ہیں۔ حکایت ابراہیم اور ہم، حکایت پیرزن، حکایت ابوالحسن خرقانی، حکایت فرید الدین عطار، حکایت مرد عارف یحی، حکایت سلطان درویش منش، حکایت صوفی، قصہ طالوت قابل ذکر ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ مولا نا روم کی مثنوی نہ صرف ان کے مطالعہ میں تھی بلکہ اس سے خوب فائدہ بھی اٹھایا ہے۔[63] مثنوی کی ابتدا حمد، نعت اور پھر حکایتیں اور داستانیں ہیں۔ مثنوی نگار نے سبب تصنیف اور تاریخ نظم بھی لکھا ہے۔:

شاعری میں ہے عمر کھوئی تمام — میں نے عقبی کا کیا ہرگز نہ کام
اپنی اس بیہودگی سے ہوں خجل — شعر کہنے سے پھرا ہے میرا دل
جی میں ہے وہ جو ہوئے ہیں نیک نام — کچھ لکھوں میں ان بزرگوں کا کلام
جس کے سننے سے ہو عقبی کا حصول — کوئی دم جاوں میں اس دنیا کو بھول
درپس ہرگر آخر خندۂ — مرد آخر ہیں مبارک بندۂ
عارفوں کی بسکہ ہیں رمزیں لکھیں — نام اس کا ہے رموز العارفین
جب بھرا دریاے معنی سے یہ طشت — تھے ہزار و یک صد وہشتاد وہشت

[64]

محمد ابواللیث صدیقی بدایونی نے میر حسن کے کلیات کے کئی اہم نسخے تلاش کر کے مثنوی زموز العارفین کو معارف کے ذریعہ اردو دنیا تک پہنچایا۔ سید احمد اللہ قادری نے مولوی سید محمد حسین صاحب کے کتب خانہ میں مثنوی کا قدیم نسخہ دستیاب کر شمس الاسلام پریس حیدر آباد سے 1933 میں شائع کیا۔ وہ مقدمہ میں لکھتے ہیں۔:

> ''تذکرہ نویسوں نے اس مثنوی کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس کے طبع کرانے کی مجھے ایک مدت سے آرزو ہے اسی بنا پر میں نے میر حسن کے حالات زندگی جمع کر کے ایک مبسوط مضمون کی شکل میں مرتب کیے اور اسے آج سے تین سال قبل رسالہ زمانہ میں اشاعت کے لیے بھیجا جو 1931 کے تین نمبروں میں شائع ہوئے، لیکن اصل مثنوی کو اس لیے چھپوا نہ سکا کہ میرے پاس اس کا جو مخطوطہ ہے وہ جدید الخط ہے۔ حال میں اس کا ایک خوش خط مخطوطہ مولوی سید محمد حسین صاحب بلگرامی سابق صدر محاسب سرکار عالی کے کتب خانہ سے میسر آیا، بلگرامی صاحب کا مخطوطہ قدیم ہے اور مصنف کی وفات کے دوسرے سال بمقام لکھنؤ 21 محرم 1203 کو تمام ہوا ہے اور یہی شائع کیا جا رہا ہے۔''[65]

فاضل مرتب نے نہ صرف مثنوی کی تدوین وترتیب کا کام کیا ہے بلکہ طویل دلچسپ اور معلوماتی مقدمہ بھی

تحریر کیا ہے۔انہوں نے نہ صرف مثنوی رموز العارفین پر روشنی ڈالی ہے بلکہ ان کی دیگر مثنویوں اور ان کے حالات بھی رقم کیے ہیں۔

'نواح دہلی کی اردو کی دو قدیم ترین کتابیں' کے عنوان سے ڈاکٹر رشید الدین احمد کا مضمون معارف جنوری 1944 کو شائع ہوا۔فاضل مضمون نگار نے مذکورہ مضمون میں نواح دہلی کی دو قدیم کتابوں 'مثنوی واقعات امامیہ' 'دیوان منعم تجاوری' کا تعارف پیش کیا ہے۔ان کتابوں کے بارے میں ڈاکٹر رشید الدین احمد کا دعوہ ہے کہ یہ اردو کی قدیم ترین کتابوں میں سے ہیں۔مضمون کے ابتدا میں یہ معلومات بھی درج ہے۔:

''صاحب گلشن ہند وآب حیات وغیرہ نے شاہ ولی اللہ دکنی اورنگ آبادی متوفی 1155 کو اردو زبان کا پہلا شاعر لکھا ہے جو سید ابوالمعالی کے ساتھ بہ عہد سلطنت محمد شاہ 1134 میں دہلی آئے۔ ...1141 میں انہوں نے مثنوی دہ مجلس لکھی ..... مصنف دکن میں اردو نے وجدی کی مثنوی تحفۂ عاشقاں کو 1015 کی تصنیف قرار دے کر زبان اردو کا پہلا شاعر وجدی کو مانا ہے مگر بہار مظہر میں ہے.... تحفۂ عاشقاں 1152 میں اور پنچھی نامہ یا پنچھی باچھ جو منطق الطیر کا ترجمہ ہے 1146 میں اور جاں افزا 1145 میں لکھی گئی ہیں.... جواہر سخن مطبوعہ ہندستانی اکیڈمی الہ آباد کی جلد اول میں اردو کا پہلا شاعر وجہی دکنی کو لکھا گیا ہے،جنہوں نے کتاب سب رس نثر میں بہ زبان دکنی 1045 میں لکھی۔تاریخی ادب اردو میں پہلا شاعر محمد قلی قطب شاہ متوفی 1022 کو لکھا گیا ہے۔''66

مذکورہ معلوماتی تمہید کے بعد دونوں کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔'مثنوی واقعات امامیہ' جو حضرت شاہ غلام رسول تجاوری برادر حضرت شاہ حافظ منور بایزید ثانی معمر قریشی نے ہمایوں کے عہد میں 938 میں لکھی۔جو کہ کتب خانہ مجیدیہ واقع خانقاہ شعیبی مملوکہ حضرت صاحب سجادہ نشین خانقاہ شعیبیہ تجارہ میوات میں موجود ہے۔جس کو ڈبلو ایل ہارولے سابق پرایم منسٹر ٹونک اور چیف منسٹر راج الور نے عجائبات میں شمار کرتے ہوئے اس کی حفاظت کے لیے ایک سو بیس روپے مرحمت فرمایا تھا۔مضمون نگار کا خیال ہے کہ یہ اردو کی سب سے قدیم ترین مثنوی ہے۔67 یہ مثنوی کب اور کس عہد میں لکھی گئی فاضل مضمون نگار نے چند اشعار کی مدد سے وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔اشعار حسب ذیل ہیں:۔

ہمایون شہ آن شاہ جمشید جاہ — جو ہے حکمران اب بلا اشتباہ
غلام رسول است امید وار — شہا شہریاران مرادش برآر
تجارہ شہر وطن مالوف اوست — درین ملک میوات معروف اوست

68

مذکورہ اشعار کی مدد سے مضمون نگار نے لکھا ہے کہ یہ مثنوہ ہمایوں کے عہد میں 938 میں لکھی گئی۔نمونہ کلام کے طور چند اشعار بھی نقل کیے گئے ہیں:۔

الہی تیرا فضل جو یار ہو فلک اور ملک سب مددگار ہو
میرے دل مین ہے آرزوے تمام حقیقت لکھوں واقعات امام
ہندی زبان بعض درفرس ہم نگارش نمودیم ترتیب نظم
کتھا درد دکھ کی جگہ سوز ہے دل افسردہ گان شعلہ افروز ہے
رضاے خدا گر نبودے چنین ستمگر نہ بستے میاں پھر کہین
زمین پیٹ پھٹ کھائی جاتی بدم فلک ٹوٹ پڑتا نہ با این ستم
غلام رسول آؤ سرکر سخن کی مری خلق تیرے سخن کو سنن

69

ڈاکٹر رشید الدین نے مثنوی واقعات امامیہ کو اردو کی سب سے قدیم ترین مثنوی قرار دیا ہے۔جبکہ اس سے قبل معارف اکتوبر 1923 کے شمارے میں نصیر الدین ہاشمی کے قلم سے اردو کی سب سے قدیم مثنوی 'کدم راو پدم راؤ' کے مخطوطہ کا تعارف شائع ہو چکا ہے۔مثنوی کدم راو پدم راو جس کے خالق فخر دیں نظامی ہیں جو بالاتفاق آج بھی اولیت کا اعزاز رکھتی ہے۔جمیل جالبی نے اپنے مقدمہ کے ساتھ اسے شائع کر دیا ہے۔اس مثنوی پر تفصیلی بحث دکنیات کے باب میں کر دی گئی ہے۔

دیوان منعم تجاوری یہ اس دور کی دوسری اہم کتاب ہے۔جس کے مصنف مولانا شاہ محمد اشرف عمرانی القریشی منعم ہیں۔یہ حضرت شاہ غلام رسول مصنف واقعات امامیہ کے بھانجے ہیں۔یہ دیوان بھی مذکورہ بالا لائبریری میں موجود ہے۔70 دیوان کے مختصر تعارف کے بعد نمونہ کلام بھی نقل کیے گئے ہیں۔چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:۔

دیکھ کر اس قد موزوں کو زبس شرم کے ساتھ
گڑ گیا خاک میں سرو آج گلستان کے بیچ

ہے پیچ وتاب میں سنبل کا دل بی دیکھ
سن کر صبا سین طرہ دستار کی خبر

شمع اس یار کے رخسار کو ن دیکھ

ہوئی فانوس میں جل کر کے روپوش
ٹک ایک تو چپت مت کہو عمر ضائع
نہیں بہتر ہے منعم خواب خرگوش

رونق نہین ہے صفحہ کی جدول بغیر دیکھ
ایسے ہی حسن کے تئین دے ہے بہار خط

کونسا معشوق ہے جگ میں جلے عاشق کے ساتھ
اس قدر عاشق نوازی کوں ترے چھاتی ہے شمع

ابر ہے سبزہ ہے اور خندان ہے گل گلشن کی بیچ
حیف ہے اس وقت میں ساقی نہین دیتا ایاغ

رات دن ہے شوق سیمیں گل کے چمن میں پایے بند
سب غلط ہے جو کوئی کہتا ہے سروآزاد ہے

منعم ہو عاشقان میں اس وقت کا سلیمان
دبوگر اپنی اسکون انگشتری نشانی

72ؔ

ڈاکٹر رشید الدین احمد کا مضمون یہاں مکمل ہوجاتا ہے مگر ماہنامہ معارف میں اردو کی دو قدیم کتابوں کے حوالے سے مباحث کا ایک سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ یہ سلسلہ جون 1945 تک چلا۔ ڈاکٹر رشید الدین احمد کے مضمون کے جواب میں نصیر الدین ہاشمی کا مضمون مارچ 1944 اور محمد خلیل تجاوری کا جنوری 1945 اور پھر جون 1945 میں نورالحسن ہاشمی کا مضمون شائع ہوا۔ دو قدیم کتابوں پر مباحث کا سلسلہ یہاں بھی ختم نہ ہوتا اگر مدیر معارف کا یہ نوٹ شائع نہ ہوتا کہ اب اس سلسلہ میں کوئی اور مضمون شائع نہ کیا جائے گا۔

ڈاکٹر رشید الدین احمد نے اپنے مضمون کے ابتدا میں لکھا تھا کہ نصیر الدین ہاشمی نے مثنوی تحفۂ عاشقاں 1015 کے مصنف وجدی کو پہلا شاعر مانا ہے۔ جس کے جواب میں معارف مارچ 1944 کو نصیر الدین ہاشمی کا مضمون 'اردو کی دو قدیم کتابیں' شائع ہوا۔ زیر نظر مضمون کے اہم نکات یہاں نقل کیے جاتے ہیں:۔

1"۔ راقم کی کتاب دکن میں اردو کے حوالے سے تحفہ عاشقاں کا تذکرہ کر کے اس کے سن تصنیف کی صحت کی گئی ہے۔ بیشک راقم نے دکن میں اردو کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں وجدی کی تحفہ عاشقاں کو دکھنی زبان کی پہلی کتاب قرار دیا تھا، لیکن اس کے بعد جو تحقیقات کی گئی اس کے لحاظ سے طبع ثالث میں اصلاح کر دی گئی ہے۔ دکھنی نظم کی پہلی کتاب جواب تک دریافت ہوئی ہے وہ نظامی کی مثنوی ہے۔ جو 865 میں تصنیف ہوئی ہے اس کے متعلق راقم کا مضمون بہمنی عہد حکومت کا ایک دکھنی شاعر کے عنوان سے رسالہ معارف بابت اکتوبر 1932 میں شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی متوفی 825 کی کتابیں جو نثر میں لکھی گئی ہیں موجود ہیں البتہ خواجہ صاحب کی نظم کے متعلق ہنوز پوری تحقیقات نہیں ہوئی ہے۔

2۔ زیر بحث مضمون میں 'جواہر سخن' کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ وجہی پہلا شاعر تھا جس نے سب رس 1045 میں لکھی ہے۔ جواہر سخن میں وجہی کی مثنوی قطب مشتری کا تذکرہ ہے نہ کہ سب رس کا ،قطب مشتری کی تصنیف 1018 میں ہوئی ہے۔

3۔ بحوالہ تاریخ ادب اردو محمد قلی قطب شاہ کی وفات 1022 میں بتائی گئی ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے تاریخ مذکور میں قطب شاہ کا سن وفات 1625 لکھا گیا ہے۔ سلطان کی وفات دراصل 1020 میں ہوئی ہے نہ کہ 1022 میں۔ اس صحت کے بعد مجھے مضمون زیر بحث کی کتابوں کے متعلق بھی صراحت کرنی ہے۔ اس میں دو کتابوں کا تذکرہ ہے ایک مثنوی واقعات امامیہ ہے اور دوسری کتاب دیوان منعم ہے۔ اول الذکر مثنوی کے متعلق لکھا گیا ہے یہ 938 میں مرتب ہوئی ہے اور ثانی الذکر کے متعلق بتایا گیا ہے کہ یہ بھی اسی دور کی تصنیف ہے۔ صاحب مضمون نگار نے واقعات کے لحاظ سے سن کی صراحت کی ہے لیکن تیقن کے ساتھ سن تصنیف کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے، جو نہایت ضروری ہے۔ مضمون زیر بحث میں اس امر کی وضاحت نہیں ہے کہ مثنوی واقعات امامیہ شاہ غلام رسول برادر شاہ حافظ منور بایزید ثانی کی تصنیف ہونے کا کیا ثبوت ہے۔؟

اس سے قطع نظر دیوان منعم کو 938 یا اس زمانے کا دیوان قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ہو سکتا ہے کہ محمد اشرف منعم تخلص رکھتے ہوں مگر کسی اور شخص کا تخلص منعم ہونا خارض از قیاس نہیں ہو سکتا ،زبان کے لحاظ سے دیوان منعم کو ہرگز 938 کی کتاب قرار نہیں دیا جا سکتا۔"72

نصیر الدین ہاشمی نے مذکورہ مضمون میں نہ صرف رشید الدین احمد کے اٹھائے گئے سوالوں کا جواب دیا ہے بلکہ اشعار کی زبان کے حوالے سے لکھا ہے کہ زبان اس قدر صاف ہے کہ اس کو 938 کی زبان تصور کرنے میں شبہہ کی گنجائش ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کے مذکورہ مضمون کے بعد محمد خلیل صاحب تجاوری کا مضمون 'اردو کی دو قدیم کتابیں' معارف جنوری 1945 کو شائع ہوا۔ جس میں نہ صرف یہ کہ نصیر الدین ہاشمی کے اٹھائے گئے شبہات کا جواب دیا گیا

ہے بلکہ ان دونوں کتابوں پر روشنی بھی ڈالی گئی ہے۔محمد خلیل صاحب کے مضمون کے اہم نکات ملاحظہ ہوں:۔

1۔ تاریخ ادب اردو مطبوعہ نول کشور پریس جو اس وقت پیش نظر ہے اس مین صفحہ نمبر 63 پر سلطان محمد قلی قطب شاہ ولد ابراہیم قطب شاہ کا سنہ وفات 1611 لکھا ہے،اور سلطان محمد قطب شاہ کا سن وفات صفحہ نمبر 67 پر 1625 ہے،لیکن ہاشمی صاحب نے اسی کتاب کے حوالے سے سلطان محمد قلی قطب شاہ کا سن وفات 1625 تحریر فرمایا ہے۔اسی طرح ہاشمی صاحب کو کتاب سب رس کے بارے میں بھی شاید سہو ہو گیا ہے ورنہ تاریخ ادب کے صفحہ 70 پر سب رس کا سن تصنیف 1040 تا 1045 تحریر ہے اور محمد قلی قطب شاہ کی وفات کا سن ہجری ہاشمی صاحب نے 1020 لکھا ہے، بہار مظہر میں 1022 ہے۔

2۔ مثنوی واقعات امامیہ کے تصنیف رسولی ہونے کا ثبوت طلب کیا ہے تو واضح ہو کہ مثنوی میں مصنف کا نام، وطن، بادشاہ وقت ہمایوں بادشاہ کا نام اور اس کی تعریف موجود ہے۔جس سے زمانہ کو تعین ہوتا ہے،اور ایک جگہ سن تحریر ہے ۔پھر مراہ الانساب، مراۃ احمدی،نسب نامہ مفتیان ریواڑی ارمغان ولی وغیرہ سے مصنف اور اس کے آبا و اجداد کے حالات علم میں آتے ہیں۔جس میں ان کا شجر نسبی، شجر قرآنی و شجر شاعری وغیرہ بھی درج ہیں۔اور اس کے بعد کا سلسلہ شاگردی قاری حافظ حکیم سید شاہ نجم الدین صاحب نصیری کوڑی کے شاگرد تک پہنچتا ہے۔حضرت شاہ غلام رسول کے مزار شریف کے متصل قلندر مسجد کی دیوار پر اس کا وطعہ تاریخ چونے کے ابھرے ہوئے حرفوں میں لکھا ہے۔دیوا گر جانے کی وجہ سے کچھ عبارت کے حروف ٹوٹ گئے ہیں۔بقیہ یہ ہیں:

گلزار نظام الدین گلے رفت رسولش نامی گویند باغم
سیہ دل اند لالہ از رحیالش ..... .فخر دین از کشت داغم

3۔ دیوان منعم کے بابت لکھتے ہیں کہ اس کو 938 یا اس زمانے کا دیوان قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ہوسکتا ہے کہ محمد اشرف منعم رکھتے ہوں مگر کسی اور شخص تخلص منعم ہونا خارج از قیاس نہیں ہوسکتا ۔اس سلسلہ میں عرض ہے کہ حضرت مولانا شاہ محمد اشرف غلام رسول کے برادر زادہ ہیں۔اور حضرت سجادہ نشین صاحب خانقاہ شعیبیہ تجارہ آفتاب میوات کے بزرگان گذشتہ سے ہیں، یہاں کے سوا کہیں اور یہ دیوان موجود نہیں۔مولانا عبد الحئی صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند بھی اپنے گرامی نامہ نمبر 5349 میں ارقام فرماتے ہیں کہ میرے کتب خانہ میں قدیم اردو کے کئی سو قلمی نسخے موجود ہیں، مگر آپ کے حضرت شاہ غلام رسول اور دیوان منعم کا کلام نہیں ملا، آپ کی بدولت اس کی اطلاع پہلی بار ملی کیا ہے ممکن ہے کہ میں آپ کی وساطت سے اس کی زیارت کرسکوں۔مثنوی میں ہمایوں بادشاہ کا نام اور اس کی مدح موجود ہے جو کافی ثبوت اس امر کا ہے کہ اس وقت کی لکھی ہوئی ہے۔میں آپ سے مل کر اس مثنوی اور دیوان منعم کے متعلق گفتگو کرنا

چاہتا ہوں، یا یہ ممکن نہ ہو تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ ان کی نقلیں مل جائیں۔ رہا بعض شعروں کا صاف ہونا تو ہوسکتا ہے مضمون نگار نے صاف اشعار خاص طور پر منتخب کر کے اس لیے لکھے ہوں کہ جس طرح کلام ولی و مثنوی میر حسن میں جو ڈیڑھ سو سال پیشتر کی زبان ہے بہت سے اشعار کس قدر صاف ہیں۔''73

مذکورہ مضامین کے بعد معارف جون 1945 کو ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کا مضمون اس حوالے سے شائع ہوا۔ انہوں نے مذکورہ مضامین کا نہ صرف جواب دیا بلکہ اس موضوع پر سیر حاصل بحث بھی کی۔ نورالحسن ہاشمی کے مضمون سے اہم نکات پیش کیے جاتے ہیں:۔

''پچھلے سال جناب ولی محمد صاحب سجادہ نشین خانقاہ تجارہ عرس حضرت نظام الدین اولیا میں شرکت کی غرض سے تشریف لانے والے تھے، تو قبلہ مولوی عبدالحق صاحب نے انہیں لکھ دیا تھا کہ اگر آپ اپنے ہمراہ یہ دونوں کتابیں لیتے آئیں تو یہاں دیکھنے پر واضح ہو سکے گا کہ یہ کس عہد کی کتابیں ہیں، چونکہ مولوی صاحب قبلہ اس زمانہ میں دہلی سے باہر جانے والے تھے، اس لیے یہ کام میرے سپرد کر گئے تھے۔ میں نے مسجد قاضی حوض دہلی میں سجادہ نشین صاحب موصوف سے ملاقات کی، وہ صرف دیوان منعم اپنے ہمراہ لائے تھے۔ اور وہ بھی اول و آخر سے ناقص اور بیچ کے اوراق بھی جگہ جگہ سے غائب تھے، مثنوی واقعات امامیہ کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ان کے برادر کلاں اسے دہرہ دون اپنے ہمراہ لے گئے ہیں بعد کو دکھائی جاسکے گی۔ دیوان منعم کو ایک نظر ہی دیکھنے سے معلوم ہو گیا کہ وسط بارہویں صدی سے پیشتر کا کلام نہیں ہوسکتا۔ ولی کی غزلوں پر کئی غزلوں اس میں موجود ہیں ، یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ولی کے دیوان کے پہنچنے دلی میں ،حاتم، آبرو، مضمون، احسن، فائز وغیرہ نے اردو میں شاعری اور دیوان سازی شروع کردی تھی اور شعر و شاعری کی دنیا میں ایک ہل چل مچ گئی تھی ۔منعم نے بھی اپنا دیوان دوسرے شاعروں کی طرح ترتیب دینا شروع کیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس عہد کے شاعروں میں سے جس کا کلام یا مکمل دیوان دستیاب ہوجائے تو وہ اردو ادب وشعر میں ایک اچھا اضافہ کریگا، لیکن منعم کے دیوان کو دسویں صدی ہجری کا کلام بتانا سرتا سر غلط اور بے سروپا بات ہے۔ حالانکہ مثنوی واقعات امامیہ سجادہ نشین صاحب موصوف اپنے ہمراہ نہیں لائے تھے، لیکن اس قدامت کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے، محمد خلیل صاحب نے اپنے مضامین میں غلام رسول صاحب مصنف مثنوی مذکور کو منعم کا چچا بتلایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر چچا بھتیجے کی عمر میں چالیس پچاس یا زیادہ سے زیادہ ساٹھ سال کا فرق بھی فرض کرلیا جائے تو غلام رسول صاحب کس طرح ہمایوں کے زمانہ تک نہیں پہنچے، اس کے علاوہ ان اشعار سے بھی جو مثنوی کے نمونتہ پیش کئے گئے ہیں، یہ مثنوی فرخ سیر یا زیادہ سے زیادہ اواخر عہد عالمگیری سے پیشتر کی نہیں معلوم ہوتی، خود محمد شاہ کے زمانہ تک اس قسم ریختوں کا راج رہا، اور جس

کے نمونے بھی کافی ملتے ہیں، جس میں افعال اور حروف روابط فارسی کے ہوتے ہیں، خود میر نے بھی اس قسم کے ریختہ کا ذکر اپنے زمانہ کے اقسام ریختہ میں کیا ہے اور اس قسم ریختہ کو قبیح گردانا ہے۔.... مولوی عبدالحق قبلہ کے خط نمبر 5349 کا حوالہ قدامت کے ثبوت میں دینا بالکل غلط طریقہ ہے۔ مولوی صاحب کا مطلب تو یہ ہے کہ اگر مثنوی مذگور ہمایوں کے عہد کی ہوئی تو واقعی قابل قدر ہوگی اور چونکہ وہ نہیں ہے اس لیے مولوی صاحب بھی اس کے قائل نہیں ہو سکتے۔ محمد خلیل صاحب نے یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ مثنوی مذکور پر سنہ کتابت اور دیباچہ میں ہمایوں کی تعریف وغیرہ درج ہے، لیکن مجھے اب بھی گمان یہی ہے کہ خلیل صاحب کو مضمون کے سیاق وسباق نیز تاریخ کتابت مثنوی مذکور کو پڑھنے اور سمجھنے میں سہو ہوا ہے۔ بہتر ہوگا کہ وہ بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں اور مکرر سہ مکرر، کیوں کہ قرائن ایسے ہیں کہ کسی صورت سے یہ مثنوی اتنی قدیم نہیں ہوسکتی جتنا کہ کہا جاتا ہے۔ رہا دیوان منعم تو اس کے متعلق تو کوئی گفتگو کی گنجائش ہی نہیں ہے وہ وسط بارہویں صدی سے پیشتر کی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔'' 74

اردو کی دو قدیم کتابوں کے مباحث کا سلسلہ اسی مضمون پر ختم ہو گیا۔ نورالحسن ہاشمی نے نسخہ کے مطالعہ سے ثابت کر دیا کہ یہ کتاب اتنا قدیم نہیں ہے جتنا کہ کہا جا رہا ہے۔ اوراق غائب ہیں اس پر کوئی سن کتابت نہیں اس لیے صحیح سن کا تعین نہیں ہو سکا البتہ قرائین سے لگتا ہے کہ وہ ولی کے بعد کے کسی زمانے کی تصنیف ہے۔ البتہ دونوں کتابیں کافی اہم ہیں۔ ضرورت اس بات ہے کہ انہیں تلاش کر کے دوبارہ مطالعہ کیا جائے تاکہ حقائق کو پیش کیا جا سکے۔

پنڈت دیا شنکر نسیم اور ان کی مشہور مثنوی گلزار نسیم تعارف کی محتاج نہیں، اسی مثنوی نے انہیں حیات جاوید عطا کیا۔ معارف اگست 1946 کو سید ظہورالحسن رامپوری کا مضمون ''مثنوی گلزار نسیم کے ماخذ' شائع ہوا۔ زیرنظر مضمون میں پہلی بار دو قلمی مثنویوں کو گلزار نسیم کا ماخذ قرار دیا گیا ہے۔ مثنوی باغ و بہار جو کہ اردو زبان میں ہے جس کے خالق ریحان الدین لکھنوی ہیں جبکہ دوسری مثنوی فارسی زبان میں ہے اور اس کے شاعر کا نام رفعت لکھنوی ہے۔ اس حوالے سے ظہورالحسن لکھتے ہیں:۔

''ہمارے پاس دو مثنویاں قلمی ہیں جنہیں ہر طرح مثنوی گلزار نسیم کی اصل کہا جا سکتا ہے۔ ان میں کی ایک مثنوی اردو میں ہے جس کا تاریخی نام باغ و بہار ہے۔ یہ ریحان الدین لکھنوی متخلص بہ ریحان کی لکھی ہوئی ہے، دوسری مثنوی فارسی میں ہے یہ رفعت لکھنوی کی تصنیف ہے، افسوس باوجود کوشش بسیار مکمل نہیں مل سکی، لیکن جگہ جگہ تخلص آنے سے اس کے مصنف کا پتہ چلتا ہے۔ ان تینوں مثنویوں کا ایک ہی قصہ ہے، ایک ہی بحر ہے اور نام اور مقام بھی ایک ہی ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر مصرعوں اور شعروں کا لفظ بہ لفظ مثنوی گلزار نسیم میں موجود ہونا خود اس خیال کا بڑا موید ہے کہ نسیم کی نظر سے یا دوسری یا دونوں مثنویاں ضرور گزری ہیں۔'' 75

فاضل مضمون نگار نے ان مثنویوں میں منظوم قصہ، نام، مقام، بحر اور متعدد اشعار کی مشابہت کی وجہ سے ان مثنویوں کو گلزار نسیم کا اصل ماخذ قرار دیا ہے۔ جبکہ مثنوی گلزار نسیم کے بارے میں یہ رائے عام ہے کہ اصل قصہ عزت اللہ بنگالی نے فارسی نثر میں لکھا تھا جسے نہال چند لاہوری نے 1803 میں گلکرسٹ کی فرمائش پر اس کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے 1838/39 میں اسے اردو نثر میں نظم کیا۔ خود دیا شنکر نسیم نے بھی اس کی صراحت کی ہے:۔

ہرچند سنا گیا ہے اس کو | اردو کی زبان میں سخن گو
وہ نثر ہے داد نظم دوں میں | اس مے کو دو آتشہ کروں میں

76

مضمون نگار کا یہ بھی خیال ہے کہ مثنوی گلزار نسیم 1254 میں لکھی گئی جبکہ باغ بہار 1211 میں لکھی جا چکی تھی۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کو کسی طرح یہ مثنوی مل گئی ہوگی اس سے انہوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ 77 مضمون نگار کو رفعت لکھنوی کی فارسی مثنوی کا نام اور سال تصنیف نہیں مل سکا البتہ اس کے بعض مصرعوں اور شعروں کا ہو بہو ترجمہ مثنوی گلزار نسیم میں پایا جانا ثابت کیا ہے۔ سید ظہور الحسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ رفعت لکھنوی نے اپنی مثنوی میں اس بات کا خود اعتراف کیا ہے کہ یہ افسانہ انہیں نثر ملا:۔

یعنی چو کہن بشد زمانہ | کم قدر شدہ است این فسانہ
خواہم کہ بگویش وگربا | یارب بکشا بم بہ گفتار 78

مضمون کا بیشتر حصہ مثنویوں کے تقابل پر مشتمل ہے۔ ظہور الحسن رامپوری نے دونوں مثنویوں کے متعدد مصرعوں سے گلزار نسیم سے تقابل کر کے ایک دوسرے سے مماثل بتایا ہے۔ چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

رفعت	نسیم
عازم بہ سفر شدند ہر چار	شہزادے ہوئے وہ چاروں تیار
زیشان بہ برید شاہ ناچار	رخصت کئے شہ نے چارنا چار
گفتند کہ چشم شاہ شد کور	سلطان زین الملوک شہ زور
می گشت چو گرد رہ بدشتے	میدان مین خاک اڑا رہا تھا 79

نسیم	ریحان
پورب میں تھا یک شہنشاہ	تھا زین الملوک نام جس کا
سلطان زین الملوک ذیجاہ	دوران فلک غلام جس کا
لشکر کش تاجدار تھا وہ	یوں کہتے ہیں رادیان آگاہ

دشمن کش شہر یار تھا وہ　　　تھا شرق کی سرزمین میں کوئی شاہ80

فاضل مضمون نگار نے نہ صرف ان مثنویوں کا تقابل کر کے مثنوی گلزار نسیم کا ماخذ قرار دیا ہے بلکہ باغ و بہار کے شاعر ریحان الدین کو دیا شنکر نسیم سے بڑا شاعر اور مثنوی باغ و بہار کو لطف زبان، صفائی، سادگی، روانی اور شستگی میں گلزار نسیم سے بلند گردانہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> ''اس مقابلہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نسیم رفعت کا کس درجہ زیر بار احسان ہے۔ اس کے بعد باغ و بہار اور گلزار نسیم کے اشعار پیش کیے ہیں، ان کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک لطف زبان، صفائی، سادگی، روانی اور شستگی کا تعلق ہے باغ و بہار نسیم کی مثنوی سے بہت بلند ہے۔ اس میں دو مصنوعی صنعت گری بالکل نہیں پائی جاتی جس سے گلزار نسیم کے مصنف نے کام لے کر اپنے آپ کو ریحان سے آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔''81

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا مضمون 'دیوان عاشق دہلوی' کے عنوان سے معارف اکتوبر 1946 کو شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے اپنے کتب خانہ میں موجود دیوان عاشق دہلوی کے قلمی نسخہ کا تعارف کرایا ہے۔ دیوان کا تعارف کراتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:۔

> ''میرے مختصر کتب خانہ میں اس دیوان کا ایک قدیم نسخہ ہے۔ تین ضخیم تذکرۃ الشعرا، عاشق دہلوی کے ذکر سے خالی ہیں، دو قلمی ریاض الشعرا، والہ واواغستانی، مجمع الغرائب احمد علی سندیلوی، ایک مطبوعہ مجمع الفصحا رضا قلی خان متخلص بہ ہدایت۔ دیوان خط اور کاغذ دونوں کے لحاظ سے پرانا لکھا ہوا ہے۔ مگر سنہ تحریر نہیں ہے، اس لیے کہ نسخہ ناقص ہے۔ عنوان پر درج ہے 'دیوان عاشق دہلوی تلمذ مولانا امیر خسرو دہلوی طوطی ہند' اس کے نیچے مہر ہے۔ بخط نستعلیق خوشخط، اس میں نام عبدہ زین العابدین درج ہے۔ تعداد اوراق موجودہ 82 ہے۔ تلمذ کا ثبوت اشعار ذیل سے ہوتا ہے۔

عاشق این رنگ سخن راز کجا یافتہ است　　　این ہمہ از چمن خسرو چیدہ گل لعل

ایک قطعہ امیر خسرو کی شان میں لکھا ہے اس کا پہلا شعر ہے:

چو خسرو شاعرے از ہند برخاست　　　کہ قدر شاعرانہ اصفہان کاست

مقطع ہے:

ہمنیش بس دلیل پیشوانی　　　کہ عاشق پیرو گفتار دراست 82

حبیب الرحمٰن خاں شروانی صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ نسخہ مولف کے زیر مطالعہ رہا ہے بلکہ خود مصنف کے قلم کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے 83 جگہ جگہ پر اصلاحیں موجود ہیں۔ انہوں نے اس کے لیے متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ دیوان سے نمونہ کلام بھی پیش کیے ہیں۔ چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں:۔

زہے بست بشکر خندراحت جانہا　　　　گل عذاز نورشک گل گلستانہا

چہ فتنہ است ندانم بچاک دامانت　　　　کہ چاک گشتہ کسانرازدگریبا

ایضاً

مژد اشک بارراناز م　　　　رگ ابر بہار رانا زم

نیست در اختیار صبر خرد　　　　دل بے اختیار رانا زم

غنی از سیر لالہ زارم کردہ　　　　سینہ دا غدار رانا زم

خاک گردید وجز بخاک نساخت　　　　عاشق خاکسار رانا زم

یہاں صرف 1947 تک کے مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔البتہ ان مضامین کے علاوہ مخطوطات کی بازیافت، قلمی کتابوں اورنسخون کی دریافت کے حوالے ماہنامہ معارف میں ایک بڑاذخیرہ ہے۔ایک صدی سے زائد کا عرصہ گزرجانے کے باوجود بھی اس حوالے سے اب تک کوئی کام نہیں کیا گیا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے ان شماروں کودوبارہ پڑھا جائے اوراس پر باضابطہ تحقیق کی جائے تا کہ یہ معلوم ہوسکے کہ ادبی تحقیق کے فروغ میں ماہنامہ معارف نے کیا کردارادا کیا۔

دکنیات

اردو ادب کے فروغ میں دکن کا نمایاں کردار رہا ہے۔ اردو کی پیدائش گر چہ دہلی اور نواح دہلی میں ہوئی مگر اس کی پرورش و پرداخت کا کام سرزمین دکن نے ہی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی ابتدائی نثری اور منظوم کتابیں دکن میں ہی لکھی گئیں ۔معارف تحقیق میں اقبالیات، غالبیات، لسانیات ، اسلامیات کے علاوہ ایک حصہ دکن اور دکنی موضوعات پر مشتمل ہے۔ دکنی مباحث کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جس کو 'معارف' نے سلجھایا ہے۔ ماہنامہ معارف نے جب علم و تحقیق کی دنیا آباد کی تو دکنیات سے متعلق بہت سے گوشوں کو پیش کیا۔ دکنی کتابوں کا تعارف کرایا۔

اردو کی سب سے پہلی مثنوی 'کدم راو پدم راو' جس کے مصنف فخر دین نظامی ہیں اس کی بازیافت کا سہرا معارف کے سر ہے۔ اکتوبر 1932 میں نصیرالدین ہاشمی (1895۔1964) نے پہلی بار اس مثنوی کے متعلق ایک طویل مضمون لکھا اور اس مثنوی کے نام کا بھی تعین کیا۔ اسی طرح اردو کی سب ضخیم مثنوی 'خاور نامہ' جو دکن کے ایک باکمال شاعر کمال خاں رستمی کی تصنیف ہے۔ اس مثنوی کے قلمی نسخے کی اطلاع سب سے پہلے معارف ہی نے علمی وادبی دنیا کو پہنچائی۔ 'کتاب نورس' جو بیجاپور کے چھٹے حکمراں ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کے راگ راگنیوں کا مجموعہ ہے۔ نصیرالدین ہاشمی نے جون 1932 میں 'نورس' کے تین مختلف نسخوں کی معارف کے ذریعے اطلاع دی جس کے بعد جولائی 1953 میں ڈاکٹر نذیر احمد (1915۔2008) کا ایک تفصیلی مقالہ ماہنامہ معارف میں شائع ہوا، جس میں کتاب نورس کے دس مخطوطوں کی اطلاع تھی ۔1955 میں ڈاکٹر نذیر احمد نے ہی اپنے تفصیلی مقدمے کے ساتھ اسے مرتب کر کے شائع کیا۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی (1048۔1083) بیجاپور کے شاہی حکمرانوں میں آٹھواں حکمراں تھا جو علم و فضل کا قدرداں اور خود بھی ذی علم تھا۔ شعر و سخن میں ید طولی رکھتا تھا۔ اس کا اردو کلیات جو نایاب تھا 1933 میں معارف نے اس کے قلمی نسخے کی بازیافت کی ۔ جسے ایک مدت کے بعد زینت ساجدہ نے 1962 میں مرتب کر کے شائع کیا۔ شیخ داود ضعیفی جو ایک صاحب دیوان دکنی شاعر تھا ان کی دو کتابوں 'ہدایت ہندی اور عشق صادق' سے ہی اب تک ادبی دنیا واقف تھی معارف نے پہلی بار ان کی ایک اور کتاب 'نصیحت مدن' سے متعارف کرایا۔ بالا جی نایک ذرہ جو گیارہویں صدی ہجری کا ایک ہندو دکنی شاعر ہے جس کا کلام اب تک ناپید تھا پہلی بار معارف نے کتب خانہ آصفیہ میں اس کے غیر مطبوعہ کلیات کے بازیابی کی خبر دی۔ سید میران ہاشمی بیجاپوری (1635۔1697) کا شمار دکن کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ ریختی کا ایک دیوان اور دو کتابیں 'احسن القصہ' اور 'یوسف زلیخا' ان کی یادگار ہیں۔ اب تک یہ خیال عام تھا کہ 'احسن القصہ' اور 'یوسف زلیخا' دو الگ الگ کتابیں ہیں مگر ماہنامہ معارف نے برٹش میوزیم کے ایک قلمی مخطوطے کے موجودگی کی خبر دی جس کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ دونوں کتابیں دراصل ایک کتاب کے دو نام ہیں ۔اس کے علاوہ ماہنامہ معارف دکنی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جس میں نادر و نایاب نسخوں کی دریافت، ادبا و شعراء کے احوال، شعرا کے تذکرے اور دکنی کتابوں پر تعارف و تبصرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی (1895۔1964) محقق، مخطوطہ شناس اور ماہر دکنیات کے طور پر شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے دکنی ادب کی بہت سی غیر مطبوعہ کتابوں کی بازیابی کی ہے۔ دکنی مخطوطات کا ایک بڑا حصہ یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہے۔ نصیر الدین ہاشمی تعلیم و تعلم کے سلسلے میں ایک مدت تک یورپ میں مقیم رہے ہیں۔ یورپ کی مختلف لائبریریوں کے کیٹلاگ اور ان میں موجود کتابوں کا نہ صرف یہ کہ مطالعہ کیا بلکہ ان پر تفصیلی مضامین بھی لکھے جو 'یورپ میں دکھنی مخطوطات' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ماہنامہ معارف میں دکن سے متعلق مختلف کتابوں اور مخطوطوں کے حوالے سے ان کے متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں۔ یہ مضامین نصیر الدین ہاشمی کی کتاب 'دکھنی قدیم اردو کے چند تحقیقی مضامین' میں بھی شامل ہیں۔ اکتوبر 1932 میں معارف میں ان کا مضمون 'بہمنی عہد کا ایک دکھنی شاعر' شائع ہوا۔ نصیر الدین ہاشمی نے اس مضمون میں عہد بہمنی کے ایک مشہور شاعر فخر دین نظامی کا تعارف اور اس کی یادگار مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کو متعارف کرایا ہے جس سے ادبی دنیا اب تک ناواقف تھی۔ اس مثنوی کو جمیل جالبی نے کتابی شکل میں اپنے طویل مقدمے کے ساتھ 1973 میں شائع کیا۔ اس کا نیا ایڈیشن نظر ثانی کے بعد 1979 میں شائع ہوا، جس میں جمیل جالبی نے نصیر الدین ہاشمی کے اس مضمون کا ذکر کیا ہے جو ماہنامہ معارف میں شائع ہوا تھا۔84 نصیر الدین ہاشمی نے اپنے ایک عزیز مولوی لطف الدین ادریسی کے پاس موجود مخطوطے کے مطالعے سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مثنوی اردو کی سب سے پہلی مثنوی ہے۔ مثنوی چونکہ ناقص ہے درمیان اور آخری کا حصہ نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے مثنوی نگار اور سن تصنیف کا علم نہیں ہوتا۔ چونکہ مثنوی میں کدم راو پدم راو کا قصہ منظوم ہوا ہے اسی مناسبت سے نصیر الدین ہاشمی نے اس مثنوی کا نام 'کدم راو پدم راو' رکھا۔ مثنوی کے اوراق غائب ہیں اس لیے یہ پتا لگانا مشکل ہے کہ مثنوی نگار کا نام کیا تھا البتہ نصیر الدین ہاشمی نے مثنوی کے متن کے اشعار حوالے سے لکھا ہے کہ اس کا تخلص نظامی تھا اور پورے مضمون میں نظامی سے ہی مخاطب کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

جو ادا تھیں نہ چلی پون کوئی — نظامی کدھین سن برس نہ ہوئی
نظامؔی مے دہر د کہ کیون رادھے — کہ پت ورت کن پات دھن سودھے
کہوں سد ساجی نظامی دھرم — پدم سب سنے بات بانجی کدم
نظامی کہنہار جس بار پوئے — سنہار سن نغز گفتار ہوئے 85

مثنوی کے مذکورہ اشعار میں مثنوی نگار نے خود کو بار بار نظامی سے مخاطب کیا ہے اس لیے نصیر الدین ہاشمی نے مثنوی نگار کا تخلص نظامی قرار دیا ہے۔ جبکہ جمیل جالبی جو اس مثنوی مرتب ہیں انہوں نے مثنوی کے متعدد اشعار کی مدد سے مثنوی نگار کے تخلص کے ساتھ ساتھ نام کی بھی صراحت کی ہے اور مثنوی نگار کا نام فخر دین قرار دیا ہے۔ اشعار حسب ذیل ہیں:

سنو فخر دیں اب کسی سنور سے　　　　الوالامر اپنا اسی سنور سے

نظامی کہنہار جس یار ہوے　　　　سنہار سن نغز گفتار ہوے 86

مذکورہ شعر سے مثنوی نگار کے نام اور تخلص کا پتا تو چل جاتا ہے البتہ یہ مثنوی کب اور کس عہد میں لکھی گئی یہ نہیں معلوم ہوتا۔ یہ ایک پیچیدہ بحث ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے مثنوی کے اشعار اور عناوین کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مثنوی احمد شاہ بہمن کے عہد میں لکھی گئی جو کہ بہمنی عہد کا ایک بادشاہ تھا، انہوں نے اس کی جو وجوہات بیان کی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

الف۔ اشعار ذیل سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مثنوی بہمنی دور کی پیداوار ہے

شہنشاہ بڑا شاہ احمد کنور　　　　پرتپال سینسا کرتا رادھار

دھنین تاج کا کون راجا ابھنگ　　　　کنور شاہ کا شاہ احمد بجھنگ

لقب شہ علی آل بہمن ولی　　　　ولی تھی بہت بدھہ تدآگلی

ب۔ مثنوی میں مختلف عنوانات ہیں جن میں سے ایک عنوان حسب ذیل ہے 'مدح سلطان علاوالدین بہمنی نوراللہ مرقدہٗ'

ج۔ زبان کے لحاظ سے نہایت قدیم مثنوی قرار دی جاسکتی ہے کیونکہ اب تک قدیم سے قدیم جو کلام دستیاب ہوا ہے اس سے بھی اس کی زبان مشکل ہے

د۔ رسم الخط کے لحاظ سے بھی نہایت قدیم مثنوی قرار دی جاسکتی ہے

اس کے بعد یہ امر تحقیق طلب ہے کہ یہ مثنوی کس سن میں تصنیف ہوئی اس کے متعلق جو کچھ ہمارے معلومات میں ہیں وہ صرف یہ ہیں کہ یہ مثنوی علاوالدین بہمن کے انتقال کے بعد لکھی گئی اور اس کے شہزادے کا نام احمد شاہ تھا۔ لہذا اب اس امر کی تحقیق ہونی چاہیے کہ بہمنی خاندان میں سے کن کن بادشاہوں کا نام علاوالدین تھا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ خاندان بہمن میں پانچ بادشاہ علاوالدین کے نام سے گذرے ہیں یعنی

۱۔	علاؤالدین بہمن شاہ	بانی خاندان	748 تا749ھ
۲۔	علاؤالدین مجاہد شاہ	تیسرا حکمراں	777 تا780ھ
۳۔	علاؤالدین احمد شاہ ثالث	دسواں حکمراں جو احمد شاہ کا لڑکا تھا	838 تا862ھ
۴۔	علاؤالدین ہمایوں شاہ	گیارہواں حکمران	862 تا865ھ
۵۔	علاؤالدین	سولہواں حکمران	927 تا929ھ

ان میں سوائے نمبر چار کے کوئی ایسا نہیں ہے جس کا شہزادہ احمد ہو صرف وہی ایسا حکمران ہے جس کا لڑکا احمد

شاہ ثالث تھا،اور وہ 865ھ میں تخت نشین ہوا اور 867ھ میں فوت ہوا اس کو اگر چہ مصنف تاریخ فرشتہ نے نظام شاہ سے موسوم کیا ہے۔ جو سکے 865ھ سے 867ھ تک مضروب ہوئے ان پر بادشاہ کا نام احمد شاہ مسکوک ہے۔اس مثنوی کے اس عہد میں تصنیف ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ شاعر بادشاہ کا مصاحب تھا اور اس کو دربارشاہی سے تعلق تھا اس لیے بہت ممکن ہے کہ شاعر نے اپنا تخلص بادشاہ کے لقب پر نظامی قرار دیا ہو۔''87

نصیرالدین ہاشمی نے مذکورہ شعراور تاریخ کی مدد سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ مثنوی احمد شاہ ثالث کے عہد میں لکھی گئی جو عہد بہمنی کے گیارہویں حکمران علاؤالدین ہمایوں شاہ کا لڑکا تھا جس نے 865ھ سے 867ھ ہجری تک حکمرانی کی، گویا یہ مثنوی 865ھ اور 867ھ کے درمیان لکھی گئی۔مگر جمیل جالبی نے نصیرالدین ہاشمی کی تردید کی ہے اورانھوں نے اسی مذکورہ شعر سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مثنوی 'کدم راو پدم راؤ'احمد شاہ ولی بہمنی کے دور حکومت 825ھ اور 829ھ کے درمیان لکھی گئی ان کی دلیل یہ ہے:

''ہاشمی صاحب کا یہ کہنا سوائے گیارہویں حکمران علاؤالدین ہمایوں شاہ کے کوئی اور ایسا حکمران نہیں ہوا جس کا لقب علاؤالدین احمد شاہ اس کے ولی عہد کا نام ہو اس لئے قابل قبول نہیں ہے کہ وہ اپنی تردی بھی یہ کہہ کر خود کر دیتے ہیں کہ اگر چہ تاریخ فرشتہ میں احمد شاہ ثالث کا لقب نظام شاہ بہمنی لکھا ہے اور وہ قریب ترین معاصر تاریخ کو چھوڑ کر صرف سکوں کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ اس دور کے قریب ترین مورخ فرشتہ کو صرف سکوں کی بنیاد پر کیوں اور کیسے رد کر دیا جائے۔۔۔اب ان معلومات کی روشنی میں وہ شعر پڑھیے جو مثنوی میں 'مدح سلطان علاؤالدین بہمنی' کے تحت لکھے گئے ہیں اور جو اوپر نقل کیے جا چکے ہیں۔ان اشعار میں دو احمد بیان ہوئے ہیں۔ایک وہ احمد شاہ جسے بڑا شہنشاہ ظاہر کیا گیا ہے اور دوسرا وہ احمد جسے بادشاہ کا کنور ظاہر کیا گیا ہے اور جس کا لقب احمد ولی بہمن بتایا گیا ہے۔اس لحاظ سے تاریخ کی ورق گردانی کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی احمد شاہ ولی بہمنی ہے جو احمد خان کا بیٹا اور علاؤالدین حسن بہمنی بانی سلطنت کا پوتا ہے۔'تذکرہ سلاطین دکن میں مذکور ہے کہ چونکہ احمد شاہ بہمنی ولی مشہور تھا۔زندگی میں تمام اس کی ولایت کو مانتے تھے مرنے کے بعد زندگی سے زیادہ اس کی ولایت کی قدر کرنے لگے۔''88

مندرجہ بالا دلائل کی روشنی میں مثنوی 'کدم راو پدم راؤ' کو اردو کی سب سے قدیم اور پہلی طبع زاد مثنوی قرار دیا جا سکتا ہے۔مثنوی کی ابتدا حسب قاعدہ حمد سے ہوئی ہے پھر نعت اور اس کے بعد علاؤالدین شاہ بہمن کی مدح بیان کی گئی ہے۔مدح اور مدح کے بعد اشعار غائب ہیں اس لئے فوراً اصل قصہ شروع ہو جاتا ہے۔مخطوطے کے صفحات بیچ بیچ سے غائب ہیں اس لئے قصے کا تسلسل بھی بار بار ٹوٹ جاتا ہے۔اس میں راجہ کدم راو اور وزیر پدم راو کی دلچسپ

کہانی بیان کی گئی ہے۔ بہر حال اردو کی اہم اور نایاب مثنوی 'کدم راو پدم را' جواب تک نایاب تھی جس کو پہلی بار اردو دنیا سے متعارف کرانے کا سہرا معارف کے سر ہے ۔

نصیر الدین ہاشمی کا ایک مضمون معارف نومبر 1930 کے میں شمارے 'خاور نامہ دکنی' کے عنوان سے تین قسطوں میں شائع ہوا۔ جس میں اس بات کی اطلاع دی گئی تھی کہ دکن کے باکمال شاعر کمال خاں رستمی کی مثنوی 'خاور نامہ' جو اردو کی سب ضخیم اور پہلی رزمیہ مثنوی ہے اس کا واحد نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ہاشمی نے پہلی بار علمی وادبی دنیا کو دکھنی 'خاور نامہ' سے واقف کرایا جسے شیخ چاند حسین نے مرتب کر کے ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ 1968ء میں شائع کیا۔ کمال خاں رستمی کی مثنوی 'خاور نامہ' 'فارسی خاور نامہ' مصنف ابن حسام کا ترجمہ ہے جو 830ھ میں 'شاہنامہ فردوسی' کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ فارسی خاور نامہ کے متعدد نسخے دستیاب ہیں۔ اس کا ایک باتصویر نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے، جو 1097ھ میں لکھا گیا۔ اس کے کاتب کا نام مولا چند ملتانی ہے۔ جبکہ دو نسخے انڈیا آفس میں موجود ہیں جن میں ایک باتصویر اور ایک بغیر تصویر کے ہے۔

کمال خاں رستمی اسماعیل خاں کا لڑکا تھا۔ اس کو اور اس کے بزرگوں کو سلاطین شاہی کی طرف سے خاں کا خطاب عطا ہوا تھا۔ رستمی دکھنی زبان کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی ید طولی رکھتا تھا۔ 'خاور نامہ' کے علاوہ اس نے قصائد اور غزلیات بھی لکھے تھے مگر اب وہ سب ناپید ہیں۔ رستمی نے یہ مثنوی خدیجہ سلطان شہر بانو ملکہ محمد عادل شاہ کے حکم سے 1059ھ میں صرف ڈھائی سال کی مدت میں دکنی زبان میں منتقل کیا۔ 'خاور نامہ' میں تیئس ہزار سات سو پینتیس (۲۳۷۳۵) اشعار اور ایک سو پچاس (۱۵۰) تصاویر ہیں۔ مثنوی کے سن تصنیف کی تصدیق مثنوی نگار کے ہی شعر سے ہو جاتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہو:

نبیؐ کی جو ہجرت تھے کیتا خیال
ہزار پر پچاس اور نو کی تھی سال
کیا رستمی اس وقت یو کتاب
بندیا بات کی کو مران بے حساب 89

مثنوی کے مذکورہ شعر سے مثنوی کا 1059ھ میں تصنیف ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی مثنوی کے اشعار اور تصاویر کی مجموعی تعداد کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''یہ مختصر کا خلاصہ اس مضمون کا جو بڑی تقطیع کے ساتھ 1086 صفحوں میں آیا ہے، کتاب کے پورے صفحہ پر 38 شعر آتے ہیں جیسا کہ خاتمہ کی عبارت سے واضح ہے چوبیس ہزار شعر ہیں۔''90

تصویروں کی تعداداوران کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے مزید نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''ان تصاویر میں سے بعض تو پورے صفحہ پر ہیں اور بعض نصف اور ربع صفحہ پر، بعض مقامات پر ایک صفحہ پر دو دو تصویریں ہیں، کل تصویروں کی تعداد 837 ہے۔ان میں مختلف رنگوں کا استعمال کیا گیا ہے اور رنگ میں خصوصیت بھی رکھی گئی ہے مثلاً شب خون حملہ کی تصویر ہو تو زمین سیاہ دیکھائی ہے، دریا کا منظر ہو تو نیلگوں رنگ استعمال کیا گیا ہے۔آنحضرت صلعم اور حضرت علی کی تصویر جہاں دی گئی ہے وہاں چہرہ ظاہر نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہر جگہ ایک نقاب سے گردن تک پوشیدہ کر دیا گیا ہے۔''91

مذکوہ اقتباس میں نصیرالدین ہاشمی نے خاورنامہ کے اشعار کی تعداد چوبیس ہزار (24000) لکھی ہے اور تصاویر کی تعداد آٹھ سوسینتیس (837) مگر 'دکن میں اردو' جو کہ ان کی مشہور زمانہ کتاب ہے اس میں اشعار کی تعداد تیئیس ہزار سات سو پینتیس (23735) اور تصاویر کی تعدا صرف ایک سو پچاس (150) لکھی ہوئی ہے۔ واضح رہے کہ دکن میں اردو 1985 میں شائع ہوئی ہے یعنی 'ماہنامہ معارف' میں نصیرالدین ہاشمی کے شائع ہونے والے مضمون سے تقریباً 55 سال بعد۔ خاورنامہ کی اختتامی عبارت سے بھی چوبیس ہزار (24000) اشعار کا ہونا ظاہر ہے۔'دکن میں اردو' کا اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ہاشمی نے اشعار اور تصاویر کی تعداد لکھی ہے:

''رستمی کے 'خاورنامہ' مملوکہ انڈیا آفس میں علی ابراہیم خاں نے 1789ء میں ایک فارسی نوٹ بھی لکھا ہے جس میں ابن حسام کے وطن، رستمی کے 'خاورنامہ' کے اشعار اور اسکی تصاویر کی تعداد کی صراحت کی ہے یعنی تیئیس ہزار سات سو پینتیس اشعار اور 150 تصاویر ہونا ظاہر کیا ہے۔''92

'خاورنامہ' کے مرتب شیخ چاند ابن حسین احمد نگری نے مثنوی کے اشعار اور تصاویر کی تعداد پر کوئی بحث نہیں کہ ہے۔ رستمی کے با کمال اور قدر الکلام شاعر ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ 'خاورنامہ' دکھنی فارسی خاورنامہ کا ترجمہ ہے مگر اس کی خوبی یہ ہے یہ ترجمہ نہیں اصل کتاب معلوم ہوتی ہے۔ رستمی نے ہو بہو ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ بہت سے حذف واضافے بھی کیے ہیں۔ مثنوی میں اس وقت کی تہذیب ومعاشرت کو جس طرح سے پیش کیا ہے قابل دید ہے۔ نصیرالدین ہاشمی خاورنامہ کے محاسن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھے ہیں:

الف۔ یہ اردو کی سب سے پہلی ضخیم مثنوی ہے، نہ تو اس سے پہلے اور نہ آج تک ایسی ضخیم مثنوی اردو میں لکھی گئی۔

ب۔ یہ سب سے پہلی رزمیہ مثنوی ہے اور پھر پہلی ہی نہیں بلکہ آخری بھی کیوں کہ ایسی ضخیم رزمیہ مثنوی اردو میں کوئی نہیں ہے۔

ج۔ ضخیم ہونے کے باوجود اس کا تسلسل بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

د۔سلاطین عادل شاہی کے رزم و بزم کا اندازہ ہوسکتا ہے کیوں کہ ترجمہ میں ان امور کا داخل ہونا ناگزیر تھا جو اس وقت کی معاشرت اور تمدن کے لوازمات تھے۔93

مذکورہ اقتباس سے مثنوی خاور نامہ کی اہمیت اور کمال خاں رستمی کی قادرالکلامی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ دوسری زبان سے ترجمہ ہونے کے باوجود اس میں جس طرح سے سلاطین عادل شاہی کے رزم و بزم، تہذیب ومعاشرت، آرائش وزیبائش اور رہن سہن کو دکھایا گیا ہے وہ لاجواب ہے۔مثنوی میں مذکور کرداروں کے رہن سہن اور کھان پان کو بالکل عادل شاہی عہد کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔مثنوی ترجمہ نہیں بلکہ طبع زاد لگتی ہے اس کی سب بڑی وجہ یہ ہے کہ رستمی نے مثنوی کا لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ اپنی تخلیقی ذہانت سے حذف واضافے بھی کیے ہیں۔ مثنوی میں حضرت علیؓ کی معرکہ آرائیوں کے محیرالعقول واقعات بیان گئے ہیں، جو تاریخ سے ثابت نہیں ہیں۔مثنوی میں منظر کی پیش کش کو عمدہ اور دلکش بنانے کے لیے جگہ جگہ تصویروں کا استعمال کیا گیا ہے۔تصویروں کے استعمال میں اس بات کا خاص دھیان رکھا گیا ہے کہ کہیں بھی اللہ کے رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کے چہرے کو ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔مخطوطے کی دریافت سے قبل اس کے بارے میں طرح طرح کی غلط بیانیاں اور قیاس آرائیاں تھیں مثلاً یہ کہ اس میں حضرت علیؓ کے محاربات کا تذکرہ ہے، کمال خاں کا تخلص رستمی کے بجائے رسمی ہے۔نصیرالدین ہاشمی کے اس مضمون نے تمام غلط بیانیوں کو دور کردیا ہے۔

جنوبی ہند کا علاقہ ارکاٹ جہاں ایک مدت تک والی جاہی سلطنت کا قیام رہا۔والی جاہی خاندا کے بانی نواب انوارالدین خان اور ان کے چار فرزندوں نے 1163ھ سے 1258ھ تک اس علاقے پر حکمرانی کی۔نواب والی جاہ اور ان کے فرزند بڑے علم دوست تھے۔ان کے زمانے میں بڑے بڑے علماء، اطباء، شعرا و ادبا جمع تھے۔جنہوں نے عربی، فارسی اور اردو میں بڑی تعداد میں کتابیں لکھیں۔اس زمانے کی بیشتر کتابیں اب بھی دستیاب ہیں۔ارکاٹ میں لکھی گئی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہے۔معارف جولائی 1931 کے شمارے میں نصیرالدین ہاشمی کا مضمون 'یورپ میں ارکاٹ کے دکھنی مخطوطات' شائع ہوا جس میں پہلی بار یورپ کے کتب خانوں میں موجود ارکاٹ کے دکھنی مخطوطوں کی اطلاع دی گئی۔مذکورہ مضمون کے مطالعہ سے ارکاٹ کے صاحب دیوان شاعر وادیب مولانا محمد باقر آگاہ (1158ھ۔-1220ھ) کی سوانح اور ان کی خدمات سے آگہی ہوتی ہے۔باقر آگاہ تین سو تین کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے چودہ کتابیں اردو کی بھی ہیں۔دس کتابیں یورپ کے کتب خانوں میں اب بھی موجود ہیں۔جن میں سے 'ہست بہشت، ریاض الجنان، محبوب القلوب اور تحفہ احباب' برٹش میوزیم لندن میں اور تحفۃ النساء، رسالہ فرقہ ہائے اسلام، ہدایت نامہ، معراج نامہ اور رسالہ عقائد کے مخطوطات پیرس میوزیم کے کتب خانے میں موجود ہیں۔اس کے علاوہ 'مثنوی گلزار عشق عرف قصہ رضوان شاہ وروح افزا' آکسفورڈ یونی ورسٹی کے کتب

خانے میں موجود ہے۔یورپ کے کتب خانوں کے علاوہ باقر آگاہ کی بقیہ چھ کتابیں 'دیوان اردو، روضۃ السلام، ریاض السیر، خمسہ متجرہ، مثنوی روپ سنگار اور فرائد در عقائد' ہیں۔سلطنت والی جاہی کا ایک اور مصنف مولانا غوث شرف الملک جو 31 کتابوں کے مصنف ہیں۔اردو میں صرف ایک کتاب 'ترجمہ کیدانی یا فقہ حنفی' ہے۔اس کے علاوہ اردو کی ایک طویل مثنوی 'چہار گلشن' جس کے مصنف سرشار ہیں کا بھی مخطوطہ یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہے۔94

علی عادل شاہ ثانی شاہی (1048ھ۔1083ھ) عادل شاہی سلطنت کا آٹھواں حکمراں تھا۔جس نے 1067ھ سے لیکر 1083ھ تک حکمرانی کی۔اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک منصف مزاج اور رعایہ پرور بادشاہ تھا۔نہایت خوش مزاج، رنگین طبع، لطیفہ گو اور فنون لطیفہ میں بھی اچھا ذوق رکھتا تھا۔بذلہ سنجی، شاعری اور موسیقی میں بھی مہارت تامہ رکھتا تھا۔علماء وفضلا کا قدرداں تھا اس کے اسی انہماک کا نتیجہ ہے کہ اس کے زمانے میں گھر گھر شعر وشاعری کا چرچا تھا اور ہر طرف علمی وادبی سرگرمیوں کا دور دورہ تھا۔سلطان عادل شاہ خود بھی قادرالکلام شاعر تھا اس نے اردو کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی مگر اس کے کلام کا ایک بڑا حصہ ناپید ہے۔نصیرالدین ہاشمی نے مئی 1933 کے معارف میں اس کے اردو کلیات کے ایک نادر مخطوطے کی برہان پور میں دریافت کی اطلاع دی۔زینت ساجدہ نے اپنے مقدمے کے ساتھ اسے 1962 میں مرتب کیا۔

علی عادل شاہ ثانی کا کلیات 240 صفحات پر مشتمل ہے جس میں کل چھ قصائد اور تین مثنویاں ہیں جن میں سے ایک مثنوی 'خیبر نامہ' ہے، جس میں جنگ خیبر کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔کلیات کے مشمولات میں 18 غزلیں، مخمس، ریختی، رباعی، مثمن، فرد، مراثی، گیت وغیرہ شامل ہیں۔کلیات کے مطالعہ سے علی عادل شاہ ثانی کی قادرالکلامی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔کلیات شاہی کا صرف ایک ہی نسخہ اب تک دریافت ہوا ہے جو سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد کے دفتر میں محفوظ ہے اس کے علاوہ کسی اور نسخے کا آج تک نہیں پتہ چل سکا ہے۔مخطوطے کی ضخامت سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہی کے کلام کا ایک بڑا حصہ اب تک ناپید ہے۔موجودہ مخطوطہ کے ابتدائی اور درمیانی کچھ اوراق غائب ہیں۔ناقص الاول ہونے کی وجہ سے صاحب کلیات کا بھی نام غائب ہے۔نصیرالدین ہاشمی نے اسے علی عادل شاہ ثانی کا کلیات قرار دیتے ہوئے مختلف وجوہات پیش کی ہیں:

الف۔کلیات میں متعدد جگہ شاہی تخلص آیا ہے اور یہ معلوم ہے کہ شاہی علی عادل شاہ ثانی کا ہی تخلص تھا۔

ب۔اشعار ذیل اس امر کا کافی ثبوت پیش کرتے ہیں کہ یہ علی عادل شاہی کا کلیات ہے۔

تیرا یاد دن رات شاہی کا کاج
تیرے فیض سون ہے اسے تخت و تاج

مظفر علی شاہ کے ہاتھ کا
اچک تیرلاگیا نشان کے پلک
لاکھ سون بھون چٹ تبوت سون سید سین بنادے
بھید پر رنگ گت علی عادل سیوک مرتضیٰ ترت نجاوے

سلطان کی کنیت ابوالمظفر ہونے کی تصدیق نہ صرف تاریخوں سے ہوتی ہے بلکہ نصرتی کے ذیل کے اشعار سے بھی اس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

علی عادل شاہ غازی شہنشہ بوالمظفر کون
دیا ہے جس خدا ایسا کہ تھا جیسا سکندر کون
الٰہی سور یونت ان کو عالمگیر ہے جگ میں
تلک جم فتح ونصرت سیوے شاہ ابو المظفر کون

ج۔کلیات کے عنوانات میں صراحت کی گئی ہے' حضرت شاہی فرمودند'

د۔شرف برج اور بادشاہ محل کی تاریخیں 1080ھ کی برآمد کی گئی ہیں اس زمانہ میں علی عادل شاہ ثانی حکمران تھا۔

ہ۔شرف برج کی تاریخ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ کا مصنف خود سلطان ہے۔

و۔علی داد محل کی تعمیر اسی سلطان نے کی تھی اس کے قصیدے کا طرز بیان اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہی اس کا بانی ہے۔95

مذکوہ بالا دلائل کی روشنی میں نصیرالدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ یہ کلیات علی عادل شاہ ثانی شاہی کا ہے کیوں کہ کلیات میں شاعر نے' شاہی' تخلص اور کنیت' ابوالمظفر' استعمال کی ہے، جو عادل شاہی سلطنت میں سوائے عادل شاہ ثانی کے کسی اور کے ساتھ خاص نہیں اس لیے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کلیات علی عادل شاہ ثانی شاہی کا ہے۔مخطوطہ پر نہ کوئی ترقیمہ ہے اور نہ سن کتابت اس لیے یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کلیات کب مرتب ہوا۔نصیرالدین ہاشمی نے یہ قیاس لگایا ہے کہ یہ کلیات 1081ھ میں لکھا گیا ہوگا چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''کلیات کے خاتمہ پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے مگر اس میں بادشاہ محل کی تاریخ 1081ھ درج ہے اس سے واضح ہے کہ اس سن کے بعد ہی اس کی ترتیب ہوئی ہوگی۔''96

مذکورہ اقتباس سے کوئی قطعی تاریخ متعین نہیں ہوتی۔مگر بادشاہ محل کی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کلیات 1081ھ کے بعد ہی لکھی گئی۔سید مبارزالدین رفعت نے بھی کلیات شاہی کے مقدمہ میں بادشاہ محل کی تاریخ پر قیاس

کرتے ہوئے نصیر الدین کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔97 کلیات شاہی کی مرتب زینت ساجدہ نے بھی کوئی واضح رائے نہیں پیش کی ہے انہوں نے بھی بادشاہ محل کی تاریخ کو بنیاد بنا کر قیاس آرائی کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

''مخطوطہ پر کوئی ترقیمہ ہے اور نہ کتابت وترتیب کا سن درج ہے۔اس لئے اس کے سن ترتیب کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔لیکن کلیات کے آخر میں شرف مدح اور بادشاہ محل کی تاریخیں علی الترتیب 1080ھ اور 1081ھ موجود ہیں جس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ نسخہ 1081ھ کے بعد مرتب یا مکمل ہوا ہے اور ممکن ہے وہی ہو جس کی ترتیب ابوالمعالی کے ذمہ تھی۔''98

مذکوہ اقتباسات کی روشنی میں کلیات شاہی کی ترتیب کی قطعی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔مختلف شواہد کی روشنی میں 1080ھ کے آس پاس زمانہ مان لیا گیا۔شاہی کے کلام کے متعلق اب تک کوئی مفصل تفصیل نہیں مل سکی۔اردو کی ابتدائی تاریخ کے ایسے بہت سے پہلوا بھی تک گمشدہ ہیں جن کی تلاش وتحقیق ضروری ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی (988ھ-1037ھ) عادل شاہی سلطنت کا چھٹا حکمران تھا، جونہایت علم پرور اور ادب نواز تھا۔اس کے حکمرانی کا دور علم وہنر کی ترقی کے لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔سلطان نے دکھنی زبان کی خوب سرپرستی کی۔عادل شاہی کے زمانے میں دفتری زبان فارسی کردی گئی تھی99 اس نے اردو مستعمل کیا جس سے دکھنی زبان کے شعرا کو خوب عروج ہوا۔ابراہیم عادل شاہ کو شاعری، موسیقی، تاریخ اور خطاطی سے بڑا شغف تھا۔وہ خود بھی قادرالکلام شاعر تھا اور ابراہیم تخلص کرتا تھا۔تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے مثنوی، غزل اور قصیدے بھی کہے تھے جواب ناپید ہیں۔'کتاب نورس' بھی ایک زمانے تک نایاب تھی اس زمانے کے لکھے گئے تذکرہ میں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کو موسیقی اور راگ راگنیوں سے بڑی دلچسپی تھی اور اس نے راگ راگنیوں پر مشتمل ایک کتاب ''کتاب نورس' مرتب کی تھی جواب نایاب ہے۔کتاب نورس کا دیباچہ ملاظہوری نے 'سہ نثر ظہوری' کے نام سے لکھا تھا۔جون 1932 میں نصیر الدین ہاشمی کا ایک مضمون 'عجائب خانہ حیدرآباد کا ایک نایاب دکھنی مخطوطہ' کے عنوان سے شائع ہوا جس میں 'کتاب نورس' کے تین مخطوطوں کی دریافت کی خبر دی گئی تھی اور ان مخطوطوں پر تفصیلی بحث بھی۔اور پھر معارف ہی میں جولائی 1953 میں ڈاکٹر نذیر احمد کا ایک مضمون کتاب نورس کے متعلق شائع ہوا جس میں 'کتاب نورس' کے دس مخطوطوں کی بازیافت اور ان کا تقابل پیش کیا گیا تھا۔جسے 1955 میں ڈاکٹر نذیر احمد نے کتابی شکل میں مرتب کر کے شائع کیا۔

سلطان کو لفظ نورس سے بڑی محبت تھی یہی وجہ ہے کہ سلطان کے زمانے میں بہت سی چیزیں نورس سے ہی موسوم کی جاتیں تھی۔سلطان نے 1005ھ میں ایک قلعہ نورس کے نام سے تعمیر کرایا، 1013ھ میں ایک شہر اسی نام

سے آباد کیا اس کے علاوہ شاہی مہروں، سکوں پر بھی یہ نام درج ہوتا تھا بلکہ نورس کے نام سے سالانہ ایک جشن بھی منایا جاتا تھا۔ڈاکٹر نذیر احمد نے ایک فہرست درج کی ہے جس میں 19 چیزیں ہیں جو نورس کے نام سے موسوم تھیں 100۔ لفظ نورس سے محبت کا نتیجہ کتاب نورس بھی ہے۔ابراہیم عادل شاہ ثانی کی تصنیف نورس ہندی راگ راگنیوں کا مجموعہ ہے۔ابراہیم عادل شاہ کے سترہ راگوں میں گائے ہوئے کل 59 گیت ہیں۔کتاب نورس کے متعلق ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں:

''کتاب نورس علم موسیقی سے متعلق ایک مختصر کتاب دکھنی نظم میں ہے۔اس میں کچھ راگ راگنیوں کی تصریح صرف اس قدر ہے کہ ایک راگ یا راگنی کو عنوان قرار دے کر اس کے تحت بادشاہ کے نظم کیے ہوئے گیت درج کر دیے گئے ہیں۔ہر گیت موضوع کے اعتبار سے مختلف ہے، اس لحاظ سے کتاب میں مسلسل مضمون کی تلاش بے سود ہے۔میرے پیش نظر کتاب مذکور کے نو نسخے ہیں جن میں 17 راگوں کے ذیل میں کل 59 گیت اور 17 دوہرے ملے ہیں۔'' 101

کتاب نورس میں شامل 59 گیت مضامین کے اعتبار سے مختلف ہیں اور ہر گیت ایک دوسرے سے علاحدہ ہے۔مذکوہ دونوں مضامین میں کل دس نسخوں کی دریافت کا تذکرہ ہے۔جن میں تین نسخوں کی بازیافت نصیر الدین ہاشمی کے سر ہے جبکہ دس مخطوطوں کی دریافت ڈاکٹر نذیر احمد نے کی ہے۔مذکورہ تمام مخطوطوں میں سے کسی میں بھی سن تصنیف درج نہیں اس لئے یقین سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کتاب کس سن میں لکھی گئی البتہ قیاس آرائیوں اور مختلف دلائل کی روشنی میں اس کی سن تصنیف متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔نصیر الدین ہاشمی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ کتاب اس نے ہندی راگ اور راگنیوں پر لکھی تھی، افسوس ہے اس کی تصنیف کا صحیح سن معلوم نہیں ہوسکا مگر اس قدر پتہ چلتا ہے کہ اس کی تصنیف 990ھ اور 1015ھ کے درمیان ہوئی ہے۔بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے یہ 1005ھ میں تصنیف ہوئی۔ 102

مذکورہ اقتباس میں نصیر الدین ہاشمی نے 'کتاب نورس' کا سن تصنیف 1005ھ قرار دیا ہے مگر اس کی کوئی خاص دلیل پیش نہیں کی ہے۔مرتب کتاب نورس ڈاکٹر نذیر احمد نے بھی کوئی قطعی تاریخ نہیں متعین کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اگرچہ قطعی طور پر یہ معلوم نہیں کہ بادشاہ نے کس سن میں یہ کتاب لکھی لیکن چند قرائن سے اس کی تصنیف کا عہد معین کیا جاسکتا ہے۔ظہوری نے دیباچہ گلزار ابراہیم میں ابراہیم عادل شاہ کی عمر تیسرے عشرے میں قرار دی ہے بادشاہ کی پیدائش 979ھ میں ہوئی اس اعتبار سے گلزار ابراہیم کی تکمیل 1009ھ سے قبل ہو چکی تھی چونکہ دیباچہ مذکور میں بادشاہ کی تصنیف کا ذکر آیا ہے اس سے یہ بات قطعی ثابت ہو جاتی ہے کہ کتاب نورس 1009ھ سے بہت زیادہ قبل مرتب ہو چکی

تھی ۔۔۔کتاب مذکور میں چاند سلطان کا ذکر اس طرح ہوا ہے گویا وہ بقید حیات ہے۔ چاند بی بی کو چاند سلطان کا لقب 1004 ھ کے وسط میں ملا تھا۔ اس کا قتل دوسری اردی بہشت 1008 ھ کو عمل میں آیا اس حساب سے کتاب کی تصنیف 1004 ھ کے بعد اور 1008 ھ سے قبل ثابت ہوتی ہے۔'' 103

'کتاب نورس' مصوری، موسیقی اور شاعری کا حسین سنگم ہے ادبی اور فنی اعتبار سے بھی اس حیثیت مسلم ہے۔ اس پر دوبارہ تحقیقی اور تنقیدی نظر اس لیے ضروری ہے کہ کتاب نورس کے گمشدہ پہلو سامنے آسکیں اور اختلاف سنین کو قطعی شکل دی جا سکے۔

ایک ہندو دکنی صاحب دیوان شاعر بالا جی نا یک ذرہ ہیں، جن سے ادبی دنیا ناواقف تھی۔ پہلی بار تمکین کاظمی کا مضمون معارف جولائی 1928 کے شمارے میں 'ایک گمنام ہندو دکنی شاعر' کے عنوان سے شائع ہوا۔ جس میں ذرہ کے کلیات کی کتب خانہ آصفیہ میں بازیابی کی اطلاع دی گئی تھی جواب تک نایاب اور غیر مطبوعہ تھا۔ کلیات کے مطالعہ سے ذرہ کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتی البتہ خاتمہ پر درج عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذرہ کا نام بالا جی نا یک تھا اور تخلص ذرہ تھا۔ کلیات کے اختتام پر یہ عبارت درج ہے 'ختم شدہ دیوان بالا جی نا یک ذرہ' جس سے صاحب کلیات کے نام کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ شاعر نے تخلص کے طور لفظ ذرہ کا استعمال کیا ہے۔

غلغلے تیرے شعر کے ذرہ

اس دکھن سے ہین چو کدہن مین آج 104

کلیات ذرہ کے مطالعہ سے اس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں ہوتا البتہ کلیات میں رسا، ضیا، آزاد بلگرامی اور اقدس وغیرہ کا ذکر معاصرین کے طور پر کیا ہے۔ معروف غیر معروف تمام تذکرے ذرہ کے حالات سے خالی ہیں البتہ نصیر الدین ہاشمی نے 'دکن میں اردو' میں ذرہ کے متعلق چند سطریں لکھی ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''بالا جی ترمبک نام اور ذرہ تخلص تھا۔ رسا سے تلمذ حاصل تھا۔ 1150 ھ سے 1200 ھ تک ان کے موجود رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔ کتب خانہ آصفیہ میں خود ان کا قلمی دیوان موجود ہے۔ غزلیں عموما چار چھ شعر ہیں۔ دو مثنویاں بھی لکھی تھیں۔ ایک مظہر نامہ اور دوسری لطیف سے موسم تھی۔'' 105

مذکوہ اقتباس میں ہاشمی نے ذرہ کا نام بالا جی ترمبک لکھا ہے جبکہ کلیات میں جو نام درج ہے وہ بالا جی نا یک ہے۔ اسی طرح ہاشمی نے 1200 ھ تک ان کے زندہ ہونے کا اندزہ لگایا مگر اس کی کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے۔ کلیات میں 1192 ھ تک کا کلام موجود ہے اس لئے مضمون نگار تمکین کاظمی نے 1192 ھ تک ان موجودگی کا قیاس لگایا ہے۔ زیر بحث کلیات میں 334 صفحات ہیں۔ کلیات کے مشمولات میں غزلیں، قطعات، رباعیات، سلام اور

شہادت وغیر شامل ہیں۔کلیات کے متعلق تمکین کاظمی لکھتے ہیں:

''کتب خانہ آصفیہ میں نمبر 53 پر کلیات ذرہ مدت سے رکھا ہوا ہے مگر کسی نے شاید دیکھا نہیں اور اگر دیکھا بھی ہو تو کچھ اعتنا نہیں کی، 334 صفحات پر غزلیں ،قطعات،مرثیے ،سلام رباعیات،وغیرہ نہایت ہی عمدہ خط مین لکھے ہوئے ہین۔12 سطری مسطر بڑی تقطیع سرخ حاشیہ اور مقطع میں تخلص سرخی سے لکھا ہوا ہے،آخر میں 140 صفحات پر فارسی کلام بھی ہے مگر سن کتابت شروع میں ہے نہ ختم پر صرف ایک جگہ ختم شدہ دیوان بالا جی نایک ذرہ لکھا ہوا ہے۔''106

بالا جی نایک نام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندو تھے گر ان کا کلیات کے مطالعہ سے بالکل بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ شاعر ہندو تھا کیونکہ کلیات کے مشمولات میں سلام ،مرثیہ،تسلیم،بندگی،شہادت، کے علاوہ مسلمانوں کے تہواروں عید بقرعید،شب برأت وغیرہ پر عمدہ کلام شامل ہے۔کلیات کے مطالعہ سے ان کے قادرالکلامی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ان کے کلام ناپید کو معارف نے بازیاب کیا اور اردو دنیا کو ذرہ کے کلیات سے متعارف کرایا۔واضح رہے کہ کلیات ذرہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے شائع کیا جائے۔

شیخ داؤد ضعیفی دکنی عادل شاہ ثانی کے زمانے میں بیجا پور کے ایک باکمال شاعر تھے۔عالم فاضل ،متقی، پرہیزگار اور عارف کامل انسان تھے۔نصرتی ،فراقی ،صنعتی اور مختار بیجاپوری کے معاصرین میں تھے۔وہ ایک صاحب دیوان شاعر تھے مگر اب تک ان کا دیوان دستیاب نہیں ہوا ہے۔ان کی مشہور کتابوں میں 'ہدایت ہندی' اور 'قصہ عشق صادق' (فارسی سے ترجمہ) منظر عام پر آچکی ہیں۔ہدایت ہندی فقہ حنفی کی ایک مستند اور مقبول کتاب ہے۔سخاوت مرزا نے ان کی ایک اور کتاب 'نصیحت مدن یا نقل نامہ' کے مخطوطے کی اطلاع ماہنامہ معارف (مارچ 1953) میں دی۔انھوں نے بتایا کہ 'نصیحت مدن' کتب خانہ آصفیہ کا ایک نایاب مخطوطہ ہے۔جس میں عورتوں کے متعلق پند ونصائح عورتوں کی زبان میں ہیں۔زیر بحث مخطوطہ ناقص الآخر ہے ترقیمہ سن کتابت غائب ہے اس لیے مجموعی اشعار کی تعداد کا پتہ نہیں چلتا البتہ موجودہ اشعار کی تعداد 282 ہے۔نصیحت مدن میں عورتوں کو نصیحت کے علاوہ مدح صحابہؓ،منقبت حضرت علیؓ،حضرت حسنؓ،حضرت حسینؓ،حضرت فاطمہؓ اور منقبت غوث الاعظم بھی شامل ہے۔ازواج مطہرات کے واقعہ ایلا پر ایک دلچسپ نظم 'نظم ایلا' بھی شامل ہے۔غرض یہ ہے کہ عورتوں کے متعلق ایک دلچسپ کتاب ہے جس کی بازیابی کا شرف معارف کو حاصل ہے۔

قادر ولی دکن کی ایک روحانی شخصیت ہیں، جو جنوبی ہند کے ساحلی شہر ناگور میں دفن ہیں۔یہاں ہزاروں کی تعداد میں ان کے معتقدین ہیں۔وہاں کے لوگ ان کو قادر ولی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔یہ بزرگ کون تھے؟ ان کا نام کیا تھا؟ کس کے مرید تھے؟ کس زمانے میں یہاں آئے؟ کس علاقے سے ان کا تعلق تھا؟ ان سب سوالوں کا

جواب کسی بھی مؤرخ اور تذکرہ نگار کے پاس نہیں اور نہ ان کے معتقدین ہی اس طرح کی کوئی معلومات رکھتے ہیں۔ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کا ایک مضمون 'اردو کی ایک قدیم مثنوی :احوال قادر ولی عرف شاہ میران کا تحقیقی جائزہ' معارف 1991 میں تین قسطوں میں شائع ہوا۔جس میں انہوں نے ایک قدیم مثنوی کے مخطوطے کے حوالے سے ان تمام سوالوں کے جواب دیے ہیں۔مثنوی کے ناقص ہونے کی وجہ سے مثنوی کا نام نہیں معلوم ہوسکا چونکہ مثنوی میں قادر ولی کے حالات ہیں اس لیے اس مثنوی کا نام احوال قادر ولی رکھا۔مذکورہ مخطوطہ سے نہ صرف یہ کہ قادر ولی کے حالات،اسفار اور کرامات کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ایک نایاب مثنوی سے واقفیت بھی ہوتی ہے۔مثنوی نگار کا نام اعزالدین تخلص نامی تھا جو آرکاٹ مدراس کا باشندہ تھا۔

مولانا عبد السلام ندوی (1883۔1956) کا ایک مختصر مضمون 'ایک قدیم دکھنی شعر' معارف جولائی 1932 میں شائع ہوا جس میں انہوں نے شعرالہند میں شامل ایک قدیم دکھنی شعر پر بحث کی ہے۔وہ شعر یہ ہے:

کن دھر کہوں،کان جاوں مین،مجھ دل پہ بہل بچھراٹ ہے
ایک بات کئے ہون گے سجن یہاں جیو بارہ باٹ ہے 107

مذکورہ شعر کو تذکرہ نگاروں نے مختلف شعرا کی طرف منسوب کیا ہے اور بیشتر تذکرہ نگاروں نے الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ شعر کو نقل کیا ہے۔عبدالسلام ندوی نے اس شعر کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شعرالہند میں مذکور شعر بالکل غلط ہے۔البتہ قائم چاند پوری نے 'تذکرہ مخزن نکات' میں جس طرح اس شعر کو لکھا ہے وہ بالکل درست ہے۔انہوں نے شعر کو اس طرح نقل کیا ہے:

کسدر کہون ،کان کاؤن مین،مجھ دل پہ کھٹن بچھراٹ ہے
یک باٹ کے ہون گے سجن یہاں جیو بارہ باٹ ہے

قائم چاند پوری نے مذکرہ شعر کو عبداللہ قطب شاہ کی طرف منسوب کیا ہے۔شعر کسی کا ہو اور اسے چاہے جس طرح لکھا اور نقل کیا گیا ہو دراصل تمام تذکرہ نگاروں کا مقصد شعر میں مستعمل ابتدائی زبان اور رنگ تغزل کو دکھانا مقصود تھا۔مولانا عبدالسلام ندوی کے اس مضمون کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے جس طرح اس شعر کے انداز و اسلوب پر بحث کی ہے اس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مضمون کے ذریعے پہلی بار اسلوبیاتی تنقید کو موضوع بنایا گیا۔اس سے قبل اردو ادب میں اسلوبیاتی انداز میں اس طرح کی تنقید کا تصور نہیں تھا۔مولانا کا یہ مضمون ابتدائی زبان واسلوب کی تفہیم اور قدیم شعری تغزل کے حوالے سے کافی اہم ہے۔

معارف تحقیق میں دکنیات کا ایک بڑا خزانہ ہے جن میں دیوان نظامی کے قلمی مخطوطے،ولی کا غیر مطبوعہ کلام، انڈیا آفس لندن کی بعض دکھنی کتابیں،دکھنی اردو کی قلمی کتابیں،انڈیا آفس کے کیٹلاگ میں دکھنی مخطوطات،یورپ کے

دکھنی مخطوطات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان مضامین کے علاوہ دکنیات کا اہم سرمایہ ماہنامہ معارف میں دکنی کتابوں پر لکھے گئے تبصرے اور تعارف ہیں۔

معارف کا ایک مستقل کالم 'مطبوعات جدیدہ' کے نام سے ہے جس کے تحت کتابوں کا مختصر تعارف شائع ہوتا ہے۔کتابوں کے تعارف کا یہ سلسلہ معارف میں 1916 سے تاحال جاری ہے۔دکنیات سے متعلق معارف میں بے شمار کتابوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔معراج العاشقین کو 1343ھ میں مولوی عبدالحق نے شائع کیا تھا اور مقدمہ میں خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی تصنیف بتایا تھا۔اب تک یہ خیال عام تھا کہ معراج العاشقین بندہ نواز (1321۔1422) کی تصنیف ہے۔ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تحقیقی کتاب 'معراج العاشقین کا مصنف' شائع ہوئی جس میں انہوں نے مولوی عبد الحق (1870۔1961) کی تردید کی ہے اور دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب دکن کے بارہویں صدی کے مصنف مخدوم شاہ حسینی کی کتاب ہے۔مبصر معارف لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر حفیظ قتیل نے مولوی صاحب کے خیالات کی تردی کی ہے اور بڑی تحقیق وکاوش، خارجی وداخلی شہادتوں اور قرائن سے ثابت کیا ہے کہ یہ خواجہ صاحب کے بجائے مخدوم حسینی کی تصنیف ہے۔مصنف کے دلائل میں وزن نظر آتا ہے مگر آئندہ یہ دیکھنا ہے کہ ان کی یہ تحقیق ارباب نظر کے حلقہ میں کہاں تک صحیح قرار دی جاتی ہے۔اس کی اشاعت سے اردو زبان وادب میں ایک مفید ادبی وتحقیقی کتاب کا اضافہ ہوا ہے۔'' 108ؔ

ماہنامہ معارف کے تبصرے معیاری ہوتے ہیں اس میں نہ تو کسی کی تنقیص کی جاتی ہے اور نہ غیر ضروری تعریف۔معارف کے تبصرے مختصر مگر جامع ہوتے ہیں ان کے مطالعہ سے کتاب کی اصل نوعیت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔اس کے تبصروں کی ایک نوعیت تعارف کی بھی ہے۔جس میں کتاب پر بتصرہ کے بجائے اس کا محض تعارف کرادیا گیا ہے۔

امین الدین اعلی کا شمار دکن کے اہم ادبا وشعرا میں ہوتا ان سے متعدد نثری ومنظوم کتابیں منسوب ہیں۔ڈاکٹر حسینی شاہد نے 'سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ' کے عنوان سے کتاب مرتب کی جس میں انہوں نے امین الدین اعلی کے عہد کا سیاسی وسماجی پس منظر کے ساتھ ساتھ مختلف مخطوطوں کی مدد سے ان کی کتابوں پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔اس کے علاوہ ان کے زبان واسلوب پر بھی مفصل بحث کی ہے۔مذکورہ کتاب پر مارچ 1975 میں معارف میں ایک تبصرہ شائع ہوا۔مبصر معارف لکھتے ہیں:

> ''کتاب میں کہیں کہیں بیجا طوالت اور غیر ضروری تفصیل سے کام لیا گیا ہے، حضرت شاہ امین الدین کے نام اور ان کے بعض دوسرے مباحث کو اس قدر پھیلا دیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو اکتاہٹ ہونے لگتی ہے اور نفس مسئلہ میں الجھاو بھی پیدا ہوگیا ہے...ان کے حالات اور کمالات

کے بعض واقعات جو اس کتاب میں دیے گئے ہیں مشکوک معلوم ہوتے ہیں تاہم یہ بڑی محنت اور کاوش سے لکھی گئی ہے اور اس سے حضرت امین کی دکھنی زبان وادب اور اردو کی ابتدائی خدمات میں ان خانوادے کی مساعی سامنے آجاتی ہے۔'' 109؎

مذکورہ تبصروں سے ماہنامہ معارف کی تبصرہ نگاری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ بیشتر تبصرے ایسے ہیں کی تبصروں کے مطالعہ سے ہی کتاب کی نوعیت اور اس کی تفصیل بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مکاتیب مرزا مظہر جان جاناں، کتاب نورس، سید شاہ امین الدین اعلی، کلیات قلی قطب شاہ، ماثر دکن، سلطان احمد شاہ بہمن، مقدمہ تاریخ زبان اردو اور معراج العاشقین جیسی غیر معمولی اہمیت کی حامل کتابوں پر تبصرہ کیا ہے۔

سراج الدین طالب کا مضمون 'انور نامہ اور اس کا مصنف' معارف ستمبر 1932 میں شائع ہوا۔ جس میں انور نامہ جو کرناٹک کی منظوم تاریخ ہے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فاضل مضمون نگار کے مطابق ابجدی ملا محمد قاسم فرشتہ صاحب تاریخ فرشتہ کے بہنوئی سید شاہ میر بیجاپوری کے فرزند تھے۔ ابجدی نہ صرف عربی، فارسی اور اردو پر عبور رکھتے تھے بلکہ ایک اچھے شاعر اور متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ان کے اردو اور فارسی دیوان کا ذکر فارسی کے متعدد تذکروں میں ملتا ہے۔ دربار والا جاہی میں عمدۃ الامرا اور امیر الامرا کی تعلیم کے لیے معمور تھے۔ دربار والا جاہی سے آپ کو ملک الشعرا کا خطاب بھی ملا۔ ابجدی نے کئی اہم مثنویاں بھی تحریر کی تھیں، جن میں ہفت جوہر، زبدۃ الافکار، مودت نامہ اور قصہ راغب ومرغوب قابل ذکر ہیں۔

انور نامہ فارسی زبان میں کرناٹک کی منظوم تاریخ ہے۔ جو نواب والا جاہ کی فرمائش پر لکھی گئی۔ انور نامہ کی وجہ تالیف یہ ہے کہ محمد علی خاں نواب والا جاہ کو ابجدی کا کلام سننے میں آیا۔ جس پر انہوں نے ابجدی کے حالات دریافت کیے۔ جب یہ خبر ابجدی تک پہنچی تو انہوں نے تقریب باریابی کے لیے ایک قصیدہ لکھ بھیجا۔ جو نہ صرف یہ کہ والا جاہ کو پسند آیا بلکہ انعام واکرام سے بھی نوازہ۔ مزید یہ کہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر کے اپنے خاندان اور عہد کی تاریخ نظم کرنے کے لیے کہا۔ ابجدی نے نواب والا جاہ کے حکم پر اس کام کو پانچ سال میں مکمل کیا۔ 110؎

کتاب کی اختتامیہ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ انور نامہ 1203 میں مدراس میں مکمل ہوئی۔ مکمل کتاب حمد ونعت کے علاوہ 67 ابواب پر مشتمل ہے۔ مذکورہ کتاب کے نسخہ کمیاب ہیں البتہ کتاب اپنے عہد کی تاریخی کتابوں میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ دکن اور کرناٹک کی تاریخ کی تدوین میں اسے بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔

احسن القصہ یوسف زلیخا کے خالق سید میران ہاشمی کا شمار دکن کے با کمال شعرا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اردو شاعری کا ایک دیوان اور مثنوی یوسف زلیخا تحریر کی بلکہ انہیں ریختی کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔ سید میران ہاشمی علی عادل شاہ ثانی (1656-1672) کے عہد میں گزرے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ نصرتی کے ہمعصر تھے بلکہ ان

کے قدرداں بھی تھے۔ ہاشمی کو وہ شہرت نہ مل سکی جو نصرتی کو ملی۔ میران ہاشمی سید شاہ ہاشمی علوی کے مرید تھے اس لیے ہاشمی تخلص استعمال کرتے تھے۔ سید میران ہاشمی کے متعلق تذکروں میں بہت کم ملتا ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش کے متعلق کوئی معلومات نہیں ملتی البتہ ان کی وفات کے متعلق متعدد آرا ہیں۔ چونکہ احسن القصہ 1686 میں مکمل ہوئی اس لیے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تب تک باحیات تھے۔ ان کے حالات کے متعلق زیادہ معلومات نہیں ملتی البتہ ان کے متعلق یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ پیدائشی اندھے تھے۔ قوت حافظہ بہت تیز تھا۔ احسن القصہ انہوں نے زبانی نقل کرائی تھی۔

سید میران ہاشمی نے مثنوی یوسف زلیخا، غزلیات کا ایک دیوان اور مراثی تحریر کی تھی۔ احسن القصہ کے متعلق یہ خیال عام تھا کہ یوسف زلیخا اور احسن القصہ دونوں الگ الگ کتابیں ہیں۔ معارف دسمبر 1938 میں ملک محمد باقر کا مضمون شائع ہوا جس میں پہلی بار اس بات کی وضاحت کی گئی کہ وہ دونوں الگ الگ کتابیں نہیں بلکہ ایک کتاب کے دو نام ہیں۔ دراصل سید محی الدین قادری پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے لکھا کہ ہاشمی نے ان تین کتابوں کے علاوہ احسن القصہ کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ یوسف زلیخا علاحدہ کتاب ہے۔ فاضل مضمون نگار کے مطابق قادری صاحب کو سہو ہوا ہے انہوں کتاب کے مخطوطات دیکھے ہی نہیں۔ ملک محمد باقر نے برٹش لائبریری میں موجود ایک قلمی نسخہ کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ احسن القصہ اور یوسف زلیخا ایک ہی کتاب کے دو الگ الگ نام ہیں۔ 111

غالبيات

معارف تحقیق کا ایک بڑا حصہ غالبیات پر مشتمل ہے۔معارف کے ابتدائی شماروں سے ہی غالب شناسی کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔غالب کے متعلق معارف میں جو تحریریں شائع ہویں ان میں غالب کے مختلف پہلو،شاعری اور ان کی تحریروں کے بارے میں تحقیق اور غالب کے شاگردوں کا تذکرہ اور تحقیق ،کلام غالب کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔غالب کے حوالے سے کئی اہم پہلوؤں پر مباحث کا سلسلہ معارف سے ہی شروع ہوا جو نہ صرف کئی برسوں تک جاری رہا بلکہ بعد میں اس پر مختلف رسائل میں مضامین لکھے گئے۔غالب کے متعدد خطوط کی بازیابی معارف کے ذریعہ ہوئی۔غالب کے فکروفن سے متعلق لکھی گئی کم وبیش سو کتابوں پر تبصرے یا ان کا تعارف کرایا گیا ہے۔غالب صدی کے دوران ہندوپاک کے رسائل نے کثرت سے غالب نمبر شائع کیے ان میں سے کئی اہم نمبروں پر بھی تبصرہ شائع ہوا۔غالب سے متعلق لکھے گئے مقالات کی تعداد بے شمار ہے یہاں صرف 1947 تک کے ان مضامین پر گفتگو کی گئی ہے۔جو تحقیقی حیثیت کے حامل ہیں۔

مطالعہ غالب میں نسخہ حمیدیہ ایک مستقل موضوع رہا ہے۔واضح رہے کہ نسخہ حمیدیہ کی دریافت ماہنامہ معارف کی اولیات میں سے ہے۔ستمبر 1918 کے شذرات میں سید سلیمان ندوی مرزا غالب کے ایک قلمی دیوان کی معارف میں اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہمارے دوست مولانا عبدالسلام ندوی شعرالہند کے خاطر آج کل کتب خانوں کی خاک چھان رہے ہیں۔اسی سلسلے میں وہ بھوپال بھی پہنچے۔وہاں کتب خانہ حمیدیہ میں انہیں ایک انمول جواہر ملا یعنی مرزا غالب کا ایک مکمل اردو دیوان بلا حذف وانتخاب،جو موجودہ دیوان سے ضخامت میں دوگنا ہے،نہایت عمدہ مطلع نسخہ ہے۔کسی خوش خط کے ہاتھ وہ پڑا تھا اس نے ان غزلوں کا مطبوعہ غزلوں سے مقابلہ کرکے اختلاف نسخ بھی لکھ دیا ہے۔یہ نسخہ اب جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مشیر تعلیمات بھوپال کے مطلعہ میں ہے۔موصوف آجکل دیوان غالب کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں اور عنقریب ان کے نتائج فکر ترقی اردو کے ذریعے سے منظر عام پر آئیں گے۔ہم نے ڈاکٹر صاحب سے التماس کیا ہے کہ اس نئے نسخے پر تقریض لکھ کر وہ ناظرین معارف کے لیے مرحمت فرمائیں۔''[112]

اس اطلاع کو معارف میں مطالعہ غالب کے آغاز سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔یہ نسخہ بعد میں نسخہ حمیدیہ کے نام سے جانا گیا۔نسخہ حمدیہ اور کتب خانہ حمیدیہ کے متعلق بحث کا سلسلہ 1918 سے 2017 تک جاری رہا۔اس نسخے کے دریافت کے بعد غالبیات میں نئے مباحث کا آغاز ہوا۔واضح رہے کہ یہ دیوان 1821 میں مرزا غالب نے اس وقت مکمل کیا تھا جب وہ محض چوبیس سال کے تھے۔قلمی نسخے کے کاتب حافظ معین احمد تھے۔

یہ نسخہ فوجدار محمد خاں کے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھا۔جو ریاست بھوپال کے حکمراں نواب سکندر جہاں بیگم

کے ماموں تھے۔بیگم غالب کی بڑی قدرداں تھیں۔1857 کی غدر کے بعد غالب کی مشکلات سن کرانہیں بھوپال آنے کی دعوت دی تھی۔غالب نے یہ دعوت قبول نہیں کی تو اپنے ماموں محمد خاں کے ہاتھوں رقم بھیجوادیا کرتی تھیں۔ سلیم احمد رضوی نے تاریخ بھوپال میں لکھا ہے کہ 'ایسے ہی کسی دورے کے دوران فوجدار محمد خان نے غالب سے یہ نسخہ حاصل کیا تھا۔'113

یہ نسخہ کب اور کس طرح بھوپال پہنچا اس کا کوئی خاص ثبوت نہیں ملتا البتہ تاریخ کتابت اور نسخہ پر موجود مہروں سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ نواب غوث محمد خاں کے بیٹے محمد خان کے لیے لکھا گیا تھا۔ابتدائی صفحات پر 'دیوان ہذا من تصنیف مرزا نوشہ دہلوی المتخلص بہ اسداللہ از کتب خانہ سرکار فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں فوجدار محمد خاں بہادر دام اقبالہ' لکھا ہے۔اور اس کے سامنے دو مہریں ثبت ہیں ایک میں 1261ھ(1848) جبکہ دوسرے میں 1248ھ(1861) ہے۔خاتمہ پر کاتب کے قلم سے ایک تحریر موجود ہے جس میں نسخے کے تکمیل کی تاریخ 1237ھ درج ہے۔جو نومبر 1821 کے مطابق ہے۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ محمد خاں کی مہر سے گیارہ سال قبل مکمل ہو چکا تھا۔

نسخہ حمیدیہ کی دریافت کے بعد اس پر مباحث کا طویل سلسلہ ہے۔عبدالرحمٰن بجنوری اس زمانے میں انجمن ترقی اردو کے لیے غالب کے دیوان کا مشرح اڈیشن تیار کر رہے تھے۔نسخہ حمیدیہ کی دریافت کے بعد مولانا عبدالسلام ندوی نے اس نئے دیوان کی تدوین کے لیے دعوت دی۔انہوں نے ابھی کام شروع ہی کیا تھا کہ وبا کا شکار ہو کر اس دار فانی سے 1918 میں کوچ کر گئے۔

عبدالرحمٰن بجنوری کے انتقال کے بعد مفتی انوار الحق نے نسخہ حمیدیہ کے تدوین کی ذمہ داری قبول کی۔انہوں نے اپنے مقدمہ کے ساتھ 1921 میں دیوان کو شائع کیا۔انہوں نے نہ صرف یہ نسخہ حمیدیہ کی ترتیب وتدوین کا کام کیا بلکہ بہت سے گمشدہ پہلوؤں کی دریافت بھی کی۔نسخہ حمیدیہ کے حوالے سے متعدد سوالات کے جواب بھی دیے۔

نسخہ حمیدیہ کی تدوین کے بعد متعدد اہل قلم کو اسے دیکھنے کی دلچسپی ہوئی۔مولانا امتیاز علی خاں عرشی، سید ہاشمی، حمید احمد خاں اور ڈاکٹر عبداللطیف نے نہ صرف مختلف مواقع پر اس دیوان کو دیکھا بلکہ اس سے نوٹ بھی لیے۔سید ہاشمی انجمن ترقی اردو کی جانب سے بھوپال گئے تاکہ نسخہ حمیدیہ کو ملاحظہ کر سکیں۔ڈاکٹر عبداللطیف مذکورہ نسخے کو تاریخی ترتیب سے مرتب کرنا چاہتے تھے۔تقریبا تمام کام بھی مکمل کر چکے تھے۔بدقسمتی سے اس کا بیشتر حصہ ایک حادثہ کی نذر ہو گیا۔1928 میں نامکمل دیوان شائع کیا گیا۔ڈاکٹر عبداللطیف نسخہ حمیدیہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جلد اس قدر مجہول ہے کہ ورق آسانی سے الگ کیے جا سکتے ہیں۔متن 75 صفحات پر محیط ہے۔ہر صفحہ ۷ضرب ۱۱۱/۲ انچ ہے۔آغاز وانجام پر مرکزی متن جیسے چار اوراق کا اضافہ کیا گیا

ہے۔کاغذ دستی اور ہندستانی ساختہ لگتا ہے۔دونوں طرف لگائے گئے چار اوراق کے علاوہ دونوں طرف دو انگریزی کاغذ بھی لگائے گئے ہیں۔مخطوطے کے آغاز میں یہ کاغذ صفحہ نمبر تین اور چار کے بیچ میں ہیں۔ ہر صفحہ پر دس سے گیارہ ابیات ہیں، جو چینی روشنائی سے خوش خط نستعلیق میں رقم کیے گئے ہیں۔ پہلے چار قصائد ہیں،اس کے بعد 276 غزلیات،آخر میں 11 رباعیاں ہیں۔اوراق کو لاجودی اور سنہرے رنگ سے مزین کیا گیا ہے۔تمام مخطوطے میں متن کے گرد سنہرا حاشیہ ہے۔''114؎

ڈاکٹر عبدالطیف کے بعد حمید احمد خاں اور مہر افشاں فاروقی نے بھی اس نسخہ پر تحقیقی کام کیا۔ملک بھرست متعدد اہل علم نے اس پر مضامین ومقالات تحریر کیے۔2017 میں معارف ہی میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی کا ایک مقالہ نسخۂ حمیدیہ کے حوالے سے شائع ہوا۔جس میں نہ صرف یہ اس نسخہ پر متعدد حوالوں سے روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ کئی اہم سوالوں کا جواب بھی دیا ہے۔اس طرح نسخۂ حمیدیہ کا سلسلہ جو معارف 1918 سے شروع ہوا تھا اب بھی جاری ہے۔اور اب بھی متعدد ایسے پہلو ہیں جن پر تحقیق جاری ہے۔

معارف اپریل اور مئی 1922 کے شمارے میں دو قسطوں میں حافظ احمد علی خاں کا ایک مقالہ 'سراج الدین ظفر شاہ دہلی اور مرزا غالب کی زندگی کا ایک گم شدہ ورق' شائع ہوا۔جس میں بہادر شاہ ظفر کی شیعیت کے مسئلہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔کتب خانہ رامپور میں موجود ایک کتاب 'دستور العمل اودھ' میں مولانا سید محمد صاحب مجتہد لکھنوی کے نام غالب کا ایک خط ہے جس میں بہادر شاہ ظفر کے شیعیت اختیار کرنے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔مقالے کی ابتدا میں حافظ احمد علی خاں موضوع کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رام پور کے کتب خانے میں 'دستور العمل اودھ' کے نام سے نمبر ۲۲۹ پر ایک کتاب ہے۔اس میں سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب مجتہد لکھنوی کے عرائض اور شاہی احکام اور مختلف خطوط نقل ہیں۔ان خطوط کی سطروں میں سراج الدین ظفر شاہ اور مرزا غالب کی زندگی کے ایک خاص واقعہ پر روشنی پڑتی ہے۔دلی کے انحطاط اور لکھنو کے عروج کے زمانے کا ایک خاص واقعہ یہ ہے کہ خاندان تیمور کے چند شہزادوں نے لکھنو آکر یہ مشہور کیا کہ بادشاہ بھی شیعہ ہو گئے ہیں،اور بادشاہ کی طرف سے مہر شقہ بھی انہوں نے پیش کیا۔دہلی کے اکابر واعیان اور عام مسلمانوں کو جب یہ معلوم ہوا تو وہاں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ظفر شاہ نے حکام انگریزی کے ذریعہ سے اس کی اعلانیہ تردید کی اور غالب سے ایک فارسی مثنوی لکھوائی،جس میں اس کی تردید تھی۔لکھنو کے اہل دربار کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس مثنوی کا مصنف اقلیم ہنر کا معزول بادشاہ ظفر نہیں بلکہ کشور سخن کا حکمراں مطلق غالب ہے۔اس کے بعد غالب نے اپنا ایک قصیدہ دربار لکھنو میں بھیجا۔یہ گویا اس مثنوی کی تلافی تھی۔''115؎

مذکورہ واقعہ 1270ھ مطابق 1853 کا ہے۔ دلی کے اجڑنے کے اکثر شعراء وادبا نے لکھنؤ کا رخ کیا، اسی زمانے میں کچھ تیموری شہزادے بھی لکھنو آئے اور آکر یہ مشہور کردیا کہ بادشاہ ظفر شیعہ ہوگئے ہیں۔ ان شہزادوں نے ثبوت کے طور پر ایک مہر شقہ بھی پیش کیا۔ رامپور کے کتب خانہ میں ایک کتاب 'دستور العمل اودھ' موجود ہے جس میں سید محمد صاحب مجتہد کے فتوے، شاہی حکام، عرائض اور بہت سارے خطوط بھی ہیں۔ زیر نظر مقالہ میں حافظ احمد علی خاں خطوط کو زمانی ترتیب سے جمع کیا ہے۔ خطوط کی عبارت فارسی میں ہے البتہ صاحب مضمون نے اس کو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ بادشاہ ظفر کے سید محمد خاں کے نام لکھے ہوئے اس خط کو یہاں نقل کیا جاتا ہے جس سے اس واقعہ پر روشنی پڑتی ہے۔ خط کا مضمون یہ ہے:

> ''افضل العلما افقہ الفقہا سید السادات مقتدائے مومنین ومومنات مجتہد العصر والزماں سلطان العلماء دامت برکاتہ، اللہ کا شکر ہے کہ محبت اہل بیت علیہم السلام دل سے میں نے اختیار کی ہے اور حضرت علی علیہ السلام کے دشمنوں سے قطعی تبرا کیا ہے، امام بارہ کی تعمیر شروع ہوگئی ہے، عمارت تمام ہوجانے کے بعد جناب سید الشہدا کی مجلس تعزیت ہوا کریں گی۔ میری کوشش ہے اتما اللہ تعالی کے ہاتھ ہے، مفصل مدارج دین کے جن پر راسخ ہوں مرزا محمد حیدر شکوہ کی زبانی معلوم ہوں گے وہ اس معاملہ میں راز دار ہیں۔'' 116

مذکورہ خط کے علاوہ دو اور خط موجود ہیں جن میں ایک مرزا حیدر شکوہ جبکہ دوسرا مرزا انوار الدین بہادر کے نام ہے۔ یہ دونوں شہزادے مرزا سلیمان شکوہ کے پوتے تھے۔ مذکورہ خطوط سے صاف ظاہر ہے کہ بادشاہ ظفر نے دل سے شیعیت کو اختیار کیا ہے۔ اس خط پر بادشاہ کی مہر بھی ہے۔ جب یہ مشہور ہوا کہ بادشاہ شیعہ ہوگئے تو صرف دلی ہی نہیں بلکہ پورے ہندستان میں یہ بات ہوا کی طرح پھیل گئی۔ بادشاہ ظفر کو جب یہ خبر پہنچی تو انہوں نے حکام انگریز کے ذریعہ اس کی تردید کی اور غالب سے ایک مثنوی لکھوائی جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا۔ ظفر کے شیعیت والے واقعہ کو یادگار غالب میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ البتہ حالی نے اس حوالے سے جو واقعہ بیان کیا ہے وہ مختلف ہے۔ حالی کے نزدیک بادشاہ کا یہ مسئلہ ان کی شفایابی سے جڑا ہوا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک دفعہ بہادر شاہ بہت سخت بیمار ہوئے۔ اس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ جو اکبر بادشاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے یہاں مہمان تھے۔ ان کا مذہب اثنا عشری تھا۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا، مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاک شفا دی گئی اور اس کے بعد بادشاہ کو صحت ہوگئی۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہوجائے گی تو حضرت عباس کی درگاہ میں جو کہ لکھنو میں ہے علم چڑھاونگا۔ چناچہ

انہوں نے لکھنو جا کر بادشاہ کو عرضداشت بھیجی کی میرا مقدور نذر ادا کرنے کا نہیں ہے، حضور مدد فرمائیں۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ کچھ روپیہ مرزا شکوہ کو بھجوایا اور انہوں نے بڑی دھوم دھام سے علم چڑھایا۔ جس میں اودھ کا تمام شاہی خاندان اور امرا و علما سب شریک تھے اور مجتہد العصر کے ہاتھ سے علم چڑھوایا گیا۔'' 117ؔ

الطاف حسین نے لکھا ہے مذکورہ واقعہ کے بعد لوگوں میں یہ بات عام ہوگئی کہ بادشاہ شیعہ ہوگئے ہیں۔ اور جب بادشاہ کو اس بات کی خبر پہنچی تو حکیم احسن اللہ خان نے اس کے تدارک کے لیے رسالے شائع کرائے اور بہت سے اشتہارات بازار اور گلیوں میں بھی چسپا کیے گئے۔ بادشاہ کے حکم سے مرزا غالب نے بھی فارسی میں ایک مثنوی لکھی۔ مثنوی کا نام 'منع الباطل' رکھا گیا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مثنوی کا مضمون حکیم احسن اللہ خان نے تیار کیا تھا۔ جب یہ مثنوی لکھنو پہنچی تو مجتہد العصر نے مرزا غالب سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ میں بادشاہ ملازم ہوں مجھے جو حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ 118ؔ

صاحب مضمون کا یہ بھی خیال ہے کہ جب یہ مثنوی لکھنؤ پہنچی اور یہ عیاں ہوگیا کہ مثنوی مرزا نے لکھی ہے تو غالب نے واجد علی شاہ کی خدمت میں ایک قصیدہ لکھ بھیجا۔ مضمون کا دوسرا حصہ غالب کے اسی قصیدہ پر مشتمل ہے ۔قصیدہ ایک طرح سے معذرت نامہ یا پھر اس مثنوی کی تلافی تھی۔ حافظ علی احمد خاں نے 'دستور العمل اودھ' کے حوالے سے اس مسئلہ پر بحث کرنے کوشش کی ہے البتہ اس مضمون سے کوئی نتیجہ نکل کر سامنے نہیں آتا۔ آج بھی یہ پہلو تحقیق طلب ہے۔

معارف دسمبر 1922 میں نواب علائی اور مرزا غالب کے عنوان سے غالب کا ایک منظوم رقعہ شائع کیا گیا۔ مرزا غالب نے یہ خط نواب علاء الدین خاں علائی کے نام تحریر کیا تھا، نواب صاحب نے بھی اس کا منظوم جواب دیا تھا۔ نواب صاحب نے اس خط میں غالب کو دعوت دی تھی جس کے جواب میں غالب نے عذر کرتے ہوئے لکھا کہ وہاں آم کیا ملے گا۔ مدیر معارف موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نواب علاوالدین خان علائی مرحوم والی لوہار اور مرزا غالب کے درمیان جو دوستانہ تعلقات اور مراسم محبت تھے۔ سوانح غالب کا جاننے والا ان سے بیخبر نہیں۔ یہ دوستانہ اور مراسم محبت جو دو اہم عہد باکمال سخنوروں میں تھے، افسوس کی ان کی ادبی یادگاریں دنیا سے مٹ رہی ہیں۔ ہم جناب ضیاالدین خان صاحب رامپوری کے ممنون ہیں کہ انہوں نے نواب علائی خان مرحوم کے خلف الرشید نواب مرزا بشیرالدین خان صاحب سے ذیل کے منظوم رقعے لیکر ہمیں عنایت فرمائے ہیں۔ یہ منظوم رقعے بے تکلفانہ خطوط ہیں۔ نواب صاحب مرزا کو اپنے یہاں بلاتے ہیں، اور مرزا غالب عذر کرتے ہیں کہ وہاں آم کہا ملیں گے۔ مرزا غالب آموں کے بہت شائق تھے۔ نواب

صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ انشاء اللہ تمام فرمائشیں حاضر ہونگی۔ مرزا غاب کے اردو وفارسی قطعات کا جواب نواب صاحب نے انہیں بحر وقافیہ میں دیا ہے۔ اللہ اللہ اب نہ وہ بامزہ صحبتیں ہیں اور نی ایسے خودار اور بامحبت لوگ ہیں، نہ ایسے باکمال شاعر ہیں نہ ایسے قدر داں امرا۔'' 119ؕ

مذکورہ خط میں دو دو قطعات ہیں ایک اردو اور دوسرا فارسی۔ دونوں میں یکساں بحر وقافیہ استعمال کیا گیا ہے۔ معارف کے ذریعہ یہ خط پہلی بار منظر عام پر آیا۔ مذکورہ خط ضیاء الدین خاں رامپوری نے مرزا بشیر احمد خاں سے حاصل کیا تھا۔ یہی منظوم مکتوب خلیق انجم نے اپنی کتاب 'غالب کی نادر تحریریں' میں بھی شائع کیا ہے۔ ان خطوط کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

رقعہ مرزا غالب بنام نواب علاؤالدین خان مرحوم علائی

خوشی ہے یہ آنے کی برسات خوکے — پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آغاز موسم میں اند ھے ہیں ہم — کہ دلی کو چھوڑیں لہارو کو جائیں
سو اناج کے جو ہے مقلوب جا — نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں — ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول — وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت سو بھیڑ کا ریشہ دار — کہو اس کو کھا کے کیا حظ اٹھائیں
خوانی بسوے خویش د ندانی کہ مردہ ام — دانی کہ مردہ رارہ ورسم خرام نیست
نے شیخ سید دام نہ الہ بخش مرگ من — از عالم جنابت و مرگ حرام نیست

جواب از طرف نواب صاحب مرحوم بنام مرزا غالب

خوشی ہے ہمیں آنے کی آپ کے — کہ باہم پئیں بادہ اور آم کھائیں
سر آغاز موسم میں کیا خوب ہو — جو دلّی سے حضرت لہارو کو آئیں
عجب لطف ہے یاں کی برسات میں — کہ کیچڑ کہیں نام کو بھی نہ پائیں
سرولی کے وہ ڈاک پر سبز آم — وہ دلی سے انگور ہر شام آئیں
کریں حکم باورچیوں کو کہ ہاں — ابھی جا کے ہر چیز جلد یں پکائیں
وہ لیں جا کے باغ سے املی کے پھول — وہ جنگل سے کڑوے کریلے منگائیں
وہ بے ریشہ بکری کا لحم طری — کہ کیا کیا کھا کے اسے خط اٹھائیں
کہیں ان کو بے مہرو کاہل اگر — لہارو وہ اس بات پر بھی نہ آئیں
خوامتسوئے خویش و ندانم کہ مردۂ — دانم کہ چون توئی منع خرام نیست
پندمت زئیسن تجلی لال بیگ مرگت چو — شیخ و تد و زراہ حرام نیست 120ؕ

معارف مئی 1926 میں نذیر احمد کا ایک مضمون ’مرزا غالب کے بچپن کی ایک تحریر‘ شائع ہوا۔ یہ ایک قسم کا دستاویز ہے جس کو مرزا غالب نے خدادادخاں ولی دادخاں کے پاس اپنا مکان گروی رکھ کر جو روپیہ لیا تھا اس کے عوض میں لکھ کران کے حوالے کیا تھا۔ یہ تحریر فارسی میں ہے۔ اس دستاویزی تحریر کے آخر میں ایک مربع مہر ہے جس پر اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ لکھا ہوا ہے، مہر کے نیچے 1219ھ کی تاریخ درج ہے۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ غالب نے اسے 1804 میں اس وقت لکھا جب ان کی عمر صرف آٹھ سال تھی۔ فارسی کی یہ عبارت مئی 1926 کے شمارہ میں صفحہ 372 پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

’’خان صاحب مشفق مہربان خدادادو ولی دادخان صاحب سلامت، از اسداللہ خاں عرف مرز انوشہ بعد سلامفر مانید، کہ چوں آن صاحبان یا جناب والدہ صاحبہ قبلہ وکعبہ حضرت عزت النسا بیگم صاحبہ، مدظلہ (ظلہا) العالی ہم بطریق رہن حویلی وہم بسبیل دستگردان طرح داد وستد درمیان دارند، بلحاظ امرتاگزیر کہ لازم نفوس بشری است، دلجمعی خوداز ین جانب می خواہند، لہذا نوشتہ می بود کہ خدائے جہان آفرین جناب بیگم صاحبہ قبلہ یعنی والدہ صاحبہ را تا دیرگاہ دارد، بذات خود، لک آن ہر دو حویلی اند، وندیگرے رادرآن ہیچگو نہ شرکت دانبازی نیست، داگر احیاتاً خدانخواستہ باشد امرنا گزیر کرلازم ذات انسانست پیش خواہد آمد، انچہ از املاک مملوکہ ومقبوضہ جناب مدوحہ، تعرف این کہ گنہگار خواہد آمد ازاں مجموع اول ادائے قرض آنصاحبان کردہ خواہد شدہ گرنا کا دہ وجہ قسمت آن مجموع باداسی قرضہ آنصاحبان کفایت نما کردہ بقیہ قرضہ آن صاحبان از نیز دخودادا خواہم کرد، لیکن، این معنی بخاطر باشد کہ طون جناب والدہ صاحبہ نوشتن وخواندن میدانند لہذا اقراد آنست کہ ہر تمسک مہری جناب والدہ صاحبہ کہ بے دست خط جناب ممدوحہ خواہد شد، کہ از مایۂ اعتبار ساقط متصور خواہد شد، خلاصہ این کہ آن صاحبان ہر زرے کہ بجناب والدہ صاحبہ قبلہ بسبیل قرض دہند تمسک مہری جناب مدوحہ حاصل کردہ نزدخود دارند، ہر تمسک کہ این چنین خواہد بود از مندرجۂ آن، گر بحسب اتفاق بذمۂ جناب مدوحہ باقی خواہد ماند از جناب مدوحہ ادائے آن زرخواہ از املاک متروکہ خواہ از جادا خاص خود من کل الوجوہ بذمہن خواہد بود ہرگز درین امرتر ددنفر مایند، داین خط را کہ من بدست خود درحالت ثبات حواس بے جبرد، کراہ برضائے خود نوشتہ ام، دستاویز کامل شناسند، فقط، نگاشتہ سی، ام جنوری ۱۸۱۴ء۔‘‘

مربع مہر

عرف مرزا نوشہ اسداللہ خاں

1219ھ 21ے

معارف میں اس تحریر کی اشاعت کے بعد محققین نے بالخصوص ڈاکٹر مختار الدین آرزو اور مالک رام نے اس

طرف توجہ کی اور اس حوالے سے مختلف رسالوں میں مضامین لکھے گئے۔معارف میں اس تحریر کی اشاعت کے تقریبا 10 سال بعد رسالہ زمانہ کانپور جولائی 1936 میں 'کتب خانہ حبیب گنج میں غالب کی چند یادگاریں' کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا جس میں اس تحریر کو موضوع بنایا گیا ہے۔مضمون کے ابتدا میں ایک تمہید ہے جس میں بہت سے نقاط پر روشنی ڈالی گئی ہے۔تمہید میں اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ تحریر آگرہ کے اس خاندان سے لی گئی ہے جس سے غالب کے کاروباری تعلقات تھے۔تحریر نقل کرنے کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ:

''اس خط سے کئی دلچسپ باتوں کو پتہ چلتا ہے۔اولاً مرزا غالب کی والدہ نہ صرف پڑھی لکھی تھیں بلکہ خانگی معاملات میں بذات خود نوشت وخواند کرتی تھیں۔علاوہ ازیں متن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نام کی ایک مہر بھی تھی، نیز وہ اہم کاغذات پر اپنے دستخط کرتی تھیں اور مہر بھی لگاتی تھیں۔اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ پابند قیود رہ کر بھی ایک ہندوستانی خاتون کس احتیاط کے ساتھ اپنے خانگی انتظامات انجام دیتی ہے۔مغرب میں ہندوستانی عورت کو حرم سرا کا ''بے زبان قیدی سمجھا جاتا ہے۔مگر جن لوگوں نے ابوالفضل کے رقعات مریم مکانی، شکر النسا وغیرہ کے نام خطوط پڑھے ہیں وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ملکی امورات میں بھی بیگماتِ حرم کہاں تک دلچسپی لیتی تھیں۔مرزا کی والدہ خواجہ غلام حسین کمیدان کی بیٹی تھیں جو میرٹھ کے ایک معزز فوجی افسر اور عمائد شہر آگرہ میں سے تھے۔مرزا عبداللہ بیگ عرف دولھا بیگ مرزا کے والد نے بطور خانہ داماد اپنی تمام عمر سسرال میں ہی بسر کی۔یادگار غالب میں ایک خط کا کچھ حصہ درج ہے۔جو مرزا نے منشی شیونرائن رئیس آگرہ کو لکھا ہے۔اس میں انھوں نے وہ بے شمار حویلیاں اور املاک گنائی ہیں جو آگرے میں ان کے نانا کی ملکیت میں تھیں۔اس جائداد کا کچھ حصہ ضرور مرزا کی والدہ کو ملا ہوگا جس کا انتظام وہ خود کرتی ہوں گی۔مگر سب س ےدلچسپ چیز مرزا غالب کی مہر ہے۔میرے خیال میں یہ مہر اس وقت کی ہے جب کہ مرزا صاحب نے ابھی غالب تخلص اختیار نہیں کیا تھا۔اس کا سنہ 1231ھ ہے۔اور مرزا صاحب نے بقول صاحب آب حیات اپنا تخلص 1245ھ میں بدلا۔مہر کی موجودگی کے لحاظ سے بھی نیہ خط اہم ہے۔ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے رسالہ ہندستانی ما اپریل 1934 میں جو غالب کے لفافوں کے عکس دیے ہیں ان میں سے ایک پر غالب کی مہر بھی ہے جس پر غالب ''غالب ۱۲۴۸'' کندہ ہے۔''[122]

زمانہ کے مضمون نگار علم دوست نے مہر غالب پر درج تاریخ 1231ھ بتائی ہے۔جس کی تصدیق مالک رام کے بیان سے بھی ہوتی ہے، جنہوں نے یہ تحریر مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ذخیرہ حبیب گنج میں دیکھی تھی۔مالک رام نے اپنے ایک مضمون 'ایک فارسی خط کی تاریخ' میں اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ تحریر 1840 کی ہے۔[123] معارف میں شائع ہونے والی اس تحریر سے اردو دنیا نہ صرف نو دریافت تحریر سے آشنا ہوئی بلکہ پہلی مرتبہ

غالب کی والدہ کے نام کا انکشاف ہوا نیز کی ایک کاروباری تحریر سے بھی واقفیت ہوئی۔تحریر کے اختتام پر درج تاریخ 1231ھ سے اندازا ہوتا ہے کہ یہ تحریر، 1815، 1816 سے قبل کی ہرگز نہیں۔اس تحریر سے غالب کی فارسی دانی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔یہ تحریر کب لکھی گئی اب بھی تحقیق طلب ہے۔

معارف مارچ 1927 مولوی ضیاالدین احمد برنی کا ایک مضمون 'غالب وصہبائی کے خطوط' شائع ہوا۔اس مضمون میں مختصر تمہید اور تعارف کے ساتھ دونوں دریافت خط پیش کیے گئے ہیں۔ایک خط مرزا غالب کا ہے جبکہ دوسرا خط امام بخش صہبائی کا ہے۔دونوں خطوط کے مکتوب الیہ خان بہادر شمس العلماء مولوی ضیاالدین خاں ایل ایل ڈی ہیں۔مولوی ضیاء الدین خان اپنے زمانے کے زبردست مستشرق تھے۔ریاضی کے جملہ فروع میں مہارت رکھتے تھے۔عربی زبان پر ان کی قدرت قابل رشک تھی۔ایڈنبرا یونی ورسٹی نے انہیں ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی۔

صاحب مضمون مولوی ضیاالدین برنی کو مولوی سید منور الدین جو کہ ضیاء الدین ایل ایل ڈی کے صاحبزادے ہیں سے ملنے کا موقع ملا۔وہ نہ صرف اہل علم ہیں بلکہ ایک اعلی درجہ کی لائبریری بھی رکھتے ہیں۔جس میں علم وادب کے بے شمار خزانے موجود ہیں۔لائبریری میں ان کو یہ دونوں خطوط ملے۔یہ خطوط نہ صرف اپنی کم یابی کی وجہ سے اہم ہیں بلکہ اس عربی اور فارسی زبان پر جو گفتگو کی گئی ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔

مولانا ضیاالدین احمد برنی مضمون کی تمہید میں لکھتے ہیں:

> ''اتفاق سے اس ذخیرہ میں سرسری تلاش کے بعد غالب کے دو خطوط نکل آئے ہیں۔جو غالباً اردوئے معلیٰ کے مروجہ ایڈیشن میں درج نہیں ہیں۔اس طرح سے خدا جانے اور کتنے خطوط ہوں گے۔جو اس میں درج ہونے سے رہ گئے ہیں، بہر حال یہ اصلی خطوط ہیں جو غالب کی مہر کے ساتھ ساتھ محفوظ ہیں جو ان کی صحت کا بہترین ثبوت ہے، مجھے امید ہے کہ نہ صرف غالب کے پرستار ان خطوط کا دلچسپی سے مطالعہ کریں گے بلکہ وہ لوگ بھی جو غالب کے معاملہ میں غلو نہیں رکھتے اس کے مطالعہ سے یکساں مستفید ہوں گے۔علاوہ ازیں صہبائی مرحوم کا بھی ایک خط دستیاب ہوا ہے جسے میں تبرکاً پیش کرتا ہوں، اس وقت غالب کا صرف ایک خط پیش کیا جاتا ہے اور دوسرا خط بعد کو ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔میرے خیال میں یہ اور قسم نکے دوسرے خطوط و تحریریات قومی سرمایہ ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم اصل مسودات کو قائم و برقرار رکھیں، اس تمہید کے ساتھ میں غالب اور صہبائی کے خطوط ناظرین 'معارف' کے روبرو پیش کرنے کی عزت چاہتا ہوں''[124]

صاحب مضمون کے بقول اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے البتہ خط کے آخر میں غالب نے لکھا ہے 'ایک مجلد درفش کاویانی نذر کرتا ہوں' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کا یہ خط دسمبر 1965 کے بعد کا ہے۔مولا غلام رسول

مہر کے مرتبہ مجموعہ میں یہ خط شامل نہیں ہے البتہ دوسرے خطوط موجود ہیں۔ دوسرے خط پر 27 فروی 1866 درج ہے۔ان دونوں خطوط کا پس منظر برہان قاطع کا قضیہ ہے۔125؎ غالب نے اس خط میں عربی وفارسی زبان کی وسعت کا نہ صرف مطالعہ کیا ہے بلکہ ان دونوں کے موازنہ کے بعد عربی کو فائق بتایا ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

''بعد سلام عرض کیا جاتا ہے کہ میں عالم نہیں مگر شرف علم اور فضلیت علما میرے دلنشین ہے۔اور علم کو زبان عربی میں مختصر جانتا ہوں ،اللہ اللہ علم عربی کی وسعت صرف ونحو ،منطق ،فلسفہ ،تفسیر ،حدیث ،فقہ پانچ سات برس تک آدمی اس کو تحصیل کرسکتا ہے ،یعنی طب ونجوم وہیئت وہندسہ وریاضی اور اس کے سوا اور علوم سب عربی زبان میں ہیں۔'' 126؎

ماہنامہ معارف مارچ 1932 میں محمد علی ایک مضمون 'ممبئ یونی ورسٹی کے کتب خانے میں چند فارسی مخطوطات' شائع ہوا۔مضمون میں لکھے ہوئے نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقالہ شیخ عبدالقادر سرفراز نے انگریزی رسالہ 'رائل ایشیا ٹک سوسائٹی' ممبئ میں جنوری 1928 میں شائع کیا تھا۔معارف کے لیے اس مضمون کا ترجمہ محمد علی (پونہ) نے کیا۔مضمون کے آغاز میں ایک طویل تمہید ہے جس میں مخطوطات کے ذخیروں اور مختلف کتب خانوں کے ذخیروں کی بازیافت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔متعدد لائبریریوں کا ذکر کیا گیا ہے جہاں اب بھی عربی فارسی اور اردو کی بڑی تعداد میں غیر مطبوعہ کتابیں موجود ہیں۔ ہندستان اور ہندستان سے باہر ممالک کی لائبریریوں میں موجود مخطوطوں کی نہ صرف نشاندہی کی گئی ہے بلکہ متعدد مخطوطات کے بازیابی کی داستان بھی رقم کی گئی ہے۔

مذکورہ تمہید کے بعد ممبئ یونی ورسٹی کے کتب خانہ میں موجود متعدد مخطوطات کا نہ صرف تعارف پیش کیا گیا ہے بلکہ ان کی اہمیت اور طبع کیے جانے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ان مقالوں میں ایک مقالہ گجرات کے ریختہ گویوں کا ایک فارسی تذکرہ 'مخزن الشعرا' کے عنوان سے ہے۔ جسے قاضی نورالدین بن قاضی سید احمد حسین رضوی فائق نے لکھا ہے۔صاحب مقالہ کا خیال ہے کہ اس تذکرے کی تکمیل 1268ھ بمطابق 1851،1852 میں ہوئی،جس کے بعد اسے تصحیح کی عرض سے مرزا اسداللہ خاں غالب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ مذکورہ تذکرہ 'مخزن الشعرا' کی وضاحت کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار لکھتے ہیں:

''نمبر ۵ جلد (۴۳) یہ بیت ہے مفید مخطوطہ ہے اس میں گجرات کے ریختہ گویواں کا تذکرہ ہے جسے فارسی میں قاضی نورالدین بن قاضی سید احمد حسین رضوی فائق نے لکھا ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ یہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے اور اسپرنگر صاحب کے ریختہ گویوں کے تذکروں میں اس کا نام نظر نہیں آتا سوا اس کے یہ مولف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے، جسے مولف نے حسب عبارت خاتمہ کتاب ۱۲۷۰ھ میں بھرچ میں لکھا تھا، وہ عبارت یہ ہے تمت ہذا تذکرہ تاریخ شانزدہم شوال المکرّم روز جمعہ سنہ ہزار دوصد وہفتاد من ہجرہ المبارک در بندر بروچ باتمام

رسید کاتب ومولف و مالک ہذا یکی است‘‘ ان تاریخی مادون سے جو خاتمہ کتاب میں درج ہیں ثابت ہوتا ہے کہ تذکرہ کی تالیف کا کام ۱۲۶۸ھ ۵۳-۱۸۵۲ میں ختم ہوگیا تھا۔ یہ تالیف تصحیح کی غرض سے دہلی کے شاعر معروف غالب مرحوم کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ ان کی رائے تذکرہ کے صفحہ آخر کے حاشیہ پر نقل کی گئی ہے، وہو ہذا‘‘ 127؎

مذکوہ تذکرے کی اصلاح مرزا غالب نے کی تھی۔ ان کی رائے تذکرے کے آخری صفحہ پر درج ہے۔ مرزا غالب کی اصلاحی عبارت سے قبل یہ بھی درج ہے ’عبارتی کہ جناب مرزا اسداللہ خاں صاحب بعد مطالعہ این اوراق واصلاح آن تحریر فرمود برائے یادگار تحریر نموذ‘۔ مذکورہ تحریر کے بعد غالب کی اصلاح درج ہے۔ جسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

’’مخدوم مکرم حضرت قاضی محمد نورالدین حسین خان بہادر کی خدمت میں عرض ہے کہ برخوردار حرا شہاب الدین خاں بہادر نے یہ اجزا مجھ کو دیے۔ نظم سے میں نے بالکل قطع نظر کی، کامل صاحب کی نثر جو آغاز میں ہے اس کو بھی نہیں دیکھا، اوراس کو موافق حکم آپ کے بعض جا درست کر دیا، بعض موقع پر نشا اصلاح بھی لکھ دیا ہے مجھ کو یہ پایہ نہیں کہ آپ کی نثر میں دخل کروں نجواے الا مرفوق حکم بجالایا ہوں، مرحبا آفرین بخدا خوب نثر لکھی ہے، اللہ سبحانہ آپ کوتم سے من نے بال کی ایک صاحب کی شر جو آغاز ین ہے اس کو بھی نہین کی نصرت کی نشر کو کیا اوراس کوعوافی حکم آپ کے حیض با درست کر دیا بعض موقع پر متال بی کی وجہ یہی کہ آپ کی زمین مل کر لجوال الامرفوق ا لادب، مرحبا آفرین خدا خوب رکھی ہے، ادیان آپ کو درج علیٰ کو پہنچاوے اور سلامت رکھے مرقومہ دوشنبہ جولائی ۱۸۸۲۔ خوشنودی احباب کا طالب (غالب)‘‘ 128؎

غالب کی مذکورہ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تذکرہ ان تک مرزا شہاب الدین خاں بہادر کی وساطت سے پہنچا۔ انہوں نے بعض جگہ عبارت کی اصلاح کی ہے، مگر انکساری کا یہ عالم کہ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ’مجھ کو یہ پایہ نہیں کہ آپ کی نثر میں دخل دوں‘ اس کے ساتھ ہی مرحبا وآفریں سے بھی نوازا ہے۔ غالب کی اصلاح کے آخر میں جولائی 1862 کی تاریخ درج ہے۔ تذکرہ کے داخلی مواد پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالقادر سرفراز لکھتے ہیں:

’’تذکرہ کے شروع میں کامل کا فارسی نثر میں مقدمہ ہے، جس میں تذکرہ کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ اس کے بعد مصنف کا دیباچہ ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ میں نے میر عباس علی شوق اور میر حیدر صاحب دوستوں کی گذارش پر گجرات کے شاعروں کا تذکرہ طالیف کیا اور اسے مخزن الشعرا کے نام سے موسوم کیا فارسی زبان میں حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق شاعروں کے مختصر حالات اور ان کے منتخب اشعار درج ہیں۔ ان شاعروں میں ایک عورت ہے جس کا تخلص حجاب ہے۔ مولف نے فائق کے تحت میں اپنا حال لکھا ہے، تذکرہ کے آخر میں مرات الحسن ایک فارسی مثنوی ہے جس

میں نظام الدین خاں فائق نے سراپا بیان کیا ہے۔اس کے بعد اسی مضمون پر ایک اور مثنوی مہری شاعرہ کی ہے جس کی نور جہاں بیگم ملکہ جہانگیر نے پرورش اور تربیت کی تھی اور بعد حکیم خواجہ محرم علی سے شادی کردی تھی۔''129

مولانا عبد الماجد دریابادی کا ایک مضمون 'مرزا غالب کا ایک فرنگی شاگرد آزاد فرانسیسی' معارف جنوری 1922 میں شائع ہوا۔اس مضمون میں ایک معروف یورپی اردو شاعر الیگزینڈر ہدرلے آزاد(Alexander Headtherly Azad) کا تعارف ان کے مطبوعہ دیوان سے کرایا گیا ہے جو ان کی اطلاع کے مطابق کتب خانہ رامپور میں موجود ہے۔تلامذہ غالب کے سلسلہ میں ایک اور مضمون 'بریلی میں غالب کے تلامذہ' فروری 1969 معارف میں شائع ہوا۔ڈاکٹر سید لطف الدین کے اس مقالہ میں غالب کے چھ بریلوی تلامذہ کا احوال درج ہے جن کے نام حسب ذیل ہیں۔مفتی سلطان خاں احسن،مفتی سید احمد خاں سید،قاضی عبد الجمیل جنوں،قاضی عبد الرحمٰن وحشی،غلام بسم اللہ خاں بسمل اور محمد حسین حاجب۔اس مضمون سے نہ صرف ان شاگردوں کے احوال ملتے ہیں بلکہ اپنے موضوع پر ایک مستند حوالے کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔

مذکورہ مضمون کی اشاعت سے قبل مرزا غالب کے اس فرنگی شاگرد کا ذکر خطوط غالب کے علاوہ محض چند تذکروں تک محدود تھا۔جو حسب ذیل ہیں: قطعہ منتخب،ارمغان گوگل پرشاد،بیاض سخن،خم خانہ جاوید،سخن شعرا اردو اور دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ قابل ذکر ہیں۔مذکورہ تذکروں میں آزاد فرانسیسی کے متعلق کوئی خاص معلومات نہیں ملتی ،البتہ تذکرہ خم خانہ جاوید میں ان کی شخصیت اور دیوان کے متعلق قدر تفصیل ملتی ہے۔مولانا عبد الماجد دریابادی نے اپنے مذکورہ مضمون کی ترتیب میں تذکرہ خم کانہ جاوید،منشی میر شوکت علی فتح پوری اور آزاد فرانسیسی کے بڑے بھائی تھامس ہدرلے ڈپٹی کلکٹر بھرت پور کے مطبوعہ بیانات کو مدنظر رکھا ہے۔مذکورہ مضمون کے ابتدا میں ایک تمہید ہے جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ دسمبر 1921 کے شذرات میں چند فرنگی شاگردوں کا تذکرہ کیا گیا تھا جو قارئین معارف کو بہت پسند آیا اس لیے اب ایک فرانسیسی ادیب پر مفصل روشنی ڈالی جارہی ہے۔دسمبر 1921 کے شذرات کو نقل کیا جاتا ہے:

''ہندوستان کے حکمران قوم کو ہندوستان کی زبان سے آج جو مغائرت و بیگانگی ہے وہ اس وقت بہت زیادہ حیرت انگیز ہوجاتی ہے۔جب یہ حقیقت پیش نظر رکھی جاتی ہے کہ آج سے سوا سو برس پہلے انگریزوں اور دوسرے فرنگیوں کو اسی ''پست وحقیر'' زبان اردو کے ساتھ غیر معمولی شغف و اعتنا تھا،اس وقت بڑے سے انگریز بھی نہیں کہ خود اردو سیکھتے تھے، بلکہ اردو زبان،ادب وشاعری کی سرپرستی کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔مصارف کثیر برداشت کرکے اردو میں ترجمہ کراتے تھے،اور خود اردو صرف ونحو ولغت پر محققانہ تالیفات کرنے میں اپنی عمریں صرف کردیتے

تھے۔گلکرسٹ، ٹیلر، رچرڈسن، ڈی ٹاسی، شیکسپیئر وغیرہ نے اٹھرہویں صدی عیسوی کے خاتمہ اور انیسویں صدی کے آغاز میں جو احسانات اردو پر کیے ہیں، ان سے قیامت تک سبکدوشی نہیں ہوسکتی، انیسویں صدی کے وسط تک بھی فیلن، لاٹینر، ہالرائڈ وغیرہ کے سے اصحاب ذوق اور اردو کی واجبی قدر کرنیوالے افراد، حکمران قوم میں پیدا ہوتے رہے۔لیکن آج، آج ہندوستان کے سارے طول وعرض میں چند ایسے فرنگیوں کا بھی وجود کہا جاسکتا ہے جو اس ملک کی زبان سے ماہرانہ واقفیت یا گہرا ذوق رکھتے ہیں؟ خدانخواستہ کہیں اس بے اعتنائی و بے پروائی کا محرک استحکام حکومت کا جذبہ غرور تو نہیں سنتے ہیں کہ لوگ بے زبان جانوروں کو پالتے اور ان سے کام لیتے رہتے ہیں۔وہ بھی ان کی زبان سے امکان بھر واقفیت حاصل کر لیتے ہیں، ممکن ہے ’عقل فرنگ‘ نے باشندگان ہند کو بے زبان جانوروں سے بھی زیادہ بے زبان سمجھ لیا ہو۔‘‘130؎

مولانا عبدالماجد دریابادی نے مذکورہ مضمون میں الیکزنڈر ہیدرلے کو ایک فرانسیسی خاندان کا رکن بتایا ہے اور اس کے لیے انہوں نے تذکرہ خم خانہ جاوید (جلد اول) کو حوالے کے طور پر پیش کیا ہے۔البتہ آزاد کے دیوان سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔رام بابو سکسینہ اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے ہیدرلے خاندان کے بعض افراد سے خود ملاقات کی تھی اور ان کے خاندانی دستاویزات سے بھی استفادہ کیا تھا۔بعد کے محققین بالخصوص ڈاکٹر اسلم فرخی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر شفقت رضوی نے بھی انہیں دلائل کو اختیار کیا ہے۔مضمون کی ابتدا میں ایک تمہید ہے جس میں الیکزنڈر ہیدرلے فرانسیسی آزاد اور اس کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہی:

’’الیکزنڈر ہیدرلے، ایک فرانسیسی خاندان کے رکن تھے، ولادت غالباً ہندوستان میں ہی ہوئی تھی، سال ولادت تقریباً ۱۸۲۹ء تھا۔اٹھارہ سال کی عمر سے اردو شاعری کا شوق پیدا ہوا، مشورۂ سخن کے لیے کلام کو نواب زین العابدین خان عارف (شاگرد عزیز مرزا نوشہ) اور خود غالب کی خدمت میں پہنچانا شروع کیا، ان حضرات کا فیض توجہ بے اثر نہیں رہ سکتا تھا، کچھ عرصہ میں اچھی خاصی مشق ہوگئی، اور کلام میں فی الجملہ پختگی آگئی، جو ایک غیر قوم کے فرد کے لیے بہت بڑی بات ہے، عمر نے وفا نہ کی، ۳۲ سال کی عمر میں ۷ جولائی ۱۸۶۱ کو انتقال کیا، تاہم اتنے ہی عرصہ میں کلام کا مجموعہ اس قدر ہوگیا تھا کہ معمولی ضخامت کا دیوان تیار ہوجاتا، چنانچہ مرحوم کے برادر کلاں طامس بیدرلی نے دو برس کے بعد اس دیوان کو شائع کرایا۔تخلص آزاد کرتے تھے، اس لیے دیوان بھی آزاد کے نام سے موسوم ہے۔ضخامت ۱۷۵ صفحہ ہے، مطبع احمدی آگرہ سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا، اب بازار میں نایاب ہے، میرے پیش نظر کتب خانۂ سرکاری رامپور کا نسخہ ہے۔131؎

مذکورہ اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد کو اٹھارہ سال کی عمر میں شاعری کا شوق ہوگیا تھا۔نواب زین

العابدین (جو کہ غالب کے شاگرد تھے)اور غالب سے اصلاح لیتے تھے۔زین العابدین خاں عارف غالب کی بیوی کے بھانجے تھے،جنہیں غالب نے اپنے سات بچوں کے بے وقت مرجانے کے بعد بیٹا بنالیا تھا۔اچھے استاد مل جانے سے کم عمری سے ہی اچھی شاعری کرنے لگے تھے۔1929 میں پیدا ہوئے اور1861 میں صرف 32 سال کی عمر میں انتقال کیا۔مگراس کم مدت میں بھی اس قدر کلام جمع ہوگیا کہ اسے ایک مختصر دیوان کی شکل دی جاسکے۔ان کے انتقال کے دوسال بعد بڑے بھائی طامس ہیدرلے نے1863 میں شائع کیا۔مذکوہ دیوان ایک مدت تک کم یاب تھا،مولانا عبدالماجد دریابادی نے رامپور کی لائبریری میں اس کو دیکھا تھا۔دیوان کے ابتدا میں دودیباچے ہیں ۔پہلا دیباچہ فارسی زبان میں منشی شوکت علی فتح پوری کا لکھا ہوا ہے۔اس دیباچہ کی خاص بات یہ کہ کافی شاعرانہ انداز میں لکھا گیا ہے۔دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''فتاے ہنر مند گوہر ذکا پیوند خدا وند عقل وتمیز ،صاحب فراست و ہردلعزیز مستعد ازلی الیکزنڈر ہیدرلے کہ ذہن وذکا را در خلقش خمیر بود،وسعادت ومروت درضمیرش جا پذیر،درسن ہیزدہ سالگی بہ شنیدن اشعاراساتذہ متقدمین ومتاخرین طبع وقادش درتحصیل کمالش توجہ نمود گاہ گاہ ہنگام فرصت بمطالعہ تصانیف استاداں پرداختے وبامحتشم الدولہ امیر الملک محمد اسداللہ خان بہادر سہراب جنگ غالب متخلص ونواب زین العابدین خان متخلص بی عارف کہ دوحضرات از اکابر امراؤالادودمان دہلی بودند بذریعہ مراسلات ومکاتبات استمداد سخن داشتے''132؎

دیباچہ کے ایک حصہ کو یہاں نقل کیا گیا ہے البتہ مکمل دیباچہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد فرانسیسی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ طب میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ان کے ہاتھ میں بڑی شفا تھی ۔دوسرا دیباچہ ان کے بڑے بھائی طامس ہیدرلے کا لکھا ہوا اردو زبان میں ہے۔یہ تقریظ مختلف حیثیتوں سے اہم ہے اس سے نہ صرف آزاد اوران کے دیوان کے متعلق معلومات ہوتی ہے بلکہ ایک فرانسیسی شخص کے نثری نمونے کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔طامس ہیدرلے لکھتے ہیں:

''نیاز مند درگاہ لم ینہ طامس ہیدرلی ابن مسٹرجیمس ہیدرلی مرحوم بیان کرتا ہے اور اپنا راز دل یوں پر یوں عیاں کرتا ہے کہ سیرا حقیقی چوتا بہائی کپتان الگذیندر ہیڈلی جوان معاتمند شیریں زبان دانش پیوند ابتداے عمر میں شعروسخن کا مایل ہوا اور چندروز میں جیسا چاہیے مایہ سخنوری وگستری اس کو حاصل ہوا کیونکہ طبعیت دراک تھی فکر چالاک تھی جو کچھ دل سے زباں تک اور زباں سے قلم تک آیا اس نے گلہاے معنی کا ایک تختہ خوشرنگ کہایا۔رفتہ رفتہ اس کے کلام کی وہ صورت ہوئی کہ ہم فنون کو رشک ہوا اور دانشمندوں کو حیرت ہوئی۔نواب زین العابدین خان دہلی کے اسیر زادہ عالی خاندان جو عارف تخلص کرتے تھے اور جناب نجم الدولہ اسداللہ خاں بہادر غالب کے شاگرد تھے وہ

اس کے استاد تھے اور اس نوجوان کو اپنے استاد اور اپنے استاد کے استاد کے انداز پیش نظر تھے اور اکثر ان کے اشعار یاد تھے۔ ہنوز برادر موصوف بہت کچھ کہنے نہ پایا تھا بلکہ میں کہ سکتا ہوں کہ جو کچھ اس کے دل میں تھا ابھی اس کی زبان پر نہ آیا تھا کہ ناگاہ وقت ناگزیر اا پہنچا اور اس سعادت منداز ل کو پیغام اجل کا آ پہنچا۔ چونکہ سرکار الور میں عہدہ کپتانی پر معمور تھا دنیا سے سفر کرتے وقت میری نظر سے دور تھا۔ ایسا ایک ہونہار بھائی جس نے کل۔۔ اوپر تیس برس کی عمر پائی ساتویں جولائی ۱۸۶۱ کو کام تمام ہوا۔ اس غم کا جس قدر بیان کیجیے اس سے سوا ہے جو اپنا حال بنا ہے اور جس قدر غم کیا جائے بجا ہے این ماتم بجا سخت است کہ گویند جوان مرد۔ افسوس نہ فریاد میں فائدہ دیکھا نہ رونے میں تاثیر پائی بہت روئے پیٹے آخر صبر کرتے بن آئی۔ اشعار اس مرحوم کے جو پریشان جا بجا پڑے پائے گویا سونے میں زمرد اور یاقوت کے نگینے بڑے پائے، خیال آیا کہ جواہر کو بکھرا پڑا نہ رہنے دیجیے۔ اور ان سب اشعار کو ردیف دار جمع کر کے دیوان مرتب کیجیے تا کہ جو کوئی دیکھے وہ کہے کہ اگر چہ اس شخص کی تھوڑی زندگی تھی مگر واہ اس قلیل مدت میں کیا گہر افشانی تھی نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے مجھ کو یہ یقین ہے کہ یہ جو کاغذ پر سیاہی سے لکھے گئے ہیں سو اس کے اشعار اس کے ماتم میں سیہ پوش ہوئے ہیں اللہ یہ مجموعہ اشعار مقبول طبع ہر سخن رہوں اور الگزنڈر ہیدلی کی روح کو حضرت یسوع کے قدم مبارک میں مغفرت میسر ہو تما شدا۔'' 133

دیوان کے ابتدا قصیدہ، حمد اور نعت ہے۔ ابتدائی تین صفحوں میں اعزہ، احباب اور والیان ریاست کی شان میں قصائد ہیں۔ صفحہ نمبر 46 سے 156 تک غزلیات اور بقیہ صفحات میں دیگر اصناف مثلاً قطعات، مخمس اور مرثیہ وغیرہ ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ حمد کا رنگ وہی ہے جو ایک مسلم شاعر کا ہوتا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

تیری رحمت حامئی رزق گدایان یا مسیح　　تیری بخشش تاج بخش تاجدار ن یا مسیح
تیری شفقت ہر کس و ناکس کی خواہان یا مسیح　　ہے تجھی سے نیک و بد کی شکل آسان یا مسیح
ساقی کونین و شاہ دو جہاں تو ہی تو ہے　　یا مسیحا چارہ ساز عاصیان تو ہی تو ہے 134

دیوان میں متعدد ایسی غزلیں جس میں تضمین کی گئی ہے۔ ناسخ کی غزل 'میرا سینہ مشرق آفتاب داغ ہجراں کا' کی تضمین کے علاوہ غالب کی مشہور غزل 'تمہیں کہو کہ انداز گفتگو کیا ہے' کی تضمین بڑی دلچسپ ہے۔ پہلا بند یہ ہے:

بلا سے میں نہ سہی خاک بھی عدو کیا ہے　　تمہیں اسی کی قسم اس کی آبرو کیا ہے
زبان شوخ بیان کا یہ حسن خو کیا ہے　　ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے

آخری بند یہ ہے:

کہا جو میں نے کہ غالب نظر نہیں آتا	نیاز آپ کی خدمت میں اب نہیں لاتا
تو بولے بھید کو آزاد تو نہیں پاتا	ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے 135

دیوان مذکور میں بے شمار غزلیں غالب کی زمین میں ہیں۔بعض غزلیں دیوان میں ایسی ہیں کہ اہل زبان بھی فخر کریں۔استاد محترم کا مرثیہ بھی خوب لکھا ہے۔زبان و بیان کی بعض غلطیاں بھی ہیں لیکن س کے باوجود البتہ ایک مستشرق کے لیے اس نوع کی شاعری کرنا اردو کے لیے قابل فخر ضرور ہے۔

معارف اکتوبر 1930 میں سید مقبول حسین احمد پوری کا ایک مضمون 'عیش مایوسی' شائع ہوا۔اس مضمون میں بڑی جامعیت کے ساتھ غالب کے تصور امید بیم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔یہ ایک طرح کا تنقیدی مضمون ہے البتہ اس میں غالب کی اس فکر کی جو تشریح کی گئی ہے وہ قابل ذکر ہے۔صاحب مضمون نے اس کو عیش مایوسی کا نام دیا ہے۔چناچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''مرزا صاحب ناکامی میں کامیابی کے جویا ہیں۔شکست میں ان کو فتح نظر آتی ہے۔رنج و غم سے انہیں فرح حاصل ہوتی ہے۔اور منتہائے مایوسی ان کے نزدیک عیش و عشرت کی منزل ہے...یہی وہ فلسفہ ہے جس کو افادیات کی تحت میں عیش مایوسی کہنا زیادہ مناسب ہے۔'' 136

مطالعہ غالب میں ابھی تک معاف کا ذکر شاید ہی کسی نے کیا ہو۔حالانکہ ان مضامین کے علاوہ غالب تحقیق پر بے شمار مقالات ماہنامہ معارف میں موجود ہیں،ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مقالات کو دوبارہ پڑھا جائے اور ان مباحث پر از سرے نو تحقیق کی جائے۔یہاں صرف 1947 تک کے مضامین کو موضوع بنایا گیا ہے۔معارف میں تحقیق و تنقید کے ساتھ کتابوں پر تبصرے بھی لکھے گئے۔بعض کتابوں پر مطبوعات جدیدہ کے تحت صرف تعارف پیش کیا گیا ہے۔عتیق جیلانی نے اپنے غیر مطبوعہ مقالے میں معارف میں شائع ہونے والے تبصروں کی جو فہرست درج کی ہے ان کی تعداد تقریبا سو کے قریب ہے۔ان تبصروں میں بعض باتیں ایسی ہیں جو تحقیقی نوعیت سے کافی اہم ہیں۔

اقباليات

ماہنامہ معارف کا ایک بڑا حصہ سرمایہ اقبالیات پر مشتمل ہے۔علامہ شبلی اور علامہ اقبال کے گہرے مراسم تھے۔شبلی اور اقبال کے مزاج اور فکر و خیال میں بڑی ہم آہنگی تھی۔یہی وجہ ہے کہ اہل علم نے اقبال کو پیروئے شبلی قرار دیا ہے، جس کی متعدد مثالیں کلام اقبال میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ 1903 میں علامہ اقبال نے اپنی پہلی کتاب علم الاقتصادیات لکھی تو علامہ شبلی نے ان کی خواہش پر اس کتاب کا مطالعہ کیا نیز بعض مباحث کی تصحیح بھی کی۔علامہ شبلی نے مجلس علم الکلام بنائی تو علامہ اقبال کو اس کا ممبر بنایا۔وقف علی الاولاد کے لیے قانون بنانے کی تحریک چلائی تو اس میں بھی علامہ اقبال کو شامل کیا۔حفاظت و اشاعت اسلام کے نام سے تنظیم بنائی تو علامہ اقبال کو نامزد کیا۔غرض دونوں ہی ایک دوسرے کی بڑی قدر کرتے تھے۔شبلی اور اقبال کی پہلی ملاقات محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی 1911 میں ہوئی۔137 اس اجلاس میں علامہ شبلی نے انہیں ترجمان حقیقت کا خطاب دیا بلکہ دوسرے غالب ہونے کی بشارت بھی دی۔علامہ شبلی نے اپنی تقریر میں کہا :

''یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں ہے اور اس کو محض تفریح تصور نہ کرنا چاہیے۔ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطابات کی قدر کرتے رہے ہیں اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کی نہیں ہوئی۔محقق طوسی وغیرہ کو اس زمانے کے سلاطین نے بڑے بڑے خطابات دیے لیکن آج سوا کتابوں کے اوراق کے کسی زبان پر نہ چڑھ سکے لیکن قوم کی طرف سے محقق کا جو خطاب دیا گیا تھا، وہ آج تک زبان زد خاص و عام ہے۔جو عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے، وہ ان کے لیے بڑی عزت و توقیر کی بات ہے اور حقیقت میں وہ اس عزت کے مستحق ہیں۔ڈاکٹر اقبال کا علم، ادب اور ان کی شاعری کا مقابلہ غالب کی شاعری سے کیا جائے تو مبالغہ نہیں ہوسکتا۔''138

علامہ شبلی اقبال سے عمر میں بیس سال بڑے تھے۔جب شبلی کا قلم شباب پر تھا اس وقت اقبال بلندیوں کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔دونوں ایک دوسرے کی علمی لیاقت کی قدر کرتے تھے۔شبلی نے اقبال کی اس وقت پذیرائی کی جب وہ اپنے شعری سفر کے ابتدائی مراحل طے کر رہے تھے۔علامہ شبلی نے اقبال کے جوہر کو بھانپ لیا تھا اسی وجہ سے انہوں نے ایک بڑے شاعر ہونے کی بشارت دے دی تھی۔سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔:

''مولانا شبلی مرحوم نے اقبال کو اس وقت پہچانا تھا جب ہنوز ان کی شاعری کے مرغ شہرت نے پر و بال نہیں پیدا کیے تھے۔چنانچہ انہوں نے پیشن گوئی کی تھی کہ حالی و آزاد کی جو کرسیاں خالی ہوں گی ان میں سے ایک اقبال کی نشست سے پر ہوجائے گی۔''139

علامہ شبلی کے جانشین سید سلیمان ندوی سے بھی اقبال کے گہرے مراسم تھے۔علامہ اقبال اور سید صاحب کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ رہا 'اقبال نامہ' میں سید صاحب کے نام علامہ اقبال کے 70 خطوط شامل ہیں۔علامہ

اقبال کے جو خطوط معارف میں شائع ہوئے ان کی تعداد 62 ہے۔سید صاحب نے ان کی زندگی ہی میں شذرات معارف میں متعدد بار تذکرہ کیا۔اقبال کی پہلی غزل 'ترانہ اقبال' جون 1918 میں پہلی بار معارف میں شائع ہوئی۔نظم پولٹیکل گداگری اکتوبر 1919 کا عنوان سید سلیمان ندوی ہی نے دیا۔رموز بے خودی کا تعارف و تجزیہ سب سے پہلے سید صاحب نے ہی کیا۔سید سلیمان ندوی نے لکھا کہ مولوی رومی نے سات دفتروں میں سات آسمانوں کے خزانے یکجا کر دیے اور چونکہ وقت کی چیز تھی اس لیے اہل معنی میں اس کو بے انتہا مقبولیت ملی،ضرورت تھی کہ ہمارے اہل دل شعرا مثنوی میں مولوی روم کا ایک دوسرا نسخہ ہمارے لیے تیار کرتے،شعرائے حال میں ڈاکٹر اقبال کو اللہ تعالی نے اس ضرورت کے لیے چن لیا ہے۔انہوں نے اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر دو مثنویاں لکھیں،اسرار خودی اور رموز بے خودی۔140ؔ

مثنوی کے تبصرے میں سید صاحب نے نہ صرف ان دونوں مثنویوں کا موازنہ کیا ہے بلکہ اس کی زبان اور بیان پر بھی روشنی ڈالی۔سید صاحب کا معمول تھا کہ علامہ اقبال کے متعلق جب کوئی خوش کن خبر آتی تو معارف میں اس کا ذکر ضرور کرتے تھے۔1920 میں اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ لندن سے شائع ہوا تو سید سلیمان ندوی نے لکھا کہ:

''مشرقی لٹریچر کے ہوا خواہ بالعموم ڈاکٹر اقبال کے مداح بالخصوص اس خبر کو سن کر خوش ہونگے کہ ان کی مشہور فارسی مثنوی اسرار بے خودی کا انگریزی ترجمہ لندن میں چھپ کر شائع ہو گیا ہے۔مترجم کیمبرج یونیورسٹی کے ممتاز مستشرق پروفیسر نکلسن ہیں جو اسلامی ادبیات وتصوف پر متعدد تصانیف کے مصنف ہیں اور عربی فارسی کی چند نادر بیش بہا کتابیں اڈٹ کر چکے ہیں،اس ترجمہ پر انہوں نے بکثرت حواشی دیے ہیں اور ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر کیا ہے،ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ دو بار اس پر مقدمہ لکھ چکا ہے جو علمی حلقوں میں کتاب کی اہمیت ومقبولیت کی ایک واضح دلیل ہے۔141ؔ

علامہ اقبال کو جب سر کا خطاب ملا تو سید سلیمان ندوی نے جنوری 1923 کے شذرات میں بہت اہتمام کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔اقبال کی علمی اور فکری سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور لکھا کہ:

''ہماری حکومت نے اس کا اعتراف اس وقت کیا جب پروفیسر نکلسن کے قلم سے ان کے بعض رموز واسرار شاعرانہ انگلستان کی بزم سخن میں جا کر فاش ہوئے۔''142ؔ

اپریل 1927 میں سید سلیمان ندوی نے انجمن حمایت اسلام میں شرکت کی غرض سے لاہور کا سفر کیا۔جہاں انہوں نے 'عہد رسالت میں اشاعت اسلام' کے موضوع پر خطبہ دیا۔لاہور سے واپسی پر انہوں نے سفر کی روداد قلم بند کی جس میں انہوں علامہ اقبال کا خاص طور سے ذکر کیا نیز اقبال کے نئے مجموعہ کلام کی خوشخبری بھی

دی۔ مئی 1927 کے شذرات میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اقبال ان تمام صحبتوں میں شمع محفل تھے۔انھوں نے شمع اور شاعر لکھا ہے لیکن میں نے لاہور میں خود شاعر کو شمع دیکھا اور قدر شناسوں کو اس کا پروانہ پایا،ان کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بہت بلند کر رہی ہے،ان کے فلسفیانہ نکات،عالمانہ افکار،شاعرانہ خیالات ان کے آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں اور ان کی زمزمہ پردازیوں کا نیا مجموعہ 'زبور عجم' کے نام سے عنقریب سامعہ نواز ہونے والا ہے۔میں نے کہا کہ فلسفہ عجم کے دشمن کو مناسب بھی یہی تھا کہ عجم کے ہاتھ میں زبور دے کر ان کے خیالی فلسفہ کو مزامیر داؤد کی دعاؤں سے بدل دے اور ان کے کانوں کو زبور کا پردہ رکھ کر قرآن کی نغمہ سنجیوں سے مانوس کردے۔''143ء

علامہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں نظم خضر راہ پڑھ کر سنائی تھی۔سید سلیمان ندوی نے اس کے چند بند 'ماہنامہ معارف' میں سب سے پہلے شائع کیا۔علامہ اقبال نے سید صاحب کو پیام مشرق کی خوش خبری دی تو انہوں نے یہ خبر قارئین معارف کو سنائی۔بال جبریل شائع ہوئی تو سید صاحب نے معارف میں اس پر ایک مفصل تقریظ لکھی۔1936 میں ضرب کلیم کی اشاعت کی خبر سید صاحب نے معارف کے ذریعہ پہنچائی۔اقبال کی متعدد نظمیں اور غزلیں سب سے پہلے معارف میں ہی شائع ہوئی۔یہ بات بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ مولانا عبدالسلام ندوی کی کتاب 'اقبال کامل' آزاد ہندستان میں اقبال پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔۱۲اپریل 1938 کو علامہ اقبال نے وفات پائی تو معارف بھی حزن وملال کا مرقع بن گیا۔سید سلیمان ندوی نے بڑے جذباتی انداز میں ان کا ماتم کیا،وہ لکھتے ہیں:

''وہ اقبال ہندستان کی آبرو،مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا۔آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی۔ایسا عارف فلسفی،عاشق رسول شاعر،فلسفہ اسلام کا ترجمان اور کاروان ملت کا حدی خواں،صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو۔اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگ درا،اس کی جان حزیں کی ہر آواز،زبور عجم،اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق،اس کے شعر کا ہر پرواز بال جبریل تھا۔144ء

اقبال کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال صرف شاعر نہ تھا وہ حکیم تھا،وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں بلکہ وہ حکیم جو اسرار قدرت کا محرم اور رموز فطرت کا آشنا تھا۔وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں گھول کر دکھاتا تھا،یعنی بادہ انگور کو نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا145ء

اسی مضمون میں سید سلیمان ندوی نے یہ پیش گوئی بھی کی تھی:

''اقبال کی تصنیفات زمانہ میں یادرہیں گی۔وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بن کر انشاء اللہ رہے گا۔ان کی شرحیں لکھی جائیں گی۔نظریے ان سے بنیں گے۔ان کا فلسفہ تیار ہوگا۔اس کی دلیلیں ڈھونڈھی جائیں گی۔قرآن پاک کی آیتوں ،احادیث شریفہ کے جملوں ،مولانا رومی اور حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا اور اس طرح اقبال پیام اب دنیا میں انشاء اللہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اقبال زندہ جاوید۔'' 146؎

علامہ اقبال سید سلیمان ندوی کے فضل وکمال سے بہت متاثر تھے وہ نہ صرف ان کی قدر کرتے تھے بلکہ ان کے اوران کی کتابوں کے متعلق اکثر لکھا کرتے تھے۔نادرشاہ کی دعوت پر تعلیمی اصلاحات کے لیے دونوں افغانستان کے سفر پر ساتھ تھے۔علامہ اقبال نے ایک خط میں لکھا کہ مولانا شبلی کے بعد آپ استاذ الکل ہیں،اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہوگا۔147؎ سید سلیمان ندوی کو فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے اورینٹل کالج لاہور میں مقرر کرانا چاہتے تھے تاکہ ان کے علم سے لاہور کے لوگ استفادہ کرسکیں۔مگر سید سلیمان ندوی نہیں گئے تو علامہ اقبال نے دعا دی کہ اللہ تعالی دارالمصنفین کے کام میں برکت دے اور آپ کا وجود مسلمانوں کے لیے مفید ثابت کرے۔148؎

دارالمصنفین کے قیام بعد علامہ اقبال نے اس ادارے سے نہ صرف دلچسپی لی بلکہ تاحیات اس کے رکن بھی رہے۔وہ صرف ایک رکن ہی نہیں رہے بلکہ متعدد ایسے مشورے دیے جس سے دارالمصنفین کے وقار میں اضافہ ہوا۔تاریخ فقہ اسلامی اور حکمائے اسلام جیسی اہم کتاب ان کے ہی مشورے سے دارالمصنفین سے شائع ہوئی۔خلافت کے متعلق سید سلیمان ندوی کے مضامین ان کے مشورے سے ہی کتابی شکل میں شائع ہوئے۔دارالمصنفین کی مطبوعات ان کے مطالعہ میں رہیں۔سید سلیمان ندوی نے ایک بڑا دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے کہ میں نے سفر افغانستان کے دوران ایک دن علامہ اقبال سے کہا کہ جب تک آپ کی شاعری زندہ رہے گی ہندستان میں اسلام باقی رہے گا۔علامہ نے فرمایا نہیں جب تک دارالمصنفین کی تصنیفات باقی رہیں گی ہندستان میں اسلام باقی رہے گا۔سر راس مسعود بھی شریک بزم تھے۔انہوں نے کہا کہ اسے یوں کہہ لیجیے کہ جب تک اقبال کی شاعری اور دارالمصنفین کی تصنیفات باقی رہیں گی ہندستان میں اسلام باقی رہے گا149؎

جولائی 1916 میں معارف کا اجرا ہوا تو علامہ اقبال نے اس سے بھی پوری دلچسپی لی۔وہ اس کی اشاعت کے مشتاق رہتے تھے۔سید صاحب کے نام لکھے گئے خطوط سے بھی ان کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''یہی تو ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔'' 150؎

افکار اقبال کے مطالعہ کا آغاز معارف کی ابتدائی جلدوں سے ہوگیا تھا۔عہد سلیمانی سے تا حال علامہ اقبال

کی سوانح، شاعرانہ عظمت اور ان کے فکر و فلسفہ پر ڈیڑھ سو سے زائد مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ان مضامین سے نہ صرف اقبال شناسی میں مدد ملتی ہے بلکہ بے شمار ایسے گوشے ہیں جن کا ذکر سب سے پہلے معارف میں آیا۔اس کے علاوہ اقبال کی اور ان کے فکر و فلسفہ پر لکھی گئی تقریباً سو کتابوں پر تبصرے بھی شامل ہیں۔معارف کے سرمایہ اقبالیات کی فہرست کافی طویل ہے البتہ ان پر لکھی گئی تحریروں کو آسانی کے لیے مختلف حصوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔فکر اقبال پر مقالات، کلام اقبال کی اشاعت، تجاویز اور مشورے، اقبال پر لکھی جانے والی کتابوں کا تجزیہ، حیات اقبال پر تحقیق، کلام اقبال کی فنی جہت کا تعین، کتب اقبال پر تبصرے، کلام اقبال کی تعبیر و تشریح اور فلسفہ اقبال کی تفہیم قابل ذکر ہیں۔معارف کی عمر ایک صدی سے زیادہ ہے اس مدت میں اقبال پر سیکڑوں مقالات اور تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔اشاریہ معارف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہنامہ معارف میں اقبالیات کا ایک بڑا خزانہ ہے۔الیاس احمد اعظمی نے اپنی کتاب 'اقبال اور دبستان شبلی' میں جو فہرست درج کی ہے اس میں مقالات کی تعداد ۱۶۰ ہے۔علامہ اقبال کی تصانیف اور ان پر لکھی جانے والی کتابوں اور خاص نمبروں پر جو تبصرے شائع ہوئے ان کی تعداد ۹۴ ہے۔اقبال کے انتقال کے بعد معارف میں تقریباً ۱۲ لوگوں نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ان فہارس سے معارف کی اقبال شناسی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔البتہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ مجھے صرف تحقیقی نوعیت کے مباحث پر ہی گفتگو کرنی ہے اور 1947 تک شائع ہونے والے مضامین کو موضوع بنانا ہے۔

معارف جنوری 1926 کو اکرام الحق سلیم کا مضمون 'فلسفہ اقبال' شائع ہوا۔مضمون کا عنوان فلسفہ اقبال ہے البتہ جزوی طور پر اقبال کے فلسفہ خودی کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔البتہ فاضل مضمون نگار نے عصر حاضر میں مسلم معاشرے کے لیے کلام اقبال کی کیا اہمیت ہے اس پر زیادہ زور دیا ہے۔

پہلا عنوان اخوت و اخلاص ہے۔جس میں کلام اقبال کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ اخوت و اخلاص پر مشتمل ہے۔اس میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ اقبال منتشر پراگندہ ملت اسلامیہ کو محبت کے رشتہ میں منسلک دیکھنا چاہتے ہیں۔دوسرا عنوان یاس اور حزن ہے۔جس میں اقبال کے پیام حرکت و عمل کی وضاحت کی گئی ہے۔اکرام الحق سلیم نے اس حوالے سے لکھا ہے کہ:

> ''علامہ اقبال کے نزدیک استحکام حیات تخلیق و تولید مقاصد سے وابستہ ہے، یاس وحزن ام الخبائث اور قاطع حیات ہیں اور جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں صرف توحید ہی ان امراض خبیثہ کا ازالہ کرسکتی ہے، ان کا ہر شع شعاع امید و آرزو سے تابندہ نظر آتا ہے۔گرچہ وہ خود ملت بیضا کے ظاہری اور باطنی اضطراب سے متاثر ہیں اور اس کے مصائب پر اشک ریز تاہم آیۃ لاتقنطو پر انہیں کامل بھروسہ ہے اور وہ محسوس کرتے ہیں۔.... حضرت اقبال ہمہ تن اس کوشش میں مصروف

ہیں کہ مسلمانوں کو یاس کے خواب اور اثر سے نجات دلا کر ان کے دلوں کی ظلمت کو امید کی تنویر
سے متبدل کر دیں، تا کہ پھر قوم کے افراد جذبہ عمل اور جان فروشی سے متمیز نظر آئیں۔'' 151ؔ

علامہ اقبال کا فلسفہ قرآن و حدیث کی روشنی میں ہے۔ جس طرح اسلام نا امیدی کو کفر کہتا ہے اسی طرح اقبال بھی مایوسی کو بالکل بھی پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے کلام میں ملت کو یہی پیغام دیا ہے کہ اللہ نے انسانوں کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور بے شمار صلاحیتوں سے نوازہ ہے ضرورت اس بات ہے کہ خود کو اور خود کے اندر موجود مخفی صلاحیتوں کو پہچانا جائے۔ تیسرا عنوان خود اعتمادی اور خودداری ہے۔ اس عنوان کے تحت نہ صرف یہ کہ اقبال کے فلسفہ خودی کی تعریف بیان کی گئی ہے بلکہ اس کے تین مدارج کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''انسان کے اندر زندگی کا مرکز خودی یا انا ہے، اس کی توسیع اور تربیت جدوجہد سے وابستہ ہے اور اس کا استحکام عشق سے ہے۔ عشق کا استعمال بہت وسیع معنوں میں ہونا چاہیے۔ خودی کو اپنی تکمیل میں تین مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ مرحلہ اول اطاعت، مرحلہ دوم ضبط نفس، مرحلہ سوم نیابت الٰہی، ذوق عمل کا عدم وجود انحطاط کا پیش خیمہ ہے، اس لیے تمام ایسی چیزوں سے جو خودی کو ضعیف کر دیں احتراز واجب ہے۔ ادبیات، مذہب، اخلاقیات کے اثرات کا صحیح اندازہ اسی معیار سے قائم کیا جاتا ہے۔'' 152ؔ

مضمون نگار کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اقبال کا فلسفہ خالص اسلامی فلسفہ ہے۔ اقبال تخیل احساس اسلام سے وابستہ ہے۔ مضمون میں فلسفہ اقبال کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جبکہ اس کے علاوہ بھی فکر اقبال کے متعدد پہلو ہیں۔ مذکورہ مضمون فلسفہ اقبال کی تفہیم میں کوئی خاص مدد نہیں کرتا البتہ اس حوالے سے کافی اہم ہے کہ یہ تحریر اس وقت کی ہے جب علامہ حیات تھے۔ فکر اقبال کو سمجھنے کی ابتدائی کوششوں میں سے ایک ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مقالہ نگار نے اقبال کی تفہیم کے ابتدائی دنوں میں جو نکات پیش کیے ہیں وہ آج بھی بنیادی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔

فلسفہ اقبال کی تفہیم و تشریح کے حوالے سے شوکت سبزواری کا ایک مضمون 'فلسفہ اقبال کا مرکزی خیال وحدت وحرکت' معارف فروری 1946 میں شائع ہوا۔ مذکورہ مضمون میں کلام اقبال کی روشنی میں وحدت و حرکت پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ شوکت سبزواری نے مضمون کے ابتدا میں بتایا ہے کہ ہر فلسفہ نظام کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے، جس پر اس کی پوری عمارت قائم ہوتی ہے۔ مرکزی خیال ہی دراصل اس نظام کی جان ہوتی ہے۔ جو اپنے ڈھانچے میں لے کر اس میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ باقی دیگر خیالات اس مرکز کے چاروں طرف گردش کرتے ہیں۔ جس طرح ہمارے اس نظام میں سیارے آفتاب کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری فلسفہ اقبال کے مرکزی خیال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال کا فلسفہ دراصل فلسفہ حیات ہے جس میں زندگی اور اس کے امکانات کو روشنی میں لایا گیا ہے۔.... اقبال کے خیال میں حقیقت صرف ایک ہے اور وہ ہے حقیقت کبری، جسے اقبال نے Ultimate Reality اور حیات برتر کہا ہے۔ یہ حیات اس عالم کی تنہا اور واحد حقیقت ہے۔ یہ جوہر وعرض جسم و روح، زمان و مکان، مادہ و توانائی فکر و عمل مختصر یہ کہ تمام کی جامع یہی ایک حقیقت ہے۔ یہ حقیقت روحانی ہے اور انفرادی شخصیت کی حامل بھی، اس لیے اقبال نے اس کو انا یا ایغو کی حیثیت میں پیش کیا ہے۔ ایغو میں ایک شخصی رجحان ہوتا ہے اور اس مین ایک طرح کی مرکزیت پائی جاتی ہے۔ حیات ہر چند بسیط، مجتمع اور منفرد ہے لیکن فکر انسانی اسے کچھ اس طرح محسوس کرتی ہے گویا وہ برقی لہروں کی طرح پھیلتی جا رہی ہے، یہ فکر انسانی کی خصوصیت ہے کہ وہ ہر بسیط سے بسیط حقیقت کو بھی مثال کے لباس میں پیش کرتا ہے، اس لیے حیات کی عریاں اور بسیط حقیقت پر بھی اس نے کائنات محسوس کے حجابات ڈال دیے ہیں اور اسے اشیا میں اس طرح دوڑا دیا ہے گویا وہ کوئی مقناطیسی قوت ہے جو رگوں میں خون کی طرح رواں دواں ہے۔''153ؔ

اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مقالہ نگار نے عمل کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ عمل محض اور عمل ظاہر۔ عمل محض روح یا نفس کا متبادل ہے اور عمل ظاہر جسم کا قائم مقام۔ روح اور جسم کے درمیان فرق کو آن اور نقطے کی مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ فرق صرف یہ کہ نقطہ آن کا کثیف تصور ہے۔ مختصر یوں کہ اقبال کائنات کو عین خدا تسلیم کرنے کے بجائے اسے خدا کا فعل سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک خدا کا ہر عمل و ارادہ ایک انا ہے۔ اور اناؤں کے ایک طویل سلسلہ میں سب سے طاقت ور انا انسان ہے۔ بے شمار اناؤں کا مجسمہ کائنات ہے۔

اقبال کے فکر و فلسفہ کے حوالے سے عبد السلام ندوی کا مضمون 'اقبال کا فلسفہ خودی' آٹھ قسطوں میں معارف اپریل تا نومبر 1947 کو شائع ہوا۔ جس کے بعد یہی مقالہ ان کی کتاب اقبال کامل کا حصہ بنا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اقبال کامل ہندستان میں اقبال پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ پہلی قسط آٹھ صفحات پر مشتمل تمہیدی ہے۔ تمہید میں رسالہ نیرنگ خیال کے اقبال نمبر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ دراصل اس نمبر میں اقبال کے فلسفہ خودی کی تشریح کرتے ہوئے اسے جبر و قہر، قوت شوکت اور حیوانیت کے مترادف ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عبد السلام ندوی اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ خودی کی نہایت غلط اور خطرناک تشریح ہے۔ نہ ہمارے صوفیہ ایسا کہتے اور نہ ڈاکٹر صاحب انسان کو موذی جانور بننے کی تعلیم دیتے۔ ان کے فلسفہ بننے کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ اخلاقی فضائل کی دو قسمیں ہیں۔ ا۔ ایجابی، مثلاً خودداری دلیری، آزادی، حق گائی، بلند ہمتی، استقلال، عزم و ثبات، وقار، صبر و سکون، مطالبہ حق، جدوجہد، سعی و محنت وغیرہ وغیرہ۔ ۲۔ سلبی، مثلاً زہد تقشّف، توکل وقناعت، تواضع و خاکساری، عفو و درگذر، حلم و بردباری، وغیرہ

وغیرہ۔154

اسلام میں ایجابی، سلبی، انفرادی، اجتماعی ہر طرح کے اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلامی نظام اخلاق صرف اس صورت میں قائم ہوسکتا ہے، جب انسان کو اپنی خودی کا احساس وادراک ہو۔ مذکورہ دو قسموں کے علاوہ انہوں نے اخلاق کی دو اور قسم بیان کی ہے۔ اثبات خودی کے لیے انہوں نے اپنے دلائل کو دس حصوں میں تقسیم کیا ہے اور انہیں مقدمات خودی کا نام دیا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے کلام اقبال سے ان دلائل کو اخذ کیا ہے ،اور ہر دلیل کے لیے کلام اقبال کو پیش کیا ہے۔ مولانا کے پیش کردہ دلائل کے اہم نکات کو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ خودی۔ خودی بذات خود پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کا پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ انسانی خودی کا وجود خدا کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ انسانی خودی اللہ کی ذات سے بالکل الگ ایک مستقل چیز ہے۔ خودی کو بذات خود قائم کر کے اپنے نظری اقتصادات کو پورا کرنا چاہیے۔ انسانی خودی کے علاوہ کائنات کی بھی ایک خودی ہے۔ کائنات کی خودی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑھنا، پھرنا، نشونما حاصل کرنا اور اپنی صلاحیتوں کو روبہ کار لانا چاہتی ہے۔ کائنات کی خودی کا ایک خاصہ ہے کہ وہ اپنے اردگرد کی چیزوں کو جذب کر لیتی ہے۔

۲۔ شرف انسانیت۔ انسان کی خدا سے الگ ایک مستقل ہستی ہے۔ انسان کو تمام کائنات پر فضیلت حاصل ہے۔ وہ فرشتوں سے بھی زیادہ افضلیت رکھتا ہے۔ انسان کا وجود ایک لازوال چیز ہے ،زمانہ کی گردش اس کو فرسودہ نہیں کر سکتی۔ انسان خدا کا اصل مقصد اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ خدا ہر چیز میں اس لیے جلوہ گر رہتا ہے تا کہ اس میں انسان کو تلاش کر سکے۔

۳۔ تسخیر فطرت۔ انسان کی جدوجہد کا کوئی دخل نہیں بلکہ خود خداوند تعالی نے قدرت کی تمام بڑی بڑی طاقتوں کو انسان کا مسخر اور فرمابردار بنا دیا ہے۔ انسان اپنی جسمانی قوت اور سعی ومحنت کے ذریعہ سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتا ہے۔ انسان اپنی عقلی طاقت سے فطرت کو مسخر کرتا ہے۔ انسان روحانی طاقت سے فطرت کو مسخر کرتا ہے اور یہ صرف اولیا کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور یہ قوت نہ جسمانی طاقت سے ہے نہ عقل وعلم سے بلکہ عشق سے پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ مسئلہ خیر وشر۔ خیر ایک ایجابی اور شر ایک سلبی جز ہے۔ مطلب یہ کہ دنیا میں خیر کا وجود تو ہے مگر شر کا نہیں۔ خیر شر پر غالب ہے اور خیر کی تعداد و مقدار شر سے زیادہ ہے۔ تخلیق انسانی کا مقصد حصول لذت نہیں بلکہ خودی کا تحقق کمال اور نشونما ہے اور یہ تمام چیزیں شر، مصیبت اور رنج والم سے حاصل ہوتی ہیں۔ اصل فطرت اور مشیت الٰہی میں خیر وشر کچھ نہیں۔ عقل نیک وبد کا امتیاز کرتی ہے۔ دنیا میں اصل وجود شر کا ہے اور اس شر کے ازالہ کا نام خیر ہے۔ قیام وبقا صرف شر کو ہے۔

۵۔ روح وجسم کا اتحاد۔ جسمانی قوت سے روحانی قوت حاصل ہوتی ہے۔ جسم کی طاقت سے روح کی

طاقتور ہوتی ہے۔روح وجسم میں مغائرت نہیں بلکہ اتحاد ہے۔اقبال روح وجسم کو ایک ہی حقیقت گردانتے ہیں۔اقبال زندگی کے لیے روحانی اور جسمانی دونوں طاقتوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔

۶۔ خیر واختیار۔انسان کی تقدیر کا لکھنے والا خود اللہ ہے۔انسان کی قدرت ،اختیار وایجاد واختراع کی کوئی حد نہیں ہے۔انسان نہ مجبور ہے نہ مختار بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک متحرک طاقت ہے۔متحرک اور زندہ طاقت کی وجہ سے انسان اپنے فعال واعمال میں آزاد ہے اور اس کا ذمہ دار بھی۔اسی عمل آزادی کی بنا پر خودی کی نشونما ہوتی ہے۔اور وہ عذاب وثواب کا مستحق ہوتا ہے۔

۷۔ تخلیق مقاصد۔بلند مقاصد حقیر خواہشوں کو فنا کرکے انسان کو مستغنی اور بے نیاز کر دیتے ہیں۔سرکاری ملازمت سے خودی ضعیف ہوتی ہے۔خواہشوں کی ایک قسم زندگی کے لیے باعث تخریب ہے اور ایک قسم باعث تعمیر ہے،جس سے نفس کی تہذیب اور خودی کی نشونما ہوتی ہے۔

۸۔ صحرائیت وبدویت۔تعلیم وتربیت علم وعرفان کا حقیقی ذریعہ نہیں ہے بلکہ حقائق کا علم صرف کوہ وبیاناں میں ہوتا ہے۔خودی کی تربیت صرف دشت وبیابان میں ہوتی ہے۔صحرائیت اور بدویت سے جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی قوت حاصل ہوتی ہے۔

۹۔ عقل وعشق۔عقل وعشق خودی کی جزو ترکیبی ہیں۔خدا خود اپنی ذات پر عاشق ہے۔حسن وجمال اور تمام محاسن وفضائل کا منبع خدا کی ذات ہے۔عقل وعشق دو حریف ہیں۔اقبال نے عشق کے مقابلے عقل کو شکست دی ہے۔عشق خودی کی ترقی کا ذریعہ ہے۔عشق بذات خود ایک عز وشرف ہے اور اس کا آخری درجہ شہادت ہے۔

۱۰۔ مسئلہ ارتقا۔انسان کامل صرف روحانی ارتقا سے جنم لے سکتا ہے۔انسان کامل عقل،عشق اور اخلاق حسنہ کا نمونہ ہے۔155ؔ

مولانا عبدالسلام ندوی نے مقالے کے ساتویں حصہ میں فلسفہ خودی کے ماخذ سے بحث کی ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے سب سے پہلے نکلسن کے نام اقبال کے خطوط کی تردید کی ہے۔دراصل جب پروفیسر نکلسن نے اقبال کی مثنوی اسرار خودی کا ترجمہ کیا تو مغربی مفکرین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ فلسفہ جرمنی کے مشہور مفکر نٹشے سے ماخوذ ہے ۔اقبال کا انسان کامل اور جرمن مفکر فوق الانسان ایک ہی چیز ہیں۔جس کی تریدی کرتے ہوئے علامہ اقبال نے لکھا ہے کہ:

> ''بعض انگریز تنقید نگاروں نے اس سطحی تشابہ اور تماثل سے جو میرے اور نٹشے کے خیالات میں پایا جاتا ہے، دھوکا کھایا ہے اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں ذی ایتھم والے مضمون میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں وہ بہت حد تک حقائق کی غلط فہمی پر مبنی ہیں،لیکن اس غلطی کی ذمہ داری صاحب مضمون پر عائد نہیں ہوتی،وہ انسان کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور نہیں سمجھ سکا،یہی وجہ ہے کہ اس نے

غلط مبحث کر کے میرے انسان کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل انسان کامل کے متوصفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گذری تھیں۔''156

علامہ اقبال کے مذکورہ خط سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال جرمن مفکر نٹشے سے بالکل بھی متاثر نہیں بلکہ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب میں نے انسان کامل کے بارے میں لکھا تھا اس وقت تک میں نٹشے سے واقف نہیں تھا۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال کا انسان کامل اور نٹشے کا فوق الانسان دو الگ الگ چیزیں ہیں۔فاضل مضمون نگار نے اقبال کے اس دعوے کا بھی ذکر کیا ہے کہ اسرار خودی کا بنیادی فلسفہ مسلمان صوفیہ اور حکماء کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے۔آخری حصہ اقبال اور مولانا روم کے فلسفیانہ قربتوں کے تجزیے پر مشتمل ہے۔ان دونوں شخصیتوں کے افکار میں متعدد مماثلتیں ہیں۔مثلاً دونوں وجدان کو عقل پر فوقیت دیتے ہیں۔دونوں خودی کے برعکس اس کی تقویت کے داعی ہیں۔تقدیر کے بارے میں دونوں کا تخیل عام تصور سے الگ ہے۔دونوں کے نزدیک سعی وجد و جہد زندگی ہے اور خفتگی موت۔انسان خدا کی ذات میں فنا ہونے کے بعد بھی اپنی خودی قائم رکھ سکتا ہے۔اس کے علاوہ متعدد مماثلتیں ہیں۔ان مماثلتوں کے ذکر کے بعد مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے۔:

''اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب کا فلسفہ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا یا انہوں نے دوسروں کی خوشہ چینی کر کے انہیں کے فلسفوں کو شاعرانہ آب و رنگ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ان کے فلسفہ خودی کے تمام اساسی مضامین درحقیقت قرآن مجید سے ماخوذ ہیں۔قرآن مجید میں فضیلت انسانی تسخیر فطرت،عزم واستقلال،جرات وشجاعت،فتح ونصرت،حمیت وغیرت اور قدرت واختیار پر بہ کثرت آیتیں موجود ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے یہ تمام مضامین قرآن سے لیے۔اس کے بعد انہوں نے فلسفہ وتصوف پر نگاہ ڈالی تو ان کو دو متضاد فلسفیانہ اور صوفیانہ نظریے نظر آئے۔ایک تو شوپنہار کا قنوطی فلسفہ تھا اور اس کے برخلاف نٹشے کا فیصلہ تھا۔اسی طرح صوفیانہ تعلیمات مختلف تھیں۔تصوف کی عام کتابیں اکثر صوفیا اور فارسی شاعری کا تمام تر ذخیرہ،اشراقی اور فلاطونی فلسفے سے متاثر تھا،جو زندگی کو ہیچ قرار دیتا تھا اور صرف سلبی اخلاق کی تعلیم دیتا تھا۔لیکن مثنوی مولانا روم میں ان کو جا بہ جا ایسے اشعار اور ایسے خیالات ونظریات ملے جو قرآن مجید کی تعلیمات کے موافق اور فلسفہ خودی کے موید ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے ان تمام فلسفیانہ اور صوفیانہ نظریات میں شوپنہار اور صوفیانہ تعلیمات اور فارسی شاعری کے تمام ذخیرے کو قرآن مجید کی تعلیمات کے مخالف پایا،اس لیے ان کو بالکل نظر انداز کر دیا،اسی طرح نٹشے کے فلسفے میں ان کو خودی کے جو شیطانی عناصر نظر آئے،ان کو تو انہوں نے بالکل چھوڑ دیا

،البتہ اصل مسئلہ کولیکر اس شیطانی خودی کو یزدانی خودی بنادیا اور اس میں ان کو قرآن مجید کے بعد مولانا روم کی مثنوی سے مدد ملی۔'' 157

صاحب مضمون نے نہ صرف یہ کہ مولانا روم اور اقبال کی مماثلتوں کا ذکر کیا ہے بلکہ ناقدین اقبال بالخصوص خلیفہ عبدالحکیم کے حوالے سے اقبال اور نٹشے کی فکری مماثلتوں اور ذہنی صلاحیتوں کا جائزہ لیا ہے۔مولانا کا یہ مقالہ ان کی کتاب 'اقبال کامل' کا حصہ بنا۔اقبال کامل میں انہوں نے اقبال کی شخصیت فکر وفن کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک اہم مضمون 'اقبال اور سیاست' مارچ ،اپریل 1946 میں دو قسطوں میں شائع ہوا ۔اس مضمون میں اقبال کے فلسفہ سیاست سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ اقبال کی شاعری اور سیاست اس طرح باہم ملی جلی ہیں جس طرح دانتے کی شاعری اور فلارینس کی سیاست 158

مغربیت سے پوری دنیا مرعوب اور متاثر تھی ۔اقبال نے مغربی مفکرین سے ضرور استفادہ کیا البتہ کبھی ان سے مرعوب نہیں ہوئے ۔اقبال کے سیاسی نظریے کا جب بھی ذکر آتا ہے تو معترضین کی طرف سے طرح طرح کے سوال اٹھائے جاتے ہیں ،انہیں ولیم بلیک ،نطشے اور برگساں کا خوشہ چیں اور مقلد قرار دیا جاتا ہے۔اس اعتراض کے جواب میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :

''معترضین کے بقول اقبال لحظہ بہ لحظہ بدلتے اور نئے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں ،اس ضمن میں اقبال کے خیالات میں کچھ تحاد بھی نظر آتے ہیں ،مثلا فسزم اور سوشلزم دونوں کی تعریف فقر اور مادی استیلا دونوں کی حمایت وغیرہ ،بظاہر اس اعتراض کی صداقت سے انکار نہیں ہوسکتا ،لیکن اس سے اس بات کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اقبال کی سیاسی فکر کی پختگی میں ان تجربات کا کثیر حصہ بھی شامل ہے ، جو انہیں اوضاع واطوار عالم کے عمیق مطالعہ سے حاصل ہوئے اس میں شبہ نہیں کہ علامہ اقبال ایک زمانہ میں بعض وطنی تحریکات کے مؤید اور حامی تھے ،لیکن ان کے یہ خیالات زیادہ تر ملی فضا اور اہل مغرب کی کتابوں کے مطالعہ پر موقوف تھے ، جو انہیں مغرب کے ایسے مصنفین کی کتابوں سے حاصل ہوئے جو عموما قومیت ، جمہوریت اور وطنی عصبیت کو اپنے افکار سیاسی کا جزو لاینفک خیال کرتے ہیں ۔سچ تو یہ ہے کہ تہذیب فرنگ کی تابانی کے سامنے بڑے بڑے خودی آشنا بھی آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں ،علامہ اقبال بھی چندے اس کے دام میں گرفتار رہے مگر علوم مشرق کے گہرے مطالعہ اسلام اور مشرقی تمدن کی روح کے صحیح ادراک ، یورپ کے سفر اور تمدن مغرب کے فریبی تجزیے نے ان کو بہت جلد اس کی تابانی سے بدظن کر دیا۔'' 159

ڈاکٹر سید عبد اللہ نے مذکورہ مقالہ میں متعدد عناوین قائم کیے ہیں ۔پہلا عنوان 'اقبال کی سیاسی فکر کے ماخذ' جس میں انہوں نے اقبال کے سیاسی فکر کے ماخذ کی نشاندہی کی ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ فلسفہ خودی کی ترتیب

میں اساس خودی کے متعلق خیالات نطشے سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں ۔جد وجہد اور استحکام خودی کا فلسفہ نٹشے کا ہے۔عشق بطور سرچشمہ علم اور وقت کے متعلق بہت کچھ برگساں کے زیر اثر لکھا گیا ہے۔160

دوسرا عنوان ’اقبال کی فکری نشونما‘ ہے۔جس میں ان خیالات کا اظہار کیا گیا ہے کہ اقبال کا سیاسی نصب العین اکثر بدلتا رہا ہے۔ان کے افکار میں مختلف اوقات کے ساتھ ساتھ تبدلیاں واقع ہوتی رہی ہیں۔اقبال نے کسی زمانے میں ہندستانیت سے سرشار نظمیں لکھیں جن میں ترانہ ہندی ، نیا شوالہ ، ہندستانی بچوں کا قومی گیت ، تصویر درد قابل ذکر ہیں۔ بعد ازاں انہوں نے بلاد اسلامیہ ، ترانہ ملی ، خطاب بہ جوانان اسلام ، شکوہ و جواب شکوہ جیسی ملی وخالص اسلامی نظمیں تحریر کیں۔اس کے علاوہ فاسزم اور سوشلزم کی حمایت کی ،ایک زمانہ میں بعض وطنی تحریکات کے حامی بھی رہے۔

معارف ستمبر 1945 میں بشیر مخفی قادری کا مضمون ’اقبال کے تصور خودی کا ماخذ‘ کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔جس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال کا تصور خودی اور ان کے بعض دوسرے افکار و مصطلحات سید گل حسن صاحب قادری پانی پتی سے ماخوذ ہیں۔بشیر مخفی قادری لکھتے ہیں:

’’اقبال کے نظریہ خودی کے متعلق آپ سے گزارش کرنا چاہتا ہوں ، آپ نے لکھا کہ اقبال سے پہلے خودی کا لفظ خود شناسی کے معنوں میں کسی دوسرے شاعر نے استعمال نہیں کیا ہے اور نہ صوفیوں کے کلام میں نظر سے گزرا ہے۔ بلکہ خودی کا لفظ ان کے یہاں استکبار اور خود پسندی کے معنوں میں آیا ہے۔حقیقت میں یہ درست ہے کہ اقبال سے پہلے صوفیہ اور شعرا نے لفظ خودی کو اکثر غرور ہی کے معنی میں استعمال کیا ہے ، لیکن اقبال نے جہاں خودی کو خود شناسی کے معنی میں استعمال کیا ہے وہ ایک حد تک صوفیہ کے فلسفہ تعین ذات و عرفان نفس کے معنی میں ہے ، لیکن اکثر مقامات پر قومی خودی کے احساس و آگہی اور خودداری کے انقلابی اور فلسفیانہ معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔اقبال کی یہ خودی خود شناسی کے مفہوم و مقصد سے قریب تر ہے۔اس لیے اس میں اور صوفیہ نظریہ خود شناسی میں کوئی اختلاف نہیں رہتا اور اس معنی میں خودی عرب و عجم کے بہت سے اکابر و بزرگان اسلام بلکہ خود آنحضرتؐ اور صحابہ کرام ، تابعین عظام اور ائمہ دین اور اولیا و صلحائے امت کے ارشادات کا نچوڑ ہے۔میرا مقالہ ’اقبال کا نظریہ خودی اور حافظ کی بیخودی‘ اسی نصب العین پر لکھا گیا ہے۔یہ ناچیز مطالعہ اور غور و فکر سے اس نتیجہ پر پہنچا ہے ، کہ نظریہ خودی جسے اقبال نے اپنایا ہے نیا نہیں بلکہ مے کہن ور ناد دہ نو کا مصداق ہے۔اس بات کو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اقبال سے پہلے اس نظریے کے حقیقی مبلغ میرے نانا بزرگوار علیہ الرحمتہ کے رہبر برحق حضرت علامہ مولانا الحاج سید گل حسن شاہ صاحب حسن قلندر ثانی قادری پانی پاتی قدس سرہ مصنف و مولف تذکرہ غوثیہ و تعلیم غوثیہ تھے۔‘‘161

مضمون کے ابتدا میں مدیر معارف کی طرف سے ایک مختصر وضاحتی اور اختلافی نوٹ بھی موجود ہے، جس میں بشیر مخفی قادری کے مذکورہ خیالات کی تردید اور دلائل کو رد کیا گیا ہے۔ مدیر معارف لکھتے ہیں:

''اس مضمون میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال کا تصور خودی اور ان کے بعض دوسرے افکار و مصطلحات سید گل حسن شاہ صاحب قادری پانی پتی کے کلام اور ان کے صوفیانہ تصانیف سے ماخوذ ہیں اور خودی کے اس تصور کے پہلے مبلغ شاہ صاحب تھے۔ درحقیقت دنیا میں بہت کم افکار و تصورات ایسے ہیں جنہیں بالکل نیا اور اچھوتا کہا جا سکے اس لیے تنہا کسی فکر کا دھندلا اور ابتدائی تصور پیدا ہونا ایجاد کی نسبت کے لیے کافی نہیں ہے۔ موجد وہی کہلائے گا جس نے سب سے پہلے مکمل طور پر مدلل اور مرتب طریقہ سے بحیثیت فن فلسفہ یا تعلیم کے اس کو پیش کیا اقبال کے بعض افکار و خیالات دھندلا تصور قدیم فلاسفہ، تکلمین اور صوفیا کے یہاں ضرور ملتا ہے، مولانا روم تو ان کے روحانی مرشد ہی تھے اور ان سے ان کا ستفادہ معلوم و مشہور ہے۔ لیکن اقبال سے پہلے جن مفکرین کے یہاں ان کے جن تصورات کا سراغ ملتا ہے وہ محض ضمنی ہیں اور ان کی کوئی مستقل حیثیت نہیں اور اقبال کے افکار کے مقابلہ میں ان کا تصور بہت ابتدائی ناقص اور محدود ہے۔ اقبال پہلے شخص ہیں جنہوں نے ان کو مستقل موضوع بنایا اور ان کو ترقی دے کر ذرہ کو صحرا اور قطرہ کو دریا بنا دیا اور مرتب و مدلل فلسفہ اور تعلیم کی حیثیت سے ان کو پیش کیا اس لیے اس کو نقل نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک جزوی استفادہ کہا جا سکتا ہے، جس سے کوئی مجتہد اور مفکر بری نہیں اور اس سے اقبال کے کلام کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔'' 162ؔ

مضمون نگار کا یہ بھی خیال ہے کہ حضرت شاہ نے تعلیم غوثیہ میں جن ارشادات و شاعرانہ نکات کو پیش کیا ہے اس کا بھی اقبال پر اثر پڑا ہے۔ خودی اور خدائی پر مبنی اقبال کے ایک شعر اور تعلیم غوثیہ کے ایک ارشاد کو نقل کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال نے یہ تصور یہیں سے لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ان کے ارشادات اور شاعرانہ نکات کا بھی اقبال پر اثر پڑا ہے، اقبال کی تمام تعلیمات کی روح اور نظریہ خودی کی اساس اقبال کے الفاظ میں خودی اور خدائی اور فقر میں شہنشاہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

بے ذوق نمود زندگی موت تعمیر خودی میں ہے خدائی
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

حضرت علامہ حسن پانی پتی تعلیم غوثیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''طوبائے شریعت پر صوفیوں کی نغمہ سرائی طائران سدرہ کی زمزمہ سنجی سے بالاتر ہے، خودی میں

خدائی ورعیت میں بادشاہی مزے جو صوفیوں نے لوٹے دوسروں کو خواب میں بھی نصیب نہ ہوئے' یہ کتاب 1919 میں طبع ہوئی ہے، مجھے یہ معلوم نہیں کہ علامہ اقبال نے کب نظریہ خودی کو اپنا کر اس کی اشاعت کی۔ میرے نانا بزرگوار علیہ الرحمہ کے ارشاد کے مطابق اقبال نے حضرت قلندر صاحب سے بھی استفادہ کیا تھا، اس لیے گمان غالب ہے کہ اقبال نے اس حکیم العصر اور مجتہد صوفی کے نظریہ خودشناسی خودی میں خدائی کو بھی زیرنظر رکھا ہے، بلکہ اس سے قبل ان کے مرشد بزرگ کے وصال پر جو مثنوی فارسی میں دورآخر کے نام سے لکھی تھی اور جو تذکرہ غوثیہ میں موجود ہے اس میں بھی یہ نظریہ موجود ہے، بلکہ ان کے طرز بیان آرٹ و اسلوب والفاظ کو بھی اقبال نے اپنالیا ہے۔''163ؕ

مذکورہ بالا مثال میں صاحب مضمون نے اپنے دعوے کی تائید میں جو دلائل دیے ہیں وہ ناکافی اور بے بنیاد ہیں۔ سید گل حسن قادری کی کتاب تعلیم غوثیہ جس پر مذکورہ مضمون کی اساس ہے 1919 میں شائع ہوئی ہے جبکہ اقبال نے خودی کا تصور 'اسرار خودی' میں پیش کیا تھا جو 1915 میں منظرعام پر آئی۔ اس ضمن میں فاضل مضمون نگار کا یہ قیاس بھی قابل غور ہے کہ شاید اقبال نے مولانا اسماعیل میرٹھی کے توسط سے شاہ صاحب تک رسائی حاصل کی ہو جن کے اسماعیل میرٹھی سے خاص مراسم تھے لیکن انہوں نے اقبال اور اسماعیل میرٹھی کے تعلقات کی نشاندہی نہیں کی ہے۔

علامہ اقبال نے متعدد مغربی مفکرین سے استفادہ کیے ہیں۔ کلام اقبال کے مطالعہ سے مغربی مفکرین کے اثرات بخوبی نظر آتے ہیں، البتہ وہ کبھی کسی کے معتقد نہیں رہے۔ اس حوالے سے معارف میں شائع ہونے والا پہلا مقالہ مولانا عبدالسلام رامپوری کا 'اقبال اور برگساں' ہے۔ ابتدائی نوٹ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مقالہ 19 ستمبر 1940 کو صولت پبلک لائبریری رامپور کے یوم تاسیس کے موقع پر سید سلیمان ندوی کی صدارت میں پڑھا گیا۔ یہی مقالہ بعد میں معارف فروری تا اپریل 1941 کو تین قسطوں میں شائع ہوا۔ مذکورہ مضمون اقبال اور برگساں کی فکر کے موازنہ پر مشتمل ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس مضمون کی اشاعت کے بعد مغربی مفکرین اور اقبال کے حوالے متعدد مضامین نہ صرف معارف میں بلکہ مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ اس موضوع پر باضابطہ طور سے کتابیں بھی لکھی گئیں۔ اس تناظر میں ڈاکٹر عشرت انور کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ معارف میں اقبال اور مغربی مفکرین کے حوالے سے ان سلسلہ وار آٹھ مضامین شائع ہوئے۔ جن میں اقبال اور برگساں (مئی، جون، 1951) اقبال اور نطشے (جولائی 1951) اقبال اور جیمس وارڈ (اگست اکتوبر 1951) اقبال اور ولیم جیمس (نومبر 1951) اقبال اور وائٹ ہیڈ (دسمبر 1951 جنوری 1952) اقبال رومی اور ولیم جیمس (فروری 1954) اقبال رومی اور برگساں (مارچ 1954) اقبال رومی اور شنکر (جون اگست ستمبر 1954) قابل ذکر ہیں۔ میری تحقیق کا موضوع چونکہ آزادی سے قبل تک ہے اس لیے یہاں صرف عبدالسلام رامپوری کے مضمون 'اقبال اور برگساں' پر تحقیقی روشنی

ڈالی گئی ہے۔

مذکورہ مضمون میں عبدالسلام رامپوری نے نہایت محققانہ انداز میں اقبال پر برگساں کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ساتھ ہی دونوں کے درمیان موجود فکری مماثلت اور اختلاف کا ذکر کیا ہے۔موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔:

''اقبال کا فکری نظام اصولاً تصوری ہے،لیکن اس میں اسلام کے عملی رخ کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ انہوں نے تصوریت اور اسلامی عملیت کو ترکیب دے کر اپنے فلسفے کی اساس بنائی ہے۔انہوں نے اپنے خیالات کی مابعد الطبعیاتی بنیاد کے لیے ایسی تصوریت کا انتخاب کیا ہے، جو تصوریت اور مادیت کے بین بین ہے۔عموماً مذاہب مادی فلسفے پر قائم نہیں ہوتے۔مذاہب کی بنیاد کے لیے تصوریت ہی کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ نہ خالص مادیت پر قائم ہو سکتا ہے اور نہ خالص تصوریت پر۔غالباً اقبال نے اسی وجہ سے فرانس کے مشہور فلسفی ہنری برگساں کے مابعدالطبعیات کو اپنے کلام کی اساس قرار دیا ہے۔اقبال نے برگسانی مابعدالطبعیات کو جوں کا توں اختیار نہیں کیا،انہوں نے اس کے بہت سے خلاؤں کو بھی پر کیا ہے اور نئی چیزوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔پھر بھی دونوں کے نظام ہائے فکر اصولاً ایک ہی ہیں۔دونوں کی ابتدا ایک ہی نقطے سے ہوئی ہے اور دونوں کا منتہا بھی آخر میں کسی نہ کسی حد تک ایک ہی ہو جاتا ہے۔''[164]

مذکورہ اقتباس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ اقبال نے برگساں سے استفادہ کیا ہے۔انہوں نے برگساں کی فکر کو من وعن اخذ نہیں کیا بلکہ اس میں ترمیم واضافہ بھی کیے ہیں۔ مذکورہ مقالہ تین قسطوں پر مشتمل ہے،اور ہر قسط میں متعدد عناوین قائم کیے گئے ہیں ۔جن میں اقبال کے کلام کی فکری خصوصیت،برگساں کے نزدیک کائنات کی حقیقت،برگساں کے فلسفہ کے اساسی نقطے اور اس کے شہرت کی وجہ،اقبال کے نزدیک کائنات کا تصور،اقبال مابعد الطبعیات اجمالی خصوصیت،اقبال کے نزدیک خدا کا تصور،فلسفہ اقبال کے اساسی نقطے،برگساں کا تخلیقی ارتقا،اقبال اور برگساں کے مشترکہ خیالات،اقبال کے امتیازی عناصر،وحدت الوجود وغیرہ قابل ذکر ہیں۔مقالے کے اہم نکات کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

''برگساں کے نزدیک کائنات میں جس شے کی واقعیت کا ہمیں سب سے زیادہ علم ہے وہ ہماری ذات ہے۔اور ہماری ذات کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر لمحہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیلی ہو رہی ہے۔ایک بظاہر قائم حالت کا ہر حالیہ لمحہ اپنے ماقبل کے لمحے کے شعور اور اس کی یاد پر مشتمل ہوتا ہے۔ برگساں کائنات کو متحرک،سیال اور زندہ فعل سے تعبیر کرتا ہے۔ برگساں مدعی ہے کہ کائنات کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا نہ تکمیل اور نہ کوئی مقصد،اس کی نگاہ میں عالم محض ایک غیر مختتم

تغیر کا نام ہے۔ برگساں وقت کے دو تصور پیش کرتا ہے۔ ایک ریاضیاتی طبیعیاتی تصور جو اس کے نزدیک محض وہمی اور خیالی شے ہے اور دوسرا حقیقی یا واقعی۔
اقبال کی نظر میں کائنات ان معنی میں بامقصد ہے کہ وہ نقصان سے کمال اور کمال سے اکملیت کی طرف ارتقائی حرکت کر رہی ہے اقبال کے خیال میں ذات کی طرح زمانے کے بھی دو رخ ہیں ،ایک باطنی اور دوسرا ظاہری۔ اقبال کے نزدیک مکان ایک وہمی شے ہے۔ اصل ذات بے کثرت، بے وضع اور بے تعلق، وہ نہ مکان ہے اور نہ مکانی۔ اقبال کے خیال میں اشیا اور افعال ،ذات کے باطن میں امکانات اور صلاحیتوں کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ جب تک باطن میں رہتے ہیں تقدیر ہیں اور جب ظاہر ہوں تو خلق ہیں۔ تقدیر ذات کی اہلیت اور رسائی کی آخری حد ہے۔"165

زیر نظر مقالے میں مولانا عبدالسلام خاں رامپوری نے اقبال اور برگساں کے افکار میں درجہ ذیل مماثلتوں کا ذکر کیا ہے:

"کائنات کا مبدا ٹھوس اور جامد شے نہیں ہے۔ اس کی ابتدا محض حرکت ہے۔ یہ حرکت تخلیقی اور ارتقائی ہے۔ انسان اس ارتقائی حرکت کی آخری ترقی یافتہ صورت ہے۔ عقل وفکر کاروباری زندگی سے متعلق ہیں اور حقیقت کے باطن تک رسائی کے لیے وجدان کا سہارا ضروری ہے۔ زمانہ اپنے عام تصور کے اعتبار سے غیر حقیقی ہے۔ کائنات کوئی ساختہ پرداختہ شے نہیں ہے، جس کا خلاق فعلیت سے تعلق ختم ہو گیا ہے یا ہو جائے گا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں ہر لمحہ تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔"166

اقبال اور برگساں کے موازنہ کو مکمل کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام خاں رامپوری لکھتے ہیں:

"برگساں کے ساتھ ساتھ اقبال کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے فلسفیانہ نظام تصوری ہیں۔ ان میں سے موخرالذکر کے نظام میں متوصفانہ عنصر زیادہ شامل ہے۔ اقبال کے نظام میں جو انفرادی نکتے ہیں، ان میں سے اکثر کا اضافہ نظام کی عقلی تکمیل کے لیے نہیں ہے، بلکہ ان کو محض مذہبی تصورات کی اساس بنانے کے لیے زیادہ کیا گیا ہے۔ اقبال اور برگساں کے بنیادی فرق کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے نظام میں ایک اجمالی اعتبار کی زیادتی ہے جو برگساں کے یہاں نہیں ہے۔ برگساں کے تصور کائنات سے ایک بسیط تجریدی اعتبار کا انتزاع کر لیا ہے اور اس میں برگسانی تصور کی اجمالی حیثیت میں تمام خصوصیتیں اور ان کے علاوہ بعض دوسری خصوصیتیں بھی فرض کر لی گئی ہیں۔ اس اجمال اور تفصیل میں قدیم اصطلاح کے مطابق ظہور و کمون کے اعتبار سے فرق ہے۔"167

خواجہ عبد الحمید کا مضمون 'اقبال اور انا کی تخلیق' کے عنوان سے معارف نومبر، دسمبر 1944 میں شائع ہوا ۔مذکورہ مضمون میں اقبال اور ہرقلاطیس کے نظریہ کائنات کے تغیر اور جرمن مفکر لیبنیز کے نظریہ جوہر واحد یا موناڈ کا موازنہ اقبال کے نظریہ فرد انا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مضمون پر گفتگو کا آغاز اقبال کے اس نظریہ سے کیا گیا ہے کہ اقبال کا عقیدہ ہے کہ عالم موجودات کوئی بنی بنائی شے نہیں ہے جو کسی قسم کے تغیر وتبدل کے باقی وقائم رہے۔کائنات کی مثل ایک ایسی رو کی سی ہے جو ہر وقت متحرک ہے،اس کا ہر لمحہ دوسرے لمحوں سے مختلف ہے اور اس کی ایک حالت دوسری حالتوں سے یکساں نہیں ہے۔کائنات بحیثیت کل بھی متحرک ہے اور بحیثیت جز بھی متحرک، وہ بڑھتی ہے،پھلتی ہے اور پھولتی ہے۔مطلب یہ ہے کہ عالم موجودات کوئی بنی بنائی جامد اور اٹل غیر متغیر اور مستقل شے نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ایسا نظام ہے جو اپنی گود میں نت نئے حقائق، کیفیات، واقعات اور تغیرات لیے ہوئے ہے۔

قدیم یونانی مفکر ہرقلاطیس نے پہلے پہل اپنے مشہور قول میں یہ کہا تھا کہ 'ہر شئی بدل رہی ہے صرف یہ قانون نہیں بدلتا' اقبال کا مشہور شعر 'سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں' ہرقلاطیس کے مقولے کا گویا ترجمہ ہے۔بعض معترضین کا خیال ہے کہ اقبال ہرقلاطیس کے خوشہ چیں ہیں۔وہ قدیم یونانی مفکر کا فلسفہ تغیر کی تشریح کر رہے ہیں ،جبکہ ایسا بالکل نہیں ہے۔یہ حقیقت ہے کہ دونوں تغیر کے قائل ہیں ،البتہ دونوں کے نظریوں میں کافی اختلاف ہے۔خواجہ عبد الحمید دونوں کے نظریات میں پائے جانے والے اختلافات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قدیم یونان مین ہرقلاطیس نے یہ نظریہ اول اول پیش کیا تھا کہ کائنات میں سکون محال ہے، ہر شے ہر وقت تغیر پذیر ہے اور ہر طرف حرکت ہی حرکت ہے۔اس نظریے اس نے اپنے مشہور مقولے میں یوں ادا کیا ہے 'ہر شے بدل رہی ہے صرف قانون نہیں بدلتا' اقبال کا مشہور شعر 'سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں' ہرقلاطیس کے اس مقولہ کا گویا ترجمہ ہے۔اس سے بعض لوگوں کو یہ خیال لاحق ہوگا کہ اقبال اس قدیم یونانی حکیم کا فلسفہ تغیر ہی ہمیں سنا رہے ہیں۔یہ خیال غلط ہے۔ہرقلاطیس اور اقبال میں یہ اصولی اور اساسی موافقت ضرور ہے کہ تغیر اصلی اولی اور مثبت حالت ہے اور سکون ضمنی، ثانوی اور سلبی کیفیت ہے۔لیکن اس کے بعد ان دونوں میں تضاد مطلق ہے اور یہ تضاد بھی اصولی اور اساسی ہے۔ہرقلاطیس کے مطابق تغیرات کا لامتناہی اور غیر منقطع سلسلہ جو کائنات کہلاتا ہے، بالکل اسی دھارے کی طرح ہے جو کسی مقصد کے بغیر وادی وکوہ کے نشیب وفراز ،زمین کی نرمی وسختی اور اپنی تندی اور ضخامت سے مجبور ہو کر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔اس کی رفتار اور اس کی ہر کیفیت وحالت چند ایسے میکانکی اصولوں کے مطابق ہے جنہیں کم وبیش غور کے بعد انسان سمجھ سکتا ہے،اور اگر ہم ان تمام کوائف اور شرائط کو صحیح صحیح سمجھ لیں جو اس دھارے کی روانی کے لیے علت کا کام کرتی ہیں،تو ہم یہ کہہ سکیں گے کہ فلاں وقت یہ دھارا فلاں

علاقہ مین ہوگا اور اس حالت میں بہتا نظر آئے گا... اقبال کا عقیدہ ہے (اور قرآن کے مطالعہ نے ان کے اس عقیدہ کو پختہ تر اور شکوک سے بالاتر کر دیا تھا) کہ کائناتی تغیر اندھا دھند اور بے مقصد نہیں ہے۔ مقاصد اس کے اندر جاری وساری ہیں اور یہ مقاصد ہیں مختلف ذی حیات اور ذی فہم ہستیوں کے مختلف اشخاص کے اور مختلف اناوں کے جو غیر شعوری اور شعوری دونوں طرح سے ان کے حصول کے لیے مصروف عمل و پیکار ہیں۔ تغیرات کا وہ غیر منقطع سلسلہ جو کائنات کہلاتا ہے ،اپنی ہست و بود کے لیے مرہون منت ہے۔ ان بے شمار چھوٹے بڑے اناوں کا جو ایک انائے کبیر وعظیم کے تخلیق کن سے حیات پاتے ہیں اور پھر ادنی پیانے پر اسی انائے کبیر کے تخلیقی کام میں شریک ہوتے ہیں۔ جس طرح انائے کبیر کا تخلیقی کن، ہر لحہ مصروف عمل ہے اسی طرح مخلوق انا اپنے اپنے کم وبیش محدود مقاصد کے حسول کے لیے مصروف پیکار رہتے ہیں۔''168

ہر قلاطیس اور اقبال کے نظریہ کے بعد انہوں نے جرمن مفکر لیبنیز (Leibnitz) کے نظریہ جوہر واحد یا موناڈ اور اقبال کے نظریہ فرد انا پر روشنی ڈالی ہے۔ لیبنیز کے مطابق کائنات بے شمار موناڈوں کا مجموعہ ہے۔ ہر موناڈ اپنی اپنی جگہ مستقل حیثیت کا حامل ہے اور دیگر موناڈوں سے تعامل نہیں کرتا۔ البتہ سارے موناڈ کبیر موناڈ کے تابع ہیں۔ اقبال کا فرد انا نظام عالم میں دوسرے اناوں سے تعامل کے ذریعہ اپنے وجود کا اظہار کرتا ہے۔ صاحب مضمون اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال کا نظریہ فرد انا جرمن مفکر لائبنٹز کے نظریہ جوہر واحد (موناڈ) سے ملتا جلتا ہے، لیکن اس مماثلت کے ساتھ ساتھ ان دونوں نظریوں میں اہم فرق بھی ہے۔ لائبنٹز کے مطابق عالم موجودات لاتعداد موناڈوں سے بنا ہے۔ ہر موناڈ ایک جوہر واحد ہے، جو بسیط ہے، نا قابل تحلیل ہے، وسعت سے مبرا ہے، اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے، کائنات کا ایک اساسی واحد ہے، اور قوت حرکت کا ایسا مرکز ہے جو انا سے مشابہ ہے، لیکن ان بے شمار موناڈی واحدوں میں کسی قسم کا تعامل نہیں ہے۔ البتہ سب تابع ہیں اس کبیر موناڈ کے جسے خدا کہتے ہیں۔ خدا نے نظام کائنات چلاتے وقت ہر ایک موناڈ کو کچھ ایسے حسن و ترتیب سے چھوڑا کہ سب آہنگ ہو کر اس کے ازلی وابدی مقصد کے مطابق اپنا کام کر رہے ہیں۔ اب اقبال کا فرد انا لائبنٹز کے موناڈ سے چند نہایت اہم باتوں میں مختلف ہے۔ جہاں موناڈ محض حال مست، اپنی ذات میں مستغرق، قلعہ بند، اور دوسرے موناڈوں سے اس قدر نا آشنا ہے کی کسی قسم کے لین دین کی گنجائش نہیں ہے۔ اقبال کا فرد انا اور دوسرے ایسے افراد ہر وقت مصروف تعامل ہیں... اس کے برعکس ہر موناڈ ایک بند اور محدود نظام ہے، جس کی حیثیت کائنات میں ایسی ہوگی جیسی ان مختلف ذروں کی ہوتی ہے۔ اقبال کا فرد انا اپنے تعامل میں کسی حد تک اپنے سے کم رتبہ افراد کو اپنے اندر ضرب کر سکتا ہے یہ مختلف انا ایک

> دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ایک دوسرے کو ابھارتے ہیں، گراتے ہیں، فیض بخشتے ہیں، اور فیضیاب ہوتے ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ سب انائے کبیر سے جو ان کی حیات وہستی کا منبع ہے فیضان حاصل کرتے ہیں۔'' 169؎

مذکورہ نظریوں کی وضاحت کرنے کے بعد انہوں نے اقبال کی بشری انا پر روشنی ڈالی ہے۔اس کو مغربی مفکرین بالخصوص اسلامی مفکرین نے بالکل نظرانداز کر دیا تھا۔اقبال نے اپنے کلام میں جس جامعیت کے ساتھ اسے پیش کیا ہے وہ اسلامی دنیا پر ایک احسان عظیم ہے۔

فاضل مقالہ نگار بشری انا کی اہم خصوصیت یعنی وصف تخلیق کا ذکر کرتے ہیں۔یہ صفت تخلیق اس انا کو انائے کبیر کے سوا دیگر سے ممتاز اور ممیّز کرتی ہے۔بشری انا اور اس عالم کے درمیان انا کبیر یا منبع روحانیت کے سبب ایک اشتراک موجود ہے۔لیکن اس اشتراک کے باوجود بشری انا اس کائنات میں خود کو اجنبی اور بے آسرا سوگوار محسوس کرتا ہے۔وجہ یہ ہے کہ اس عالم موجودات میں بشری انا کا درجہ ان کم رتبہ، خوابیدہ اور از خود نا آشنا، خاموش اور بے زبان اور مبہم اناوں سے بلند ہے جو مل ملا کر مادی دنیا کا نام پاتے ہیں۔170؎ انائے بشری کے مقاصد سے بحث کرتے ہوئے فاضل مصنف قرآن کریم کے حوالے سے نیابت الٰہی کو اس کا اہم ترین مقصد قرار دیتے ہیں۔اس کے بعد خواجہ عبدالحمید نے اقبال کے مردمومن کی صفات بیان کرتے ہوئے اس کی صفت تخلیق پر خاص زور دیا ہے۔

عبدلحمید کے مذکورہ مضمون کی اشاعت کے بعد معارف جولائی 1945 کو اسد ملتانی کا مضمون اقبال انا اور تخلیق شائع ہوا۔مضمون نگار نے تمہیدی کلمات میں جہاں اقبال کے فکر وفلسفہ پر لکھے جانے سے خوشی کا اظہار کیا ہے وہیں اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ اقبال پر بڑی تعداد میں سطحی قسم کی تحریریں بھی سامنے آرہی ہیں۔کلام اقبال کی غلط تفہیم وتشریح پیش کی جارہی ہے۔خواجہ عبدالحمید کے مذکورہ مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ مقالہ قابل تعریف ہے البتہ بعض پہلوں میں تشنگی کی شکایت بھی کی ہے۔تمہید کے بعد مضمون نگار نے اقبال کی مشہور نظم زبور عجم کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ناقدین وشارحین نے اس کی تفہیم وتشریح میں غلطی کی ہے۔اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''یہاں تک تو اقبال نے اس حقیقت کی ترجمانی کی ہے کہ یہ دونوں جہاں ہمارے ادراک وتخیل کا نتیجہ ہیں۔اب اس تمہید کے بعد خالق کون ومکاں کو مخاطب کر کے سوال کیا ہے کہ تیرا نشان کہاں ہے۔جب یہ دونوں جہاں ہمارے اثار ہیں تو تیرا جہاں کون سا ہے۔سوال نہایت نازک ہے کیوں کہ واقعیجو کائنات ہمارے ہی خیال کا بت خانہ ہو اس کے مطالعہ سے تو ہمیں خود اپنی ذات کا پتہ چلے گا۔ایسی محدود کائنات میں خدا کا نشان کیوں کر مل سکتا ہے۔لیکن شاعر نے باکمال حکمت اسی سوال میں 'اے من از تو پائندہ' کا ٹکڑا رکھ کر انسان اور خدا کے تعلق کی طرف بلیغ اشارہ کر دیا

ہے۔''171ء

مضمون میں اسد ملتانی نے ڈاکٹر یوسف حسین کی کتاب روح اقبال کا بھی تذکرہ کیا ہے۔انہوں نے روح اقبال کے حوالے سے لکھا ہے کہ یوسف حسین نے اقبال کی نظم زبور عجم کی تشریح میں غلطی کی ہے۔خواجہ عبدالحمید نے مذکورہ مضمون میں انا کی جو توضیح کی ہے اس پر بھی سوال قائم کیے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک میں نے غور کیا ہے یہ دونوں شرحیں حقیقت سے بہت دور ہیں اور غلط فہمی کا باعث ،ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پوری نظم بالخصوص آخری شعر کو مدنظر نہیں رکھا گیا اور دوسرے یہ کہ اشاعر کو کائنات کی تخلیق سے متعلق سمجھا گیا ہے۔حالانکہ یہ محض ادارک ومشاہدہ سے تعلق رکھتے ہیں۔پوری نظم کو سامنے رکھا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظم نہ شاعرانہ تخیل کا نتیجہ ہے اور نہ خدائی نقطہ نظر کی ترجمانی بلکہ انسان اور محض انسان کے مطالعہ کائنات پر مبنی ہے۔یہ دعوے نہ مجذوب کی بڑ ہے، نہ شاعر کا مبالغہ، بلکہ امر واقعہ ہے اور عین حقیقت ،ان اشعار میں من وما سے کوئی فوق البشر یا غیر معمولی انا نہیں بلکہ انسان اور مطلق انسان مراد ہے۔جو حواس خامسہ کے ذریعہ اس مادی دنیا کو محسوس کرتا ،اور ذہنی طور پر اس دنیا کے مقابلے میں ایک عقبی کا تصور کر سکتا ہے۔اس نظم کے پہلے تین شعر میں جہان یعنی اس مادی دنیا کے متعلق ہیں۔پانچواں اور چھٹا شعر ان جہان یعنی عقبی کے بارے میں ہے اور چوتھا شعر دونوں جہاں پر حاوی ہے۔آخری شعر کا استفہام پوری نظم کی جان ہے۔اور ایسا سوال جس کے اندر جواب بھی پوشیدہ ہے۔''172ء

اقبال کی نظم زبور عجم کی تشریح وتفہیم کے علاوہ متعدد ایسے اشعار جن کی تفہیم میں غلطی ہوئی ہے اسد ملتانی نے اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ اقبال کے فلسفہ کائنات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔یہ مضمون اس حوالے سے کافی اہم ہے کہ اسد ملتانی نے اقبال تنقید پر اس وقت لکھا جب اقبال کے فکر وفلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

معارف جون 1945 میں ڈاکٹر میر ولی الدین کا مضمون 'زمانہ حاضر کا انسان اور اقبال' شائع ہوا۔صاحب مضمون اس حوالے سے اقبال کے خیالات کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال کے نزدیک زمانہ حاضر کا انسان قلب اور نظر کے امراض فاسدہ میں مبتلا ہے اور یہ یوں بے شمار ہیں لیکن ان میں زیادہ مہلک یہ ہیں لادینی اور تشکیک، جبر یا اپنے اختیار وآزادی کے فقدان کا احساس ،لذت پرستی وغیرہ۔ان مضامین کے علاہ سیکڑوں تحقیقی مضامین معارف کے صفحات میں موجود ہے۔البتہ یہاں صرف 1947 تک کے اہم تحقیقی مقالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مذکورہ مقالات کے جس قدر اثرات اقبال شناسی میں مرتب ہوئے ہیں وہ شاید ہی اردو کے کسی اور رسالے کے حصے میں آئے ہوں۔

ان مقالات کے علاوہ اقبال کی کتابوں پر بھی دلچسپ اور معلوماتی تبصرے شائع ہوئے۔ اقبال شناسی کی ابتدا سے اب تک جو اہم کتابیں اقبال کے سوانح اور ان کے فکر و فن پر لکھی گئی، یا پھر جن رسالوں کے اقبال نمبر شائع ہوئے ماہنامہ معارف کے مبصرین نے ان کے تعارف اور تجزیہ کے ذریعہ بھی اقبال شناسی میں اہم کردار ادا کیا۔ اشاریہ معارف کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بمشکل ہی کوئی کتاب ہوگی جس پر معارف میں تبصرہ نہ شائع ہوا ہو۔ جن کتابوں پر تبصرے شائع ہوئے ان کی تعداد تقریبا سو کے قریب ہے۔ اسرار خودی اور رموز بے خودی علامہ اقبال کی اہم مثنویاں ہیں۔ معارف میں ان دونوں مثنوں پر تبصرے شائع ہوئے۔ سید سلیمان ندوی ان دونوں مثنویوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رموز بے خودی میرے خیال میں زبان کے لحاظ سے اسرار خودی سے بہتر ہے اور اصل معنی کے لحاظ سے دونوں میں یہ فرق ہے کہ اس میں مظاہر سیاست بیشتر اور اس میں مذاہب کے عناصر زیادہ ہیں لیکن منزل مقصود ایک ہے۔''173

مثنوی کی زبان و بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''ایک بالغ نظر اس مثنوی (رموز بے خودی) میں الفاظ کی صحت یا صحیح فارسی معنی میں ان کے استعمال میں شک اور بعض فارسی محاوروں کی گرفت کرسکتا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ اقبال کے شاعرانہ خیالات میں اتنی بہتر روانی ہے کہ خس و خاشاک اس کی خوبی و لطافت میں مزاحم نہیں ہو سکتے اس لیے اس تقریظ میں ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ نکتہ چینی اور حرف گیری بہت ہو چکی ، اب کچھ سوچنا سمجھنا بھی چاہیے اور یہی اس مثنوی کا اہم المطالب ہے۔''174

مذکورہ تبصرے سے نہ صرف یہ کہ مثنوی کی اہمیت بلکہ معارف کی تبصرہ نگاری کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ معارف کے تبصروں کی ایک خاص بات یہ بھی رہی ہے اس کے لکھنے والے ہمیشہ سے بلند پایہ عالم، ادیب اور نقاد رہے ہیں۔ معارف کی فائلوں میں اقبالیات کا ایک بڑا خزانہ ہے۔ بعض مضامین ان کی زندگی ہی میں شائع ہوئے یا پھر اقبال شناسی کے ابتدائی دنوں میں، ان مضامین میں جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے آج بھی ان کی اہمیت مسلم ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے دوبارہ پڑھا جائے اور اس پر تحقیق کی جائے۔ معارف میں اقبال تنقید اور تحقیق کا اس قدر سرمایہ ہے کہ معارف کی اقبال شناسی پر پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

لسانيات

معارف نے جب علم وادب کی دنیا آباد کی تو بہت سے گوشوں پر مضامین ومقالات شائع کیے۔ دکنیات، اقبالیات، غالبیات کے علاوہ معارف کا ایک بڑا حصہ اردو زبان اور لسانیات پر مشتمل ہے۔ معارف میں شائع ہونے والے لسانی مضامین کی تعداد ستر کے قریب ہے۔ مضامین کے علاوہ شذرات میں بھی زبان و بیان کا ایک بڑا سرمایہ ہے۔ معارف کی ایک خاص بات یہ رہی ہے کہ اس نے ابتدائی جلدوں سے ہی لسانی موضوعات کو جگہ دی۔ قابل غور بات یہ ہے کہ معارف نے اس وقت ان موضوعات کو فوقیت دی جب اردو کے دیگر رسائل لسانی مضامین سے خالی ہوتے تھے۔ لسانی موضوعات کی طرف قارئین کو سب سے پہلے معارف ہی نے مبذول کرایا۔

معارف جولائی 1932 میں عبدالسلام ندوی کا مضمون 'ایک قدیم دکھنی شعر' شائع ہوا جس سے نہ صرف یہ کہ اردو زبان میں اسلوبیاتی تنقید کی ابتدا ہوئی بلکہ عالمی ادب میں اسلوبیاتی مطالعہ کی ابتدائی تحریر کہی جا سکتی ہے۔ اردو میں اسلوبیاتی تنقید کے باضابطہ طور بانی مسعود حسین خان ہیں، البتہ معارف کے مذکورہ مضمون کو اسلوبیاتی تنقید کا ابتدائی نقوش کہا جا سکتا ہے۔

مولانا عبد السلام ندوی (1883-1956) کا ایک مختصر مضمون 'ایک قدیم دکھنی شعر' معارف جولائی 1932 میں شائع ہوا جس میں انہوں نے شعرالہند میں شامل ایک قدیم دکھنی شعر پر بحث کی ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

کن دھر کہون، کان جاون مین، مجھ دل پہ بہل بچھراٹ ہے

ایک بات کئے ہون گے سجن یہان جیو بارہ باٹ ہے 175؎

مذکورہ شعر کو تذکرہ نگاروں نے مختلف شعرا کی طرف منسوب کیا ہے اور بیشتر تذکرہ نگاروں نے الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ شعر کو نقل کیا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے یہ شعر کس تذکرہ سے نقل کیا ہے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ تذکرہ نگاروں نے اس شعر الگ الگ طرح سے نقل کیا ہے۔ تذکرہ گلشن ہند میں یہ شعر ابوالحسن تانا شاہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اور شعر کو اس طرح نقل کیا گیا ہے۔

کس در کہوں جاؤں کہاں، مجھ دل پہ بھل بچھراٹ ہے

اک بات کے ہون گے سخن، یہاں جی ہی بارہ باٹ ہے۔ 176؎

میر حسن مذکورہ شعر اس طرح نقل کیا ہے:

کس دہر کہون، کان جاون مین مجھ دلپہ پھل پٹھڑات ہے

ایک بات کے ہونگے سجن، یہان جیو بارہ بات ہے 177؎

عبدالسلام ندوی نے اس شعر کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شعرالہند میں مذکور شعر بالکل غلط ہے۔ البتہ قائم چاندپوری نے 'تذکرہ مخزن نکات' میں جس طرح اس شعر کو لکھا ہے وہ بالکل درست ہے۔ انہوں نے شعر کو اس

طرح نقل کیا ہے:

کسدر رکھون، کان کا وَن مین، مجھ دل پہ کھٹن بچھراٹ ہے

یک باٹ کے ہون گے سجن یہان جیو بارہ باٹ ہے

قائم چاند پوری نے مذکرہ شعر کو عبداللہ قطب شاہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ شعر کسی کا ہو اور اسے خواہ جس طرح سے لکھا اور نقل کیا گیا ہو دراصل تمام تذکرہ نگاروں کا مقصد شعر میں مستعمل ابتدائی زبان اور رنگ تغزل کو دکھانا مقصود تھا۔ مولانا عبدالسلام ندوی کے اس مضمون کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے جس طرح اس شعر کے انداز و اسلوب پر بحث کی ہے اس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مضمون کے ذریعے پہلی بار اسلوبیاتی تنقید کو موضوع بنایا گیا۔ اس سے قبل اردو ادب میں اسلوبیاتی انداز میں اس طرح کی تنقید کا تصور نہیں تھا۔ مولانا کا یہ مضمون ابتدائی زبان واسلوب کی تفہیم اور قدیم شعری تغزل کے حوالے سے کافی اہم ہے۔

معارف مئی 1939 میں سید سلیمان ندوی کا ایک تحقیقی مقالہ 'بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے اردو زبان میں رائج بہت سے قدیم الفاظ کی تحقیق، ان کی اصل اور وجہ تسمیہ بیان کی ہے۔ انھوں نے الفاظ کی مفصل تاریخ کے ساتھ ساتھ لفظ کی اصل زبان اور کس طرح ہندوستان پہنچا اور یہاں کن معنوں میں مستعمل ہوا، ان تمام باتوں کو نہایت علمی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس ذیل میں انھوں نے ناشتہ نہاری ،سلفہ ،قاب ،رکابی، جہاز ،سرخی، نستعلیق، تماشا ،احدی، قورمہ، شوربہ، کباب، راز، مستری، خراد اور ساہول وغیرہ الفاظ کی تحقیق کی ہے اور ان الفاظ کے منتقلی کے جو اسباب بتائے ہیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ سید سلیمان ندوی لفظ خراد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بڑھیوں کی بول چال میں ایک لفظ 'خراد' اور 'خرادنا' ہے، میز کرسی یا پلنگ وغیرہ کے پایوں کو چھیل کر کہیں موٹا، کہیں پتلا کہیں گاؤدم وغیرہ مختلف شکلیں دیتے ہیں، یہ خالص عربی لفظ 'خرط' ہے، عربی میں اس کے معنی اس طرح چھیلنے کے ہیں کہ اس کی اوپری پرت اتر جائے، اس سے 'خراط' بنا، یعنی وہ آلہ جس سے لکڑی کو اس طرح چھیلا جائے۔ وہ خرّاط ہمارے یہاں خراد ہوا اور اس سے خراد پر چڑھنا محاورہ اور خرادنا مصدر بنا، یہ لفظ اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ لکڑی کی یہ صنعت کاری مسلمانوں کے ذریعے ہندوستان میں آئی اور پھیلی۔'' 178؎

ایک اور عام لفظ 'نہاری' جسے ہم روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ عجیب بات ہے کہ ناشتہ کے لئے اکثر زبانوں میں بھوک توڑنے کی اصلاح بن گئی ہے، میں دو زبانیں جانتا ہوں ایک پورب کی ایک پچھم کی یعنی عربی اور انگریزی دونوں میں یہی بات ہے

اس سے سمجھتا ہوں کہ اور زبانوں میں بھی کچھ ایسا ہی حال ہوگا عربی میں اس کو فطور کہتے ہیں۔ اسی سے مسلمانوں کا افطار نکلا ہے، اور جس سے افطار کریں اس کو افطاری کہتے ہیں۔ فطور کے معنی توڑنے کے ہیں یعنی روزہ کی بھوک توڑنا، ہمارا ناشتہ بھی اسی قسم کا لفظ ہے۔ فارسی میں اس کے معنی اس بھوک کے ہیں جس نے صبح سے کچھ نہ کھایا ہو۔ موید الفضلا و برہان قاطع اب دیکھئے کہ یہ نام تو اس آدمی کا تھا جس کے منہ میں صبح سے کچھ نہ پڑا ہو۔ اور اب ہم اس چیز کو کہتے ہیں جو صبح سویرے ایسے آدمی کو کھلا دی جائے یعنی شخص کی بجائے چیز کا نام ہو گیا۔ اسی معنی میں ایک اور لفظ نہار آپ بولتے ہیں نہار منہ یہ بھی فارسی سے ہے، مگر دیکھئے کہ فارسی ہندوستانی سے ایسا مل گیا ہے کہ گویا ہندوستانی ہی ہے۔ اس کی اصلیت ا'' نا آبار'' ہے نا نفی کے لئے ہے، اور آبار کے معنی غذا کے ہیں نابار یعنی نہیں کھایا ہوا (برہان قاطع) اب اس سے ناہاری یعنی نہاری تیار ہوئی جو صبح کو نہار منہ کھائی جائے۔ اور لکھنؤ اور دلی میں خاص چیز ہے جو بازاروں میں پکی پکائی بہت چٹپٹی ملتی ہے۔''179

مذکورہ اقتباس میں نہاری کی بڑی دلچسپ تشریح کی گئی ہے۔ عام طور سے ہم نہار صبح کے ناشتے یا پھر دلی اور لکھنؤ میں ایک طرح کے سالن کو کہا جاتا ہے جو زیادہ تر صبح کے ناشتے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان الفاظ کے علاوہ متعدد ایسے الفاظ ہیں جن کی نہ صرف یہ تشریح کی گئی ہے بلکہ مختلف زبانوں میں اس کے لیے متبادل الفاظ اور یہ زمانے کے ساتھ کس طرح بدلتا رہا ہے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ناشتہ نہاری، سلفہ، قاب، رکابی، جہاز، سرخی، نستعلیق، تماشا، احدی، قورمہ، شوربہ، کباب، راز، مستری، خرادا اور ساہول وغیرہ متعدد الفاظ ہیں جن کی تشریح بیان کی گئی۔ یہ مضمون نہ صرف ہے کہ منفرد ہے بلکہ لسانی تاریخ کے حوالے سے بھی کافی اہم ہے۔

معارف کے پہلے شمارہ جولائی 1916 میں 'رسم الخط کی اجمالی تاریخ' کے عنوان سے معین الدین ندوی کا مضمون شائع ہوا۔ مذکورہ مضمومیں متعدد عناوین قائم کیے گئے ہیں۔ جس کے ذریعہ انہوں نے رسم الخط کی تاریخ بیان کی ہے۔ پہلا عنوان رسم الخط کی ایجاد ہے۔ جس میں صاحب مضمون نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ قدیم زمانے میں انسانوں نے اپنی یادوں اور تجربات کو یاد رکھنے کے لیے کچھ اصطلاحیں وضع کی تھیں جسے وہ پتھروں پر کندہ کرتے تھے۔ اسی کو ایجاد خط کا سنگ اساس سمجھنا چاہیے۔ دوسرا عنوان خط صوری ہے۔ اس طریقہ خط میں یہ ہوتا تھا کہ انسان کسی واقعہ کی اس طرح تصویر بناتا تھا کہ جس سے مصور کی مراد آسانی سے سمجھی جاسکے۔

انسان نے جب ذرا ترقی کی تو خط رموز کے طریقہ کو اپنایا جانے لگا۔ یہ بھی ایک مصوری طریقہ تھا البتہ اس میں صرف پہلے جز کی شکل بنائی جاتی تھی اور یہ افہام وتفہیم کے لیے کافی آسان ہوتا تھا۔ مولانا معین الدین ندوی نے صوری طریقہ تحریر کی متعدد قسمیں بیان کی ہیں البتہ اس میں تین بہت اہم ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''مصری ہیروگلیفک خط کی تین قسمیں ہیں پہلی اور سب سے قدیم قسم محض صوری ہے۔یعنی کتابت کا طریقہ صرف تصویر کشی پر منحصر تھا اوراس کا استعمال زیادہ تر سنگی کتبوں اور عمارتوں پر ہوتا تھا۔اس کا نام ہیروگلفی (ہیروگلیف) ہے،دوسری قسم وہ تھی جو خطوں اور دستاویزں کے لئے مخصوص تھی۔ یہ ہیروگلفی سے مختصراور ہیراتی (ہیروٹک) کے نام سے موسوم ہے۔اس میں مجازی تصویریوں اور الفاظ کے مفروضہ علامت سے کام لیا جاتا تھا۔مجازی تصاویر کی اس موقعے میں صر پیش آتی تھی جبکہ مصور یا کاتب کے سامنیاس خیال کے لیے خارج میں میں کوئی مادی اور موجود شکل موجود نہیں ہوتی تھی مثلاً شر یا برائی کی کوئی مادی صورت خارج نہیں ہوتی اس لیےاس کے اظہار کا یہ طریقہ تھا کہ ایک شخص کی تصویر بنا دی جاتی تھی جو خودکشی کرر ہا ہو کیونکہ برائی کی قبیح ترین صورت خودکشی ہے،الفاظ کے مفروضہ علامت سے یہ مقصد ہے کہ ہر لفظ کے لیے ایک مخصوص علامت وضع کر دی گئی تھی۔اور جب اس لفظ کو لکھنا ہوتا تھا تو وہ علامت بنا دی جاتی تھی۔تیسری قسم کا نام مصری عامی یا ڈیموٹک ہے یہ ہیراٹک (ہیروٹک) سے سہل اور مختصر تھی ، بلکہ اس کو خطہ ہجائی تک پہنچنے کے لیے آخری کڑی سمجھنا چاہیے۔بابروس کے صحیفوں اور مصری آثار میں اب تک اس کے بہت سے نمونے موجود ہیں۔''180؎

قدیم مصوری طریقہ کارکئی صدیوں تک چلتا رہا۔انسان اپنے احساسات وتجربات اور تمام تر ضروری امور کو اسی طرح پورا کرتا تھا۔خط مسماری (کینیو فارم) بھی ابتدا میں صوری تھا البتہ اکادی قوم نے اس میں جدید تر اصلاحیں کی اور پھر یہ طریقہ تحریر ایران پہنچا تو اسکو اور مختصر کیا گیا۔مصری ہیروکلیفک کو جب فینیقی قوم نے سیکھا تو رسم الخط کو ہجائی طریقہ تک پہنچا دیا،جس سے یہ ہوا کہ ہر چیز کو ایک مفرد آواز سے سمجھا جانے لگا اور پھر ان آوازوں کو علامت کی شکل دے دی گئی۔اور پھر مختلف قوموں کے اختلاط کے بعد یہ طریقہ حروف تہجی تک پہنچ گیا۔181؎

حروف تہجی کی ایجاد کا مسئلہ بہت مختلف فیہ ہے۔اس حوالے سے متعدد آرا پیش کی گئیں ہیں۔یہ خیال پیش کیا جاتا ہے کہ حضرت آدمؑ نے سکھائے ،تو بعض نے حضرت ادریسؑ کی طرف منسوب کیا ہے۔جدید محققین میں بعض اہل شام اور مصر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔مولانا معین الدین ندوی ان خیالات کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لیکن ہمارا خیال ہے کہ حروف تہجی یا خط ہجائی کی ایجاد وتکوین کو کسی ایک شخص یا قوم کی طرف منسوب کرنا شدید ترین غلطی ہے بلکہ جس طرح اقوام کے باہمی اختلاط وارتباط سے زبان بنتی بگڑتی ہے اسی برح رسم خط بھی متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ علمائے آثار کا بیان ہے کہ فیسی (فینیشین) رسم خط اور مصری ہیروٹیک اور ڈیموٹیک خطوط میں پندرہ حروف ایک ہی طرح کے ہیں۔بقیہ حروف یکساں تو نہیں ہیں،لیکن ایک حد تک مشابہ ضرور ہیں البتہ صرف ایک حرف ایسا ہے جو بالکل جداگانہ ہے،اس سے صاف معلوم ہوتا ہے ک فینقی قوم نے مصریوں سے اختلاط

وارتباط پیدا کر کے ہیروٹیک اور ڈیموٹیک خطوط کی خوشہ چینی کی اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے کچھ تغیر وتبدل کیا پھر رفتہ رفتہ امتداد زمانہ اور گرد و پیش کے مؤثرات نے اس کو خط ہجائی کی صورت میں بدل دیا۔''182؎

طریقہ ہجائی رائج ہونے کے بعد بہت جلد مقبول ہوگئی اور پھر یہ طریقہ یونان، یورپ، عرب اور دیگر کئی ممالک میں پھیل گیا۔اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی رہا ہے کہ فینقی قوم بڑی متمدن تھی،اس کی تجارت کا سلسلہ دنیا کے ایک بڑے حصہ میں پھیلا ہوا تھا۔وہ تجارت کی غرض سے پوری دنیا میں جاتے تھے، وہ جہاں بھی جاتے، جس علاقہ میں جاتے تجارت کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کو بھی رائج کرتے تھے۔معین الدین ندوی بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اختلاف السنہ کا اثر رسم خط پر: تمام دنیا کے رسوم خط اور حروف تہجی کا اختلاف درحقیقت اختلاف السنہ پر مبنی ہے کیوں کہ غور وفکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ تمام زبانوں کے حروف تقریباً متحد الاصل ہیں مثلاً عربی میں ہے ''الف'' ''باء'' ''جیم'' ''دال'' عبرانی اور سامری میں ہے۔'' الف'' ''بیتھ'' ''جیمل'' ''دالتھ'' حبشی میں ہے۔''الف'' ''بیت'' ''جمل'' ''دن'' یونانی میں ہے۔''الفا'' ''بیٹا'' ''گما'' ''دلٹا'' ہندی زبانوں کے حروف ہجا بھی مع شئی زائد اس سے ملتے جلتے ہیں غرض اسی طرح تمام زبانوں میں حروف ترتیب الماخذ ہیں، اس دعوے کی دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ ان زبانوں میں حروف ترتیب بھی تقریباً یکساں ہے مگر رفتہ رفتہ جس طرح باہم زبانوں میں اختلاف پیدا ہوتا گیا اسی طرح طریق کتابت اور رسوم خط میں بھی تغیر ہوتا گیا، یہاں تک کہ اب باہم کوئی مناسبت بھی نظر نہیں آتی۔''183؎

مولانا معین الدین ندوی نے مذکورہ مضمون میں رسم الخط کی ابتدا اور اس کی ترقی کا عہد بہ عہد جائزہ لیا ہے۔ معارف کے پہلے ہی شمارے میں اس طرح کا مضمون شائع ہونا، اس کی معنویت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ مذکورہ مضمون اس لیے بھی کافی اہم ہے کہ اس میں لسانی تاریخی کے اس پہلو کو بیان کیا گیا ہے جس سے بہت کم لوگ ہی واقف تھے۔

سید سلیمان ندوی کا مضمون 'ہوم رول سے ہوم لنگویج' (ملکی زبان) شائع ہوا۔ مذکورہ مضمون میں ملکی زبان کی اہمیت اور ملکی زبان میں تعلیم دینے کی کے فوائد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مضمون کی ابتدا میں سید سلیمان ندوی نے دسمبر 1916 کے اپنے ایک مضمون کا اقتباس پیش کیا ہے۔نقل کیا جاتا ہے تاکہ موضوع کی اہمیت کا اندازا کیا جاسکے:

''مگر ہندوستان سے انگریزی زبان چھین لی جائے اور یہ فرض کرلیا جائے کہ ملک کے تمام صوبوں اور گوشوں سے غائبان ملک اور نمائندگان اقوام کی ایک عظیم الشان مجلس شوریٰ قائم ہے۔ ہمارا قومی اسپیکر اب ہمارے متحدہ پلیٹ فارم پر آتا ہے، سوال یہ ہے کہ ہم کو کس زبان میں مخاطب کرگا، وہ جوش اور جذبات سے لبریز ہے، لیکن کیا پنجابی زبان اس کے خیالات کی ترجمانی کرگی؟ کیا

بنگالی اور مرہٹی زبان اس مختلف اللسان مجمع کی گرہ کشائی کر سکے گی۔''184ؔ

مذکورہ اقتباس میں سید سلیمان ندوی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ قوم کو ایک زبان کا انتخاب کرلیا جائے جو ہماری ذریعہ تعلیم بھی ہو۔ دراصل واقعہ یوں ہے کہ جولائی 1917 کے اخبارات میں مسٹر گاندھی کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے ہندی کو ہندستان کی عمومی زبان کا درجہ دینے کی تحریک دی۔ اور اسی مسئلہ کو لے کر دسمبر 1916 کو لکھنؤ میں ایک پروگرام منعقد کیا گیا تھا۔ جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ہندستان کی ایک زبان اور ایک خط ہو اور وہ زبان ہندستانی ہو۔ اس اجلاس میں الہ آباد کے ایک مشہور لیڈر نے انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

''آپ لوگ ہوم رول چاہتے ہیں اور مجھے کہتے ہیں کہ انگریزی میں بولو کیا ہوم رول ملنے پر کوئی انگریزی میں بولا کرے گا۔ اگر ہوم رول کے بعد بھی آپ انگریزی میں بولا کریں گے تو ہوم رول کچھ فائدے کی چیز نہ ہوگی۔ اگر آپ کے پاس ایسی زبان نہیں جس میں اپنی ضرورت کی باتوں کو کہہ سکیں تو ہوم رول کی آپ کو کچھ ضرورت نہیں ہے۔''185ؔ

مذکورہ اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ اس اجلاس کا مقصد نہ صرف یہ کہ ہندستان میں ہندی زبان کو عمومی زبان بنانا تھا بلکہ اردو کے وجود کو ختم کرنا تھا۔ اسی وجہ سے سید صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ ملکی زبان میں تعلیم دی جائے۔ انہوں نے اس ضمن میں ملکی زبان میں تعلیم دینے کے فوائد کے تعلق سے سائنٹفک سوسائٹی کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''اصل یہ ہے کہ ہندوستان جس مرض کا بیمار ہے اس کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ ملکہ زبان میں تعلیم ہے، جب تک اس نسخہ کی آزمائش نہ ہوگی ہماری مشکلات کا خاتمہ نہ ہوگا، ہماری تعلیمی ترقی کا سب سے صحیح راستہ وہی تھا جو سائنٹیفک سوسائٹی کے مشعل میں سرسید کو ۱۸۶۳ء میں نظر آیا تھا اور جس پر ایک مدت تک وہ قدم زن بھی رہے، اس سوسائٹی کا مقصد یہ تھا کہ ملکی زبان کے ذریعہ سے قوم میں تعلیم کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ اس سوسائٹی کے ذریعہ سے چالیس کتابیں اردو زبان میں لکھی اور چھاپی گئیں۔ ۳۰ ہزار کی لاگت سے علی گڑھ میں اس کے لیے عمارت بنی، اور چند ہی دنوں میں اس نے ملک اور حکومت دونوں میں اقتدار پیدا کرلیا، وزیر ہند نے اس کی سر پرستی قبول کی۔''186ؔ

سید سلیمان ندوی نے اردو ہندی کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ بہت سے لوگ اس بنا پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ ہیں، جبکہ اس کی بنیاد پر اسے غیر ملکی زبان نہیں قرار دیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی زبان بغیر کسی اختلاط کے وجود میں نہیں آتی، بمشکل ہی کوئی زبان ہوگی جس میں دوسری زبانوں کے

اثرات نہ ہوں، خواہ عربی، اردو، ہندی، انگریزی اور فارسی سب میں کسی نہ کسی زبان کا اختلاط ضرور ہے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''زبان میں تین چیزیں ہوتی ہیں۔ اسما افعال اور حروف زبان کی اصل ماہیت افعال اور حروف ہیں۔ اسما دوسری زبان سے آتے رہتے ہیں اور مٹتے جاتے ہیں اور بدلتے جاتے ہیں عربی زبان میں سیکڑوں لفظ دوسری زبانوں سے آئے ہیں، فارسی میں ہزاروں عربی الفاظ مستعمل ہیں۔ انگریزی میں لاتعداد یونانی اور لیٹن لفظ ہیں تاہم ان کو عربی اور فارسی اور انگریزی ہی کہیں گے اسی طریقے سے اگر ہماری اردو میں آدھے فارسی اور عربی اسما مل گئے ہیں۔ تو اس سے وہ ہندی ہونے سے خارج نہیں ہوسکتی۔ جب کہ اس کے تمام تر افعال تمام تر حروف اور نصف اسما بھاشا اور ہندی المولد ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کی قومی اور مذہبی ضرورتوں کے لحاظ سے جو کبھی مٹ نہیں سکتی ان کا خزانہ عاریت باختلاف قومیت عربی و فارسی و سنسکرت ہے رہے گا۔ اور اس میں کچھ حرج نہیں مصر کے مسلمانوں اور عیسائیوں کی زبان عربی ہے لیکن عیسائیوں کی تمام مخصوص قومی اور مذہبی اصطلاحات قبطی ہیں۔''187؎

سید سلیمان ندوی کا مضمون 'ہماری زبان بیسویں صدی میں' نومبر 1937 میں شائع ہوا۔ ابتدائی نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ مضمون نومبر 1936 کے کسی اجلاس کی صدارت کے لیے لکھا گیا تھا البتہ مزید اضافہ کے ساتھ نومبر 1937 میں شائع کیا گیا۔ سید سلیمان ندوی نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدا تک زبان جن عناصر کی وجہ سے ترقی کی ہے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ زبان کی ترقی کے اصول اور معیار کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ مضمون کے ابتدا میں انہوں نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ زندہ زبانوں کے جو اجزا سمجھے جاتے ہیں مثلا رسائل، چھاپہ خانے، کتابیں اور کتب خانے اردو میں اس قدر ہیں جو تسلی کے قریب ہیں۔ انیسویں صدی کے خاتمہ اور بیسویں صدی کے ابتدا میں ملک والوں بالخصوص مسلمانوں نے اردو زبان کی ترقی کے لیے جو کوششیں کی ہیں ان محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔

اردو زبان کو ترقی دینے والے آٹھ محرکات کا تذکرہ کیا ہے۔ جس میں سرسید تحریک، تعلیم کی عام اشاعت، مذہبی تحریکات، اردو ہندی جھگڑے، سیاسی تحریکات، جامعہ عثمانیہ کا قیام، قومی زبان کا تخیل اور آمد و رفت کی سہولیت وغیرہ۔ سرسید تحریک نے اردو زبان و ادب کو خوب فروغ بخشا، ناول، تنقید، افسانہ، سوانح غرض متعدد جدید اصناف اسی تحریک نے دین ہے۔ اس تحریک کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہماری زبان دہلی اور لکھنؤ کی قید سے نکل کر پورے میں پڑھی لکھی جانے لگی۔ اردو زبان کو ترقی دینے میں ہندی اردو جھگڑے کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ اس جھگڑے نے قوم کو اپنے زبان کی حفاظت کی طرف مجبور کیا۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''غرض اس اردو ہندی کے جھگڑے نے مسلمانوں کو اس زبان کی حفاظت اور ترقی کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا اور اس کے نتیجہ کے طور پر 1903 میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی، اور ان ٹھوس علمی کارناموں کا سلسلہ بڑھا اور پھیلا جو گذشتہ صدی میں صرف سرسید کی تعلیمی تحریک کے دائرہ میں محدود تھا۔'' 188؎

اردو زبان کی ترقی کے محرکات کے علاوہ زبان کی ترقی اور اصول و معیار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ہندستان اور ہندستان سے باہر اردو بولنے پڑھنے اور لکھنے والوں کا جائزہ لیا ہے۔ مختلف ممالک کی یونیورسٹیوں میں شعبہ اردو کے قیام اور خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ غرض یہ مضمون اردو زبان کی حفاظت اور ہندی اردو کے جھگڑے کے حوالے سے کافی اہم ہے۔

مباحث حاضرہ 'اردو ہندی' کے عنوان سے علامہ شبلی کی ایک تحریر اکتوبر 1916 میں شائع ہوئی۔ یہ کوئی مضمون نہیں ہے بلکہ اردو ہندی کے حوالے سے حکومت کی اسکیم کے متعلق لکھی گئی ایک تحریر ہے۔ دراصل 1912 میں الہ آباد گورمنٹ نے ایک ورنکولر اسکیم کمیٹی قائم تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ اسکولوں اور کالجوں میں دیسی زبان کا کوئی کورس ایسی زبان میں مرتب کیا جائے جو اردو ہندی دونوں میں ایک ہی عبارت والفاظ کے ساتھ پڑھا جاسکے۔ مسٹر برن اس کمیٹی کے چیف سکریٹری تھے اور مولانا شبلی نعمانی اس کے ممبر تھے۔ سکریٹری نے اس حوالے سے ایک اسکیم مرتب کی تھی مگر مولانا کی مذکورہ تحریر اس قدر موثر رہی کہ اردو ہندی بننے سے بچ گئی۔ مسٹر برن نے اپنی یادداشت میں جو تجویز پیش کی تھی اس میں سب سے اہم دفعات 3 اور 4 ہے۔ مولانا شبلی نعمانی ان دفعات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اردو زبان اور ہندی زبان دراصل ایک ہی زبانیں ہیں کیوں کہ ان کی گرامر متحد ہے اور جن دو زبانوں کی گرامر متحد ہوتی ہے وہ زبانیں دراصل ایک ہی ہوتی ہیں اس بنا پر ورنا کیولر کورس ایسی مشترک زبان میں بانا نا چاہیے کہ صرف رسم خط (کیرکٹر) کے فرق سے وہ اردو اور ہندی دونوں بن جائے۔ لیکن ہندی زبان کی خصوصیت ہے کہ اس کی نظم و نثر کی گرامر مختلف ہے اس لیے ہندی نظم کی گرامر کی واقفیت اور مہارت کے لیے راماین تلسی داس کورس میں داخل ہونی چاہیے۔ ہندوں کے لیے وہ لازمی کردی جائے مسلمانوں کے لیے بھی اس کا پڑھنا مناسب ہوگا۔ 189؎

مذکورہ بیان سے صاف ظاہر ہے کہ مسٹر برن نہ صرف یہ کہ ہندی زبان کو فروغ دینا چاہتے تھے بلکہ اردو کی جگہ بھی ہندی کو تھوپنا چاہتے تھے۔ مولانا شبلی جو کہ اس کمیٹی کے ممبر بھی تھے اس سازش کو بھانپ گئے وہ دونوں زبانوں کے اختلاط اور اس کے نقصانات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس قسم کی مشترک زبان صرف اس حد تک کے لٹریچر کے لیے کافی ہو جیسے کی جنرل ریڈر کی زبان ہے۔ لیکن جب کہ یہ مقصود ہے کہ ورنا کیولر کا سلسلہ کالج کے آخری کلاسیز تک قائم رہے تو ایسے

نصاب کے بنانے کی ضرورت ہوگی جس میں ہر طرح کے عملی مضامین اور عملی خیالات ادا کیے جائیں اس حالت میں ان مضامین اور خیالات اور اصطلاحات کے ادا کرنے کے لیے عام روز مرہ کے الفاظ کافی نہیں ہوں گے بلکہ کسی علمی زبان سے مستعار لینے پڑیں گے، یہ علمی زبان عربی سنسکرت ہوگی، اور یہاں سخت کشمکش پیدا ہوگی، مسلمان ہرگز اس بات پر رضامند نہیں ہوں گے کہ بجاے ان عربی الفاظ کے جن کو ہر تعلیم یافتہ نہایت آسانی سے فوراً سمجھ سکتا ہے سنسکرت کے الفاظ سیکھیں جو ان کے لیے بالکل گوش نا آشنا ہے ہندو بھی اگر چہ درحقیقت گوش نا آشنا نہیں ہوں گے لیکن وہ بطور ایثار کے اس محنت کو برداشت کریں گے بہر حال جنرل ریڈر مروجہ حال سے آگے چل کر صاف فیصلہ کر دینا ہوگا کہ ہندی اور اردو کے کورس الگ الگ ہو جائیں دونوں زبانوں کے مخلوط کرنے سے حسب ذیل نقصانات ہوں گے:

(۱) ہمیشہ ایک کشمکش رہے گی نصاب بنانے میں ہندو اور مسلمان دونوں اپنی اپنی قومی زبان یعنی عربی اور سنسکرت کی طرفداری کریں گے اور کبھی کوئی فریق کامیاب نہ ہوگا۔

(۲) دونوں سے مل کر ایک نئی زبان پیدا ہوگی جو نہ اردو ہوگی نہ ہندی۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کو اس حد تک ترقی دینا چاہیے کہ وہ علمی زبانیں بن جائیں اور ان میں ہر قسم کے خیالات اور مضامین ادا کیے جا سکیں اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب دونوں کو علیحدہ علیحدہ آزادی کے ساتھ ترقی کا موقع دیا جائے اور ایک دوسرے کی راہ میں حائل نہ ہوں۔''190

مذکورہ بیان میں علامہ شبلی نے دونوں زبانوں کے اختلاط کو غلط بتایا ہے۔ اور ان زبانوں کے اختلاط پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نصاب بنانے میں ہندو مسلم دونوں اپنی اپنی قومی زبان بھی عربی و سنسکرت کی طرفداری کریں گے۔ دونوں زبانوں کے اختلاط سے نہ ہندی زبان بنے گی اور نہ اردو بلکہ ایک نئی زبان پیدا ہوگی۔ مسٹر برن نے یہ بھی کہا کہ ہندی اردو دراصل ایک ہی زبانیں ہیں۔ کیونکہ ان کی گرامر ایک ہے اور جن دو زبانوں کی گرامر ایک ہوتی ہے وہ زبانیں دراصل ایک ہوتی ہیں۔ مسٹر برن کے جواب میں علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''دونوں زبانون کے گرامر کے متحد ہونے سے صرف یہ ثابت ہوسکتا ہو کہ دونوں ایک ہی خاندان کی زبان ہیں یا ایک دوسرے سے نکلی ہیں۔ ان زبانوں میں گرامر کے اعتبار سے ایک عام اتحاد پایا جاتا ہے اور یہ اتحاد زبانوں میں بہت زیادہ ہوتا ہوہے تاہم وہ زبانیں مختلف رہتی ہیں اور ان سے مشترک کورس نہیں تیار ہوسکتا، عربی زبان کی جو گرامر آجکل بیروت میں شائع ہوئی ہے اور جو ایک قدیم مستند تصنیف ہے۔ وہ عربی کے نہایت قریب ہے اور اس اتحاد سے کسی طرح کم نہیں، جس قدر کہ ہندی اور اردو میں اتحاد ہے تاہم عبری اور عربی زبان کا کوئی مشترک کورس نہیں بن سکتا۔''191

مذکورہ خیالات کے علاوہ علامہ شبلی نے اور کئی اہم امور پر روشنی ڈالی ہے۔ مولانا کی یہ تحریر نہ صرف اس حوالے سے اہم ہے کہ اس میں اردو اور ہندی کے کئی اہم امور پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ اس سے اردو زبان ایک ایسی

سازش سے بھی بچ گئی جو اردو کے وجود کے لیے خطرہ تھی۔اردو ہندی کا جھگڑا علمی وادبی تنازعات میں کافی اہم ہے ۔اپنے اثرات کے لحاظ سے یہ ایک ہمہ گیر تنازع رہا ہے۔اردو ہندی کا تنازع تقریبا دوصدی پر محیط ہے۔انگریزوں نے نہ صرف یہ کہ دونوں زبانوں کے درمیان بعد کی بنیاد رکھی بلکہ اسے جنگی حکمت عملی کے طور پر بھی استعمال کیا ۔بیسویں صدی کے اخبارات ورسائل نے اپنے اپنے انداز میں اس مسئلہ کا تجزیہ کیا۔معارف نے اپنے آغاز سے ہی اردو ہندی تنازع کوموضوع بحث بنایا۔اردو کے حوالے سے اٹھنے والی ہرتحریک، ہرادارہ اور ہرخبر معارف کی توجہ کا مرکز رہی۔معارف نے نہ صرف یہ کہ ان موضوعات پر مقالے شائع کیے بلکہ شذرات میں بھی اس پر خوب لکھا گیا۔

اپریل 1931 کو ہندستانی اکیڈمی کے تحت الہ آباد میں اردو ہندی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔جس میں دونوں زبانوں کے نامور ادیبوں نے حصہ لیا۔مدیر معارف نے مشترکہ زبان 'ہندستانی' کے بارے میں رائے عامہ ہموار کرنے کی بھرپور کوشش کی اور شذرات میں متعدد بار اس موضوع پر اظہار خیال کیا۔کانفرنس کی کاروائی پر شذرت میں لکھتے ہیں:

''کانفرنس کی تقریروں اور تجویزوں اور مجلس انتظامی کے اکثر ارکان کی تقریروں میں بھی جو چیز سب سے زیادہ توجہ کے قابل تھی یہ تھی کہ ہندی کے بعض سخت حامی ہندوممبروں کے علاوہ، باقی سارے ہندومسلمان حاضرین کا اس پر اتفاق سا معلوم ہوتا تھا کہ سکرت نما ہندی اور قاموسی اردو کے بجائے کیوں نہ وہی آسان اور عام فہم بول چال جس کو ہم گھروں اور بازاروں میں بولتے ہیں، ہندومسلمانوں کی مشترک زبان بنائی جائے اور اس کو ترقی دی جائے۔اور اس میں کتابیں لکھی جائیں اور اخبارات ورسائل چھپیں۔''192

ہندستان میں اکثریت کی یہ رائے تھی وہ زبان جسے ہم عام بول چال اور ضروریات کے لیے استعمال کرتے ہیں اسے ہندومسلم ہی نہیں بلکہ پورے ملک کی مشترکہ زبان ہو،البتہ ایک ایسا بھی طبقہ تھا جو سنسکرت زدہ زبان 'ہندی' کو رائج کرنا چاہتا تھا۔سید سلیمان ندوی بھی ہندستان میں عام طور پر بولی جانے والی زبان کے لیے ہندستانی لفظ استعمال کرتے ہیں ۔شذرات معارف میں انہوں نے اس حوالے سے بار بار لکھا ہے جس سے ان کی دوراندیشی، معاملہ فہمی ،ملک وملت کے تئیں ان کی خیرخواہی اور اردو زبان سے ان کے لگاو کو دیکھا جا سکتا ہے ۔ہندستانی اکیڈمی جنوری 1937 کی کانفرس پر تبصرہ کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''ہندی اور اردو کے آسان لکھنے اور بولے جانے پر سر تیج بہادر سپرو اور صدر اردو کانفرنس اور بہت سے مقرروں نے زور دیا لیکن ہر ایک تقریر کا توڑ اس پر تھا کہ جب تک ہندومسلمانوں کے دل نہیں ملیں گے، زبان ایک نہیں ہوسکتی۔لیکن سوال یہ ہے کہ دل کیوں کر ملیں، پالیٹکس میں ان کی علاحدگی تو کھلی ہوئی ہے لیکن انتہا یہ ہے کہ جس ادبی کانفرنس کے ذریعے ہم ان کو ایک کرنا چاہتے

ہیں اس میں بھی دونوں مل کر نہیں بیٹھے۔اردو اور ہندی کے بہت سے ادیب یہاں جمع تھے مگر دونوں دوخیموں میں تھے۔ایک نے دوسرے کی صورت تک نہ دیکھی اور ایک دوسرے کی سننا اور سمجھنا تو بعد کی چیز ہے۔کیا یہ حد درجہ افسوس ناک نہیں۔''193؎

اگست 1937 میں انجمن ترقی اردو بہار کا ایک اجلاس منعقد ہوا،جس میں ملک بھر سے نامور ادبا نے شرکت کی ۔جس میں اردو زبان وادب کی ترقی اور اس مشکلات کے حوالے سے ماہرین اردو نے اپنی اپنی آرا کا اظہار کیا۔شرکاء کی رائے شذرات میں نقل کی گئی۔مدیر معارف لکھتے ہیں:

''ہندوستانی سے مراد اس ملک کی وہ زبان ہے جو ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ سے بنی ہے۔جو شمالی ہند کے باشندے عام طور سے بولتے ہیں اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کے رہنے والے سمجھتے ہیں۔جو عربی،فارسی اور سنسکرت کے نامانوس لفظوں سے خالی ہو اور جو قاری،ناگری یا کسی دوسرے خط میں لکھی جائے۔''194؎

ماہنامہ معارف کے مذکورہ شمارے کے شذرات میں ایک اعلان بھی شائع کیا گیا تھا،جو مولوی عبدالحق اور بابو راجندر پرشاد نے انجمن ترقی اردو بہار کے جلسہ میں پیش کیا تھا۔اعلان کی عبارت ملاحظہ کیجیے۔

''ہمیں اتفاق ہے کہ ہندوستانی زبان،ہندوستان کی مشترک زبان ہونی چاہیے اور اردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جانی چاہیے اور دونوں رسم الخط سرکاری اور تعلیمی مقاصد کے لیے تسلیم کر لینی چاہیے،ہندوستانی سے مراد ہماری وہ زبان ہے جس میں زیادہ سے زیادہ اجزاء اس زبان کے لیے جائیں جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی جاتی ہے اس زبان میں الفاظ کے انتخاب کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ ان کا عام بول چال میں کس حد تک رواج ہے۔ہماری یہ بھی رائے ہے کہ ہندی اور اردو دونوں کو بہ حیثیت،ادبی زبان کے پوری پوری ترقی کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ہم یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ ہندی اور اردو کے ادیبوں کی اعانت سے ہندوستانی زبان کے بنیادی الفاظ کا ایک تخت تیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اس قسم کے لغات کی تدوین کے لیے علمی تجاویز اختیار کرنے اور دوسرے اہم مسائل مثلاً اصطلاحات علمیہ کے انتخاب کے لیے ہماری تجویز ہے کہ ایک چھوٹی سی نمائندہ کمیٹی بنائی جائے جس میں اردو اور ہندی دونوں کے با اثر رکن شریک ہوں،اور جو دونوں زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ہندوستانی زبان کو ترقی دینے کے قابل ہوں اور اس طرح دونوں زبانوں کے بولنے والوں میں زیادہ خوش گواری پیدا ہو جائے۔''195؎

معارف نے نہ صرف مشترکہ زبان ہندستانی کی حمایت میں خوب لکھا بلکہ اردو ہندی کے نزع کو ختم کرنے کے لیے بھی پرزور کوشش کی ۔سید سلیمان ندوی اردو کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کا جواب دیا۔بمشکل ہی اردو ہندی اور مشترکہ زبان ہندستانی کے حوالے سے کسی مسئلہ پر سید صاحب نے نہ لکھا ہو۔انہوں نے ایک مدت تک

اس نزع کو ختم کرنے کی کوشش کی اور ایک مشترک نام ہندستانی پر زور دیتے رہے۔مگر مخالفین جو نہ صرف اردو بلکہ مسلمانوں کے بھی دشمن تھے وہ سنسکرت آمیز ہندی کے نفاذ کے لیے کوشش کرتے رہے۔سید سلیمان ندوی آخری کوشش کے طور پر لکھتے ہیں:

''یہ سب کو معلوم ہے کہ خاکسار نے مخالفتوں کے باوجود ہندوستانی نام اور ہندوستانی زبان کی پر زور حمایت کی تھی، اس سے مقصود یہ تھا کہ دونوں قوموں کے درمیان بول چال کی زبان ایک رہے۔اور جس کی صورت یہ تھی کہ ہمارے اردو اور ہندی کے اہل قلم چند اصول پر مل کر ایک ہوتے اور دونوں کوشش کرتے کہ اپنی زبان کو آسان سے آسان کریں اور لفظوں کے پڑتال کا طریقہ یہ ہوتا کہ وہ لفظ قبول کیے جاتے جو چلن میں ہیں۔اس کے لیے نہ قاموس کے ورق کھولے جاتے اور نہ شبد ساگر سے دیکھ دیکھ کر بولے اور لکھے جاتے،مگر افسوس کہ یہ میری تحریک عام طور سے کامیاب نہ ہوسکی۔اس کا ایک سبب صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ ہمارے سیاسی ہندی کے حامی یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ وہ ہندی کو یعنی سنسکرتی ہندی کو اس صوبہ کی سرکاری اور تعلیمی زبان بنا کر چھوڑیں گے۔اس خیال کے حامی اگر صوبہ کی تعلیمی وزارت مجلس قانون ساز کی صدارت اور ہماری سب سے پرانی تعلیم گاہ(یونی ورسٹی) کی وایس چانسلر کی کرسیوں پر ہوں تو نتیجے کے متعلق فیصلہ مشکل نہیں۔ہندی کے بعض حامیوں کی طرف سے یہ بات کہی گئی ہے کہ اردو مسلمان بادشاہوں کے دربار میں پیدا ہوئی اور صرف ان لوگوں کی زبان رہی جو درباروں سے تعلق رکھتے تھے۔باقی سارے ملک کی زبان ہمیشہ ہندی ہی رہی ہے۔افسوس ہے کہ یہ نظریہ ایک بڑی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔اس سے اندازا ہوگا کہ علمی اور تاریخی مسئلوں میں بھی ذہنی تنگ نظری حقیقت کو کس طرح بدلنے پر مجبور کرتی ہے۔اردو کی ہزار سال کی تاریخ اب بالکل سامنے آگئی ہے۔اس کو دیکھ کر ہر شخص فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ زبان عوام کے جھونپڑوں، بیوپاروں کی دوکانوں، لشکریوں کے خیموں اور فقیروں کی خانقاہوں سے نکل کر بادشاہوں کے درباروں تک پہنچتی ہے، یہ دربار سے بازار، بازار سے دربار تک نہیں پہنچتی ہے اور یہی واقعہ اردو کی ملکی ضرورت کے راز کو فاش کرتا ہے۔''[196]

معارف کا معمول رہا ہے کہ ملک میں جب بھی کہیں اردو ہندی نزاع کی آواز اٹھتی معارف میں اس پر ضرور تبصرہ شائع کیا جاتا تھا۔اس حوالے سے ملک میں منعقد ہونے والے تقریباً تمام اجلاس کی روداد معارف میں شائع کی گئی۔نفاذ اردو اور اردو ذریعہ تعلیم بھی معارف کا موضوع رہا ہے۔سید سلیمان ندوی کو اس بات کا اندازا بہت پہلے ہوگیا تھا کہ اردو کی ترقی کے لیے ضروری ہے کی اس کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔اس حوالے سے وہ شذرات معارف میں لکھتے ہیں:

''اردو کے ذریعے سے تعلیم دینے کا وقت آگیا۔۔۔جامعہ عثمانیہ کے وجود نے اب اس تخیل کو محال

> نہیں رکھا ہے بلکہ ممکن العمل بنا دیا ہے۔اب اس کے قبول میں جو کچھ دیر ہے وہ علمی اور تعلیمی حیثیت سے نہیں بلکہ سیاسی حیثیت سے ہے۔''197ؔ

اردو ذریعہ تعلیم کے حوالے سے معارف کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی کہ اس حکمت عملی کے ساتھ پیش کیا جائے کہ جس سے ہندی یا کسی دوسری زبان کی حق تلفی نہ ہو۔البتہ ہندی کی طرف سے اس بات کا کبھی خیال نہیں رکھا گیا۔ حکومت بھی اپنی تنگ نظری دکھاتی رہی۔ ہندی والوں کے ہر مطالبے کو نہ صرف سنا جارہا تھا بلکہ اسے پورا بھی کیا جارہا تھا۔اردو طبقے کا مطالبہ مصالحت پر مبنی تھا وہ ملک کی سالمیت اور وحدت کو زیادہ ترجیح دیتے تھے۔سید سلیمان ندوی شذرات میں لکھتے ہیں:

> ''ہندی کو ہندوؤں کی ملکی زبان بنانے کی جو کوشش ملک میں ہورہی ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ راجپوتانہ اور بالآخر گجراتی بولنے والی ریاست بڑودہ میں ہندی کو سرکاری زبان کا منصب مل رہا ہے، لیکن ضرورت ہے کہ اس کے ساتھ اردو کو بھی زندہ رہنے دیا جائے۔صوبۂ متوسط کے تعلیمات سے سنا جارہا ہے کہ اردو کو شہر بدر کیا جارہا ہے۔اگر یہ صحیح ہے تو حقیقت میں یہی وہ باتیں ہیں جو ہندوستان کی دو قوموں کو بار بار لڑنے پر آمادہ کرتی ہیں۔''198ؔ

اردو زبان کے مخالفین کی ایک بڑی تعداد تھی،جن کی طرف سے طرح طرح کے اعتراضات پیش کیے جاتے تھے۔معارف میں عموماً ان اعتراضات کے جواب شائع کیے جاتے تھے جو بڑے منطقی نوعیت کے ہوتے تھے۔اس حوالے سے معارف میں ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔بنگالی مسلمانوں کے ایک طبقہ نے تعلیمی نظام میں اردو کی شمولیت کی صرف اس وجہ سے مخالفت کی کہ بنگال میں لسانی زبانی اتحاد ٹوٹ سکتا ہے تو معارف نے لکھا:

> ''سنا جارہا ہے کہ بنگال کے کچھ مسلمان اس پر مصر ہیں کہ اردو کو اپنے صوبے کے دائرہ تعلیم میں داخل نہ ہونے دیں تاکہ صوبے کے''زبانی اتحاد''میں فرق نہ آنے پائے۔یہ خیال مبارک ہے مگر سوال یہ ہے کہ صوبے کے ہندو اگر ہندی کو ملک کی عمومی زبان کی حیثیت سے صوبے میں داخل ہونے کی اجازت دے دیں تو اس اتحاد میں فرق آجائے گا یا نہیں اور اس وقت بنگال کے مسلمانوں کا اردو کی نسبت طرز عمل کیا ہوگا؟199ؔ

ہم نے پچھلے معارف میں بنگال کے مسلمانوں کو اردو زبان کی طرف جو توجہ دلائی تھی اس کا منشا یہ نہ تھا کہ وہ اپنے صوبے کی زبان چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ کریں۔''200ؔ

اردو کے حوالے سے ملنے والی ہر چھوٹی بڑی خبر معارف کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ہندستان کے بعض علاقوں میں مادری زبان کے اختلاف کی وجہ سے یہ اعتراض پیش کیا گیا کہ اردو کی تدریس بچوں کے لیے غیر ضروری بوجھ بن جائے گی۔ان علاقوں کے مسلمانوں کو ماہنامہ معارف نے مخاطب کر کے لکھا کہ:

''ہم کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ بنگال، گجرات، مہاراشٹر، مدراس وغیرہ مختلف صوبوں کے مسلمان بچوں کو اپنے صوبوں کی زبانوں کے سیکھنے کے ساتھ ساتھ ایک نئی زبان اردو سیکھنے کی مشکل بھی پیش آتی ہے۔ جو ہندو بچوں کو پیش نہیں آتی۔ لیکن اس تھوڑے سے دقت اٹھانے کا فائدہ یہ کیا کم ہے کہ آج اردو میں لکھی ہوئی ہر کتاب ہندوستان کے ہر صوبے کے اکثر مسلمان پڑھ لیتے ہیں۔ اور ایک اردو اخبار پورے ملک کے مسلمانوں کو بیدار اور ہوشیار رکھنے میں کامیاب ہے اور ہندوستان کے ہر صوبے کے جلسے میں اردو ذریعۂ تقریر ہے۔'' 201ے

ہندی اردو جھگڑا اور اردو کے نفاذ کا مسئلہ پر مذکورہ شذرات کے علاوہ ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ معارف نے نفاذ اردو کے خلاف اٹھنے والی ہر خبر کا جواب دیا ہے۔ اردو زبان کو اس کا حق دلانے کے لیے معارف نے ہر ممکن کوشش کی، معارف نے اردو کے لیے جد وجہد کرنے والوں سے مصالحت اور آئینی حدود میں رہنے پر زور دیا۔ یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں شعبہ اردو کے قیام کی خبر کو بھی معارف نے شائع کیا۔ تقسیم ملک کے بعد ہند وپاک میں نہ صرف اردو کے مستقبل پر روشنی ڈالی بلکہ بعض اہم منطقی تجاریز بھی پیش کی۔

متفرقات

(۱) ادبا و شعرا کے احوال سے متعلق تحقیق

(۲) لائبریریوں میں موجود مخطوطوں کا تعارف

(۳) شعرا کے تذکروں سے متعلق تحقیق

ادبا وشعرا کے احوال سے متعلق تحقیق

معارف تحقیق کا ایک بڑا حصہ ادبا وشعرا کے سوانحی احوال کی تلاش وتحقیق پر مشتمل ہے۔معارف کے مشمولات میں ایسے مضامین کی ایک بڑی تعداد ہے۔ان مضامین میں بعض ایسے قدیم شعرا کے احوال ملتے جو کہیں اور نہیں ملتے یا پھر کم ہی تذکروں میں ملتے ہیں۔بعض ایسی تحریریں بھی شائع ہوئی ہیں جنہیں سوانحی تحقیق میں اولیت حاصل ہے۔ادبا شعرا کے حالات کی دریافت پر مشتمل مضامین میں صاحب اورنگ آبادی، شیخ خوب محمد چشتی، مصحفی کا سال وفات، مرزا مظہر جانجانا کا سال وفات، میر حسین تسکین، تذکرہ شعراء رام پور کا ایک گمنام شاعر، آتش سے ایک بہاری ادیب کی ملاقات، طالب علی عیش، شمس العلماء مولانا محمد سعید اورنگ آبادی، شیخ علی بخش بیمار، امیر الدین آزاد اور سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی قابل ذکر ہیں۔ان مضامین میں بعض ایسے ہیں جو نہ صرف یہ کہ سلسلہ وار کئی قسطوں میں شائع ہوئے بلکہ جواب میں متعدد محققین کے مضامین بھی شائع ہوئے۔کئی شعرا کی سن وفات کا تعین بھی معارف کے ذریعہ ہوا۔شعرا وادبا کے متعدد ایسے پہلوں جن بازیافت معارف نے کی ہے۔یہاں صرف 1947 تک مضامین کو موضوع بنایا گیا ہے۔

سید تمکین کاظمی کا مضمون 'صاحب اورنگ آبادی' معارف اکتوبر 1929 میں شائع ہوا۔لالہ لچھمی نارائن کی شخصیت کسی خاص تعارف کی محتاج نہیں۔البتہ ایک مدت تک ادبی دنیا ان کی شخصیت، سوانحی حالات اور خدمات سے نا آشنا تھی۔سید کاظمی نے مذکورہ مضمون میں تذکرہ شعراء دکن، چمنستان شعرا کی مدد سے نہ صرف ان کے سوانحی حالات اور خدمات پر روشنی ڈالی ہے بلکہ ان کی شاعری کا انتخاب بھی کیا ہے۔

لالہ نارائن کے اجداد پنجاب کے کھتری اور ملازم پیشہ تھے۔عالمگیر کے ساتھ ان کے دادا لالہ بھونی داس دکن آئے اور اورنگ آباد میں قیام کیا۔لچھمی نارائن کے والد لالہ منسارام اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم وتربیت پائی۔نواب آصف جاہ اول کے پیشکار مقرر ہوئے۔انہوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں جن میں 'قانون دربار آصفی' بہت مشہور ہے۔

لالہ لچھمی نارائن 1158 میں پیدا ہوئے۔علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی سے کتب درسیہ اور فن شاعری سے کماحقہ واقفیت حاصل کی۔صمصام الدولہ بہادر کے منصب سے سرفرازی اور خطاب بھی ملا۔لالہ لچھمی نارائن غلام آزاد کے بہت معترف تھے۔ان سے صرف استاد کا رشتہ نہ تھا بلکہ عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔لالہ لچھمی نارائن ابتدا میں صاحب تخلص کرتے تھے مگر آزاد کے کہنے پر شفیق تخلیص اختیار کیا۔جس کے بعد سے وہ شفیق سے ہی مشہور ہوئے۔البتہ عام طور سے اردو میں صاحب اور فارسی میں شفیق تخلص استعمال کرتے تھے۔فارسی سے زیادہ ان کا اردو کلام

موجود ہے۔فاضل مضمون نگار نے ان کی چودہ کتابوں کا بھی تعارف پیش کیا ہے۔جس میں چمنستان شعرا،گل رعنا ،مثنوی تصویر جاناں ،نخلستان،تمنیق شگرف،حقیقت ہائے ہندستان،ماثر آصفی ،دیوان صاحب ،حالات حیدر آباد،بساط الغنائم ،تحفہ احباب ،ماثر حیدری،تذکرہ گرونا یک اور شام غریباں شامل ہیں۔مضمون کے آخر میں دیوان صاحب اور تحفہ احباب سے کچھ اشعار بطور نمونہ دیے گئے ہیں۔

معارف کے مذکورہ مضمون سے قبل اردو دنیا لالہ لچھمی نارائن کے حالات اور خدمات سے کم آشنا تھی۔انہوں نے نہ صرف یہ کہ ان کی سوانح حیات پر روشنی ڈالی ہے بلکہ ان کی خدمات کا بھی تعارف کرایا ہے۔لالہ لچھمی نارائن پر کی جانے والی ابتدائی تحقیق کے حوالے سے کافی اہم ہے۔

خوب محمد چشتی اور مثنوی خوب ترنگ قدیم ادب کا اہم سرمایہ ہیں۔خوب محمد کے حالات اور خدمات پر ماہنامہ معارف میں چار تحریریں ملتی ہیں۔جو نہ صرف ان کی قدیم مثنوی بلکہ ان کے سوانحی حالات کے حوالے سے کافی اہم ہیں۔ابن مظہر رہبر فاروقی کا مضمون 'زبان اردو کی اولین تصنیف اور اس کا مصنف' کے عنوان سے ماہنامہ معارف فروری 1931 میں شائع ہوا۔صاحب مضمون کا خیال ہے کہ خوب محمد چشتی اردو شاعری کا بابا آدم اور ان کی مثنوی خوب ترنگ اردو کی اولین تصنیف ہے۔وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

> ''اگر آٹھویں صدی ہجری کی تصنیف اور اس کے مصنف شاہ (شیخ) خوب محمد کو اردو شاعری کا باوا آدم قرار دیا جائے تو بلا شبہ ٹھیک اور درست ہے کیوں کہ اب تک جتنے شعرا اور مصنفین اردو کا پتہ چلتا ہے وہ یا تو قیاسی ہیں یا اگر ہیں تو ان کی تعداد بالکل ہی کم ہے۔''202

خوب ترنگ ایک طویل مثنوی ہے اس کا موضوع مسائل تصوف ہے۔شعری حیثیت سے اس میں خاص خوبی نہیں ہے نیز خوب محمد بھی کوئی خوش گو شاعر نہیں تھے۔وہ درویش منش فقیر صفت انسان تھے۔اس کے علاوہ بھی ان کی کئی کتابیں تصوف و فلسفہ پر ہیں۔خوب محمد احمد آباد گجرات کے باشندے تھے۔احمد آباد کے مضافات میں رہتے تھے ۔برہان پور ان دنوں علم و ادب کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔انہوں نے برہان پور کا رخ کیا اور زندگی کے بقیہ ایام وہیں گزار کر خوب ترنگ کی تالیف کے ۲۲ سال بعد 1008ھ 1614 میں انتقال فرمایا۔

فاضل مقالہ نگار نے معاصر محققین سے نہ صرف استفادہ کیا ہے بلکہ ان سے اختلاف رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔خوب محمد چشتی کی وفات کے حوالے سے متعدد آرا ملتی ہیں۔انہوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ان کی وفات 1008 ہجری میں ہوئی۔ان کے مدفن کے حوالے سے بھی محققین کی مختلف آرا ہیں۔ابن رہبر مظہر فاروقی نے ان کے خاندان کے ایک مرید جنہوں خود خوب ترنگ کی شرح لکھی ہے ان کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے برہان پور میں انتقال کیا۔خوب ترنگ کے بارے میں مصنف کی لکھی ہوئی تاریخ کے حوالے سے لکھا ہے کہ کتاب کا نام خوب

ترنگ ہے جو 986ھ بمطابق 1586 میں مکمل ہوئی اوراس کی شرح امواج خوبی 1000ھ بمطابق 1592 میں لکھی گئی۔مضمون کی آخر میں کتاب کے نسخہ پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

مذکورہ مضمون کے بعد سید نجیب اشرف ندوی کا مضمون شاہ خوب اور خوب ترنگ معارف اپریل 1931 میں شائع ہوا۔ جو مظہر فاروقی کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ نجیب اشرف ندوی نے نہ صرف یہ کہ خوب ترنگ کے سن تالیف بلکہ ان کی تاریخ وفات اور مدفن کو غلط ثابت کیا ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ مصنف کا انتقال 1023 میں ہوا اور خوب تھے سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ مدفن احمد آباد میں سہ درازہ کے پاس فرحتہ الملک کی مسجد کے پاس اب بھی موجود ہے۔اسی وجہ سے یہ مسجد اب بھی شاہ خوب کی مسجد کے نام سے جانی جاتی ہے۔ان کے خاندان کے ایک بزرگ اب بھی اس سلسلے کے فیض کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

> ''صاحب مضمون نے مصنف کے سنہ وفات اور مدفن کے متعلق بھی جو کچھ کہا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔مصنف کا انتقال احمد آباد میں 1023ھ میں ہوا،اور خوب تھے ان کی تاریخ ہوئی ۔مراۃ احمدی اور تحفۃ الکرام وغیرہ نے یہی مادہ لکھا ہے شاہ صاحب کا مدفن احمد آباد میں سہ دروازہ کے فرحتہ الملک کی مسجد کے قریب اب تک موجود ہے اوراسی وجہ سے یہ مسجد اب شاہ خوب کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔''203

مضمون نگار نے شاہ خوب محمد کی خوب ترنگ اور امواج خوبی کے علاوہ پانچ اور کتابوں کی نشاندہی کی ہے جو حسب ذیل ہیں۔عقیدہ صوفیہ، خلاصہ موجودات، صلح کل، حفظ مراتب مقدمہ شرح جام جہانما اور شراب جام شرح جام جہانما شامل ہیں۔معارف کے مذکورہ شمارے میں 'شاہ محمد خوب' کے عنوان سے قاضی نورالدین کا ایک وضاحتی نوٹ شائع ہوا۔انہوں نے مذکورہ نوٹ میں لکھا ہے کہ میر علم میں حضرت خوب محمد چشتی قادری اور حضرت خوب میاں دونوں علاحدہ علاحدہ بزرگ ہیں اور دونوں بزرگ احمد آباد ہی میں مدفون ہیں۔

معارف ستمبر 1931 میں قاضی نورالدین نے ایک مرتبہ پھر اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ان کا تحریر کردہ ایک صفحہ 'مثنوی خوب ترنگ کے مصنف شاہ خوب محمد کے کچھ مزید حالات' کے عنوان سے شائع ہوا۔انہوں نے یہ حالات قاضی سید محمود میاں کو خط لکھ کر دریافت کیے ہیں۔جس میں ان خیالات کا اظہار کیا گیا ہے کہ ان کا انتقال احمد آباد میں ہوا اور وہ شاہ خوب کی مسجد میں مدفون ہیں۔قاضی سید محمود میاں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ان کے پاس خوب محمد کی متعدد کتابیں بھی موجود ہیں البتہ انہوں نے ان کتابوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔

قاضی عبدالودود کا مضمون معارف اکتوبر 1937 'مصحفی کا سال وفات' کے عنوان سے شائع ہوا۔جس میں انہوں نے نہ صرف یہ کہ مصحفی کے سال وفات کا تعین کیا ہے بلکہ متعدد محققین کے خیالات کی تردید بھی ہے۔قاضی

صاحب نے محققین کی کے بیانات کا تجزیہ کرنے کے بعد آب حیات میں محمد حسین آزاد کے لکھی گئی تاریخ وفات 1240ھ کو درست ثابت کیا ہے۔اور اس سلسلے میں انہوں نے متعدد دلائل پیش کیے ہیں۔204؎ دلائل کا خلاصہ حسب ذیل ہیں۔

تذکرہ ہندی کے مطبوعہ نسخے کے آخر میں درج عبارت جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصحفی ۲صفر 1238ھ سے پہلے وفات پا چکے تھے، بانکی پور میں موجود قلمی نسخے سے مطابقت نہیں رکھتی۔مصحفی کے شاگرد غلام اشرف کا مصرع تاریخ وفات مصحفی، اشرف کے قلمی دیوان (بانکی پور) میں موجود ہے جس سے 1240ھ برآمد ہوتا ہے۔مظفرعلی اسیر شاگرد مصحفی کے دیوان فارسی میں قطعہ تاریخ وفات ہے اس سے بھی 1240ھ نکلتا ہے۔کلیم الدین نے تاریخ شعرا اردو میں سال وفات 1220ھ لکھا ہے جو صریحا غلط ہے۔

سوانحی تحقیق کے حوالے سے ایک اور مضمون ماہنامہ معارف دسمبر 1937 کو حضرت نظام الدین احمد صانع بلگرامی کے عنوان سے شائع ہوا۔جس کے مضمون نگار سید حامد حسن بلگرامی ہیں۔صانع بلگرامی بنیادی طور سے فارسی کے شاعر تھے البتہ اردو میں بھی شاعری کرتے تھے۔فارسی شاعری میں مرزا رفیع سودا ان سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔مذکورہ مضمون میں بنیادی ماخذ کے تنقیدی مطالعہ کے ساتھ صانع کے حالات بھی نقل کیے گئے ہیں۔سودا کے استاد ہونے کی وجہ سے ان کی شخصیت اردو کے لیے بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

حضرت صانع بلگرامی کا اصل نام نظام الدین احمد تھا۔1129ھ میں پیدا ہوئے۔شیخ محمد ہادی کے صاحبزادے تھے۔حضرت صانع نے صرف نو سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا۔ابتدائی کتابیں میر نوازش علی بلگرامی سے پڑھی تھیں۔فارسی شاعری میں بچپن سے دلچسپی تھی۔استاد کی صحبت نے بہت جلد سخن فہم اور سخن سنج بنا دیا تھا۔اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ نہ صرف یہ کہ ہمعصروں سے سبقت لے گئے بلکہ مرزا رفیع سودا جیسے بڑے شاعر کے استاد کہلائے۔ان کی استادی کو سودا نے بھی تسلیم کیا تھا۔مرزا رفیع سودا اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

’’آپ کو اصلاح منظور ہے تو شیخ علی حزیں مرحوم کے شاگرد شیخ آیت اللہ ثنا، میر شمس الدین فقیر کے شاگرد و مرزا بچھو ذرہ تخلص موجود ہیں، حکیم بوعلی خاں ہاتف بنگالہ میں نظام الدین صانع بلگرامی فرخ آباد میں شاہ نورالعین واقف شاہجہان آباد میں ہیں یہ ان لوگوں کے کام ہیں۔‘‘205؎

صانع بلگرامی ایک مدت تک نواب فرخ آباد کی صحبت میں رہے اور پھر ملازمت کی غرض سے کلکتہ چلے گئے جہاں 1205ھ میں انتقال کیا۔فاضل مضمون نگار نے ان کے فارسی دیوان کا مطالعہ کیا تھا اور اس کے بعض اشعار بطور نمونہ مضمون کے آخر میں نقل بھی کیے ہیں۔انہوں نے نہ صرف یہ کہ ان کی شاعری اور سوانحی حالات کو نقل کیا ہے

بلکہ بعض غلط فہمیوں کا بھی ازالہ کیا ہے۔حکیم قدرت اللہ خاں نے اپنے تذکرہ مجموعہ نغز میں انہیں سید لکھا ہے۔سید حامد حسن بلگرامی نے اس کی تردید میں لکھا ہے:

''حکیم صاحب نے ان کا عرف وتخلص صحیح لکھا لیکن جس طرح انہیں حضرت صانع کا اصل نام نہ معلوم تھا،اسی طرح وہ ان کے شجرہ سے بھی ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔حضرت صانع اس وقت اپنی فارسی دانی کے سبب مشہور تھے۔اگر حکیم صاحب کو یہ علم ہوتا کہ نظام الدین احمدان کا اصلی اور تاریخی نام ہے،تو وہ یقیناً تذکروں میں اسی نام کے ساتھ ان کا حال لکھتے ہیں۔وہ سادات بلگرامی میں نہ تھے۔بلکہ جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے ان کا تعلق عثمانی خاندان سے تھا۔اس خاندان کے چشم وچراغ منشی محمود صاحب بقید حیات ہیں۔''206

سید حسن بلگرامی کے مذکورہ مضمون سے نہ صرف صانع بلگرامی کے سوانحی حالات سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ ان سے متعلق غلط فہمی کی تردید بھی ہوتی ہے۔معارف کا مذکورہ مضمون نہ صرف یہ کہ تحقیقی اعتبار سے اہم ہے بلکہ صانع بلگرامی سوانح وشخصیت کی تفہیم کے حوالے سے بھی کافی اہم ہے۔

حضرت مرزا مظہر جانجاناں کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ادب کے قدیم نمونوں میں ان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔معارف میں ان کی شخصیت وسوانح اور خدمات کے حوالے سے متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔البتہ 1947 تک اس کی سوانحی حالات پر صرف ایک مضمون ملتا ہے۔معارف اکتوبر 1942 کو عبدالرزاق قریشی کا مضمون حضرت مرزا مظہر جان جاناں شائع ہوا۔مذکورہ مضمون کافی طویل ہے۔اس میں نہ صرف ان کی مکمل سوانحی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ ان کے حوالے سے متعدد غلط روایتوں کی تردید بھی کی گئی ہے۔

مرزا کا نام جان جاں،تخلص مظہر،شمس الدین حبیب اللہ لقب،علوی نسب،نقشبندی مشرب تھا۔مرزا صاحب کا نسب ۲۸ واسطوں سے محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے۔ان کے اجداد میں ایک بزرگ امیر کمال الدین آٹھویں صدی ہجری میں طائف سے ترکستان گئے۔وہاں کے حاکم سردار الوس قاقشاں کی لڑکی سے نکاح ہوا۔چونکہ حاکم کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی جس کی وجہ سے حکومت امیر کمال الدین کو مل گئی۔البتہ جب ہمایوں نے اپنی کھوئی ہوئی حکومت واپس لے لی تو وہ ہندستان چلے آئے،ان کے ساتھ اس خاندان کے دو افراد مجنوں خاں اور بابا خاں بھی ان کے ساتھ ہندستان آئے۔حضرت مرزا مظہر جانجاناں بابا خان کی اولاد میں سے ہیں۔

مرزا کی والدہ بیجاپور کی شاہی خاندان سے تھیں۔والد کا نام مرزا محمد جاں تھا۔وہ متعدد علوم کے ماہر اور شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے۔جانی تخلص کرتے تھے۔مرزا جاں ابتدا میں سرکاری ملازم تھے۔مگر انہوں نے استعفی دے کر فقیری اختیار کر لی تھی۔مرزا صاحب کو توکل بہت پسند تھا،اس حوالے سے متعدد واقعات ملتے ہیں

1130ھ میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔

مرزا مظہر کے والد مستعفی ہوکر آگرہ آرہے تھے راستے میں کالا باغ جو حدود مالوہ میں واقع ہے، ۱۱ رمضان 1111ھ کو ولادت ہوئی۔ مرزا کی سن ولادت کے سلسلے میں متعدد آرا ملتی ہیں۔ البتہ عام طور سے تذکروں میں ان کا سن ولادت 1111ھ ملتا ہے۔ معمولات مظہر اور مقامات مظہری مرزا کے حالات پر لکھی گئی دو اہم کتابیں ہیں ۔صاحب معمولات نے 1111ھ اور صاحب مقامات نے 1111ھ یا 1113ھ سال ولادت لکھا ہے۔ اس کے علاوہ صاحب مقامات نے تاریخ پیدائش کے دو مادے بھی دیے ہیں ۔تولد صاحب شرع اور طلوع شمس الملت والدین ان دونوں سے 1111ھ نکلتا ہے۔

فاضل مضمون نگار نے مرزا جانجانا کی وجہ تسمیہ بھی بیان کی ہے۔ ان کے نام کی وجہ تسمیہ کے حوالے سے بھی کئی رائے پیش کی گئی ہیں۔ البتہ صحیح بات یہ ہے کہ اورنگ زیب نے باپ کے نام کی مناسبت سے ان کا نام جان جاں رکھا تھا، لوگوں نے جانجاناں بنا دیا، اور خود مرزا بھی بعد میں یہی نام لکھنے لگے۔

مرزا مظہر کے والد کا وطن آگرہ تھا۔ چنانچہ مرزا کی پرورش و پرداخت اور ابتدائی تعلیم اکبر آباد میں ہوئی۔ البتہ بعد میں مرزا نے دلی کو اپنا مسکن بنایا۔ دہلی میں ان کی خانقاہ جامع مسجد کے قرب میں ہے۔ ان کی تعلیم کا بندوبست کم عمری ہی سے کر دیا گیا تھا۔ فارسی کی تکمیل اپنے والد کے پاس کی تھی۔ کلام اللہ کا حفظ عبدالرسول دہلوی کے پاس، والد کے انتقال کے بعد علم حدیث وتفسیر اور دیگر کتب حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے سیکھی۔ درس کتب کے علاوہ آپ نے آداب شاہی، فن سپہ گری اور دیگر متداول علوم وفنون کی بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ تقریباً تیس برس تک مشائخ نقشبندی ومجددیہ سے کسب فیض کرنے کے بعد خود مسند رشد وہدایت پر بیٹھے اور پھر تاعمر اسی راہ میں گزار کر 1201ھ میں انتقال کیا۔

مرزا مظہر جانجانا کے حوالے سے ایک اور مضمون معارف اپریل 1952 کو 'مرزا مظہر جان جاناں کا سال وفات' شائع ہوا۔ مذکورہ مضمون میں عندلیب میرٹھی نے ان کی سال وفات کو موضوع بنایا ہے۔ مرزا کی وفات کے سلسلہ میں الگ الگ تاریخیں ملتی ہیں ۔مضمون نگار نے محققین کی رائے کو نہ صرف یہ کہ غلط ٹھہرایا ہے بلکہ دلائل سے صحیح تاریخ کا تعین بھی کیا ہے ۔ پروفیسر عطاء الرحمٰن نے مرزا کا سال وفات 1205ھ اور محمد حسین آزاد نے 1201ھ لکھا ہے۔ ان کی وفات کے حوالے سے جو قطعہ تاریخ لکھی گئیں ہیں ان سے بھی 1205ھ ہی نکلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔:

> ''دونوں تاریخ وفات سے 1195ھ برآمد ہوتے ہیں ۔معلوم نہیں صاحب مضمون نے 1205ھ کس حساب سے برآمد کیا ہے۔۔۔۔ مراۃ الشعراء میں کاتب کی غلطی سے درد کی دال

کے ۴ عدد نہیں جوڑے گئے۔۔۔۔وہ زائد اشعار جو اورنگ آبادی تذکرے میں مظہر کے نام سے درج ہیں ان پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔''207؎

ان مضامین کے علاوہ کئی اہم شعرا پر مضامین شائع ہوئے ہیں مگر وہ ہماری مدت سے باہر ہے۔معارف کی سوانحی تحقیق میں ایک مضمون 'ایک بہاری ادیب کی آتش سے ملاقات' اس قدر اہم ہے کہ آتش کی سوانح کی ترتیب میں نہ صرف یہ کہ اسے بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے بلکہ آتش کی زندگی کے کئی اہم پہلو کو سمجھنے میں کافی معاون بھی ہے۔

لائبریریوں میں موجود مخطوطوں کا تعارف

انڈیا آفس لندن قدیم ترین لائبریریوں میں سے ایک ہے۔جس کا قیام 1800 میں ہوا۔ جہاں مختلف علوم فنون کی کتابوں اور مخطوطات ایک بڑا ذخیرہ ہے ۔یہاں اردو،عربی ،فارسی ،ہندی اور انگریزی کی وہ کتابیں بھی دستیاب ہیں جو ہندستان میں نادر و نایاب ہیں۔J H BLUM HARDT کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست بھی ہے جو 1920 میں شائع ہوئی۔معارف جون 1920 کو سید سلیمان ندوی کا مضمون 'انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ' کے عنوان سے شائع ہوا۔جس میں نہ صرف انڈیا آفس لائبریری کا تعارف کرایا گیا ہے بلکہ کتب خانے میں موجود مخطوط پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔دراصل سید سلیمان ندوی اولین وفد خلافت کے رکن کی حیثیت سے انگلستان گئے ہوئے تھے جہاں انہوں نے اس لائبریری کی بھی سیر کی اور قارئین معارف کے لیے گم شدہ خزانوں پر ایک مضمون بھی شائع کیا۔سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ''میں اس وقت ناظرین معارف سے سات ہزار میل دور ہوں ۔بار بار جی چاہا کہ ناظرین معارف کے لیے اس عجائبستان عالم سے ان کے لائق کوئی تحفہ بھیجوں مگر واقعہ یہ ہے کہ 26 فروری (یعنی جس دن ہمارا وفد ساحل ہندستان پر اترا) آج ۲۷ اپریل تک شائد ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جو آمدورفت سے خالی گزرا ہو۔۔۔اس دوران میں اس ایوان حکومت میں جس کا نام انڈیا آفس ہے تین چار دفعہ جانے کا اتفاق ہوا،اس عمارت میں جہاں سیکڑوں حقیقی و مجازی زیارت گاہیں ہیں ایک زیارت گاہ کا نام انڈیا آفس لائبریری ہے۔یہ لائبریری ایک گوشہ عمارت میں واقع ہے اور ہندستان کی علمی تاریخ کا مجسمہ ہے۔۔۔اس لائبریری میں عربی ،فارسی،اردو،سنسکرت،بنگالی ،گجراتی اور ہندی کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ ہے۔''208؎

مضمون کے آخر میں بلوم ہارٹ کی مرتبہ فہرست پر روشنی ڈالی گئی ہے۔بلوم ہارٹ کی فہرست چھ ابواب پر مشتمل ہے۔علوم وفنون،تاریخ و جغرافیہ،ادبیات،کتب تعلیمی،الہیات اور متفرقات جیسے عناوین پر منقسم ہے۔ہر عنوان کے تحت متعدد عناوین قائم کیا گیا ہے۔مضمون کے آخر میں سید سلیمان ندوی نے کچھ اہم کتابوں کی تفصیلات درج کی ہے۔مذکورہ مضمون نہ صرف یہ کہ قدیم ذخیروں کی دریافت کے حوالے سے اہم ہے بلکہ اس حوالے سے تحقیق کرنے والوں کے لیے بھی قابل قدر سرمایہ ہے۔

سید سلیمان ندوی کے مذکورہ مضمون کے تقریباً سات سال بعد سید نجیب اشرف ندوی کا مضمون 'انڈیا آفس لائبریری کی فہرست مخطوطات اردو' شائع ہوا۔سید صاحب نے بلوم ہارٹ کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست کا تعارف پیش کیا تھا۔بلوم ہارٹ نے غیر مرتبہ کتابوں کی فہرست بھی تیار کی جو 1920 تک تقریباً مکمل ہو چکی تھی ۔مگر مرتب کی

علالت اور پھر 1922 میں ان کی موت کی وجہ سے یہ کام مکمل نہ ہوسکا۔ان کے انتقال کے بعد C.A Story نے اس فہرست کو نظر ثانی کر کے شائع کیا۔مولانا نجیب اشرف ندوی کا مضمون اسی فہرست تحقیق وتنقید پر مبنی ہے۔انہوں نے نہ صرف یہ کہ فہرست کا تحقیقی وتنقیدی تبصرہ کیا ہے بلکہ متعدد اغلاط کی نشاندہی بھی کی ہے۔تبصرے کے ابتدا میں وہ لکھتے ہیں:

''کتب مطبوعہ کی فہرست کی طرح یہ فہرست بھی شعبہ اردو کے مہتمم مکتبہ مسٹر جے، ایف بلوم ہارٹ ایم اے کی محنت ومطالعہ کا نتیجہ ہے اور ہمارے پاس بغرض تنقید بھیجی گئی ہے۔فہرست 1920 میں تقریباً تمام ہوچکی تھی مگر مرتب کی مسلسل علالت اور بالآخر دسمبر 1922 میں ان کی موت پھر مسئلہ طباعت کے سوال نے 1926 تک شائقین تک پہنچنے سے باز رکھا۔مسٹر بلوم ہارٹ کے بعد اس فہرست کی نظر ثانی اور پروف خوانی کا قرعہ نائب مکتبہ مسٹر سی اے اسٹوری کے نام نکلا۔یہ وہی مسٹر اسٹوری ہیں جو کسی زمانے میں علی گڑھ میں تھے۔اس لیے ہم کو امید تھی کہ یہ فہرست تحقیق صحت اور وسعت معلومات کے اعتبار سے ایک قابل قدر چیز ہوگی لیکن اس کے مطالعہ نے ہم کو ایک بڑی حد تک مایوس کر دیا اور مستشرقین انگلستان کے متعلق جو حسن ظن قائم تھا اس کو بہت صدمہ پہنچا۔'' 209؎

فہرست میں 269 قلمی کتابوں کا تذکرہ ہے۔یہ نسخے مختلف علوم وفنون سے متعلق ہیں۔ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔دینیات ۳۴، تاریخ ۱۷، سوانح ۲، تذکرہ ۱۲، جغرافیہ ۴، قصص ۲۸، نظم ۱۲۹، اخلاقیات ۲، طب ۳، موسیقی ۹، زراعت ۱، فوجی قواعد ۱، مجموعہ الفاظ ۱۴، لغت ۲، قواعد ۱۷، نظم ۱۲۹، لغت ۲، قواعد ۱۷، متفرقات ۸ ہے۔ 210؎ تبصرہ نگار نے کچھ اہم کتابوں کے مخطوطات پر تبصرہ کیا ہے۔جس میں خوب ترنگ، امواج خوبی، بوجھ نرجن، جنگ نامہ، دیوان ریختہ وغیرہ شامل ہے۔اس کے علاوہ اس فہرست میں سعادت خاں رنگین کی کتابوں کے ۲۵ مخطوطات کو شامل کیا گیا ہے۔سید نجیب اشرف ندوی نے فہرست کی متعدد غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جن میں سے بعض یہ ہیں۔ترتیب میں کسی خاص اصول کی سختی سے پابندی نہیں کی گئی ہے۔خوب ترنگ کا نام امواج خوبی درج کیا گیا ہے جو دراصل اس کے فارسی ترجمہ وشرح کا نام ہے۔نرنجن کا نام بوجھ نرنجن لکھا گیا ہے۔منطق الطیر کا دکھنی ترجمہ وجدی دکھنی کا ہے مگر فہرست میں مترجم کا نام ضعیف درج ہے۔جنگ نامہ کا مصنف وحیدی کے بجائے سیوک کو قرار دیا گیا ہے۔

مذکورہ غلطیوں کے علاوہ اس کے روشن پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔اس فہرست سے نہ صرف یہ کہ متعدد کتابوں کے مخطوطات دریافت ہوئے ہیں بلکہ بعض ایسے مخطوطات کا پتہ چلتا ہے جو اردو ادب کی تاریخ بالخصوص دکنی تاریخ کی ترتیب میں کافی معاون ہوں گے۔مولانا کا یہ تبصرہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اسی تبصرے سے نصیر الدین ہاشمی

کواس حوالے سے تحقیق کرنے کا شوق ہوا۔انہوں قیام یورپ کے دوران ان ذخائر کو نہ صرف یہ کہ متعدد بار دیکھا بلکہ اس حوالے سے کئی مضامین بھی تحریر کیےاور'یورپ میں دکھنی مخطوطات' جیسی اہم کتاب بھی ترتیب دی۔

سید نجیب اشرف ندوی کے مذکورہ تبصرے کے بعد ماہنامہ معارف میں انڈیا آفس لائبری سے متعلق دو مضمون اور ایک تبصرہ شائع ہوا۔معارف جون 1929 کو نصیرالدین ہاشمی کا مضمون 'انڈیا آفس لندن کی بعض دکھنی قلمی کتابوں پر ایک سرسری نظر' شائع ہوا۔مضمون کے ابتدا میں مدیر معارف کا ایک نوٹ ہے:

''اگر معارف یہ فخر کرے کی انڈیا آفس لائبریری کے اردو ذخیرہ کا سب سے پہلے اسی نے پتا لگایا اور ہندوستان کی پبلک کواس سے روشناس کیا تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ایڈیٹر معارف نے اپنے قیام لندن کے زمانہ 1920ء میں سب سے پہلی دفعہ انڈیا آفس لائبریری کے اردو ذخیرہ کے تلاشی لی اوراس کی مرتبہ فہرست سے فن وار اردو کتابوں کی فہرست بنا کر معارف میں چھپوایا،اس کے بعد جب وہاں کی اردو فہرست شائع ہوئی تو سب سے پہلے اسی نے فہرست کی غلطیوں کو آشکار کیا۔یہ واقعہ لکھنے کی اس لیے ضرورت پیش آئی کہ ہمارے مضمون نگار دوست سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ معارف کے مضامین نے ان کے دل میں انڈیا آفس کی اردو کتابوں کے ذاتی مطالعہ و تحقیق کی گدگدی پیدا کی ، ہاشمی صاحب جامعہ عثمانیہ کے ان تعلیم یافتوں میں ہیں جن کی لیاقت، قابلیت اور علمی شوق و ذوق نے دوران تعلیم ہی میں خاص امتیاز حاصل کر لیا تھا،فراغت کے بعد انھوں نے ''دکن میں اردو'' کے نام سے دکن کے ابتدائی اردو ادب و شاعری کے دور کی تاریخ بڑی تحقیق سے مرتب کی۔اہل علما و ارباب فن نے اس کتاب کی بے حد تعریف کی۔اوراس کے لیے اعلیٰ حضرت سرکار دکن نے ایک گراں بہا انعام دینا چاہا مگر مصنف نے اپنے علمی شوق کا عملی ثبوت یہ دیا کہ نقد انعام کے بجائے یہ خواہش کی کہ اس مضمون کی مزید تحقیق و مطالعہ کے لیے ان کو انگلستان بھیجا جائے، چنانچہ سرکار عالی نے اپنی قدر دانی سے ان کی یہ درخواست قبول کی اور ایک سال کے لیے یورپ کا تعلیمی وظیفہ دے کر ان کو انگلستان روانہ کر دیا،موصوف آج کل انگلستان میں مقیم ہیں اور اردو اور خصوصاً دکھنی اردو کی قلمی کتابوں کی تلاش و تحقیق میں مصروف ہیں۔اوراس سلسلے میں معارف کی مذکورۂ بالا حیثیت کو ملحوظ رکھ کر ذیل کا مضمون بھیجا ہے،جس کو ہم شکریہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔''211ے

مذکورہ نوٹ سے بخوبی اندازا ہوتا ہے کہ ماہنامہ معارف کو انڈیا آفس کے مخطوطات کو اردو دنیا سے روشناس کرانے میں اولیت حاصل ہے۔معارف میں لائبریری میں موجود مخطوطات کی نہ صرف یہ کہ فہرست شائع ہوئی بلکہ ان کی خامیوں کی بھی نشاندہی کی گئی۔نصیرالدین ہاشمی نے انڈیا آفس لائبریری کے مخطوطات پر سرسری نظر ڈالی ہے۔ مضمون کے ابتدا میں ایک تمہید ہے جسے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ اردو خاص کر دکھنی کتابوں کا جو نایاب ذخیرہ موجود ہے اس کی کما حقہٗ تفصیل کیٹلاگ مذکور سے واضح نہیں ہوتی۔ اس میں نہ صرف فروگزاشتیں ہوئی ہیں بلکہ ان کی پوری صراحت و وضاحت بھی نہیں ہوتی ہے۔ جس کے باعث بعض نایاب کتابوں کا حال جب تک کتب خانہ مذکور سے استفادہ حاصل نہ کریں معلوم نہیں ہوسکتا۔ اور نہ صرف انڈیا آفس (لندن) میں بلکہ برٹش میوزیم۔ رائل سوسائٹی وغیرہ کے علاوہ انگلستان کے دیگر شہروں اور پیرس۔ مارسلز اور برلن کے کتب خانوں میں بھی دکھنی مواد موجود ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یورپ میں جو دکھنی مواد ہے اس کی پوری تقسیم تو یہاں نہیں ہوسکتی اور نہ اس کا یہ موقع ہے، یہاں میں چند کتابوں مختصر نوٹ پیش کرتا ہوں۔ یہ کتابیں جہاں تک میرا خیال ہے ہندوستان میں موجود نہیں ہیں کیوں کہ اب تک ان کے متعلق کسی نے بھی پوری صراحت نہیں کی ہے۔ بلکہ صرف کیٹلاگوں سے استفادہ کر کے انھیں کی معلومات کی بنیاد پر بعض قیاسی باتیں قائم کر لی گئی ہیں، اگر ان کتابوں کا وجود ہندوستان کے ذخیروں میں ہوتا تو جن قیاسی امور کا اظہار کیا گیا ہے اس کی ضرورت داعی نہ ہوتی۔''212؎

نصیر الدین ہاشمی نے مذکورہ مضمون میں انڈیا آفس لائبریری میں موجود ۱۲ دکھنی مخطوطات کی کیفیت اور اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جن میں مثنوی خاور نامہ، مثنوی قطب مشتری، پھول بن، پدماوت، ظفر نامہ، چندر بدن ومہیار، جنگ نامہ دعاے فاطمہ، امواج خوبی، عشق صادق، قصہ ابوشحمہ وغیرہ شامل ہیں۔ مذکورہ مخطوطات میں بعض ایسے بھی ہیں جو ہندستان میں کم یاب ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی کا ایک اور مضمون 'انڈیا آفس کے کیٹلاگ میں دکھنی مخطوطات کی فروگزاشتیں' معارف نومبر 1929 میں شائع ہوا۔ اس میں بلوم ہارٹ کی مرتبہ فہرست کی تصحیح کی گئی ہے۔ اس سے قبل سید نجیب اشرف ندوی نے اپنے تبصرے میں بلوم ہارٹ کی غلطیوں کی نشاندہی کی تھی جسے بعد میں نصیر الدین ہاشمی نے نہ صرف یہ کہ انڈیا آفس کے لائبریرین کے سامنے پیش کیا بلکہ خود بھی دکھنی مخطوطات کے متعلق اپنی تصحیحات پیش کیں۔ انڈیا آفس لائبریری کے مہتمم نے اسے نہ صرف یہ کہ دل سے قبول کیا بلکہ اس کی اصلاح بھی کرائی۔ مضمون کے ابتدا میں مدیر معارف کا ایک نوٹ ہے جو حسب ذیل ہے:

''ہاشمی صاحب نے یہ مضمون انڈیا آفس لندن میں بیٹھ کر لکھا ہے۔ موصوف نے انڈیا آفس کی اردو کتابوں کی مطبوعہ فہرست کے ان اغلاط کو جن کی معارف نے تنقید کی تھی، انڈیا آفس کے لائبریرین کے سامنے پیش کیا اور ساتھ ہی دکھنی مخطوطات کے متعلق اپنی تصحیحات پیش کیں جن کو شکریے کے ساتھ قبول کیا گیا، اور آئندہ ایڈیشن میں ان کی تصحیح کا وعدہ کیا گیا۔ موصوف نے اسی طرح دوسرے کتب خانوں کی فہرست کی بھی تصحیح کی اور اب وہ اپنے سفر سے کامیاب واپس آ گئے

ہیں۔‘‘213؎

مذکورہ نوٹ سے صاف ظاہر ہے کہ انڈیا آفس کے لائبریرین نے نہ صرف یہ کہ معارف کی تجاویز واصلاحات کو قبول کیا بلکہ دوسرے ایڈیشن میں اس کی اصلاح بھی کی۔ مضمون کے ابتدا میں نصیرالدین ہاشمی کی ایک تمہید ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

> ’’اس میں کوئی شک نہیں کہ بلوم ہارٹ نے انڈیا آفس کی ہندستانی مخطوطوں کی کیٹلاگ نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کی ہے اور بہترین معلومات کو جمع کر دیا ہے۔ مگر جہاں یہ کوشش قابل ستائش ہے وہاں چند فروگزاشتیں بھی ہوئی ہیں۔ مخطوطوں میں سب سے قدیم دکھنی کہے جا سکتے ہیں ان کے متعلق میں نے کسی قدر تفصیل سے کام کیا ہے۔ دوران ریسرچ میں مجھ کو ان کے متعلق جو فروگزاشتیں معلوم ہوئیں یہاں ان کی صراحت کی جاتی ہے۔‘‘214؎

نصیرالدین ہاشمی نے جن کتابوں کی فروگزاشتوں کی نشاندہی کی ہے ان میں امواج خوبی، خاور نامہ، علی نامہ، پھول بن، روضۃ الشہدا، قطب مشتری، سیف الملوک وبدیع الجمال، قصہ ابوشحمہ، چندر بدن ومہیار، منطق الطیر، ظفر نامہ، دوازدہ مجلس، بکٹ کہانی، بوجھ نرنجن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ عتیق احمد جیلانی مضمون کے اہم نکات کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’امواج خوبی‘‘ دکنی نہیں، گجراتی زبان میں ہے۔

خاور نامہ‘‘ ایک فرضی داستان ہے اور واقعات خلافت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ معلوم شدہ مثنویوں میں سب سے بڑی ہے۔

’’علی نامہ‘‘ کی تاریخ تصنیف 1071ھ صحیح نہیں لکھی گئی۔ اس مثنوی میں ملناڑ کی فتح کا قصیدہ شامل ہے۔ اور یہ فتح 1074ھ میں ہوئی۔ لہٰذا یہ مثنوی اس کے بعد کی تصنیف ہے۔

’’مجموعۂ مثنویات‘‘ میں کل تین مثنویاں ہیں۔ فہرست میں ’’پھول بن‘‘ اور ’’روضۃ الشہدا‘‘ کے نام ظاہر کیے گئے ہیں۔ مگر تیسری مثنوی کا نام درج نہیں ہے۔ یہ مثنوی ’’قطب مشتری‘‘ ہے۔ اور اس کا مصنف وجہی ہے۔

غواصی کی مثنوی ’’سیف الملوک‘‘ نسخۂ انڈیا آفس میں سنہ تصنیف والا شعر ہی نہیں ہے۔ نسخۂ برٹش میوزیم سے 1025ھ ظاہر ہوتا ہے۔ اور مطبوعہ نسخہ سے 1017ھ۔ مگر یہ دونوں غلط ہیں۔ کیوں کہ کتاب میں عبداللہ قطب شاہ کی مدح بہ حیثیت بادشاہ وقت کی گئی ہے۔ اور سلطان مذکور کی تخت نشینی کا سال 1035ھ ہے۔

> ’’روضۃ الشہدا‘‘ ولی گجراتی اورنگ آبادی کی نہیں بلکہ ولی ویلوری کی تصنیف ہے۔ ولی ویلوری کے بارے میں کچھ معلومات ان کی دوسری تصنیف مثنوی ’’رتن و پدم‘‘ سے حاصل ہوتی ہے۔ ’’روضۃ الشہدا‘‘ کی تصنیف 1130ھ میں ہوئی۔
>
> ولی گجراتی بھی دراصل ولی اورنگ آبادی ہیں۔

قصۂ ملکہ مصر اور مثنوی لعل و گوہر کے مصنف الگ الگ ہیں۔ اول الذکر سید محمد عاجز اور ثانی الذکر عارف الدین عاجز کی تصنیف ہیں۔

''قصۂ ابوشحمہ'' (فارسی) اردو اور ''قصۂ ابوشحمہ'' (دکنی) کے مصنف ہم نام ہیں۔ امین نے فارسی قصہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں لکھا اور دکنی ترجمہ ایک دوسرے امین نے 1090ھ میں بہ عہد ابوالحسن تانا شاہ کیا۔

''مثنوی پھول بن'' کے حوالے سے کیٹلاگ میں یہ وضاحت درج نہیں ہے کہ محمد حیدر ابن جعفر نے اس میں تین سو اشعار کا اضافہ کیا۔

''قصۂ چندر بدن و مہیار'' عزیز کی تصنیف ظاہر کی گئی ہے جب کہ اس کا مصنف مقیمی ہے۔

''منطق الطیر'' وجہ الدین وجدی کی تصنیف ہے۔ اس کی تین مثنویاں مشہور ہیں ''تحفۂ عاشقاں'' ''باغ جاں فزا'' اور ''منطق الطیر'' یا ''پنچھی باچہ''۔

''ظفر نامہ'' سے متعلق کیٹلاگ میں ظاہر نہیں کیا گیا ہے کہ یہ عہد ابوالحسن تانا شاہ کی تصنیف ہے۔

''دوازدہ مجلس'' بھی دکھنی تصنیف ہے اور اس کا مصنف عطا ہے۔

کیٹلاگ میں مذکورہ نسخۂ دیوان ولی ابولمعالی کے فرزند کا مرتب کردہ ہے۔ ابولمعالی وہی بزرگ ہیں جن کے ساتھ ولی نے دہلی کا سفر کیا تھا۔

محمد افضل گوپال کی تصنیف ''بکٹ کہانی'' پنجابی میں ہے۔

''بوجھ نرنجن'' بھی غیر دکھنی تصنیف ہے۔''215ے

لندن آفس لائبریری کے فارسی مخطوطات کے حوالے سے سید سلیمان ندوی کا مختصر تبصرہ معارف 1939 میں شائع ہوا۔ جلد اول کی ترتیب مشہور فاضل ڈاکٹر ایتھے نے 1903 میں مرتب کی تھی۔ دوسری جلد کا کام بھی انہوں نے کیا تھا البتہ مکمل اور نظر ثانی کا کام ایڈورڈ ایڈورڈس نے انجام دیا جسے آکسفورڈ یونیورسٹی نے 1937 میں شائع کیا۔ کیٹلاگ میں مولانا رومی کی فیہ مافیہ کے قلمی نسخہ کو نادر و نایاب ظاہر کیا گیا۔ سید سلیمان ندوی نے اس حوالے سے لکھا ہے کہ یہ کتاب 1929 میں مطبع معارف سے شائع ہو چکی ہے۔ تبصرے کے آخر میں فہرت کے نفس مضمون کے علاوہ ڈاکٹر ایتھے کے لیے کلمہ تحسین بھی ہے۔

تبصرے میں نہ صرف یہ ہے کہ چند اہم کتابوں کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے بلکہ جامع التواریخ، گفتہ جعفر جٹلی، عطریہ نورس شاہی، تائید البصارت، خلاصتہ العیش وغیرہ پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس سے نہ صرف اس فہرست بلکہ کتابوں کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ انڈیا آفس لائبریری کے ذخائر کی نشاندہی کے بعد یورپی کتب خانوں کے حوالے سے نصیر الدین ہاشمی کے متعدد مضامین ماہنامہ معارف میں شائع ہوئے۔

کیمبرج کی اردو قلمی کتابوں پر ایک سرسری نظر کے عنوان سے نصیر الدین ہاشمی کا مضمون معارف اگست

1929 میں شائع ہوا۔کیمبرج یونیورسٹی کے ذخائر کی فہرست پروفیسر براون نے 1896 میں مرتب کی تھی اور پھر 1900 میں اضافہ وترمیم شدہ اڈیشن شائع کیا گیا۔1922 میں اس کا تکملہ شائع کیا گیا تھا۔اس کیٹلاگ میں نہ صرف یونی ورسٹی بلکہ دیگر کالجوں کے ذخائر کو بھی شامل کیا گیا ہے۔بلوم ہارٹ کی مرتبہ فہرست کے بالمقابل اس میں کم وضاحت ملتی ہے۔نصیرالدین ہاشمی نے کنگ کالج کے ذخائر کی جمع آوری کے حوالے سے لکھا ہے:

’’یہ مخطوطات اڈورڈ افریم پوٹ (Edward Eproim Pote) نے داخل کیں۔ یہ پوٹ،متوطن لیٹن (Eton) کالڑکا تھا۱۷۷۳ء میں اس نے کنگ کالج سے ڈگری حاصل کی اور کلائیو(Clive) کی ماتحتی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم ہوگیا۔اپنے ایک خط میں جو کارتیج کے نام۲فروری۱۷۸۸ءکو پٹنہ سے روانہ کیا گیا ہے لکھتا ہے کہ: جس وقت سے وہ ہندوستان پہنچا ہے،مشرقی علوم کی کتابوں کو جمع کرنے کا متمنی رہا ہے اوراپنی کوشش میں کام یاب ہوکر۵۵۰قلمی نسخے فراہم کرلیے ہیں۔یہ قلمی نسخے آہنی صندوقوں میں انگلستان پہنچے۔۔۔۔یہ خطوطات دراصل اولاکرنیل پولیر(olonel PolierC) کی ملک تھے۔۔۔۔۱۷۸۸ء میں یہ یورپ واپس آیا۔۔۔۔پولیر(Polier)اپنا تقع کردہ پوراخیرہ یورپ نہیں لا سکا تھا،جولوٹ کے ہاتھ لگااور اس نے چندسال بعدیورپ کووہ زخیرمنتقل کردیا۔216؎

مذکورہ تمہید کے بعد کیمبرج یونیورسٹی،کنگ کالج،کاپرکالج میں موجود مخطوطات کے ذخائر کی فہرست درج کی گئی ہے۔اس فہرست میں ساٹھ سے زائد کتابیں شامل ہیں۔فہرست کے بعد ولی کے تین دواوین،فارسی ودکھنی مرثیوں کی بیاض،مثنوی سیف الملوک کے دو نسخے،پدماوت کے دونسخے اورترجمہ تاریخ طبری کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔مخطوطات کے حوالے سے نصیرالدین ہاشمی کا ایک اور مضمون’پیرس کے اردو مخطوطات کی فہرست‘ کے عنوان سے جنوری 1930 میں شائع ہوا۔پیرس کے کتب خانہ میں موجود اردو مخطوطات کی ایک فہرست A.Cabaton نے 1912 میں مرتب کی تھی۔نصیرالدین ہاشمی نے کتب خانہ میں موجود مخطوطات کی فہرست نقل کرنے سے قبلA.Cabaton کے مرتبہ کیٹلاگ کے نقائص کی نشاندہی کی ہے۔جوحسب ذیل ہے:

’’یہ کیٹلاگ،انڈیا آفس یا برٹش میوزیم کے کیٹلاگ کی طرح صراحت ووضاحت سے نہیں ہے، اور پھرکئی حیثیت سے نامکمل اورغیرصحیح ہے۔اول تو یہ کہ اردو مخطوطوں کو ہندوستانی (Indien) سے موسوم کرکے جو فہرست بنائی گئی ہے اس میں۱۴۲ کتابیں ہیں گرمنجملہ ان کے صرف۱۵۱ اردو ہیں۔باقی سنسکرت،مرہٹی،تلنگی،تامل،فرنچ وغیرہ ہیں۔۔۔۔دوسری فروگذاشت یہ ہوتی ہے کہ کئی ایک مخلوطے جوایک دوسرے کے ساتھ مجلد ہیں،ان کا ذکر بھی نہیں ہے۔۔۔۔تیسری فروگذاشت یہ ہے کہ اندراج فہرست میں کوئی خاص ترتیب فن یا حروف تہجی وغیرہ کی نہیں رکھی گئی ہے۔‘‘217؎

نصیرالدین ہاشمی کے بیان کردہ مذکورہ نقائص اپنی جگہ محققین اردو بالخصوص مخطوطات پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کیٹلاگ کافی اہم ہے۔مذکورہ اغلاط کی نشاندہی کے بعد نصیرالدین ہاشمی نے مختلف عناوین کے تحت اردو مخطوطات کی فہرست کا ایک انتخاب پیش کیا ہے۔جس میں مذہبی ،تاریخی ،قصص،منظومات اور متفرقات جیسے عناوین شامل ہیں۔اور پھر ان عناوین کے تحت 51 کتابوں کی فہرست نقل کی گئی ہے۔جن میں نورنامہ،رسالہ عقائد،ہدایت نامہ،عاشورنامہ،نکات الشعرا،گلشن ہند،تاریخ آسام،ہشت بہشت،پدماوت،سحرالبیان،داستان امیرحمزہ،یوسف زلیخا،کلیات سودا،دیوان عاجز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس مخطوطات میں بعض اس قدر اہم ہیں کہ ہندستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں دستیاب نہیں ہیں۔

یورپ میں موجود اردو مخطوطات کے حوالے سے نصیرالدین ہاشمی کا ایک اور مضمون 'یورپ کے چند غیر دکھنی مخطوطات' جولائی 1930 میں شائع ہوا۔یورپ میں موجود مخطوطات کی فہرست کے حوالے سے کافی اہم ہے۔ مضمون کے ابتدا میں ایک تمہید ہے جسے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''انگلستان،اسکاٹ لینڈ اور فرانس کے دکھنی مخطوطوں کے متعلق میرے متعدد مضمون ہدیۂ ناظرین ہو چکے ہیں۔اور ان کی پوری تفصیلی صراحت کافی وضاحت کے ساتھ میری زیر تالیف کتاب ''یورپ کے دکھنی مخطوطے'' میں ہوگی،یہاں میں ان مخطوطون کی صراحت کرتا ہوں جن کو یورپ کی کیٹلاگون میں دکھنی لکھا گیا ہے،مگر دراصل وہ دکھنی نہیں ہیں،اور نیز ان کا ذکر مقصود ہے جن کو یہاں دکھنی خیال کیا گیا ہے، چونکہ یہ میری زیر تالیف کتاب سے متعلق ہیں اس لئے ان کی صراحت مفید ہوسکتی ہے۔''218ے

مذکورہ تمہید میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ یورپ میں موجود دکھنی مخطوطات کو 'یورپ کے دکھنی مخطوطات' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔اس مضمون میں ان مخطوطات کی وضاحت کی گئی ہے جو غیر دکھنی ہیں جبکہ انہیں فہرست میں دکھنی مخطوطات لکھا گیا ہے۔جن کی تعداد چھ ہے اور وہ یہ ہیں نورنامہ،مجموعہ عاشقین،بکٹ کہانی،تیرہ ماسہ،امواج خوبی اور بوجھ نرنجن وغیرہ۔نصیرالدین ہاشمی نے نہ صرف یہ کہ ان کی وضاحت کی ہے بلکہ دلائل سے ان کا غیر دکھنی ہونا ثابت بھی کیا ہے۔ان کتابوں کے نفس مضمون پر بھی مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔

معارف جولائی 1931 میں نصیرالدین ہاشمی کا ایک اور مضمون 'یورپ میں ارکاٹ کے دکھنی مخطوطات' شائع ہوا۔ارکاٹ کا علاقہ ایک مدت تک علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔نہ صرف یہ کہ وہاں مختلف علوم فنون کے ماہرین پیدا ہوئے بلکہ مختلف ریاستوں سے علم کے طلب گاروں نے وہاں کا رخ کیا۔سلاطین ارکاٹ بھی بڑے علم پرور رہے ہیں۔مضمون کے ابتدائی چند صفحات میں نہ صرف یہ کہ سلطنت ارکاٹ کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے بلکہ نواب محمد علی والا

جاہ اوران کے جانشینوں کی علم دوستی کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔نصیرالدین ہاشمی ان کی علم دوستی کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان کے زمانے میں بڑے بڑے علمائے ذی وقار، مشائخ طریقت، اطبائے حاذق، شعرائے نام دار جمع تھے۔جن کے عربی، فارسی اور اردو تصنیفات موجود ہیں۔ان ہل علم اور شعراء کے نام پیش کیے جاتے ہیں جو اس زمانے میں دربار ارکاٹ سے وابستہ تھے۔۔۔۔خاص خاندان والا جاہی کے بعض افراد بھی شاعری کرتے تھے۔۔۔۔جب خاندان شادی کو شعر و شاعری کا مذاق ہو اور حکمران وقت شعر وسخن سے دل چسپی لینے کے علاوہ خود بھی مشق سخن کرتا ہو تو ظاہر ہے کہ امرائے دربار میں بھی شعر وشاعری کا عام چرچہ ہوگا۔''219ؔ

علاقہ ارکاٹ گر چہ ایک مدت تک علم وادب کا گہوارہ رہا ہے اور تصنیف وتالیف کے بہت سارے کام وہاں ہوئے ہیں مگر یورپ کے کتب خانوں میں بہت کم مخطوطات ملتے ہیں۔نصیرالدین ہاشمی نے مذکورہ مضمون میں یورپ میں موجود صرف تین کتابوں کے مخطوطات کی نشاندہی کی ہے۔جن میں مولانا باقر کی دس کتابوں کے بارہ قلمی نسخے۔مولانا محمد غوث شرف الملک مرحوم کا ترجمہ 'کیدانی'۔سرشار کی مثنوی چار گلشن شامل ہیں۔نصیرالدین ہاشمی نے نہ صرف یہ ان کتابوں کے مخطوطات کی موجودگی کی نشاندہی کی ہے بلکہ ان پر مفصل روشنی بھی ڈالی ہے۔کتاب کے نفس مضمون پر بھی تفصیل سے لکھا ہے۔

معارف نومبر دسمبر 1924 کے دو شماروں میں مولوی نذیر احمد کا مضمون 'عبدالرحیم خان خاناں اور اس کا کتب خانہ اور اس کی موجودہ بقیہ یادگاریں' اور 'عبدالرحیم خان خاناں کے کتب خانے کی قلمی کتابیں' کے عنوان سے شائع ہوا۔پہلے مضمون میں تفصیل کے ساتھ عبدالرحیم خان کے سوانحی حالات اور خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔نیز احمد آباد میں موجود ان کتب خانے کے احوال بیان کیے گئے ہیں۔مولوی نذیر احمد مضمون کے ابتدا میں لکھتے ہیں:

''اب میں آپ کو چند عدیم النظیر بے مثل، بیش بہا، کتابوں کی طرف متوجہ کروں گا، جن کی نظیر دنیا میں نہیں، اسی سے آپ کو خانخان کی علمی قابلیت، فضیلت، نکتہ دانی اور قدر شناسی کا پتہ چلے گا ،مبارک ہیں دو کتب خانے جن مین آج خانخانان کے کتب خانہ کا کوئی بیش بہا نسخہ موجود ہے ،ان پاکیزہ، اور ستھرے نسخون سے فقیر نے اپنی سیاحت کے زمانہ میں آنکھوں کو ٹھنڈک بخشا ہے اور انگریزی نوٹ لکھ کر ان کی اشاعت کی ہے۔1917-18 کے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے رسالوں میں ان کتابون کے مختصر حالات معلوم فرما سکتے ہیں۔''220ؔ

مذکورہ تمہید سے عبدالرحیم خان خاناں کے علمی ذوق اور کتب خانہ کی اہمیت کا بخوبی اندازا ہوتا ہے۔اس کتب خانے میں کتابوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔بعض کتابیں نہ صرف یہ کہ بہت قدیم ہے بلکہ ہندستان کے کسی اور کتب خانے میں نہیں ملتی۔مذکورہ مضمون سے چند کتابوں کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔'رسالہ خواجہ عبداللہ انصاری' یہ ایک

تصوف واخلاق اورمناجات ونصائح کا رسالہ ہے۔جس کے لکھنے والے سلطان مشہدی ہیں۔تاریخ کتابت 921ھ ہے۔اس رسالے میں عبدالرحیم خان خاناں، جہانگیراورشاہ جہاں وغیرہ کی مہریں ہیں۔'مجالس العشاق' عشاق کے مسائل پرمشتمل تصوف کی کتاب ہے۔جو کہ امیر تیمور کے پرپوتے سلطان حسین کی لکھی ہوئی ہے۔جن کی وفات 911ھ میں ہوئی۔یہ کتاب 999ھ میں عبدالرحیم خان خاناں کے کتب خانہ میں داخل ہوئی۔ہندستان کی لائبریریوں میں کم یاب ہے۔ان کے علاوہ رسالہ تعبیر رویا،شش رسالہ سعدی، یوسف زلیخا،کلیات سعدی،قاموس وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جو نایاب ہیں۔اس لائبریری میں قرآن شریف کا ایک انمول مخطوطہ بھی موجود ہے جومختلف حیثیتوں سے منفرد ہے۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو کتابیں جمع کرنے اور مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ان کے اس شوق کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حبیب گنج میں موجودان کے کتب خانہ میں کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔معارف میں ان کے متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں۔معارف اپریل 1927 کے شمارے میں ان کا ایک مضمون 'چندنایاب کتابیں' شائع ہوا۔مضمون کے ابتدا میں مدیر معارف کی طرف سے ایک نوٹ ہے۔مدیر معارف لکھتے ہیں:

> '' مولانا ممدوح کا شماراس وقت کے مشہورعشاق کتب میں ہےاور یہ عشق ناکام نہیں۔ہر مہینے ان کو کچھ نہ کچھ کتابیں بہم پہنچتی رہتی ہیں۔ان کے کاص کتب خانہ حبیب گنج (علی گڑھ) میں عربی ،فارسی نوادر کا بڑاذخیرہ فراہم ہے۔جب کبھی کوئی نئی چیزان کے ہاتھ آتی ہےتواپنے والا ناموں میں اس کی اطلاع اڈیٹر معارف کوضرور کرتے ہیں۔'' 221؎

شروانی صاحب کتابوں کے بڑے رسیا تھے۔حرمین کی زیارت کے لیے گئےتو وہاں بھی نادرونایاب کتابوں کی دریافت میں مشغول رہے۔وہاں سے لوٹ کر ہندستان آنے کے بعد مدینہ کی لائبریریوں میں موجود کتابوں کی اطلاع ماہنامہ معارف کوایک مضمون میں لکھ بھیجا۔مذکورہ مضمون میں عربی وفارسی کی ۹ نادر کتابوں کےنسخوں کا تذکرہ ہے۔جن میں التقصی ،ارتیاح الاکباد فی ریاح فقدالاولاد،اخبارالکریم وغیرہ۔ان میں بعض ایسی بھی کتابیں ہیں جو ہندستان میں نایاب ہیں۔

ماہنامہ معارف نے ہمیشہ سے نادرونایاب مخطوطات کی دریافت،کم یاب کتابوں کی اطلاع اور کتب خانوں کی فہرست کے حوالے مضامین کوفوقیت دی ہے۔یہی وجہ ہے کہ قدیم کتابوں اورمخطوطوں پر بڑی تعداد میں مضامین شائع ہوئے ہیں۔اس سلسلے کا ایک اورمضمون 'پٹنہ رامپور اور لکھنؤ کے کتب خانوں کی سیراوراس کی روداد کے عنوان سے شائع ہوا۔مولانا سید ہاشم ندوی کا یہ مضمون کتب خانوں کے ذخائر کے حوالے اہمیت کا حامل ہے۔مضمون کے

ابتدا میں مدیر معارف کا ایک نوٹ ہے:

''دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن نے اپنے یہاں کی بعض زیر طبع کتابوں کے بعض ناقص اجزا یا دوسرے صحیح نسخوں کی تلاش کے لیے اپنی طرف سے مولوی سید ہاشم صاحب ندوی کو پچھلے دنوں نامزد کیا تھا، مولوی صاحب نے سفر کی واپسی کے بعد ایک مفصل روئداد دائرہ کے ارکان کے سامنے پیش کی، دائرہ شعبہ علمیہ کے ارکان نے اس کو بہت پسند کیا اسی روداد کا خلاصہ دائرہ کے معتمد نواب مہدیار جنگ بہادر (خلف الصدق نواب عماد الملک مرحوم) نے اپنے ایک مکرمت نامہ کے ساتھ معارف میں چھپنے کے لیے بھیجا ہے جس کو ہم شکریے کے ساتھ شائع کرتے ہیں اور مولوی سید ہاشم صاحب ندوی کو ان کی اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ نواب صاحب ممدوح لکھتے ہیں،''مولوی سید ہاشم صاحب حال میں دائرۃ المارف کی جانب سے شمال ہند مثلاً لکھنؤ، رامپور اور پٹنہ وغیرہ بھیجے گئے تھے تاکہ وہ وہاں کے کتب خانوں میں کتب نادر کا پتہ لگائیں، اور ایسی کتابوں کا نام پیش کریں، جن کی تصحیح اور طباعت دائرۃ المعارف اپنے ذمہ لے سکے۔ انہوں نے اس سفر کے بعد اپنی رپورٹ جو مرتب کی اور جس میں بعض عمدہ کتابوں کا ذکر کیا، وہ علمی نقطۂ نظر سے بہت بیش قیمت ہے چنانچہ دائرہ موصوف کے شعبہ علمیہ نے اس کو پسند کیا اور اس کے مرتب کنندہ کا شکریہ ادا کیا، اب اس رپورٹ کا خلاصہ آپ کے پاس اس رقعہ کے ساتھ روانہ کیا جاتا ہے، غالباً اس کو آپ بھی پسند کریں گے، اور اندازہ کر سکیں گے کہ مولوی سید ہاشم صاحب نے کیسی خدمت کی ہے، بہرحال (بشرطیکہ کوئی عمر مانع نہ ہو) آپ اس کو اپنے رسالہ معارف میں طبع کر دیں تو ممنون ہوں گا کیوں کہ یہ اہل علم کی دلچسپی کا باعث ہوگا، اور کتب قدیمہ کے متعلق اکثر اشخاص کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔''[222]

دائرۃ المعارف نے مولانا ہاشم کو مذکورہ علاقوں میں موجود مخطوطات کی سیر کے لیے روانہ کیا تھا۔ جس کی روداد انہوں نے دائرۃ المعارف کو پیش کی تھی۔ معارف کا مذکورہ مضمون اسی روداد کا خلاصہ ہے۔ مولانا نے پٹنہ لائبریری، رامپور لائبریری، کتب خانہ ندوۃ العماء، کتب خانہ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی، کتب خانہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی، کتب خانہ مولانا ناصر حسین، کتب خانہ علویہ راجا صاحب سلیم پور اسٹیٹ لکھنؤ کی سیر کی تھی اور ان میں موجود قدیم، نادر و نایاب مخطوطات کی رپوٹ دائرۃ المعارف کو پیش کی تھی۔ مولانا نے مذکورہ مضمون میں چند اہم کتابوں کی تفصیل بھی پیش کی ہے۔ یہ کتابیں نہ صرف یہ کہ قدیم و نایاب ہیں بلکہ ہماری علمی و ادبی وراثت کا قابل قدر کارنامہ ہیں۔

ذخیرہ مخطوطات کی تلاش کے حوالے سے شیخ عبدالقادر کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ انہوں نے حکومت کی اعانت سے محض تین ماہ کی قلیل مدت میں 116 مخطوطات جمع کیے تھے۔ جو کہ مختلف علوم وفنون کے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ 1917 میں شیخ عبدالقادر نے مخطوطات کے تحفظ اور فراہمی کے لیے ایک عرضداشت گورنمنٹ کو پیش کی تھی۔ شیخ

عبدالقادر کی تلاش وجستجو سے دریافت کیے گئے مخطوطات ممبئی یونیورسٹی کو سپرد کیے گئے۔ ممبئی یونیورسٹی میں پہلے سے موجود مخطوط کو ملا کر ان کی تعداد 224 ہوگئی۔ جس کی فہرست انہوں نے تیار کر کے 1953 میں شائع کی تھی۔ مذکورہ فہرست کے حوالے سے معارف جولائی 1936 کو پرفیسر سید نواب علی کا مضمون 'ممبئی یونیورسٹی کی فہرست مخطوطات' شائع ہوا۔ مضمون کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

''مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں نہ صرف بے شمار کتب خانے مشرق ومغرب میں جمع کر کے عام وخاص کے لیے علوم وفنون کے خزانوں کا منہ کھول دیا بلکہ سب سے پہلے فہرست نگاری کو فن کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا، اگر ابن خلدون فلسفہ تاریخ کا موجد مشہور ہے، تو ابن الندیم کو فن فہرست نگاری کا معلم اول کہنا چاہیے، اس کی کتاب الفہرست جس میں ۳۷۷ھ تک علوم و فنون کی وہ تمام کتابیں جو زبان عربی میں ممالک عرب وعجم میں تصنیف ہوئیں مع طبقات مصنفین ان کے مناقب ومثالب اور مختصر تبصرہ ان تمام علوم وفنون پر جو اس وقت تک ایجاد ہوئے ایک شاندار علمی کارنامہ ہے۔''223

اس ذخیرہ میں زیادہ تر فارسی مخطوطات ہیں البتہ چند مخطوطات عربی اور دکنی زبان میں بھی ہیں۔ مذکورہ مضمون میں نہ صرف یہ کہ چند اہم قلمی نسخوں کا تعارف کرایا گیا ہے بلکہ حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں یورپی فہرست نگاروں کی اغلاط کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ جن کتابوں کے مخطوطات پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں اشجار واثمار، مظہر العجائب، نامہ خیالات، قصیدہ مصنع، ہشت بہشت وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ گجرات کے ریختہ گویوں کا ایک قدیم تذکرہ 'مخزن الشعراء' بھی موجود ہے جسے قاضی نورالدین نے مرتب کیا تھا۔ اس نسخہ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ 1851،52 میں تصحیح کی غرض سے مرزا غالب کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ غالب کی رائے حاشیے پر موجود ہے۔ شیخ عبدالقادر مخطوطات کی حفاظت اور جمع آوری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''بالخصوص علوم مشرقی کے تنقیدی مطالعے اور تحقیقات کے لیے مخطوطوں کے جمع کرنے کی اہمیت پر جس قدر بھی زور دیا جائے گا وہ ہرگز مبالغہ نہیں سمجھا جائے گا۔ یورپ کے کتب خانوں میں عمدہ عمدہ مخطوطات کے بڑے ذخیرے ہیں۔ ان کے جمع کرنے پر جو روپیہ صرف کیا گیا ہے اور جو محنت اٹھائی گئی وہ بالکل حق بہ جانب ثابت ہوئی۔۔۔ ہندستان سے بکثرت مخطوطات باہر چلے گئے مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ بہت سے مخطوطات اب بھی ہندستان میں موجود ہیں۔ ان موجودہ مخطوطات میں خوش قسمت مخطوطات وہ ہیں جو حیدرآباد، رام پور، ٹونک، پٹنہ، بنگال، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔''224

پروفیسر سید نواب علی کا مذکورہ مضمون مخطوطات کی دریافت اور اس کی حفاظت کے حوالے سے بہت اہم

ہے۔اس سے نہ صرف یہ بعض قدیم اورنایاب کتابوں کی دریافت ہوئی ہے بلکہ ہمارے علمی خزانے میں اضافہ بھی ہوا ہے۔اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ بعض یورپی فہرست نگاروں کی اغلاط کی نشادہی اوران کی اصلاح کا کام بھی کیا گیا ہے۔ان مضامین کے علاوہ مخطوطات کی تلاس وتحقیق کے حوالے سے متعدد مضامین معارف میں شائع ہوئے جو 1947 کے بعد ہیں اس لیے ان پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ان مضامین میں سرجادوناتھ سرکار کے محفوظہ مخطوطات معارف 1960 اور ذخیرہ ہادی بلگرامی کے چند مخطوطات معارف 1960 قابل ذکر ہیں۔

شعرا کے تذکروں سے متعلق تحقیق

معارف کے تحقیقی سرمایہ میں شعرا کے تذکروں کے حوالے سے متعدد مضامین ملتے ہیں۔ان مضامین کی مختلف نوعتیں ہیں۔البتہ بیشتر مضامین میں کم یاب تذکروں کا تعارف،تذکروں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ،بعض تذکروں کی روشنی میں شعرا کے احوال کی تحقیق کوموضوع بنایا گیا ہے۔تذکروں پر شائع ہونے والے مضامین کی ایک بڑی تعداد ہےالبتہ یہاں صرف 1947 تک شائع ہونے والے مضامین پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

معارف اگست 1923 کو عبدالسلام ندوی کا مضمون 'تذکرہ مصحفی قلمی' شائع ہوا۔مذکورہ قلمی نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کا مملوکہ ہے۔اس نسخے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ نسخہ نہ صرف یہ کہ مصحفی کی زندگی میں لکھا گیا بلکہ خود ان کی تحریر کا ایک حصہ بھی شامل ہے۔نسخہ ندوہ میں 196 شعرا کا تذکرہ ہے جبکہ نسخہ رامپور میں 192 اور مولوی عبدالحق کے مطبوعہ نسخہ (1923) میں 193 شعرا کے احوال کا تذکرہ ہے۔مذکورہ تمام نسخوں سے یہ نسخہ منفرد ہے۔مولانا عبد السلام ندوی نے مذکورہ مضمون میں نہ صرف یہ کہ مصحفی کے حالات پر مفصل روشنی ڈالی ہے بلکہ تذکرہ کے قلمی نسخہ کی کیفیت کا بھر پور مطالعہ کیا ہے۔متعدد تذکروں کی مدد سے آب حیات کے بعض بیانات کی صحت پر بھی سوال قائم کیا ہے۔اس کے علاوہ ندوہ کے کتب خانہ میں مختلف علوم وفنون کے متعدد نسخے موجود ہیں۔ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری نے ندوہ کے ایک قلمی نسخہ 'تذکرہ الشعرا' کو مرتب کر کے 1980 میں شائع کر دیا ہے۔

حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا مضمون معارف مارچ 1924 کو تذکرہ مخزن الغرائب کے عنوان سے شائع ہوا۔مذکورہ تذکرہ احمد علی ہاشمی کا تحریر کردہ ہے۔یہ تذکرہ بہت ضخیم ہے۔جسے 1218ھ میں لکھا گیا۔دراصل ہاشمی صاحب نواب ذولفقار الدولہ کے دربار میں ملازم تھے۔وہاں اہل کمال کا مجمع تھا۔اسی فیض صحبت کا نتیجہ یہ تذکرہ ہے۔مذکورہ مضمون میں حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے تذکرہ مخزن الغرائب کے قلمی نسخہ کا تعارف کرایا ہے۔مضمون کے ابتدا میں انہوں احمد علی ہاشمی کے حالات اور تذکرے کی کیفیت پر روشنی ڈالی ہے۔مذکورہ تذکرے سے انشاء کے حالات کو آب حیات سے مقابل کر کے لکھا ہے کہ بعض واقعات میں ظلمات ونور کا فرق معلوم ہوتا ہے۔225ے مضمون کے آخر میں مدیر معارف کا ایک نوٹ ہے جس سے اندازا ہوتا ہے کہ مخزن الغرائب کا ایک نسخہ دارالمصنفین میں بھی موجود ہے:

> ''معارف: تذکرہ مخزن الغراب کا ایک خاصہ نسخہ دارالمصنفین کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔
> یہ نسخہ لنبی تختی کے ۱۰۱۸ اصفحات پر مشتمل ہے۔انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنو کے کسی خاندان سے
> یہاں منتقل ہوکر آیا ہے،مولانا شبلی مرحوم کی خرید کردہ ہے،تذکرہ کی تصنیف کی تاریخ 1218 ہے،
> اور یہ نسخہ 1220 کا لکھا ہوا ہے،گویا یہ خود مصنف کی زندگی کا ہے،اس میں حروف تہجی کی ترتیب

سے عجم و ہند کے ہر پایہ کے شعرا کے سوانح اور انتخابات اشعار ہیں، گویا یہ فارسی گو شعرا کے ناموں کی انسائیکلو پیڈیا ہے، اور ہندوستان کی تالیف کردہ ''مجمع الفصحا'' ہے، تذکرہ کی زبان عام دستور کے مطابق فارسی ہے، قدیم شعرا کے سوانح میں ہر قسم کی رطب و یابس باتین مذکور ہیں۔'' 226

مذکورہ تذکرے کے حوالے سے مولوی محفوظ الحق کا ایک مقالہ 'تذکرہ مخزن الغرائب پر ایک نظر' معارف جون 1924 میں شائع ہوا۔ مولوی صاحب کا یہ مضمون حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے شروانی کے بالمقابل نہ صرف یہ کہ تذکرہ نگار کے سوانحی حالات پر قدر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے بلکہ ان کی زندگی کے بعض ایسے پہلو کو بھی بیان کیا ہے جس کا ذکر بمشکل کہیں اور ملتا ہے۔ مولوی صاحب نے ان کی اس رائے سے بھی اختلاف ظاہر کیا ہے کہ ہاشمی نے مذکورہ تذکرہ مرزا نجف خاں کے فیض صحت سے تحریر کیا تھا۔ اس طرح معارف کی نوٹ سے اختلاف کرتے ہوئے ندوہ کے نسخے کو قدیم ترین اور بوڈلین کے نسخہ کو دوسرے نمبر پر جبکہ نسخہ خدابخش کے بارے میں لکھا ہے کہ قدیم نہیں ہے۔ 227

تذکرہ علی الکردیزی کے عنوان سے سید تمکین کاظمی کا مقالہ فروری 1928 میں شائع ہوا۔ انہوں نے 1173ھ کے مکتوبہ قلمی نسخے کی بنیاد پر اس تذکرے کا تعارف کرایا ہے۔ یہ مخطوطہ خواجہ غلام رازی خاں جیو کے حسب الارشاد میں منتقل ہوا۔ مضمون کی ابتدا میں ایک تمہید ہے جس سے نسخے کی اہمیت کا اندازا ہوتا ہے:

''علی الکردیزی کا تذکرہ الشعراء ریختہ کا نام ہی سننے میں آتا ہے۔۔ بہت کم نسخے لوگوں کے پاس ہیں۔ اتفاقا پرسوں ہمیں ایک نسخہ مطالعہ کے لیے ملا جو اس وقت پیش نظر ہے، اکثر مورخین نے اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر تفصیل کم ملتی ہے۔ گارساں دتاسی نے اپنے تذکرہ الشعرا ہند کی دوسری جلد میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ وہ اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں۔ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی فرانس جلد پنجم میں بھی اس کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے اپنی فہرست میں لکھا ہے کہ یہ تذکرہ دہلی میں 1065 میں انجام کی وفات 1159ھ کے چھ سال بعد لکھا گیا۔ اس میں سو شعرا کا حال ہے۔ اور میر تقی میر کے تذکرے کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔'' 228

مولوی عبدالحق مقدمہ تذکرہ ریختہ گویاں (1933) میں 1172ھ کے مکتوبہ ایک نسخہ کا ذکر کیا ہے البتہ اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا اور نہ ہی کوئی خاص کیفیت لکھی ہے۔ اس طرح معلوم نسخہ میں 1173ھ کا نسخہ اہمیت کا حامل ہے۔ تذکرہ علی الکردیزی انڈیا آفس میں 1180ھ کے نسخہ کا پتہ چلتا ہے۔ جو وہاں کی قدیم ترین کتابوں میں سے ہے البتہ مضمون نگار نے جس نسخہ کا تعارف کرایا ہے وہ 1173ھ کا مکتوبہ ہے۔ جس میں ۹۴ شعرا کے احوال ہیں اور پھر نمونہ کے طور پر شعرا دکن کے احوال پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

نصیر الدین ہاشمی کا شمار مخطوطہ شناسوں میں ہوتا ہے۔ قدیم قلمی کتابوں کی تلاش ان کا پسندیدہ مشغلہ رہا

ہے۔ معارف میں قدیم کتابوں کی تلاش اور مخطوطات کی دریافت کے حوالے سے ان کے متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی کا مضمون 'تمنا کا تذکرۃ الشعرا' معارف فروری 1935 میں شائع ہوا۔ جس میں تمنا کے تذکرۃ الشعرا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون کے ابتدا میں ان خیالات کا اظہار کیا گیا ہے:

''تاریخ ادب اردو کے لیے تذکرہ کی اہمیت کو سب ارباب ادب نے تسلیم کیا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کے احساس کے باوجود قدیم تذکروں کو طباعت کا جامہ پہنانے پر اب تک جیسی چاہئے ویسی توجہ نہیں ہوئی۔ جس طرح دکن کی شاعری کو شمالی ہند کی شاعری پر اولیت کا تفوق حاصل ہے۔ اسی طرح تذکرہ کی تالیف میں بھی دکن کو اولیت کا فخر حاصل ہے۔ دکن میں مرتب شدہ تذکرے شمالی ہند کے تذکروں سے قدیم ہیں۔ چنانچہ اب تک قدیم دکھنی تذکروں میں سے (1) تذکرہ حمید (گلشن گفتار مرتبہ 1164) (2) تحفۃ الشعرا مرتبہ 1165ھ (3) تذکرہ فتوت (ریاض حسنی مرتبہ 1168ھ) اور تذکرہ شفیق (چمنستان شعرا، مرتبہ 1175ھ) کا پتہ چل چکا ہے۔''229

تمنا کا تذکرہ ایک مدت تک نایاب تھا۔ نصیرالدین ہاشمی نے کتب خانہ آصفیہ میں موجود ایک مخطوطہ کی مدد سے اس کا تعارف کرایا ہے۔ مذکورہ مخطوطہ 44 صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر 19 سطریں ہیں۔ مخطوطہ کی داخلی شہادتوں اور ایک قطعہ کی مدد سے لکھا ہے کہ یہ تمنا کا تذکرہ ہے۔ جس کی تالیف 1192ھ میں شروع ہو کر دو سال بعد 1194ھ کو مکمل ہوئی۔ وہ قطعہ حسب ذیل ہے:

چوں ایں تذکرہ رانمودم شروع — زحق است امید اتمام او
تمنا بتاریخ سالش زمن — خرد گفت آغاز صفحہ بگو
تذکرہ شاعران شد چوں تمام ایں زمان — دل وجان حزیں متبہج وشادماں
داشت تمنا ولم فکر بتاریخ او — آمدہ آواز غیب شکر خداے جہاں230

تذکرہ میں حروف تہجی کے اعتبار سے شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ مختلف داخلی شہادتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ مذکورہ نسخہ خود مولف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر جا بجا مولف کی اصلاحیں موجود ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

'' اس کتاب میں حروف تہجی کے لحاظ سے شعرا کا ذکر ہے اور ہر شاعر کے فارسی کلام کے بعد اس کا اردو کلام درج کیا گیا ہے، اس عمر کے قوی قرائن موجود ہیں کہ یہ نسخہ خود مولف کا مسودہ ہے۔ سارے مخطوطہ میں جا بجا حق اصلاح موجود ہے اور نیز اضافہ اور عبارت کے بڑھانے کا جو ڈھنگ ہے وہ سواے مولف کے اور کسی کا نہیں ہوسکتا۔ متعدد صفحات خالی چھوڑ دیے گئے ہیں اس سے بھی ہمارے قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ اس تزکرے سے اس مولف کے متعلق ہمیں یہ معلوم

ہوتا ہے کہ اس کا تخلص تمنا تھا۔ وہ اورنگ آباد کا باشندہ اور حیدر آباد کا متوطن تھا۔ دربار آصفی کے امرا تک اس کی رسائی حاصل تھی صمصام الملک کا درباری شاعر تھا۔ ارباب کمال سے ربط وضبط رکھتا تھا، اس کے بعض شاگردوں نے بھی اس کے زمانے میں شہرت حاصل کر لی تھی اور اس تزکرے کی تالیف اپنے دوست محمد کریم بخش سالم قاضی پری کے کہنے سے کی ہے اس تزکرہ کے ختم کے وقت تمنا کے والد بھی زندہ تھے۔'' 231ے

مذکورہ اقتباس سے نہ صرف تمنا کے تذکرہ بلکہ ان کے سوانحی حالات سے بھی آ گہی ہوتی البتہ اب بھی ان کی زندگی کے بعض پہلو تاریک ہیں۔ تمنا کا انتقال کب اور کہاں ہوا اس کا کوئی خاص ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ 1403ھ تک باحیات تھے۔ مذکورہ تذکرے میں شعرا کی تعداد 51 ہے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شعرا کو شامل کیا گیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ دکن کے علاوہ شمالی ہند کے شعرا کا بھی تذکرہ ہے۔ جن میں آرزو، غلام علی آزاد، قزلباش خاں، بیدل ، بیدار، سودا ،مظہر جانجاناں کا نام قابل ذکر ہے۔ نصیر الدین ہاشمی تذکرے کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''(۱) اس تذکرہ میں تمنا نے صرف اپنے ہم عصر شعرا کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے اکثر زندہ تھے۔ اور ان سے تمنا کو تعارف حاصل تھا۔ البتہ شمالی ہند کے بعض ایسے شعرا کا ذکر بھی آ گیا ہے جن سے غالباً ان تعارف حاصل نہیں تھا ممکن ہے مراسلت رہی ہو۔

(۲) اکثر شعرا کے حالات میں سنین کا بہت لحاظ رکھا گیا ہے، اور واقعات کو بقید سنہ قلم بند کیا ہے۔

(۳) اکثر شعرا کے استادوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

(۴) بعض شعرا کے کلام کے متعلق رائے بھی دی ہے۔

(۵) بعض شعرا کی تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً عبدالوہاب بیکل نے ایک تذکرہ موسوم ''بے نظیر'' لکھا تھا۔ اور بہاؤالدین عروج نے تذکرہ ''خزان و بہار'' شاہ فضل اللہ فضلی نے فن سلوک میں زادراہ اردو نظم میں دو کتابیں ''قصۂ پریم لوکا'' اور قصۂ برہ بیوکا'' کے مصنف ہیں۔

(۶) بعض شاعروں کے حالات میں ان کے احباب اور ملنے جلنے والوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

(۷) مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے دو اردو شعر درج کیے ہیں، کسی اور تذکرہ میں آپ کا اردو کلام دیکھا نہیں گیا ہے، شعر حسب ذیل ہیں:۔

باغ میں جانا ہے میرا کام کا
شوق ہے مجھ کو گلابی جام کا

کہوں کیا اس کی بے پروائیوں سے دل پریشان ہے
نہ آیا ایک دم مجھ پاس جس کا نام جاناں ہے

(۸)اس تذکرہ پر دیباچہ نہیں لکھا گیا ہے، متن کتاب میں بھی تمنا نے اپنا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ فتوت اور شفیق نے اپنا حال بھی متعلقہ ردیف میں لکھ دیا ہے۔

(۹)اورنگ آباد کے دوسرے تذکرہ نویس خواجہ حمید اور لچھمی نرائن شفیق کا اس تذکرہ میں کوئی ذکر نہیں ہے، حالانکہ وہ تمنا کے ہم عصر تھے۔اور انھوں نے اپنے تذکرہ لکھ دیے تھے، اور اسی طرح شفیق اور حمید کے تذکروں میں تمنا کا کوئی ذکر نہیں ہوسکتا ہے، کہ اس بنا پر ہو کہ تمنا نے اس زمانہ میں شہرت حاصل نہ کی ہو، مگر تمنا کے تذکرہ میں حمید اور شفیق کا ذکر نہ آنا تعجب انگیز ہے۔

(۱۰)فتوت کا ذکر تمنا نے کیا ہے، مگر تعجب ہے کہ ریاض حسنی کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ دوسرے مصنفین کی کتابوں کا ذکر ہے، اور پھر یہ کہ اس وقت ریاض حسنی کی تالیف کو عرصہ گذر چکا تھا۔

(۱۱)بعض شعرا کے ساتھ اپنے ہم درس ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔

(۱۲)بعض شاعروں کی ملازمت اور ان کے مشاغل کی صراحت کی ہے۔

(۱۳)اس تذکرہ سے بعض شاعروں کے متعلق جو صحیح معلومات حاصل ہوتے ہیں اس کی وجہ سے دوسرے تذکروں کے ناکافی تحقیق کی بنا پر پیدا کردہ شکوک کا ازالہ ہوجاتا ہے۔ مثلاً شفیق نے اپنے تذکرہ میں نقد علی خان ایجاد کا ذکر کیا ہے۔ انجمن ترقی اردو کی جانب سے شفیق کا جو تذکرہ شائع ہوا ہے اس میں ایک اور ایجاد کا تحفۃ الشعرا کے حوالہ سے اضافہ کیا گیا ہے، اور ان کا نام مرزا علی نقی بتایا گیا ہے۔'' 232؎

مضمون کی آخر میں چند شاعروں کا تذکرہ بطور نمونہ درج کیا گیا ہے۔ جن میں ایجاد، انور، آشفتہ، سودا کے نام شامل ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی کا یہ مضمون تذکروں کی تحقیق کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ معارف جنوری 1946 کے شمارے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کا مقالہ 'شعرائے رامپور کا ایک قلمی تذکرہ' شائع ہوا۔ جس میں فرانسیسی نژاد ہندستانی جارج فانتوم کے قلمی تذکرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون کے ابتدا میں ایک تمہید ہے جس میں نہ صرف یہ کہ مستشرقین کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ جارج فانتوم کے سوانحی حالات بھی قلمبند کیے گئے ہیں۔

جارج فانتوم کے والد کپتان برناڈ فانتوم فرانسیسی خاندان کے فرد تھے۔ وہ ایک ماہر ڈاکٹر تھے۔ ایک مدت تک فوج میں خدمت دے کر سبکدوش ہوئے۔ نواب احمد علی خاں بہادر رامپور سے ان کو قربت حاصل تھی۔ 1837 تک وہ رامپور میں طبیب خاص تھے اور 1842 میں بریلی میں انتقال کیا۔ جارج فانتوم نے رامپور میں عربی، فارسی سیکھی۔ میر نجف علی شفقت شاعری میں ان کے استاد تھے۔ ان کی تصنیفات میں اردو دیوان، عربی کا ایک مختصر رسالہ اور فارسی شعرا کا تذکرہ ہے۔

شوکت سبزواری نے اپنے ایک دوست مولوی عبدالرشید کے یہاں اس تذکرے کا قلمی نسخہ دیکھا تھا۔ جو

فارسی میں ہے اور قدیم طرز پر لکھا گیا ہے۔ جس میں 62 رامپوری شعرا کا تذکرہ اور ان کے کلام کا انتخاب ہے۔ سن تالیف کا ثبوت نہیں ملتا البتہ داخلی شہادتوں سے لکھا ہے کہ یہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ شوکت سبزواری نے شعرا کے حالات پر روشنی نہیں ڈالی ہے البتہ تذکرہ میں مذکور ۶۲ شعرا کے نام کو نقل کیا ہے۔ مضمون کے ابتدا میں ایک مقدمہ ہے جس سے اندازا ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ نواب کلب علی خاں کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ مقدمہ کے آخر میں نواب صاحب کی مدح میں 127 اشعار کا ایک قصیدہ بھی ہے۔ دیوان کا مسودہ نایاب ہے البتہ اس کا ایک نسخہ مولوی صاحب کے پاس موجود تھا۔

شوکت سبزواری کا ایک اور مقالہ بہ عنوان تذکرہ نشتر عشق معارف فروری 1951 میں شائع ہوا۔ جس میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں موجود قلمی نسخے کا تعارف کرایا گیا ہے۔ معارف دسمبر 1962 ڈاکٹر عرفان کا مقالہ قائم چاند پوری کا تذکرہ مخزن نکات شائع ہوا۔ اس کے علاوہ عبد الحئ کا تذکرہ گل رعنا پر علی میاں کا دیباچہ معارف نومبر 1988 میں شائع ہوا۔ ان مضامین کے مطالعہ سے اندازا ہوتا ہے کہ معارف کے صفحات میں اردو شعرا کے تذکروں سے متعلق ایک قابل قدر ذخیرہ ہے۔

حوالہ جات

1۔ ماہنامہ معارف، شذرات اپریل 1917

2۔ مولوی عبدالحق، مقدمہ خواب وخیال، ص، ج

3۔ ماہنامہ معارف شذرات جولائی 1917

4۔ عابد رضا بیدار، شمس البیان فی مصطلحات ہندستان، ص 7

5۔ ایضاً، ص 7

6۔ ماہنامہ معارف شذرات دسمبر 1918

7۔ ماہنامہ معارف، شذرات اپریل 1919

8۔ ماہنامہ معارف اپریل 1922 ص 268

9۔ ڈاکٹر محمود الٰہی، نکات الشعرا، ص 76

10۔ ایضاً، ص 75

11۔ محمد حسین آزاد آب حیات، ص 119

12۔ ماہنامہ معارف، اپریل 1922 ص 269

13۔ ماہنامہ معارف جنوری 1948 ص 21

14۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دیوان فغاں، ص 49

15۔ ایضاً، ص 50

16۔ ماہنامہ معارف مارچ 1948 ص 220

17۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دیوان فغاں ص 51

18۔ ماہنامہ معارف جنوی 1948 ص 22

19۔ ایضاً، ص 22

20۔ ایضاً، ص 24

21۔ ایضاً، ص 22

22۔ ایضاً، ص 34

23۔ ایضاً، ص 34

24۔ سرورالہدی، دیوان فغاں، ص39
25۔ ماہنامہ معارف، شذرات اگست 1922
26۔ ماہنامہ معارف اکتوبر 1922 ص 311،312
27۔ ماہنامہ معارف اکتوبر 1922 ص 312
28۔ ایضا، ص311
29۔ ایضا، ص311
30۔ عمیر منظر, رشید حسن خاں کلام غالب کے شارح ص 69
31۔ ماہنامہ معارف فروری 1923 ص 153
32۔ ایضا، ص154
33۔ ماہنامہ معارف جون 1923 ص 66،67
34۔ ماہنامہ معارف فروی 1923، ص468،469
35۔ ایضا 475
36۔ ماہنامہ معارف مئی 1927 ص 344
37۔ ایضا، ص347
38۔ ماہنامہ معارف مئی 1929 ص 347
39۔ ایضا، ص349
40۔ ڈاکٹر قریشہ حسین، کلیات حضرت رکن الدین عشق ان کی حیات وشاعری، ص الف
41۔ ماہنامہ معارف جولائی 1929 ص 54
42۔ ایضا، ص55،56
43۔ ماہنامہ معارف جولائی 1937 ص 49
44۔ ماہنامہ معارف، اگست 1937 ص 118،119
45۔ ایضا، ص119
46۔ ایضا، ص120
47۔ محمد حسین آزاد، آب حیات، ص274،275
48۔ ماہنامہ معارف ستمبر 1937 ص 210

49۔ ماہنامہ معارف،شذرات اکتوبر 1937

50۔ ماہنامہ معارف مارچ 1942 ص 207

51۔ ایضاً،ص 207،208

52۔ میر حسن،تذکرہ شعرائے اردو،ص 46

53۔ مولانا عبدالحئی،گل رعنا،ص 10،11

54۔ ماہنامہ معارف مارچ 1942 ص 209،210

55۔ نصیرالدین ہاشمی،دکن میں اردو،ص 255

56۔ ماہنامہ معارف مارچ 1942 ص 210،211

57۔ ایضاً،ص 212

58۔ مولانا عبدالحئی،گل رعنا،ص،11

59۔ ماہنامہ معارف مارچ 1942 ص 213،214

60۔ ماہنامہ معارف جون 1943 ص 424

61۔ ایضاً،ص 424،425

62۔ ماہنامہ معارف اکتوبر 1943 ص 285

63۔ ایضاً،ص 292

64۔ ایضاً،ص 288

65۔ سید احمد اللہ قادری،رموز العارفین،ص 21،22

66۔ ماہنامہ معارف جنوری 144 ص 44

67۔ ماہنامہ معارف جنوری 1944 ص 45

68۔ ایضاً،ص 45

69۔ ایضاً،ص 46

70۔ ایضاً،ص 47

71۔ ایضاً،ص 47

72۔ ماہنامہ معارف مارچ 1944 ص 220،221

73۔ ماہنامہ معارف جنوری 1945 ص 15،16

74۔ ماہنامہ معارف جون 1945 ص 156، 157

75۔ ماہنامہ معارف اگست 1946 ص 130

76۔ رشید حسن خاں، گلزار نسیم، ص 5

77۔ ماہنامہ معارف اگست 1946 ص 130

78۔ ایضاً، ص 131

79۔ ایضاً، ص 132

80۔ ایضاً، ص 133

81۔ ایضاً، ص 133

82۔ ماہنامہ معارف اکتوبر 1946 ص 300

83۔ ایضاً، ص 301

84۔ جمیل جالبی، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، ص 8

85۔ ماہنامہ معارف اکتوبر 1932 ص 291

86۔ جمیل جالبی، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، ص 17

87۔ ماہنامہ معارف اکتوبر 1932، ص 91

88۔ جمیل جالبی، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، ص 15

89۔ ماہنامہ معارف فروری 1931 ص 356

90۔ ایضاً، ص 361

91۔ ایضاً، ص 357

92۔ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، ص 220

93۔ ماہنامہ معارف فروری 1931 ص 357

94۔ ماہنامہ معارف جولائی 1931 ص، 29

95۔ ماہنامہ معارف، فروری 1931 ص 354

96۔ ایضاً، ص 354

97۔ سید مبارز الدین رفعت، کلیات شاہی، ص 140

98۔ زینت ساجدہ، کلیات شاہی، ص 112

99۔ حکیم سید شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم، ص78

100۔ ڈاکٹر نذیر احمد، کتاب نورس، ص13

101۔ ایضا، ص14

102۔ ماہنامہ معارف جون 1932 ص448

103۔ ڈاکٹر نذیر احمد، کتاب نورس، ص19

104۔ ماہنامہ معارف جولائی 1928 ص40

105۔ نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو، ص436

106۔ ماہنامہ معارف جولائی 1928 ص39

107۔ ماہنامہ معارف دسمبر 1974 ص480

108۔ ماہنامہ معارف جولائی 1932 ص1

109۔ ماہنامہ معارف مارچ 1975 ص238

110۔ ماہنامہ معارف ستمبر 1932 ص203

111۔ ماہنامہ معارف، دسمبر 1938 ص446

112۔ معارف، ستمبر 1918 ص116

113۔ سلیم احمد رضوی، اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، ص70

114۔ ابو محمد سحر، نسخہ بھوپال اور ڈاکٹر عبدالطیف، ہماری زبان، مئی 1969 ص4،5

115۔ ماہنامہ معارف، اپریل 1922 ص279

116۔ ماہنامہ معارف، اپریل 1922 ص280

117۔ مولانا الطاف حسین حالی، یادگار غالب، ص69

118۔ ایضا ص69

119۔ ماہنامہ معارف، دسمبر 1922 ص66

120۔ معارف دسمبر 1922 ص467،468

121۔ ماہنامہ معارف، مئی 1926 ص372

122۔ رسالہ زمانہ جولائی 1936 ص26،27

123۔ مالک رام، فسانہ غالب، ص32

124۔ ماہنامہ معارف مارچ 1927ص 212

125۔ ایضا،ص211

126۔ایضا،ص213

127۔ ماہنامہ معارف،مارچ 1932ص 209

128۔ ماہنامہ معارف،مارچ 1927 ص 210

129۔ ایضا،ص210

130۔ ماہنامہ معارف،شذرات دسمبر 1921ص 4

131۔ ماہنامہ معارف جنوری 1922ص 9،10

132۔ ایضا،ص10

133۔ ایضا،ص11

134۔ ایضا،ص12

135۔ ایضا،ص13

136۔ ماہنامہ معارف اکتوبر 1930ص 281

137۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،اقبال اور دبستان شبلی،ص13

138۔ سید افتخار حسین شاہ،اقبال اور پیروی شبلی،ص42

139۔ مولانا سید سلیمان ندوی،یادرفتگاں،ص183

140۔ ماہنامہ معارف،اپریل 1918ص 43

141۔ ایضا،ص50

142۔ ماہنامہ معارف،شذرات،جنوری 1923

143۔ ماہنامہ معارف،مئی 1927ص 124

144۔ سید سلیمان ندوی،یادرفتگاں ص 181

145۔ ایضا،ص182

146۔ ایضا،ص182

147۔ مشاہیر کے خطوط،ص98

148۔ مشاہیر کے خطوط،ص96۔

149۔ شاہ معین الدین ندوی، حیات سلیمان، ص335

150۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ حصہ اول، ص80

151۔ ماہناہ معارف جنوری 1926 ص46

152۔ ایضا، ص50

153۔ معارف، فروری 1946 ص137

154۔ ماہنامہ معارف، اپریل 1947 ص246

155۔ عتیق احمد جیلانی، رسالہ معارف کی اردو ادبی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، ص

156۔ ماہنامہ معارف، اکتوبر 1947 ص257

157۔ ماہنامہ معارف نومبر 1947 ص335

158۔ ماہنامہ معارف مارچ، 1946 ص191

159۔ ماہنامہ معارف، مارچ 1946 ص، 194، 195

160۔ ایضا، ص194

161۔ ماہنامہ معارف، ستمبر 1945 ص172

162۔ ایضا، ص170

163، ماہنامہ معارف ستمبر 1945 ص172، 173

164۔ ماہنامہ معارف فروری 1941 ص98

165۔ ماہنامہ معارف مارچ 1941 ص175

166۔ ایضا، ص184

167۔ ماہنامہ معارف، اپریل 1941 ص298

168۔ ماہنامہ معارف، نومبر 1944 ص212، 213

169۔ ایضا، ص213، 214

170۔ ایضا، ص215

171۔ ماہنامہ معارف، جولائی 1945 ص40

172۔ ایضا، ص37

173۔ ماہنامہ معارف اپریل 1918 ص44

174۔ ایضاً،ص50

175۔ ماہنامہ معارف دسمبر 1974ص480

176۔ مرزا علی لطف، تذکرہ گلشن ہند،ص48

177۔ میرحسن، تذکرہ شعرائے اردو،ص33

178۔ ماہنامہ معارف مئی 1939ص331

179۔ ماہنامہ معارف مئی 1936ص326

180۔ ماہنامہ معارف جولائی 1916ص29

181۔ ایضاً،ص29،30

182۔ ایضاً،ص29

183۔ ایضاً،ص33

184۔ ماہنامہ معارف اکتوبر 1917ص33

185۔ ماہنامہ معارف جولائی 1917ص34

186۔ ایضاً،ص35

187۔ ماہنامہ معارف اکتوبر 1917ص37

188۔ ماہنامہ معارف، نومبر 1937ص327

189۔ ماہنامہ معارف اکتوبر 1916ص47

190۔ ایضاً،ص49

191۔ ایضاً،ص51

192۔ ماہنامہ معارف شذرات اپریل 1931

193۔ ماہنامہ معارف شذرات، فروری 1937

194۔ ماہنامہ معارف، شذرات ستمبر 1937

195۔ ماہنامہ معارف، شذرات ستمبر 1937

196۔ ماہنامہ معارف جولائی 1932ص5

197۔ ماہنامہ معارف شذرات ستمبر 1930

198۔ ماہنامہ معارف شذرات جنوری 1933

199۔ ماہنامہ معارف شذرات جنوری1933

200۔ ماہنامہ معارف شذرات فروری1933

201۔ ماہنامہ معارف شذرات جنوری1933

202۔ ماہنامہ معارف فروری1931 ص97

203۔ ماہنامہ معارف اپریل1931 ص315

204۔ ماہنامہ معارف اکتوبر1937 ص46

205۔ محمد حسین آزاد،آب حیات،ص166

206۔ ماہنامہ معارف،دسمبر1937 ص441،442

207۔ ماہنامہ معارف اپریل1952 ص470،471

208۔ ماہنامہ معارف جون1920 ص86

209۔ ماہنامہ معارف اپریل1927 ص308،309

210۔ ماہنامہ معارف اپریل1927 ص309

211۔ ماہنامہ معاف جون1929 ص18،19

212۔ ایضا،ص419

213۔ ماہنامہ معارف نومبر1929 ص246

214۔ ایضا،ص346

215۔ محمد عتیق احمد جیلانی،رسالہ معارف کی اردو ادبی خدمات:ایک تحقیقی اور تنقیدی جائزہ ،ص102،103

216۔ ماہنامہ معارف اگست1929 ص124،125

217۔ ماہنامہ معارف جنوری1930 ص56

218۔ ماہنامہ معارف جولائی1930 ص37

219۔ ماہنامہ معارف جولائی1931 ص33

220۔ ماہنامہ معارف دسمبر1924 ص415

221۔ ماہنامہ معارف اپریل1927 ص291

222۔ ماہنامہ معارف اکتوبر1929 ص253،254

223۔ ماہنامہ معارف جولائی 1936 ص 43

224۔ ایضاً ص 201

225۔ ماہنامہ معارف مارچ 1924 ص 216

226۔ ایضاً ص 219

227۔ ماہنامہ معارف جون 1924 ص 446

228۔ ماہنامہ معارف فروری 1928 ص 119

229۔ ماہنامہ معارف فروری 1935 ص 124

230۔ ایضاً ص 125

231۔ ایضاً ص 125

232۔ ایضاً ص 126، 127

مقالہ

برائے

پی ایچ۔ڈی (اردو)

اردو تحقیق کے فروغ میں معارف کا حصہ

(آزادی سے قبل)

مقالہ نگار

اطہر حسین

اندراج نمبر: A171129

نگراں

ڈاکٹر ابو عمیر

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو

اسکول برائے السنہ، لسانیات اور ہندوستانیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس

2022

ملاحق

ماحصل

دارالمصنفین کے بانی علامہ شبلی نعمانی (1857-1914) ایک عہد آفریں شخصیت کے مالک تھے۔ وہ مصنف ہی نہیں تھے بلکہ انھیں 'مصنف گر' بھی کہا گیا۔ سیرت وسوانح نگار کے ساتھ ساتھ وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ علم وتحقیق کے میدان میں علامہ شبلی کی تن تنہا خدمات ایک ادارہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے تحقیق وتنقید کے علاوہ تاریخ وسیرت پر بلند پایہ کتابیں تحریر کی۔ تحقیق وتصنیف کے میدان میں ان کی خدمات بہت متنوع ہیں۔ ہیروز آف اسلام کے تحت المامون اور الفاروق تحریر کی اس کے علاوہ سیرۃ النعمان ،الغزالی اور سوانح مولانا روم لکھی۔ سیرت وسوانح کے باب میں یہ نہایت اہم کتابیں ہیں۔ شعرالعجم جیسی غیر معمولی اہمیت کی حامل تنقیدی کتاب تصنیف کی نیز موازنۂ انیس ودبیر لکھ کر تقابلی تنقید اور مطالعہ کی بنیاد ڈالی۔ علامہ شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ سیرۃ النبیؐ ہے۔ جس کا خاکہ انہوں نے تیار کیا اور ابتدائی دو جلدیں بھی تحریر کیں۔ انہیں کسی ایک شعبہ سے نہیں جوڑا جا سکتا بلکہ انہیں ہر میدان میں دسترس حاصل تھی۔ بطور شاعر بھی علامہ شبلی نعمانی کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ تاریخی نظموں کے ساتھ ساتھ ہنگامی اور وقتی مسائل وحالات پر بھی ان کی نظمیں خاصی اہم ہیں۔

علامہ شبلی نے گرچہ بہت کم عمر پائی مگر اس قلیل مدت میں بھی انہوں نے تصنیف وتالیف کے میدان میں نہایت اہم خدمات انجام دیں۔ انہیں اپنی زندگی ہی میں انہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ دولت عثمانیہ نے ان کی علمی کاوشوں کی وجہ سے تمغۂ مجیدیہ سے نوازا۔ جامعہ ازہر مصر جس کا شمار دنیا کے بڑے اور قدیم تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے جب اس نے اپنے تعلیمی نظام کی اصلاح کرنا چاہی تو انہوں نے علامہ شبلی کا انتخاب کیا۔ اسی طرح مدینہ یونیورسٹی کا خاکے کی تیاری کے لیے شبلی کا نام تجویز کیا گیا۔ انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا تو علامہ شبلی اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے۔ 1894 میں جبکہ آپ کی عمر محض ۳۷ رسال تھی حکومت برطانوی نے آپ کو شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ اگر کوئی ایک شخص شاعر، مورخ، فلسفی، نقاد، ماہر تعلیم ،فقیہ، محدث اتنی ساری صفات کا مالک ہو سکتا ہے تو وہ شبلی کی شخصیت ہے۔ انگریزوں کے خلاف انہوں نے نہ صرف یہ کہ تحریک وقف علی الاولاد کا آغاز کیا بلکہ علماء اور قانون دانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔

شبلی نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں بڑے انتشار کا دور تھا۔ ملک پر انگریزوں کا تسلط تھا، تعلیم کا نظام بہت خستہ تھا، تعلیم سے مسلمانوں کا رشتہ پہلے کی طرح مستحکم نہیں تھا بلکہ وہ تعلیم سے منحرف ہو رہے تھے۔ علامہ کو اپنی قوم سے محبت اور والہانہ لگاؤ تھا، وہ قوم وملت اور مسلمانوں کی حالت پر بہت فکرمند تھے اور اسی لیے کسی ایسے لائحہ عمل کی تلاش

میں تھے جس سے قوم کو بیدار کر سکیں۔علامہ شبلی کا شمار عالم اسلام کے ان صاحبان بصیرت میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تحریکوں اور تحریروں سے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔وہ سرسید کے معاونین میں تھے۔ انہوں نے ان کی تعلیمی پالیسی کو بنظر خود دیکھا تھا۔اس کے علاوہ انہوں نے روم،مصر،شام نیز حجاز مقدس کا سفر کیا تھا۔ مدینہ،یورپ اور دیگر مما لک کے تعلیمی معیار وطریقئہ کار کو بغور دیکھا اور سمجھا تھا۔وہ مستشرقین کی ناپاک سازشوں سے بھی آگاہ تھے۔یورپی مستشرقین جو اسلام سے ناآشنا تھے ہیروز آف اسلام کی سیرت لکھ کر اسلام کی شبیہ خراب کر رہے تھے۔جس کی فکر علامہ شبلی کو کھائے جا رہی تھی۔شبلی کا سب بڑا امتیاز مشغلہ علمی تھا۔وہ مستشرقین کی پھیلائی گمراہیوں کو نہ صرف بھانپ جاتے تھے بلکہ اس کا منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔جرجی زیدان نے تمدن اور تہذیب کے نام پر جو گمراہی پھیلائی تھی علماء مصر اس کا جواب دینے سے قاصر تھے۔علامہ شبلی نے جرجی زیدان کی غلط کاریوں کا پردہ فاش کیا۔وہ مستشرقین کا جواب دے کر اسلام کی حقیقی تاریخ لوگوں تک پہچانا چاہتے تھے۔المامون،الفاروق،سیرت النبی ﷺ اسی فکر کا نتیجہ ہے۔ان کی دلی خواہش تھی کی یورپین مما لک کی طرز پر ہندوستان میں بھی کوئی ادارہ ہو جو قوم وملت کی خدمت کرے اور اپنے شعار کو برقرار رکھے۔وہ چاہتے تھے کہ علما جو ان علوم کے اصل وارث ہیں،وہ علوم فنون کی نادر کتابوں کی فراہمی کریں،تحقیق اور تحشیہ وتدوین کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی صحیح شناخت دنیا کے سامنے پیش کریں۔

دارالمصنفین کے قیام کا خیال علامہ کے ذہن میں ایک طویل مدت سے پرورش پا رہا تھا۔وہ چاہتے تھے کہ ایک دائرتالیف قائم کیا جائے جہاں مختلف علوم وفنون کے ماہرین یکجا ہوں اور تصنیف وتالیف میں اپنا وقت صرف کریں۔ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ یہ ادارہ یورپی اکیڈمیوں کی طرز پر کام کرے۔اس کام کے لیے علامہ شبلی ایسے مصنفین ومولفین کی اشد ضرورت محسوس کر رہے تھے جو باذوق،صاحب علم،محنتی،دیانتدار اور ایثار پسند لوگ ہوں۔نئی پرانی دونوں قدروں سے واقف ہوں اور قدیم وجدید دونوں علوم سے استفادہ کرنے پر قادر ہوں۔تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ آنے والی نسل کی تربیت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔اسلاف کے چودہ سو سالہ کارنامے جو الماریوں میں پڑے بوسیدہ ہو رہے ہیں انہیں جمع کیا جائے اور تدوین وتحقیق کر کے عوام تک پہنچایا جائے۔اس کے علاوہ ترقی یافتہ قوموں کی طرح ایک ایسے ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جو اپنے علوم وفنون کی ترویج وترسیل کر سکے اور ایسا علمی اور پرسکون ماحول ہو جو دنیا کی ہنگاموں سے دور رہ کر فقط قوم وملت کی خدمت کرے۔

علامہ شبلی نعمانی نے دارالمصنفین کے قیام کا اظہار پہلی بار دہلی میں اجلاس ندوہ (مارچ ۱۹۱۰) کے موقع پر سہ سالہ رپوٹ پیش کرتے وقت۔اس وقت علامہ شبلی نعمانی سیرت النبیؐ کی تالیف میں مصروف تھے اس کے علاوہ ندوۃ العلماء کی معتمدی بھی ان کے ذمہ تھی،اس لیے دارالمصنفین کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہیں نکال سکے۔اس کے

بعد ندوہ میں اختلاف شروع ہوگیا۔ جولائی 1913 میں جب ندوہ کی معتمدی سے مستعفی ہوگئے تو دارالمصنفین کی طرف یکسوئی ہوئی۔

دارالمصنفین کے قیام کا خیال اب اس قدر پختہ ہوگیا تھا کہ انہوں نے 1914 'الہلال' کلکتہ میں اس تجویز کو ملک کے سامنے پیش کیا اور انگریزی میں اس کے ترجمے کرا کرا پنے احباب کو اس جانب متوجہ ہونے کے لیے پیش کیا۔ دارالمصنفین کے قیام کا منصوبہ حتمی ہوگیا تھا مگر یہ طے کر پانا مشکل ہو رہا تھا کہ دارالمصنفین کو کہاں قائم کیا جائے۔ علامہ شبلی نے اس سلسلہ میں احباب سے مشورہ طلب کیا۔ جبکہ مولانا کی دلی خواہش تھی کہ دارالمصنفین ندوہ میں قائم ہو اکثر احباب شبلی بھی یہی چاہتے تھے مگر دارالمصنفین کے قیام کے لیے حالات اب وہاں سازگار نہیں تھے۔ دارالمصنفین کے قیام کے سلسلے میں تبادلہ خیال جاری تھا ابھی مقام کا تعین نہیں ہوا تھا کہ بقول سید سلیمان ندوی قاضی تقدیر نے خود اس کا فیصلہ کردیا۔ چنانچہ اگست 1914 شبلی کے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اس حادثہ کی خبر سن کر مولانا اعظم گڑھ چلے آئے یہاں ان کو سکون نظر آیا تو یہیں اپنے کاموں کا مرکز بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ بھائی کی وفات کے بعد علامہ شبلی نے اعظم گڑھ میں مستقل قیام کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اس لیے دارالمصنفین کا اعظم گڑھ میں قائم ہونا طے ہوگیا۔ اس فیصلہ کے بعد مولانا نے دارالمصنفین کے لیے اپنا ذاتی باغ اور بنگلہ وقف کیا۔ اپنے اعزہ سے بھی زمینیں وقف کرائیں۔ اپنی اور اپنے احباب کی کتابوں سے بھری کئی الماریوں کو مہیا کیا۔ دارالضیوف تعمیر کرایا۔

دارالمصنفین اپنے علمی وادبی اور تحقیقی کاوشوں کی بدولت صرف ہندو پاک ہی نہیں بلکہ دیگر ممالک میں بھی اپنی پہچان رکھتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی بعض بے شمار یونیورسٹیوں میں دارالمصنفین کی مطبوعات شامل نصاب ہیں۔ بعض کتابوں کے تراجم بھی دیگر زبانوں میں ہوئے۔ الفاروق، سیرت عائشہؓ اور خلفاء راشدین وغیرہ کا ترجمہ ترکی زبان میں ہوا، شعرالعجم کا ترجمہ فارسی زبان میں ہوا، اس کے علاوہ سیرت النبیؐ جلد اول اور دوم کا ترجمہ حکومت مصر نے عربی میں کرایا۔ غرض دارالمصنفین ایک ایسا ادارہ ہے جس کی خدمات سے پوری دنیا مستفید ہو رہی ہے۔

دارالمصنفین کا جو خاکہ علامہ نے بنایا تھا اس میں ایک علمی وتحقیقی رسالہ کا اجرا بھی شامل تھا۔ ماہنامہ کا نام 'معارف' وہ خود طے کرچکے تھے۔ ماہنامہ معارف کی اشاعت کا خیال علامہ کے ذہن میں دوران علی گڑھ سے ہی تھا۔ ترکی کے سفر میں علامہ شبلی کی نظر سے وہاں کے جو بلند پایہ علمی رسائل گزرے ان میں ایک معارف بھی تھا۔ یہ ترکی کا ایک مشہور ہفت روزہ رسالہ تھا اس میں علوم جدیدہ کے اعلی درجہ کے مضامین ہوتے تھے۔ علامہ شبلی کو یہ نام ایسا بھایا کہ ترکی سے واپسی کے دوسرے ہی سال 1993 میں انہوں نے اسی نام سے ایک رسالہ کا خاکہ شائع کیا تھا غالبا

امتیاز کے لیے اس پر لام تعریف داخل کر دیا اور رسالہ کا نام 'المعارف' رکھا۔

تصنیف و تالیف کی مصروفیت اور محمڈن اینگلو اورنٹل کالج میگزین سے وابستگی کی وجہ سے اس وقت وہ یہ رسالہ نہ نکال سکے۔ میر ولایت حسین کی ڈائری میں ایک حوالہ ملتا ہے کہ کالج میگزین بند ہوا تو شبلی نے مجھ سے کہا دونوں مل کر 'معارف' کے نام سے رسالہ نکالیں گے شبلی اس وقت تو نہیں نکال سکے ۔ اسی دوران مولوی وحید الدین سلیم نے 1898 میں معارف نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا جو علی گڑھ اور پھر پانی پت سے ساڑھے تین سال نکل کر بند ہو گیا۔ نام کی مشابہت کی وجہ سے اس کا نام لیا جاتا ہے مگر اب صرف اس کا نام ہی رہ گیا ہے۔ دارالمصنفین کے قیام کے وقت ادارہ کا اپنا پریس نہیں تھا۔ اس لیے معارف فوری طور پر جاری نہ ہوسکا۔ دارالمصنفین کے قیام کے بعد جب ادارہ کو قدر استحکام ملا تو علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد کی اس خواہش کو بھی عملی جامہ پہنایا اور تقریباً دو سال بعد جولائی 1916 میں پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ دارالمصنفین کے علمی ترجمان ہونے کی وجہ سے معارف کے اغراض و مقاصد وہی تھے جو دارالمصنفین کے تھے۔

معارف کی اشاعت اس وقت ہوئی جب ملک میں ایک بلند پایہ رسالہ کی ضرورت تھی، اہل علم نے نہ صرف اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا بلکہ متعدد اخبارات اور رسائل میں ان پر خوش کن تبصرے کیے گئے۔ بعض رسائل نے معارف کے مضامین کو اپنے کالموں میں جگہ دی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ معارف اپنی طرز کا منفرد رسالہ تھا۔ بہت کم مدت میں نہ صرف علمی و ادبی حلقوں میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا بلکہ ہندستان کی موقر رسالوں میں شمار ہونے لگا۔

معارف کے معیار کو بلند کرنے اور اپنے مقصد میں کامیاب کرنے کی غرض سے سید صاحب نے انگریزی، عربی، فارسی اور اردو کے بہت سارے رسائل منگوائے اور اس سے استفادہ کیا۔ سید صاحب نے ان تجربات سے فائدہ اٹھایا جو الندوہ اور الہلال کی صحافت سے حاصل کیا تھا۔ اس کے علاوہ ملک کے مشاہیر علماء و ادبا سے بہت سارے مضامین لکھوائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے خالص فقہی موضوعات پر مقالے حاصل کیے۔ معارف بنیادی طور پر تحقیقی رسالہ ہے اس لیے عام نثری تخلیقی ادب کو جگہ نہیں مل سکی۔ اس کے باوجود بھی معارف نے چند سالوں میں صحافتی ادب کے صف اول میں جگہ بنالی۔

معارف کی اہمیت و مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ملک اور بیرون ملک ادیب و دانشور نہ صرف یہ معارف کو پابندی پڑھتے تھے بلکہ اس کی جلدوں کو محفوظ بھی رکھتے تھے۔ علامہ اقبال کو دارالمصنفین سے دلی لگاؤ تھا وہ نہ صرف معارف کو پڑھتے تھے بلکہ ان کا کلام بھی معارف میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہی ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔ معارف کی انفرادیت اور مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ معارف کو ہمیشہ سے بلند پایہ مدیران کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ علامہ

سید سلیمان ندوی سے لے کر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی تک علم و ادب کی ایک کہکشاں ہے۔معارف کی ادارت کرنے والوں میں مولانا سید سلیمان ندوی، شاہ معین الدین ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا ضیاالدین اصلاحی اور پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کے نام شامل ہیں۔ مذکورہ مدیروں کے علاوہ مولانا عبدالماجد دریابدی اور مولانا ریاست علی ندوی نے بھی کچھ مدت تک ادارت کے فرائض انجام دیے۔

معارف کی ادارت و سرپرستی ہمیشہ سے بڑے قلم کاروں کی رہی ہے۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ معارف میں لکھنے والے بھی ہمیشہ سے بڑے پایے کے عالم، ادیب و نقاد رہے ہیں۔اس لیے معارف بہت جلد ایسا رسالہ بن گیا جس میں شائع ہونا باعث افتخار سمجھا جانے لگا۔ کم ہی ایسے لکھنے والے ہوں گے جن کی نگارشات معارف میں شائع نہ ہوئی ہوں۔ ماہنامہ معارف ظاہری اور معنوی طور پر کئی حیثیتوں سے عصری صحافت اور معاصر رسائل سے مختلف اور بہت سارے تخصصات کا حامل ہے۔ معارف کے سو سالہ سفر کو مدنظر رکھتے ہوئے چند اہم خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ معارف (جولائی 1916) آج اپنے معاصر رسائل میں قدیم ہونے کا اعزاز رکھتا ہے۔ آج تک اس کی اشاعت میں ناغہ نہیں ہوا، مسلسل بغیر کسی انقطاع کے روز اول سے جاری ہے اور اس کے تمام شمارے محفوظ اور آن لائن استفادہ کے لیے موجود ہیں۔ معارف علمی و ادبی رسالہ ہے اس کے کچھ اختصاص بھی ہیں، یعنی رسالوں میں کالم وغیرہ کی ابتدا معارف ہی نے کی ہے۔ معارف نے مختلف عنوانات کے تحت کالموں کو خاص کر رکھا ہے۔ مثلاً اداریہ کی شذرات کا ہونا مختلف عنوانات کے تحت کالموں میں بٹا ہونا۔

ماہنامہ معارف بنیادی طور پر علمی و تحقیقی رسالہ ہے، جس کا مقصد نئے گوشوں کی تلاش اور ادب کا معیار متعین کرنا ہے۔ معارف نے ہمیشہ سے تحقیقی موضوعات کو فوقیت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معارف کے توسط سے علم و ادب کے نئے نئے گوشوں کا نہ صرف انکشاف ہوا ہے بلکہ بہت سے قدیم اور نایاب مخطوطوں اور کتابوں کی تحقیق اور ان کا تعارف بھی پیش کیا ہے جس سے علمی و ادبی دنیا بے خبر تھی۔ مدیران معارف کی کوشش رہی ہے کہ اگر کسی لائبریری میں مخطوطات کے ذخیرے، قدیم اور غیر مطبوعہ نسخے، جدید تحقیقی مقالے کا علم ہو تو قارئین معارف تک پہنچا دیں۔ یہی وجہ ہے کہ علمی و ادبی دنیا تک بہت سے نادر و نایاب اور اہم مخطوطوں اور قدیم کتابوں کا تعارف معارف کے توسط سے ہی ہوا ہے۔ تحقیقی مزاج کے حامل اس رسالے میں علم و ادب کی تحقیق سے متعلق بے شمار مقالے شائع ہوئے، مباحثے بھی ہوئے ادبی دنیا میں اس کی بازگشت بھی رہی یہ کہنا مشکل ہے کہ ایسے کون سے مباحث ہیں جو معارف میں زیر بحث نہیں آئے۔

معارف کی تحقیقات کو آسانی کے لیے مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دکنیات، اقبالیات، غالبیات، لسانیات، ذخیرہائے مخطوطات کا تعارف، قلمی نسخوں اور نادر مطبوعات کی دریافت، ادبا و شعرا کے حالات کی

بازیافت،شعرا کے تذکروں کے متعلق معلومات وغیرہ اس کے علاوہ بھی اردو ادب کی تحقیق کے حوالے سے کئی ایسے پہلو ہیں جن کا ایک بڑا خزانہ شعبہ معارف میں موجود ہے۔ادبی تحقیق کی اولیات کا بھی ایک خزانہ معارف کے صفحات پر بکھرا ہوا ہے۔ایسے مضامین ومقالات کی ایک بڑی تعداد ہے۔اس لیے یہاں صرف چند اہم مضامین کا تعارف پیش کیا گیا ہے تا کہ معارف کی تحقیقی اولیات کا اندازہ لگایا جاسکے۔

ماہنامہ معارف نے جب علم وتحقیق کی دنیا آباد کی تو دکنیات سے متعلق بہت سے گوشوں کو پیش کیا۔دکنی کتابوں کا تعارف کرایا۔چونکہ اردو ادب کے فروغ میں دکن کا نمایاں کردار رہا ہے۔اردو کی پیدائش گرچہ دہلی اور نواح دہلی میں ہوئی مگراس کی پرورش وپرداخت سرزمین دکن میں ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ اردو کی ابتدائی نثری اور منظوم کتابیں دکن میں ہی لکھی گئیں۔معارف تحقیق میں ایک حصہ دکن اور دکنی موضوعات پر مشتمل ہے۔دکنی مباحث کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جس کو'معارف' نے سلجھایا ہے۔

اردو کی سب سے پہلی مثنوی 'کدم راو پدم راو' جس کے مصنف فخر دین نظامی ہیں اس کی بازیافت کا سہرا معارف کے سر ہے۔اکتوبر 1932 میں نصیرالدین ہاشمی (1895۔1964) نے پہلی بار اس مثنوی کے متعلق ایک طویل مضمون لکھا اور اس مثنوی کے نام کا بھی تعین کیا۔اسی طرح اردو کی سب ضخیم مثنوی 'خاورنامہ' جو دکن کے ایک باکمال شاعر کمال خاں رستمی کی تصنیف ہے۔اس مثنوی کے قلمی نسخے کی اطلاع سب سے پہلے معارف ہی نے علمی وادبی دنیا کو پہنچائی۔'کتاب نورس' جو بیجاپور کے چھٹے حکمراں ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کے راگ راگنیوں کا مجموعہ ہے۔نصیرالدین ہاشمی نے جون 1932 میں 'نورس' کے تین مختلف نسخوں کی معارف کے ذریعے اطلاع دی جس کے بعد جولائی 1953 میں ڈاکٹر نذیر احمد (1915۔2008) کا ایک تفصیلی مقالہ ماہنامہ معارف میں شائع ہوا، جس میں کتاب نورس کے دس مخطوطوں کی اطلاع تھی۔1955 میں ڈاکٹر نذیر احمد نے ہی اپنے تفصیلی مقدمے کے ساتھ اسے مرتب کر کے شائع کیا۔علی عادل شاہ ثانی شاہی (1048۔1083) بیجاپور کے شاہی حکمرانوں میں آٹھواں حکمراں تھا جو علم وفضل کا قدرداں اور خود بھی ذی علم تھا۔شعروسخن میں ید طولی رکھتا تھا،اس کا اردو کلیات جو نایاب تھا معارف نے 1933 میں اس کے قلمی نسخے کی بازیافت کی۔جسے زینت ساجدہ نے 1962 میں مرتب کر کے شائع کیا۔شیخ داود ضعیفی جو ایک صاحب دیوان دکنی شاعر تھا ان کی دو کتابوں 'ہدایت ہندی اور عشق صادق' سے ہی اب تک ادبی دنیا واقف تھی معارف نے پہلی باران کی ایک اور کتاب 'نصیحت مدن' سے متعارف کرایا۔بالا جی نا یک ذرہ جو گیارہویں صدی ہجری کا ایک ہندو دکنی شاعر ہے جس کا کلام اب تک ناپید تھا پہلی بار معارف نے کتب خانہ آصفیہ میں اس کے غیر مطبوعہ کلیات کے بازیابی کی خبر دی۔سید میران ہاشمی بیجاپوری (1635۔1697) کا شمار دکن کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ریختی کا ایک دیوان اور دو کتابیں 'احسن القصہ' اور 'یوسف زلیخا' ان کی یادگار ہیں۔اب تک یہ

خیال عام تھا کہ 'احسن القصہ' اور 'یوسف زلیخا' دو الگ الگ کتابیں ہیں مگر ماہنامہ معارف نے برٹش میوزیم کے ایک قلمی مخطوطے کے موجودگی کی خبر دی جس کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ دونوں کتابیں دراصل ایک کتاب کے دو نام ہیں ۔اس کے علاوہ ماہنامہ معارف میں دکنی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جس میں نادر ونایاب نسخوں کی دریافت،ادبا وشعراء کے احوال،شعرا کے تذکرے اور دکنی کتابوں پر تعارف وتبصرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔

دکنی مباحث کے علاوہ سیکڑوں ایسے مضامین ہیں جن میں قلمی نسخوں اور مخطوطات کی بازیابی کی خبر دی گئی ۔ان مخطوطات کی دریافت سے نہ صرف یہ کہ ہمارے علمی وادبی ذخائر میں اضافہ ہوا ہے بلکہ تحقیقی معیار بھی بلند ہوا ہے ۔میر اثر خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی اور صاحب دیوان شاعر تھے ۔انہوں نے اردو کی مختلف شعری اصناف میں طبع آزمائی کی ۔ان کے دیوان میں غزلیں ،رباعیات اور دو مثنویاں شامل ہیں ۔میر اثر کی مثنوی 'خواب وخیال' کو اردو ادب میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے ۔ایک مدت تک یہ مثنوی کم یاب تھی ۔پہلی بار سید سلیمان ندوی نے 1917 میں معارف کے شذرات میں اس کی اطلاع دی ۔ڈھاکہ سے حکیم مولوی حبیب الرحمٰن خاں سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں اردو لغت ومحاورات کی دو نادر کتب کی اطلاع دیتے ہیں جو کہ دریائے لطافت سے پہلے لکھی گئی ۔مذکورہ خط شذرات معارف جولائی 1917 میں شائع ہوا ۔اس خط سے نہ صرف یہ کہ اردو کی دو قدیم کتابوں کے متعلق واقفیت ہوتی ہے بلکہ محمد حسین آزاد کا یہ نظریہ بھی باطل قرار پاتا ہے کہ انشاء اللہ خاں انشاء کی دریائے لطافت (1802)اردو قواعد کی پہلی کتاب ہے۔

اشرف علی فغاں شمالی ہند کے باکمال شعرا میں سے تھے ۔اردو اور فارسی دونوں میں شاعری کرتے تھے ۔انہوں نے اردو کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی ۔میر تقی میر ،سودا ،قدرت اللہ قاسم ،درد،آرزو،مصحفی اور جان جاناں کے نہ صرف معاصرین میں سے تھے بلکہ سودا جیسے اہم شاعر نے فغاں کی تقلید میں قطعات اور غزلیں کہیں،البتہ اشرف علی فغاں کو وہ شہرت نہ مل سکی جو ان کے معاصر شعرا کو ملی ۔فغاں کے دیوان سے نہ صرف عوام بلکہ خواص بھی ناآشنا تھے ۔ماہنامہ معارف اپریل 1922 کو عبدالسلام ندوی کا ایک مضمون 'اشرف علی فغاں' کے عنوان سے شائع ہوا ۔جس میں پہلی مرتبہ فغاں کے قلمی دیوان کی دسنہ میں بازیابی کی خبر دی گئی تھی ۔

مولانا الطاف حسین کی شخصیت محتاج تعارف نہیں وہ نہ صرف اردو تنقید کے بنیاد گزاروں میں سے ہیں بلکہ انہوں نے یادگار غالب اور حیات جاوید جیسی غیر معمولی اہمیت کی حامل سوانح عمریاں بھی تحریر کیں ۔اس کے علاوہ حالی نے کئی اہم کتابیں تحریر لکھیں ۔ان کی لکھی ہوئی کتابوں سے ہر کوئی واقف ہے البتہ کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ مولانا حالی نے خود اپنی کہانی تحریر کی تھی ،جو نایاب تھی معارف نے اس کی اطلاع اردو دنیا تک پہنچائی ۔دراصل مولانا حالی نے اپنے سوانحی حالات قلم بند کر کے نواب عماد الملک بلگرامی کی خدمت میں بھیجا تھا ۔نواب صاحب کے انتقال کے بعد

ان کے کاغذات میں یہ مسودہ ملا۔ جسے مدیر معارف کے ایک مختصر نوٹ کے ساتھ ماہنامہ معارف مئی 1927 کو شائع کیا گیا۔

عظیم آباد ایک عہد تک نہ صرف علم وادب کا گہوارہ رہا ہے بلکہ بعض لوگوں کے نزدیک اسے ایک دبستان کی حیثیت حاصل ہے۔ اردو کے کئی نامور ادبا وشعرا کا مسکن بھی رہا ہے۔ دہلی کے اجڑنے کے بعد شعرا وادبا کی ایک بڑی تعداد نے عظیم آباد کا رخ کیا۔ دلی سے عظیم ہجرت کرنے والوں میں ایک نام عشق عظیم آبادی کا ہے۔ عشق عظیم آبادی کا شمار اردو کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے حالات اور کلام کا انتخاب اکثر تذکروں میں ملتا ہے البتہ ان کا کلیات نایاب تھا۔ اصحاب ذوق کی تلاش وجستجو کے بعد بھی کلیات عشق دستیاب نہ ہوسکا۔ حسرت موہانی بھی اس کلیات کی تلاش میں عظیم آباد گئے مگر افسوس ان کی یہ حسرت پوری نہ ہوسکی۔ معارف کو یہ خوش نصیبی حاصل ہے کہ اس نے کلیات عشق کے بازیابی کی اطلاع سب سے پہلے اردو دنیا کو دی۔ مولوی سید حسن رضا کا مضمون 'شاہ رکن الدین عشق عظیم آبادی ان کا کلیات اور تذکرہ حیات' معارف مئی 1929 میں شائع ہوا۔ جس میں پہلی بار کلیات عشق کی دستیابی کی خبر دی گئی۔

شاد عظیم آبادی کا ایک تبرک 'متروکات شاد' معارف جولائی 1929 میں شائع ہوا۔ شاد عظیم آبادی نے مذکورہ مضمون میں اپنی شاعری کے متروکات کو درج کیا ہے۔ شاد کی یہ ایک قدیم تحریر ہے جو ایک مدت سے نایاب تھی۔ معارف نے اس کی اطلاع سب سے پہلے دی۔ قاضی عبدالودود کا مضمون 'سید انشا کا غیر مطبوعہ قطعہ اور اس کا شان نزول' معارف ستمبر 1937 شائع ہوا۔ مذکورہ مضمون میں انشاء اللہ خاں انشا ایک ایسے قطعہ کی بازیابی کی گئی ہے۔ جو انشاء کی مطبوعہ کلیات میں بھی نہیں ہے۔ معارف اکتوبر 1943 کو محمد ابواللیث صدیقی بدایونی کا مضمون 'میر حسن کی ایک نادر مثنوی' شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے پہلی بار اردو دنیا کو مثنوی رموز العارفین سے متعارف کرایا۔ فاضل مضمون نگار نے میر حسن کی کلیات کے کئی اہم نسخے دستیاب کر کے قلمی دیوان اور مثنویوں پر مفصل روشنی ڈالی ہے ۔ یہاں صرف چند مضامین پر روشنی ڈالی گئی البتہ 1947 تک کی مدت میں شائع ہونے والے ایسے تمام مضامین کو مقالے میں شامل کیا گیا ہے۔

معارف تحقیق کا ایک بڑا حصہ غالبیات پر مشتمل ہے۔ ابتدائی جلدوں سے ہی معارف کی غالب شناسی کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ غالب کے متعلق معارف میں جو تحریریں شائع ہویں ان میں غالب کی زندگی، شاعری اور ان کی تحریروں کے بارے میں تحقیق، غالب کے شاگردوں کا تذکرہ اور تحقیق نیز کلام غالب کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ غالب کے حوالے سے کئی اہم پہلوؤں پر مباحث کا سلسلہ معارف سے ہی شروع ہوا جو نہ صرف کئی برسوں تک چلا بلکہ بعد میں اس پر مختلف رسائل میں مضامین لکھے گئے ۔ غالب کے متعدد خطوط کی بازیابی معارف کے ذریعہ

ہوئی۔غالب کے فکروفن سے متعلق لکھی گئی کم وبیش سو کتابوں پر تبصرے یاان کا تعارف کرایا گیا ہے۔غالب صدی کے دوران ہندوپاک کے رسائل نے کثرت سے غالب نمبر شائع کیےان میں سے کئی اہم نمبروں پر بھی تبصرہ شائع ہوا۔

غالب تحقیق میں نسخۂ حمیدیہ ایک مستقل موضوع رہا ہے۔واضح رہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی دریافت ماہنامہ معارف کی اولیات میں سے ہے۔ستمبر 1918 کے شذرات میں سید سلیمان ندوی نے مولانا عبدالسلام ندوی کے حوالے سے مرزا غالب کے ایک قلمی دیوان کی اطلاع دی۔اس اطلاع کو معارف میں غالب تحقیق کا نکتہ آغاز کہا جاسکتا ہے۔اس نسخہ کو بعد میں نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شہرت ملی ۔نسخہ حمدیہ اور کتب خانہ حمیدیہ کے متعلق بحث کا سلسلہ 1918 سے 2017 تک جاری رہا۔مذکورہ نسخے کے دریافت کے بعد غالبیات میں نئے مباحث کا آغاز ہوا۔واضح رہے کہ یہ 1821 میں مرزا غالب نے اس وقت مکمل کیا تھا جب وہ چوبیس سال کے تھے ۔یہ نسخہ کب اور کس طرح بھوپال پہنچا یہ اب بھی تحقیق طلب ہے ۔البتہ بعد میں محققین نے نہ صرف اس کا مطالعہ کیا بلکہ اپنی آرا کو بھی پیش کیا ہے۔

دسمبر 1922 میں ’غالب کا ایک منظوم رقعہ شائع کیا گیا۔مرزا غالب نے یہ خط نواب علاءالدین خاں علائی کے نام تحریر کیا تھا،نواب صاحب نے بھی اس کا منظوم جواب دیا تھا۔اس خط میں دو دو قطعات ہیں ایک اردواور دوسرا فارسی میں دونوں میں بحروقافیہ یکساں ہیں۔معارف کے توسط سے یہ خط پہلی بار منظرعام پر آیا۔مذکورہ خط ضیاءالدین خاں رامپوری نے مرزا بشیر احمد خاں سے حاصل کیا تھا۔یہی منظوم مکتوب خلیق انجم نے اپنی کتاب ’غالب کی نادر تحریریں‘ میں بھی شائع کیا ہے۔

مئی 1926 میں نذیر احمد کا ایک مضمون ’مرزا غالب کے بچپن کی ایک تحریر‘ کے عنوان سے معارف میں شائع ہوا۔اسے دستاویزی حیثیت حاصل ہے کیونکہ یہ تحریر جس کو 1804 کو مرزا غالب نے خداداد خاں ولی داد خاں کے پاس اپنا مکان گروی رکھ کر جو روپیہ لیا تھا اس کے عوض میں لکھ کر ان کے حوالے کیا تھا۔معارف میں اس تحریر کی اشاعت کے بعد محققین نے بالخصوص ڈاکٹر مختارالدین آرزو اور مالک رام نے اس طرف توجہ کی اوراس حوالے سے مختلف رسالوں میں مضامین لکھے گئے ۔معارف میں شائع ہونے والی اس تحریر سے اردو دنیا نہ صرف نو دریافت تحریر سے آشنا ہوئی بلکہ پہلی مرتبہ غالب کی والدہ کا نام بھی سامنے آیا۔

اپریل اور مئی 1922 کے شمارے میں دوقسطوں میں حافظ احمد علی خاں کا ایک مقالہ ’سراج الدین ظفر شاہ دہلی اور مرزا غالب کی زندگی کا ایک گم شدہ ورق‘ شائع ہوا۔جس میں بہادر شاہ ظفر کی شیعیت کے مسئلہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔جب یہ مشہور ہوا کہ بادشاہ شیعہ ہوگئے ہیں تو غالب نے ایک مثنوی لکھی جس میں بقول حالی بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا۔حافظ علی احمد خاں نے کتب خانہ رام پور کی ایک کتاب ’دستورالعمل اودھ‘ کے حوالے

سے اس مسئلہ پر بحث کرنے کوشش کی ہے البتہ اس مضمون سے کوئی نتیجہ نکل کر سامنے نہیں آتا۔آج بھی یہ پہلو تحقیق طلب ہے۔مولانا عبد الماجد دریابادی کا ایک مضمون 'مرزا غالب کا ایک فرنگی شاگرد آزاد فرانسیسی' معارف جنوری 1922 میں شائع ہوا۔اس مضمون میں ایک معروف یورپی اردو شاعر الیگزینڈر ہدرلے آزاد کا تعارف ان کے مطبوعہ دیوان سے کرایا گیا ہے جو ان کی اطلاع کے مطابق کتب خانہ رامپور میں موجود ہے۔اس مضمون کی اشاعت سے قبل مرزا غالب کے اس فرنگی شاگرد کا ذکر خطوط غالب کے علاوہ محض چند تذکروں میں ملتا ہے۔

ماہنامہ معارف کا ایک بڑا حصہ سرمایہ اقبال کی تحقیق وتنقید پر مشتمل ہے۔علامہ شبلی اور علامہ اقبال کے گہرے مراسم تھے۔شبلی نے نہ صرف انہیں ترجمان حقیقت کا خطاب دیا تھا بلکہ بڑے شاعر ہونے کی پیشین گوئی بھی کی تھی۔علامہ شبلی کے انتقال کے بعد ان کے جانشین سید سلیمان ندوی سے بھی کافی لگاو رہا۔دارالمصنفین کے قیام بعد علامہ اقبال نے اس ادارے سے نہ صرف دلچسپی لی بلکہ تاحیات اس کے رکن بھی رہے۔سید صاحب کا معمول تھا کہ علامہ اقبال کے متعلق جب کوئی خوش کن خبر آتی تو معارف میں اس کا ذکر ضرور کرتے تھے۔اقبال کی متعدد نظمیں اور غزلیں سب سے پہلے معارف میں ہی شائع ہوئی۔یہ بات بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ مولانا عبد السلام ندوی کی کتاب 'اقبال کامل' آزاد ہندستان میں اقبال پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔

افکار اقبال کے مطالعہ کا آغاز معارف کی ابتدائی جلدوں سے ہوگیا تھا۔عہد سلیمانی سے تا حال علامہ اقبال کی سوانح،شاعرانہ عظمت اور ان کے فکر وفلسفہ پر ڈیڑھ سو سے زائد مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ان مضامین سے نہ صرف اقبال شناسی میں مدد ملتی ہے بلکہ بے شمار ایسے گوشے ہیں جن کا ذکر سب سے پہلے معارف میں آیا۔اس کے علاوہ اقبال کی اور ان کے فکر وفلسفہ پر لکھی گئی تقریبا سو کتابوں پر تبصرے بھی شامل ہیں۔معارف کے سرمایہ اقبالیات کی فہرست کافی طویل ہے البتہ ان پر لکھی گئی تحریروں کو آسانی کے لیے مختلف حصوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔فکر اقبال پر مقالات،حیات اقبال پر تحقیق،کلام اقبال کی فنی جہت کا تعین،کتب اقبال پر تبصرے،کلام اقبال کی تعبیر وتشریح اور فلسفہ اقبال کی تفہیم قابل ذکر ہیں۔

ماہنامہ معارف نے لسانی موضوعات کو ہمیشہ سے فوقیت دی ہے۔معارف میں شائع ہونے والے لسانی مضامین کی تعداد ستر کے قریب ہے۔مضامین کے علاوہ شذرات میں بھی زبان وبیان کا ایک بڑا سرمایہ ہے۔معارف کی ایک خاص بات یہ رہی ہے کہ اس نے ابتدائی جلدوں سے ہی لسانی موضوعات کو جگہ دی۔قابل غور بات یہ ہے کہ معارف نے اس وقت ان موضوعات کو فوقیت دی جب اردو کے دیگر رسائل لسانی مضامین سے یکسر خالی ہوتے تھے۔معارف جولائی 1932 میں عبد السلام ندوی کا مضمون 'ایک قدیم دکھنی شعر' شائع ہوا جس سے نہ صرف یہ کہ اردو زبان میں اسلوبیاتی تنقید کی ابتدا ہوئی بلکہ یہ عالمی ادب میں اسلوبیاتی مطالعہ کی ابتدائی تحریر کہی جاسکتی ہے۔اردو

میں اسلوبیاتی تنقید کا بانی عام طور سے مسعود حسین خاں کو مانا جاتا ہے، البتہ معارف کے مذکورہ مضمون کے حوالے سے عبدالسلام ندوی کو اسلوبیاتی تنقید کے بنیاد گاروں میں کہا جاسکتا ہے۔

معارف تحقیق کا ایک بڑا حصہ ادبا و شعرا کے سوانحی احوال کی تلاش و تحقیق پر مشتمل ہے۔ معارف کے مشمولات میں ایسے مضامین کی ایک بڑی تعداد ہے۔ ان مضامین میں بعض ایسے قدیم شعرا کے احوال ملتے جو کہیں اور نہیں ملتے یا پھر کم ہی تذکروں میں ملتے ہیں۔ بعض ایسی تحریریں بھی شائع ہوئی ہیں جنہیں سوانحی تحقیق میں اولیت حاصل ہے۔ ادبا شعرا کے حالات کی دریافت پر مشتمل مضامین میں صاحب اورنگ آبادی، شیخ خوب محمد چشتی، مصحفی کا سال وفات، مرزا مظہر جانجانا کا سال وفات، میر حسین تسکین، تذکرہ شعراء رام پور کا ایک گمنام شاعر، آتش سے ایک بہاری ادیب کی ملاقات، طالب علی عیش، شمس العلماء مولانا محمد سعید اورنگ آبادی، شیخ علی بخش بیمار، امیر الدین آزاد اور سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی قابل ذکر ہیں۔ ان مضامین میں بعض ایسے ہیں جو نہ صرف یہ کہ سلسلہ وار کئی قسطوں میں شائع ہوئے بلکہ جواب میں متعدد محققین کے مضامین بھی شائع ہوئے۔ کئی شعرا کی سن وفات کا تعین بھی معارف سے ہوا۔ شعرا و ادبا کے متعدد ایسے پہلو جن بازیافت معارف نے کی ہے۔ معارف میں اردو تحقیق کا ایک بڑا خزانہ موجود ہے۔ مذکورہ مقالے میں صرف 1947 تک کے مضامین شامل کیا گیا۔ 1947 کے بعد بھی کثرت سے تحقیقی نوعیت کے مضامین شائع ہوئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مقالات کو دوبارہ پڑھا جائے اور ان مباحث پر از سرے نو تحقیق کی جائے۔ ایک صدی سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی معارف پر نہ کے برابر لکھا گیا ہے۔ معارف کے حوالے سوائے چند مضامین کے کوئی باضابطہ کتاب نہیں ملتی۔

اطہر حسین

ریسرچ اسکالر

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس

کتابیات

کتب

1۔ آب حیات، محمد حسین آزاد، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنو 1981

2۔ آب حیات کی ادبی معنویت، نازیہ امام، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی 2016

3۔ آثار اقبال، عبدالقادر سروری، ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد 1965

4۔ آثار شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ 2013

5۔ آثار الصنادید، سر سید احمد خاں، منشی نول کشور پریس لکھنؤ، 1895

6۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو کے ادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ، شعیب رضا خاں وارثی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی 1997

7۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، اردو اکادمی دہلی 1990

8۔ ادبی اور لسانی تحقیق اصول اور طریقہ کار، پروفیسر عبدالستار ردولوی، شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی 1984

9۔ ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خاں، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ 1978

10۔ ادبی تحقیق، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی 1996

11۔ ادبی شناخت، محمد نوشاد عالم، چندو نگر، کراول نگر روڈ دہلی 2005

12۔ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، علوی پریس بھوپال، 1965

13۔ اردو تحقیق کا ارتقا، ڈاکر محمد حسین، انیس کتاب گھر راجستھان، 2010

14۔ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مجلس ترقی ادب لاہور 1972

15۔ اردو صحافت انیسویں صدی میں، ڈاکٹر طاہر مسعود، فضلی پرئیوٹ لمیٹڈ کراچی 2000

16۔ اردو صحافت اور حسرت موہانی، ڈاکٹر شریف الدین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2005

17۔ اردو صحافت کا سفر، گربچن چندن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی 2007

18۔ اردو صحافت کی تاریخ، نادر علی خان، ، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ، 1987

19۔ اردو صحافت ماضی اور حال، خالد محمود، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی 2012

20۔ اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل، عابد سہیل، اتر پردیش اردو اکیدمی لکھنؤ 1981

21۔ اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں، سید محمد عقیل، اردو اکیدمی لکھنؤ، 1991

22۔ اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں، قاضی عبدالودود، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ 1995

23۔ اردو میں اصول تحقیق، ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، مقتدرہ قومی زبان پاکستان 1986

24۔ اردو میں تحقیق، خطبہ صدارت شعبہ اردو آل انڈیا اورینٹل کانفرنس علی گڑھ، مالک رام (س ان)
25۔ اردوئے قدیم، حکیم سید شمس اللہ قادری، مطبع تیج کمار وارث مطبع نولکشور لکھنؤ 1967
26۔ اشاریہ ماہنامہ معارف، ڈاکٹر یوسف فاتحہ خوانی، مکہ پبلشر دہلی 2015
27۔ اشاریہ ماہنامہ معارف، محمد سہیل شفیق، قرطاس کراچی پاکستان 2006
28۔ اشاریہ نیادور، اطہر مسعود خاں، رام پور رضا لائبریری، رامپور، 2010
29۔ اشتر وسوزن، قاضی عبدالودود، مطبع کوہ نور دہلی، 1964
30۔ اقبال اور پیروی شبلی، سید افتخار حسین شاہ، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی 1978
31۔ اقبال اور دبستان شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، 2015
32۔ اقبال اور سید سلیمان ندوی، طاہر تونسوی، اعتقاد پبلشنگ ہاوس دہلی 1979
33۔ اقبال کامل، عبدالسلام ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ 1948
34۔ اقبال نامہ، شیخ عطاءاللہ، شیخ محمد اشرف لاہور 1945
35۔ الغزالی، شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، 1928
36۔ الفاروق، شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، 1956
37۔ الکلام، شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ 1921
38۔ المامون، شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، 1992
39۔ انتخاب کربل کتھا، پروفیسر حنیف نقوی، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ 1991
40۔ انجمن ترقی اردو کی تاریخی خدمات 1947 تک، ڈاکٹر محمد یونس، ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس 2008
41۔ بیان شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2020
42۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، ڈاکٹر انور سدید، اکیدمی ادبیات پاکستان، 1992
43۔ پاکستان میں اردو تحقیق، ڈاکٹر معین الدین عقیل، انجمن ترقی اردو پاکستان، 1987
44۔ پرانے چراغ، حصہ سوم، مولانا ابوالحسن ندوی، مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنو 1980
45۔ پنجاب میں اردو، حافظ محمود شیرانی، مکتبہ کلیاں بشیرت گنج لکھنؤ 1960
46۔ تاریخ ادب اردو جلد اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی 1977
47۔ تاریخ ادب اردو جلد سوم، سیدہ جعفر، وی جی پرنٹرس حیدر آباد 2002
48۔ تاریخ ادب اردو۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، ایجوکیشنل بک ہاوس دہلی 2010

49۔ تاریخ صحافت اردو جلد اول، امداد صابری، جدید پرنٹنگ پریس چوڑی والان دہلی1953

50۔ تاریخ صحافت اردو جلد دوم، امداد صابری، جدید پرنٹنگ پریس چوڑی والان دہلی1953

51۔ تاریخ صحافت اردجلد چہارم، وامداد صابری، چوڑی والان دہلی1963

52۔ تاریخ صحافت اردو جلد پنجم، امداد صابری، چوڑی والان دہلی، 1974

53۔ تاریخ فیروز شاہی، ضیاالدین برنی، ترجمہ سید معین الحق، مرکزی اردو سائنس بورڈ لاہور، 1983

54۔ تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اول، مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات لکھنؤ2017

55۔ تاریخ ندوۃ العلماء حصہ دوم، مولانا شمس تبریز خاں، مجلس تحقیقات ونشریات لکھنؤ2015

56۔ تحقیق کا فن، گیان چند جین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی2008

57۔ تحقیق وتدوین، پروفیسر ابن کنول، کتابی دنیا دہلی، 2006

58۔ تدوین تحقیق روایت، رشید حسن خاں، ایس اے پبلیکیشنز دہلی1999

59۔ تذکرہ آرزدہ، مختار الدین احمد آرزو، ، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی1974

60۔ تذکرہ شعرائے اردو، میر حسن، عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ 1971

61۔ تذکرہ طبقات الشعراء ہند، مولوی کریم الدین، مطبع العلوم مدرسہ دہلی1848

62۔ تذکرہ گلشن ہند، مختار الدین احمد، علمی مجلس دہلی1967

63۔ تعارف: دارالمصنفین اعظم گڑھ، مطبع معارف اعظم گڑھ (س ان)

64۔ تنقیدی نقوش، ڈاکٹر عبدالقیوم، مشتاق بک ڈپو کراچی1963

65۔ جدید اردو تنقید اصول ونظریات، پروفیسر شارب ردولوی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ1994

66۔ حافظ محمود شیرانی تحقیق مطالعے، پروفیسر نزیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، 1991

67۔ حالی کی اردو کی نثر نگاری، ڈاکٹر عبدالقیوم، ریڈنگ پرنٹنگ پریس لاہور1964

68۔ حامد اقبال صدیقی، سیماب اکبر آبادی، ساہتیہ اکیدمی دہلی، 2009

69۔ حیات جاوید، الطاف حسین حالی، پنجاب اکادمی لاہور1976

70۔ حیات سلیمان، شاہ معین الدین احمد ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ2011

71۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ1970

72۔ خالق باری، مرتبہ حافظ محمود شیرانی، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، 1944

73۔ خاور نامہ، شیخ چاند، ترقی اردو بورڈ کراچی، 1968

74۔ خطوط محمد علی جوہر، محمد سرور، مکتبہ جامعہ دہلی 1940

75۔ خواب وخیال، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو دہلی 1926

76۔ خیام، سید سلیمان ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ 1960

77۔ دارالمصنفین کی ادبی خدمات کا تعارف 1980 تک، ڈاکٹر شباب الدین، دارالمصنفین اعظم گڑھ 2008

78۔ دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات، خورشید نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، 2003

79۔ دارالمصنفین کی تاریخی خدمات، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، خدابخش پبلک لائبریری پٹنہ 2002

80۔ دارالمصنفین کے سو سال، کلیم صفات اصلاحی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، 2014

81۔ داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری، کراچی اردو اکیڈمی سندھ، 1928

82۔ داستان صحافت، عبدالسلام خورشید، مجلس ترقی ادب لاہور، 1963

83۔ دکن میں اردو نصیرالدین ہاشمی، نسیم بک ڈپو لکھنؤ 1963

84۔ دکنی ادب کی تاریخ، محی الدین قادری زور، ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد، 1982

85۔ دکنی اور دکنیات، ڈاکٹر محمد علی اثر، الیاس ٹریڈرس حیدرآباد، 1982

86۔ دہلی میں عصری اردو صحافت، شاہد الاسلام، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2016

87۔ دیوان حضور، مرتبہ مختار الدین احمد، لبرٹی آرٹ پریس دہلی 1977

88۔ دیوان ذوق، مرتبہ محمد حسین آزاد، علمی پرنٹنگ ورکس دہلی 1933

89۔ دیوان فغاں، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، انجمن ترقی اردو 1950

90۔ ذکر شبلی، امین زبیری، مکتبہ جدید لاہور 1953

91۔ رشید حسن خاں اور ادبی تحقیق، ڈاکٹر عبدالحمید، کتابی دنیا دہلی، 2013

92۔ رشید حسن خاں کلام غالب کے شارح، عمیر منظر، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی 2019

93۔ رشید حسن خاں محقق اور مدون، ڈاکٹر ٹی آر رینا، اپلائڈ بکس نئی دہلی 2015

94۔ رموز العارفین، مرتبہ سید احمد اللہ قادری، شمس الاسلام پریس حیدرآباد 1933

95۔ سب رس، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو دہلی 1964

96۔ سرسید اور ان کے نامور رفقا، ڈاکٹر سید عبداللہ، یونین پرنٹنگ پریس دہلی 1960

97۔ سرسید کی نثری خدمات، ڈاکٹر مشتاق احمد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 1993

98۔ سفرنامہ افغانستان، سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ 1992

99۔ سفر نامہ روم ومصر وشام، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، 2015

100۔ سوانح مولانا روم، شبلی نعمانی، مجلس ترقی ادب لاہور 1935

101۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، محمد حامد علی خاں، ساہتیہ اکادمی 1996

102۔ سیرت النبی، شبلی نعمانی، مطبع معارف اعظم گڑھ 1974

103۔ شبلی نامہ، شیخ محمد اکرام، مکتبہ اردو دہلی 1960

104۔ شذرات سلیمانی، سید سلیمان ندوی، جلد اول، دارالمصنفین اعظم گڑھ 1990

105۔ شذرات سلیمانی، سید سلیمان ندوی، جلد دوم، دارالمصنفین اعظم گڑھ 1997

106۔ شذرات سلیمانی، سید سلیمان ندوی، جلد سوم، دارالمصنفین اعظم گڑھ 1998

107۔ شعرا اردو کے تذکرے، حنیف نقوی، مجلس ترقی ادب لاہور 1972

108۔ شعر الہند جلد اول دوم، عبدالسلام ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ 1927

109۔ شمس البیان فی مصطلحات الہندستان، عابد رضا بیدار، خدابخش لائبریری 1977

110۔ صحافت پاکستان وہند میں، عبدالسلام خورشید، مکتبہ کارواں لاہور، 1963

111۔ عربوں کی جہاز رانی، سید سلیمان ندوی، اسلامی ریسرچ ایسوشی ایشن ممبئی 1984

112۔ علامہ سید سلیمان ندوی: شخصیت اور ادبی خدمات، ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، مکتبہ فردوس لکھنو، 1985

113۔ علم الکلام، شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، 1923

114۔ عماد التحقیق، پروفیسر کلب عابد، فیکلٹی آف تھیالوجی علی گڑھ، 1978

115۔ فہرست کتب، دارالمصنفین اعظم گڑھ، مطبع معارف اعظم گڑھ (س/ن)

116۔ قدیم رسائل اور اداریہ نگاری، نورالہدی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی، 2015

117۔ کاشف الحقائق، امداد امام اثر، انجمن ترقی اردو دہلی 1939

118۔ کتاب نورس، مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد، دانش محل امین الدولہ پارک لکھنو، 1955

119۔ کتابیات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، 2011

120۔ کرناٹک میں اردو صحافت، ڈاکٹر انیس صدیقی، افلاک پبلی کیشنز، گلبرگہ کرناٹک 2003

121۔ کلیات حضرت رکن الدین عشق ان کی حیات وشاعری، ڈاکٹر قریشہ حسین، آزاد پریس پٹنہ 1979

122۔ کلیات شاہی، مرتب سید مبارز الدین رفعت، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ 1962

123۔ گلزار نسیم، رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ 2007

124۔ گل رعنا، مولانا عبدالحئی، مطبع معارف اعظم گڑھ، 1951

125۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، اردو مرکز لاہور 1967

126۔ مالک رام محقق اور دانشور، پروفیسر نثار احمد فاروقی، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی 1991

127۔ ماہنامہ معارف کا اشاریہ 1916۔1970، شائستہ خان، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ جامعہ نگر نئی دہلی 1995

128۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مرتبہ جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 1979

129۔ مجلّاتی صحافت کے اداراتی مسائل، روشن آرا، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد پاکستان، 1989

130۔ محمد حسین آزاد بحیثیت محقق، قاضی عبدالودود، ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ 1984

131۔ ڈاکٹر امتیاز ندیم، مخزن اشاریہ اور ادبی خدمات، مکتبہ نعیمیہ مئوناتھ بھنجن، 2007

132۔ مرحوم دہلی کالج، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند دہلی 1989

133۔ مشاہیر کے خطوط، بنام سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ 1992

134۔ معارف کی کہانی مدیران معارف کی زبانی، کلیم صفات اصلاحی، زاویہ پرنٹ، جامعہ نگر نئی دہلی 2021

135۔ معراج العاشقین، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند، 1923

136۔ مقالات سلیمانی (جلد ۳) سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ 1962 تا 1968

137۔ مقالات شبلی (جلد ۶) دارالمصنفین اعظم گڑھ، 1930 تا 1935

138۔ مقالات سلیمان اول، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین اعظم گڑھ، 1966

139۔ مقدمات عبدالحق، مولوی عبدالحق، اردو مرکز لاہور 1964

140۔ مقالات ہاشمی، نصیرالدین ہاشمی، فیروز پرنٹنگ پریس لاہور 1929

141۔ مکاتیب شبلی جلد اول، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ 2010

142۔ مکاتیب شبلی جلد دوم، مرتبہ سید سلیمان ندوی, دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ 2012

143۔ مکتوبات سلیمانی، عبدالماجد دریابادی، صدق بک اجنسی لکھنؤ 1963

144۔ مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں، مرتبہ اشتیاق احمد ظلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، 2015

145۔ مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند 2001

146۔ مونوگراف محمد حسین آزاد، ابوالکلام قاسمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی 2016

147۔ نقوش سلیمانی، سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ 1939

148۔ نکات الشعرا، مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ 1984

149۔ نئی تنقید، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی 1988
150۔ ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، محمد عتیق صدیقی، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، 1957
151۔ ہندی اردو تنازع، فرمان فتح پوری، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد 1988
152۔ یارعزیز، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، معارف پریس اعظم گڑھ 1965
153۔ یادرفتگاں، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ 1993
154۔ یادگار غالب، الطاف حسین حالی، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی 1986
155۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات، نصیرالدین ہاشمی، شمس المطابع عثمان گنج 1932

رسائل وجرائد

رسائل	مقام	سن اشاعت	سن اشاعت
آج کل	نئی دہلی	جون1971	مارچ1957
ادبی دنیا	بزم ادب	سالنامہ1939	
اردو ادب	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ	جولائی1955	
الندوہ	لکھنؤ	مارچ1910	
الہلال	کلکتہ	فروری1914	
امکان	لکھنؤ	جنوری2009	
اودھ اخبار	لکھنؤ	جنوری1874	
جامعہ	نئی دہلی	ستمبر1992	
زمانہ	کانپور	اکتوبر1923	
زمانہ	بریلی	فروری1903	
سب رس	حیدرآباد	جنوری1938	
سویرا	لاہور	جنوری1947	
شاہراہ	دہلی	جنوری1949	
شب خون	الہ آباد	جون1966	
فکر ونظر	علی گڑھ	فروری1995	
قومی زبان	کراچی	جنوری1977	
کتاب نما	نئی دہلی	مارچ1965	
ماہ نور	کراچی	جنوری1954	
معارف	دارالمصنفین اعظم گڑھ	1916 تا1947	
نقوش	لاہور	دسمبر1959	
نگار	لکھنؤ	نومبر1988	
نوائے ادب	انجمن اسلامِ ممبئی	جنوری1950	
نیرنگ خیال	لاہور	جولائی1925	
ہمایوں	لاہور	جنوری1922	
ہماری زبان	نئی دہلی	مئی1969	جون1949